کتاب
فیہ ما فیہ
ملفوظات
مولانا جلال الدین محمد رومیؒ
مقدمہ
آقائے بدیع الزماں فروزانفر
مترجم
مولانا شمس بریلوی
رومی پبلشنگ ہاؤس
کراچی

حمد

حمدُ لکَ والشکر لکَ یاذوالمنن | حاضری وناظری بر حالِ من
واحد اندر ملک، اُورا یار نے | بندگانش راجز اُو سالار نے
خالقِ افلاک وانجم بر علا | مردم ودیو و پری و مرغ را
خالقِ دریا و دشت وکوہ وتیہہ | ملکِ اوبے حدّو اُو بے شبیہہ
شاہِ ما بیدار و ہر دم ہوشیار | می رساند روزئی ہر مور و مار
کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِی شانٍ بخواں | مرورا بے کار و بے فعلے، مداں
او مبدل کردہ خاکے را بزر | خاکِ دیگر را بکردہ بوالبشر
تاقیامت گر بگویم زین کلام | صد قیامت بگزرد، وین ناتمام
دوست را اندر احد واحمد بزن | اے برادر وارۂ از بوجہلِ تن

اشاعت اول ـــــــــــ جولائی ۱۹۹۶ء

تعداد ـــــــــــ ایک ہزار

مطبع ـــــــــــ پنجاب پریس

ناشر رومی پبلیشنگ ہاوس۔کراچی

قیمت ـــــــــــ ۱۵۰ روپے

نعت

سیّد و سرور محمدؐ نورِ جاں   بہتر و مہتر شفیعِ مجرماں

آں چناں گشتہ پُر از اجلال حق   کہ درو ہم رہ نیابد آل حق

زاں محمدؐ شافعِ ہر داغ بود   کہ سرمہ چشم او مازاغ بود

از الم نشرح دو چشمش سرمہ یافت   دید انچہ جبرئیل آں برنتافت

مصطفٰے را وعدہ کرد الطافِ حق   گر بمیری تو نمیرد ایں سبق

من کتاب و معجزت را رافعم   بیش و کم کن رازِ قرآں دافعم

چاکرانت شہرہا گیرند و جاہ   دینِ تو گیرد زِ ماہی تا بہ ماہ

تا قیامت باقیش داریم ما   تو مترس از نسخِ دیں اے مصطفٰے

گر بگویم تا قیامت نعتِ او   ہیچ آں را مقطع و غایت مجو

مرتبہ:۔ مولانا قاضی ابو بکر محمد شیث جونپوری

ملنے کا پتہ :۔ علم و عمل بک ڈپو
۹۔ رئیس منزل، اردو بازار۔ بندر روڈ، کراچی

فہرست مضامین

فیہ ما فیہ (اُردو ترجمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارش احوال

عرصہ دراز سے یہ خواہش میرے دل میں گھر کئے ہوئے تھی کہ حضرت مولانا جلال الدین محمد رومی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظاتِ گراں بہا کو جو علمی و ادبی دنیا میں "فیہ ما فیہ" کے نام سے مشہور ہیں اُردو کے قالب میں ڈھال کر اُن ناظرین و شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں جو فارسی زبان سے مانوس نہیں ہیں۔

ملفوظات اصل میں، مجموعہ ہے اُن گفتگوؤں کا جو حضرت مولاناؒ کی مجلس میں حاضر ہونے والے دل شکستہ اور پراگندہ حال لوگوں کے سوال پر یا از خود حضرت مولاناؒ کی جانب سے اہل مجلس کی تسکین کی خاطر ہوا کرتی تھیں، یہ زوالِ بغداد کے بعد کا زمانہ ہے جب عالمِ اسلام میں ہر طرف پریشانیاں ہی پریشانیاں مسلّط تھیں، حضرت مولاناؒ طبیب روحانی تھے اور ان کی مجلس میں حاضر ہونے والے ایک ایک شخص کی فکری و خیالی بیماریوں کا علاج ہوتا جاتا تھا، اس مجموعے کو ہم اس طرح پڑھتے ہیں گویا اُسی مجلس میں بیٹھے ہوئے ہیں، حضرت مولاناؒ کی باتیں سن رہے ہیں اور ان کی توجہ سے فیضیاب ہو رہے ہیں، میں نے چاہا کہ میرے گرد و پیش بھی پریشان حال اور پریشان خیال لوگ

موجود ہیں وہ سب حضرت مولاناؒ کی مجلس میں حاضر ہوں - یہ تھی میری خواہش جس کی تکمیل چاہی اور مشہور و معروف ادیب و شاعر، فارسی زبان کے ماہر استاد، جناب شمس الحسن صاحب شمس بریلوی کی خدمات حاصل کیں جن کے قلم گوہر رقم سے متعدد چھوٹی بڑی کتابیں ترجمہ ہو ہو کر منظر عام پر آتی رہی ہیں، فاضل مترجم نے اپنی علمی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت مولاناؒ کے ملفوظات "فیہ مافیہ" کا بھی ترجمہ فرمایا لیکن اتفاق سے ترجمہ اُس نسخے سے ہوا جو سہل الحصول تھا اور اعظم گڑھ کا مطبوعہ تھا مترجم موصوف نے نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ کتابت شدہ صفحات کی تصحیح بھی فرمادی اور ازراہ کرم میری ذمہ داریوں کا بوجھ ممکنہ حد تک کم کیا۔

ترجمہ جب کتابت شدہ اور تصحیح کردہ صفحات کی صورت میں میرے پاس آیا تو اصل مسودہ اس کے ساتھ نہ تھا، اور ڈھونڈا تو کہیں نہ ملا۔ نہ مترجم موصوف کے پاس، نہ کاتب صاحب کے پاس، جس کی وجہ سے میری طبیعت پر عجیب انقباض طاری رہا - ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہو - نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب پریس میں نہ جا سکی۔ الماری کی نذر ہوگئی اور میں دوسرے کاموں میں الجھ گیا۔

کچھ عرصہ بعد "فیہ مافیہ" اور اس کے ترجمے کا تذکرہ مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی صاحب سے ہوا جن کو حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ سے کمال محبت و عقیدت ہے اور علمی و ادبی حلقے ان سے واقف ہیں کہ مثنوی مولوی معنوی پر ان کی نظر کتنی وسیع ہے، انھوں نے جستہ جستہ کتابت شدہ صفحات دیکھے تو فرمایا کہ ترجمہ کسی کتاب کا بھی ہو فارسی

وعربی کے جملے جب اردو میں منتقل ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مفہوم الٹ گیا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کے اشعار ہوں یا "فیہ ما فیہ" کی نثر، ان میں خاص خیال اس کا رکھنا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے انداز بیان کی اور ان کے اسرار و رموز کی عکاسی پوری طرح ہو۔ پھر فرمایا کہ میں ان تمام صفحات کو از ابتدا تا انتہا دیکھ کر ہی کچھ عرض کر سکوں گا لیکن مولانا ندوی صاحب اپنی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے اور ان سے بھی زیادہ اپنی علالتِ طبع کے سبب سے اس کو شروع نہ کر سکے اور شروع کیا بھی۔ اس پر محنت بھی کی تو خود میری مشغولیتیں زیادہ بڑھ گئیں اور یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

اسی اثناء میں میری ملاقات ایک دن اپنے مفتی صاحب مولانا محمد اطہر نعیمی خطیب جامع مسجد آرام باغ سے ہوئی اور اس کتاب کا تذکرہ آیا تو انھوں نے فرمایا کہ "فیہ ما فیہ" کا ایک جدید ایرانی نسخہ میرے پاس آیا ہے جس کو مرتّب نے بڑی تحقیق و تدقیق کے بعد طبع کرایا ہے۔ مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے اس کا مقابلہ کیا ہے۔ ان نسخوں میں جو غلطیاں، ترمیمیں کمی بیشی اور اختلافات نظر آئے ان کی نشاندہی بھی کی ہے اصلاح بھی کی ہے اور سب نسخوں پر ضروری تنقیدیں بھی کی ہیں، انھیں میں آپ کا یہ نسخہ بھی شامل ہے جو اعظم گڑھ کا مطبوعہ ہے۔ یہ سُن کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ حضرت مولانا جلال الدین محمد رومی رحمۃ اللہ علیہ کی کرامت تھی جس نے ابتک کتاب کو پریس میں جانے نہ دیا، حالانکہ اس کی کتابت مکمل ہو چکی تھی۔

نئی کتابت میں وقت بھی لگتا اور موجودہ کتابت پر جو اخراجات ہو چکے تھے وہ بھی ضائع جاتے۔ لہٰذا طے ہوا کہ کتابت شدہ صفحات کا اس جدید ایرانی نسخے سے مقابلہ کیا جائے چنانچہ مولانا ندوی صاحب اور مولانا نعیمی صاحب نے مل کر ان صفحات کا مقابلہ کیا اور جہاں جہاں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں وہاں تبدیلی بھی کی اور جو فصلیں چھوٹ گئی تھیں ان کو کتاب میں داخل بھی کیا۔ اس کے بعد یہ کتاب اس قابل ہوئی کہ پریس میں جائے۔

یہ جدید ایرانی نسخہ جو مفتی صاحب نے عطا فرمایا، طہران یونیورسٹی کے مشہور و معروف محقق آقائے بدیع الزماں فروزانفر کا مرتب کردہ ہے اور اس پر جو بیش قیمت اور پُر از معلومات مقدمہ اُن کا لکھا ہے اُس کے اخیر میں ۱۷ شعبان ۱۳۷۰ھ قمری درج ہے۔ ۱۳۷۰ھ قمری مطابق ہے ۱۹۵۱ء کے۔ اور وہ نسخہ جو اعظم گڑھ میں چھپا تھا اس کا سال طباعت ۱۹۲۸ء ہے۔

آقائے بدیع الزماں فروزانفر نے اپنے مقدمے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "عمر عزیز کے بائیس سال تفتیش و تحقیق میں صرف ہوئے" اور اس اثناء میں "فیہ ما فیہ" کے قلمی نسخے جہاں جہاں بھی موجود تھے اور مل سکے آقائے موصوف نے ان کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور قلمی نسخوں کے ساتھ مطبوعہ نسخے بھی جمع کئے۔ سب کا بنظر غائر

مقابلہ وموازنہ کیا اور تصحیح اغلاط بھی کی۔

حضرت مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ کے اصل مفہوم ومراد کو سمجھنے کے لئے موصوف نے حضرت مولانا کے تمام مجموعۂ نظم ونثر کا مطالعہ بھی باقاعدہ کیا تاکہ ان کی فکر ونظر اور انداز کلام پوری طرح سمجھ میں آئے اور کوئی آمیزش اس میں نہ ہونے پائے اس کے بعد آقائے موصوف اس گراں بہا مجموعۂ ملفوظات کو موجودہ ترتیب کے ساتھ دنیا کے سامنے لانے میں کامیاب ہوئے اس ضمن میں آقائے موصوف نے اپنی اور اپنے دوسرے اہل علم احباب کی محنت ومشقت کا تذکرہ بھی بڑے جذبے کے ساتھ اپنے مقدمے میں کیا ہے اور ان سب قلمی ومطبوعہ نسخوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پیش نظر رہے ہیں۔

مولانا ندوی صاحب اور مولانا نعیمی صاحب نے آقائے بدیع الزماں فروزانفر کے مقدمے کا ترجمہ شامل کتاب کر دیا ہے تاکہ اہمیت کی دوسری علمی وتاریخی باتیں بھی ناظرین کے سامنے آجائیں جو دوسری جگہ دستیاب نہیں ہونگی۔ البتہ آقائے موصوف نے جو حواشی وتعلیقات اور ضمنی فہرستیں اشعار وامثال وغیرہ کی درج کی ہیں ان کو ترجمے کا جز نہیں بنایا۔ بہرحال میں ان دونوں بزرگوں کا بیحد ممنون ہوں کہ ان کی توجہ نے اس کام کو منزل تک پہنچانے میں میری بڑی مدد کی اور آج ایک صحیح اور مکمل ترجمہ قارئین کے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب آپ حضرات کی تشنگیٔ مطالعہ کو دور کرنے کے لئے چھپ کر سامنے آئی تو ضرور مگر بڑی تاخیر سے آئی حالانکہ میں نے اس کو برسوں قبل آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی ابتدا کی تھی۔ مگر اس مقصد کی تکمیل میرے لئے ایک بڑے امتحان سے کسی طرح کم ثابت نہ ہوئی۔ تاہم میں اللہ تعالی کا شکرگزار ہوں کہ اس نے مجھے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی توفیق بخشی مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب توجہ سے پڑھی گئی تو لوگوں کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

خاکسار

حاجی احمد دین

رومی منزل، ۱۳۲- پیر کالونی، کراچی

ہمارے تاثرات

ناظرین گرامی السلام علیکم

زیر نظر کتاب کے بارے میں جناب حاجی احمد دین صاحب ناشر کتاب کی عرضداشت محترم جناب الحاج شمس الحسن صاحب بریلوی کے کلمات دوبارہ تعارف کتاب اور ایرانی محقق جناب فروزا نفر کے تاثرات ان کے بلیغ مقدمہ میں آپ خود ملاحظہ فرمائینگے ناشر کتاب جناب حاجی احمد دین صاحب کا اصرار کہ اس کتاب کے دو صفحات ہم دونوں یعنی محمد اطہر نعیمی، سید حسن مثنیٰ ندوی کیلئے مخصوص کردیئے گئے ہیں اور ہمیں اپنے ان تاثرات کو قلمبند کرنا ہے جو کتاب کی اس تصحیح کے ضمن میں پیش آئے جبکہ ہم اعظم گڈھ کے نسخہ سے ترجمہ کئے ہوئے صفحات کا ایرانی مطبوعہ نسخہ سے موازنہ کررہے تھے۔

ایرانی محقق جناب فروزانفر کے مقدمہ میں آپ خود ملاحظہ کریں گے کہ اعظم گڈھ کا مطبوعہ نسخہ جو مشہور علمی شخصیت جناب مولانا دریاآبادی کے زیراہتمام چھپا تھا وہ بھی اغلاط سے خالی نہیں لیکن فاضل مقدمہ نگار نے ان مقامات کی نشاندھی نہ کی اگر موصوف ان مقامات کی نشاندھی کردیتے تو ہمیں آسانی ہوجاتی اور ان مقامات کی درستگی عمل میں لائی جاتی اور اس مرحلہ پر پوری کتاب کے ترجمہ کو پڑھ کر حکّ و اضافہ کی دقت سے بچ جاتے اور حاجی احمد دین صاحب کو تاخیر اشاعت کی کوفت برداشت نہ کرنا پڑتی۔

جناب الحاج شمس الحسن صاحب شمس بریلوی کا ترجمہ ہو رہا تھا

یہاں ہم یہ عرض کرنے کی جسارت کریں گے کہ ارباب علم اور ناشرین نے وقیع اور نادر روزگار کتابوں کی اشاعت کا اہتمام تو بڑے ذوق و شوق سے کیا لیکن اس کتاب کی صحت کی ذمہ داری قبول نہ کرتے ہوئے کتاب کو بلا تحقیق و تجسس چھاپ کر بزعم خود ایک کارنامہ انجام دے ڈالا اور یہ نہ سوچا کہ تحقیق و تجسس کے اس دور میں جب کوئی صاحب علم اس پر توجہ دے گا اور غلطیہائے مضامین کو درست کرے گا تو اس کو کیا کچھ کرنا نہ پڑے گا۔ ہم فاضل ایرانی محقق جناب فروزانفر کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت مولانا روم قدس سرہ کے اس علمی کارنامہ پر گرانقدر مقدمہ میں اپنی علمی کاوش جو اس کتاب میں کی ہے اس پر روشنی ڈالی اور (تقریبًا) صحیح نسخہ ارباب علم کے ذوق علمی کی تسکین کے لئے پیش کیا ہم نے تقریبًا کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بشری طور پر انسان سے غلطی ممکن ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ہم نے اپنی بساط کے مطابق کتابت شدہ اوراق کی تصحیح کر کے ناشر کتاب کو پیش کر دیا اب معاملہ حاجی احمد دین صاحب اور ناظرین کے درمیان میں ہے کہ کتاب ناظرین گرامی کے سامنے کب آتی ہے،

والسلام

(مولانا) سید حسن مثنیٰ ندوی

(مفتی) محمد اطہر نعیمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حالاتِ مولانائے روم رحمۃ اللہ علیہ

محمد نام، جلال الدین لقب، عرف، مولانائے رُوم۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھے۔ جواہر مضیئہ میں سلسلۂ نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ محمد بن محمد بن حسین بن احمد بن قاسم بن مسیب بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابوبکر الصدیق۔

اس روایت کی رُو سے حسین بلخی مولانا کے پردادا ہوتے ہیں لیکن سپہ سالار نے ان کو دادا لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ حسین بہت بڑے صوفی اور صاحبِ حال تھے سلاطینِ وقت اس قدر اُن کی عزّت کرتے تھے کہ محمد خوارزم شاہ نے اپنی بیٹی کی اُن سے شادی کر دی تھی۔ بہاؤالدین اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے سلطان محمد خوارزم شاہ بہاؤالدین کا ماموں اور مولانا کا نانا تھا۔

مولانا کے والد کا لقب بہاؤالدین اور بلخ وطن تھا۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار گِنے جاتے تھے۔ خراسان کے تمام دُور دراز مقامات سے انہی کے ہاں فتوے آتے تھے۔ بیت المال سے کچھ روزینہ مقرر تھا۔ اسی پر گذر اوقات تھی۔ وقف کی آمدنی سے مطلقاً متمتع نہیں ہوتے تھے۔ معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک علومِ درسیہ کا درس دیتے تھے۔ ظہر کے بعد حقائق اور اسرار بیان کرتے۔ پیر اور جمعہ کا دِن وعظ کے لئے خاص تھا۔

یہ خوارزم شاہیوں کی حکومت کا دور تھا اور محمد خوارزم شاہ جو اس سلسلہ کا گلِ سرسبد تھا مسند آرا تھا۔ وہ بہاؤالدین کے حلقہ بگوشوں میں تھا اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اسی زمانہ میں امام فخرالدین رازی بھی تھے اور خوارزم شاہ کو اُن سے بھی خاص عقیدت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب محمد خوارزم، بہاؤالدین کی خدمت میں حاضر ہوتا تو امام صاحب بھی ہمرکاب ہوتے۔ بہاؤالدین اثنائے وعظ میں فلسفۂ یونانی اور فلسفہ دانوں

کی نہایت مذمت کرتے اور فرماتے کہ جن لوگوں نے کتبِ آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیوں کی تقویم کہن پر جان دیتے ہیں، نجات کی کیا اُمید کر سکتے ہیں! امام صاحب کو ناگوار گزرتا لیکن خوارزم شاہ کے لحاظ سے کچھ نہ کہہ سکتے۔

ایک دن خوارزم شاہ مولانا بہاؤالدین کے پاس گیا تو ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا۔ شخصی سلطنتوں میں جو لوگ مرجع عام ہوتے ہیں سلاطین وقت کو ہمیشہ ان کی طرف سے بے اطمینانی رہتی ہے۔ مامون الرشید نے اسی بناء پر حضرت علی رضا کو عیدگاہ میں جانے سے روک دیا تھا۔ جہانگیر نے اسی بناء پر مجدد الف ثانی کو قید کر دیا تھا۔ بہرحال خوارزم شاہ نے حد سے زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر امام رازی سے کہا کہ کس غضب کا مجمع ہے، امام صاحب اس قسم کے موقع کے منتظر رہتے تھے، فرمایا ہاں، اور ابھی سے تدارک نہ ہوا تو پھر مشکل پڑے گی، خوارزم شاہ نے امام صاحب کے اشارے سے خزانۂ شاہی اور قلعہ کی کنجیاں بہاؤالدین کے پاس بھیج دیں اور کہلا بھیجا کہ اسباب سلطنت سے صرف کنجیاں میرے پاس رہ گئی ہیں وہ بھی حاضر ہیں۔ مولانا بہاؤالدین نے فرمایا کہ اچھا جمعہ کو وعظ کہہ کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ جمعہ کے دن شہر سے نکلے مریدانِ خاص میں سے تین سو بزرگ ساتھ۔ خوارزم شاہ کو خبر ہوئی تو بہت پچھتایا اور حاضر ہو کر بڑی منت سماجت کی لیکن یہ اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ راہ میں جہاں گزر ہوتا تھا، تمام روسا و امراء زیارت کو آتے تھے ۶۱۰ھ میں نیشاپور پہنچے، خواجہ فریدالدین عطار ان کو ملنے آئے اس وقت مولانا روم کی عمر چھ برس کی تھی لیکن سعادت کا ستارہ پیشانی سے چمکتا تھا۔ خواجہ صاحب نے شیخ بہاؤالدین سے کہا کہ اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا یہ کہہ کر اپنی مثنوی اسرار نامہ مولانا کو عنایت کی۔

مولانا بہاؤالدین نیشاپور سے روانہ ہو کر بغداد پہنچے۔ یہاں مدتوں قیام رہا روزانہ شہر کے تمام امراء و روسا و علما ملاقات کو آتے اور ان سے معارف و حقائق سنتے تھے اتفاق سے انہی دنوں بادشاہ روم کیقباد کی طرف سے سفارت کے طور پر کچھ لوگ بغداد میں آئے تھے یہ لوگ مولانا بہاؤالدین کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر مولانا کے حلقہ بگوش ہو گئے، واپس جا کر علاؤالدین سے تمام حالات بیان کئے۔ وہ غائبانہ مرید ہو گیا۔ شیخ بہاؤالدین بغداد سے حجاز اور

حجاز شام ہوتے ہوئے زنجان آئے۔ زنجان سے آق شہر کا رُخ کیا۔ یہاں خاتون ملک سعید فخر الدین نے نہایت خلوص سے مہمان داری کے لوازم ادا کیے۔ پورے سال بھر یہاں قیام کیا۔ زنجان سے لارندہ کا رُخ کیا۔ یہاں سات برس تک قیام رہا۔ اس وقت مولانا رُوم کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ بہاؤ الدین نے اسی سنہ میں ان کی شادی کر دی۔ مولانا کے فرزند رشید سلطان ولد ۶۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ لارندہ سے شیخ بہاؤ الدین کیقباد کی درخواست پر قونیہ کو روانہ ہوئے کیقباد کو خبر ہوئی تو تمام ارکانِ دولت کے ساتھ پیشوائی کو نکلا اور بڑے تزک و احتشام سے شہر میں لایا۔ شہر پناہ کے قریب پہنچ کر علاؤ الدین گھوڑے سے اُتر پڑا اور پیادہ پا ساتھ ساتھ آیا۔ مولانا کو ایک عالیشان مکان میں اتارا اور ہر قسم کی ضروریات و آرام کے سامان مہیا کئے۔ اکثر مولانا کے مکان پر آتا اور فیض صحبت اٹھاتا۔

شیخ بہاؤ الدین نے جمعہ کے دن ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا رُوم ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاؤ الدین سے حاصل کی۔ شیخ بہاؤ الدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پائے کے فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے مولانا کو اُن کی آغوشِ تربیت میں دیا۔ وہ مولانا کے اتالیق بھی تھے اور اُستاد بھی مولانا نے اکثر علوم و فنون انہی سے حاصل کئے۔ ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، اپنے والد کے ساتھ قونیہ میں آئے۔ جب اُن کے والد نے انتقال کیا تو اس کے دوسرے سن یعنی ۶۲۹ھ میں جب اُن کی عمر ۲۵ برس کی تھی تکمیل فن کے لئے شام کا قصد کیا۔ اس زمانے میں دمشق اور حلب، علوم و فنون کے مرکز تھے۔ ابن جبیر نے ۵۷۸ھ میں جب دمشق کا سفر کیا تو خاص شہر میں بیس بڑے بڑے دار العلوم موجود تھے، حلب میں سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے قاضی ابو المحاسن کی تحریک سے ۵۶۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے۔ چنانچہ اس زمانہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا۔

مولانا نے اوّل حلب کا قصد کیا اور مدرسہ حلاویہ کی دار الاقامتہ (بورڈنگ) میں قیام کیا۔ اس مدرسہ کے مدرس کمال الدین ابنِ عدیم حلبی تھے۔ ان کا نام عمر بن ہبتہ اللہ ہے ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ محدث، حافظ، مورخ، فقیہ، کاتب، مفتی اور ادیب تھے۔ حلب

کی تاریخ جو انھوں نے لکھی ہے اُس کا ایک ٹکڑا یورپ میں چھپ گیا ہے۔

مولانا نے مدرسہ حلاویہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی علم کی تحصیل کی اور طالب علمی ہی کے زمانہ میں عربیت، فقہ، حدیث اور تفسیر اور معقول میں یہ کمال حاصل کیا کہ جب کوئی مسئلہ مشکل پیش در پیش ہوتا اور کسی سے حل نہ ہوتا تو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے۔ سات برس دمشق میں رہ کر علوم کی تحصیل کی اور اس وقت مولانا کی عمر چالیس برس کی تھی۔

یہ امر قطعی ہے کہ مولانا نے تمام علوم درسیہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کی تھی، جواہر مضیہ میں لکھا ہے کان عالمًا بالمذاھب واسع الفقہ عالمًا بالخلاف والنوع العلوم۔ خود ان کی مثنوی بڑی شہادت ہے۔

مولانا کے والد نے جب وفات پائی تو سید برہان الدین اپنے وطن ترمذ میں تھے، یہ خبر سُن کر ترمذ سے روانہ ہوئے اور قونیہ میں آئے، مولانا اس وقت لارند میں تھے، سید برہان الدین نے اُن کو خط لکھا اور اپنے آنے کی اطلاع دی، مولانا اسی وقت روانہ ہوئے، قونیہ میں شاگرد و استاد کی ملاقات ہوئی، دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور دیر تک دونوں پر بیخودی کی کیفیت طاری رہی، افاقہ کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا اور جب تمام علوم میں کامل پایا تو کہا کہ صرف علم باطنی رہ گیا ہے اور یہ تمھارے والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں، چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی، بعضوں کا بیان ہے کہ اسی زمانے میں مولانا اُن کے مُرید بھی ہو گئے، چنانچہ مناقب العارفین میں ان واقعات کو بہ تفصیل لکھا ہے۔ مولانا نے اپنی مثنوی میں جا بجا سید موصوف کا اسی طرح نام لیا ہے جس طرح ایک مخلص مرید پیر کا نام لیتا ہے۔

یہ سب کچھ تھا لیکن مولانا پر اب تک ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا۔ علوم دینیہ کا درس دیتے تھے، وعظ کہتے تھے، فتوے لکھتے تھے، سماع وغیرہ سے سخت احتراز کرتے تھے، اُن کی زندگی کا دوسرا دور، درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

شمس تبریز کے والد کا نام علاؤالدین تھا۔ وہ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام تھا لیکن انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا۔ شمس نے تبریز میں علم ظاہری کی تحصیل کی۔ پھر بابا کمال جندی کے مرید ہوئے۔ لیکن عام صوفیوں کی طرح

پیری مریدی اور بیعت وارادت کا طریقہ نہیں اختیار کیا۔ سوداگروں کی وضع میں شہروں کی سیاحت کرتے رہتے۔ جہاں جاتے کاروان سرامیں اُترتے اور حجرے کا دروازہ بند کرکے مراقبے میں مصروف ہوتے، معاش کا یہ طریقہ رکھا تھا کہ کبھی کبھی ازاربند بن لیتے اور اسی کو بیچ کر کفاف مہیا کرتے، ایک دفعہ مناجات کے وقت دعا مانگی کہ الٰہی کوئی ایسا بندہ خاص ملتا جو میری صحبت کا متحمل ہوسکتا۔ عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ۔ اسی وقت چل کھڑے ہوئے۔ قونیہ پہنچے تو رات کا وقت تھا، برنج فروشوں کی سرائے میں اُترے، سرائے کے دروازے پر ایک بلند چبوترہ تھا اکثر امراء اور عمائد تفریح کے لئے وہاں آ بیٹھتے تھے، شمس بھی اسی چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا کو اُن کے آنے کا حال معلوم ہوا تو ان کی ملاقات کو چلے، راہ میں لوگ قدم بوس ہوتے جاتے اسی شان سے دروازے پر پہنچے، شمس نے سمجھا کہ یہی شخص ہے جس کی نسبت بشارت ہوئی ہے، دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک باتیں زبانِ حال میں ہوتیں رہیں۔ شمس نے مولانا سے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامی کے ان دو واقعات میں کیوں کر تطبیق ہوسکتی ہے، کہ ایک طرف تو یہ حال تھا کہ تمام عمر خربزہ نہیں کھایا کہ معلوم نہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کس طرح کھایا ہے۔ دوسری طرف اپنی نسبت یوں فرماتے تھے کہ سبحانی ما اعظم شانی (یعنی اللہ اکبر، میری شان کس قدر بڑی ہے) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باایں ہمہ جلالتِ شان فرمایا کرتے تھے کہ میں دن بھر میں ستّر دفعہ استغفار کرتا ہوں، مولانا نے فرمایا کہ بایزید اگرچہ بہت بڑے پائے کہ بزرگ تھے لیکن مقام ولایت میں وہ ایک خاص درجہ پر ٹھہر گئے تھے اور اس درجہ کی عظمت کے اثر سے اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نکل جاتے تھے، بخلاف اس کے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منازل تقرب میں برابر ایک پائے سے دوسرے پائے پر چڑھتے جاتے تھے اس لئے جب بلند پائے پر پہنچتے تھے تو پہلا پایہ اس قدر پست نظر آتا کہ اس سے استغفار کرتے تھے۔

زین العابدین شروانی نے مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمس تبریز کو اُن کے پیر بابا کمال الدین جندی نے حکم دیا کہ روم جاؤ۔ وہاں ایک دل سوختہ ہے اس کو گرم کر آؤ شمس تبریز چلے اور پھرتے پھراتے قونیہ پہنچے، شکر فروشوں کی کاروانسرا میں اُترے۔ ایک دن مولانا روم کی سواری بڑے تزک و احتشام سے نکلی، شمس نے سرِ راہ ٹوک کر پوچھا، مجاہدہ و ریاضت سے کیا مقصد ہے؟ مولانا نے

کہا اتباع شریعت، شمس نے کہا یہ تو سب جانتے ہیں مولانا نے کہا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔
شمس نے فرمایا علم کے معنی یہ ہیں کہ "تم کو منزل تک پہنچا دے" پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا

علم کز تو ترا نہ بستاند   جہل زاں علم بہ بود بسیار

مولانا پر ان جملوں کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت شمس تبریز کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

سپہ سالار کا بیان ہے کہ چھ مہینے تک برابر دونوں بزرگ صلاح الدین زرکوب کے حجرے میں چلہ کش رہے اس مدت میں آب و غذا قطعاً متروک تھی اور بجز صلاح الدین کے اور کسی کو حجرے میں آمد و رفت کی مجال نہ تھی۔ مناقب العارفین میں اس مدت کو نصف کر دیا ہے اس زمانہ سے مولانا کی حالت میں ایک نمایاں تغیر جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اب تک سماع سے محترز تھے۔ اب اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ چونکہ مولانا نے درس و تدریس اور وعظ و پند کے اشغال دفعتہً چھوڑ دیئے اور حضرت شمس کی خدمت سے دم بھر کو جدا نہیں ہوتے تھے، تمام شہر میں ایک شورش مچ گئی لوگوں کو سخت رنج تھا کہ ایک دیوانہ بے سروپا نے مولانا پر ایسا سحر کر دیا کہ وہ کسی کام کے نہیں رہے یہ برہمی یہاں تک پھیلی کہ خود مریدانِ خاص اس کی شکایت کرنے لگے۔ شمس کو ڈر ہوا کہ یہ شورش فتنہ انگیزی کی حد تک نہ پہنچ جائے، چپکے گھر سے نکل کر دمشق کو چل دیئے۔ مولانا کو ان کے فراق کا ایسا صدمہ ہوا کہ سب لوگوں سے قطع تعلق کر کے عزلت اختیار کی۔ مریدانِ خاص کو بھی خدمت میں بار نہیں مل سکتا تھا۔ مدت کے بعد شمس نے مولانا کو دمشق سے خط لکھا۔ اس خط نے شوق کی آگ اور بھڑکا دی۔ مولانا نے اس زمانے میں نہایت رقت آمیز اور پر تاثیر اشعار کہے، جن لوگوں نے شمس کو آزردہ کیا تھا، اُن کو سخت ندامت ہوئی۔ سب نے مولانا سے آکر معافی کی درخواست کی۔ اب رائے یہ قرار پائی کہ سب مل کر دمشق جائیں اور شمس کو منا کر لائیں۔ سلطان ولد اس قافلہ کے سپہ سالار بنے، مولانا نے شمس کے نام ایک منظوم خط لکھا اور سلطان ولد کو دیا کہ خود پیش کرنا۔ خط یہ تھا:۔

بخدائے کہ در ازل بودہ ست   حیّ دانا و قادرِ قیوم
نورِ او شمعہائے عشق افروخت   تا بشد صد ہزار سرِ معلوم
از یکے حکمِ او جہاں پر شد   عاشق و عشق و حاکم و محکوم

در طلسمات شمس تبریزی	گشت گنج عجائبش مکتوم
کہ ازاں دم کہ تو سفر کردی	از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہمہ شب ہمچو شمع مے سوزیم	ز آتشی جفت و انگبیں محروم
در فراق جمال تو مارا	جسم ویران و جاں ہمچوں موم
آں عناں را بدیں طرف برتاب	زفت کن پیل عیش را خرطوم
بحضورت سماع نیست حلال	ہمچو شیطاں طرف شدہ مرحوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد	تا رسد آں بہ مشرحہ مفہوم
پس بہ ذوق سماع نامۂ تو	غزلے پنج و شش بشد منظوم
شام از نور صبح روشن باد	اے بہ فخر شام دارمن و روم

اِن اشعار کے علاوہ ایک غزل بھی ۱۵ شعر کی لکھی تھی جس کے دو شعر دیباچۂ مثنوی میں نقل کئے ہیں۔

بروید اے حریفاں بکشید یار مارا	بمن آورید حالا صنم گریز پارا
اگر او بہ وعدہ گوید کہ دم دگر بیاید	ہمہ وعدہ مکر باشد بفریبد او شمارا

سلطان ولد قافلے کے ساتھ دمشق پہنچے بڑی مشکل سے شمس کا پتہ لگا۔ سب سامنے آداب و تسلیم بجالائے اور پیش کش جو ساتھ لائے تھے نذر کرکے مولانا کا خط دیا۔ شمس مسکرائے۔

بہ دام و دانہ نگیرند مرغ دانا را

پھر فرمایا کہ ان خزف ریزوں کی ضرورت نہیں۔ مولانا کا پیام کافی ہے۔ چند روز تک اس سفارت کو مہمان رکھا۔ پھر دمشق سے سب کو لے کر روانہ ہوئے۔ تمام لوگ سواریوں پر تھے۔ لیکن سلطان ولد کمالِ ادب سے شمس کے رکاب کے ساتھ دمشق سے قونیہ تک پیادہ آئے مولانا کو خبر ہوئی تو تمام مریدوں اور حاشیہ بوسوں کو ساتھ لے کر استقبال کو نکلے اور بڑے تزک و احتشام سے لائے۔ مدت تک بڑے ذوق و شوق کی صحبتیں رہیں۔

چند روز کے بعد حضرت شمس نے مولانا کی ایک پروردہ کے ساتھ جس کا نام کیمیا تھا، شادی کرلی۔ مولانا نے مکان کے سامنے ایک خیمہ نصب کرادیا کہ حضرت شمس اس میں قیام

فرمائیں۔ مولانا کے ایک صاحبزادے جن کا نام علاؤالدین چلپی تھا، جب مولانا سے ملنے آتے تھے تو حضرت شمس کے خیمے میں سے ہو کر جاتے۔ شمس کو ناگوار ہوتا۔ چند بار منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے۔ علاؤالدین نے لوگوں سے شکایت کی۔ حاسدوں کو موقع ملا۔ سب نے کہنا شروع کیا کہ کیا غضب ہے ایک بیگانہ آئے اور یگانوں کو گھر میں نہ آنے دے۔ یہ چرچا بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شمس نے اب کے دفعہ عزم کر لیا کہ جا کر پھر کبھی نہ آئیں۔ چنانچہ دفعتہً غائب ہو گئے مولانا نے ہر طرف آدمی دوڑائے لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر تمام مریدوں اور عزیزوں کو ساتھ لے کر خود تلاش کو نکلے۔ دمشق میں رہ کر ہر طرف سراغ رسانی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی، آخر مجبور ہو کر قونیہ واپس چلے آئے۔

مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمس اوّل دفعہ جب ناراض ہو کر چلے گئے تو اپنے وطن تبریز پہنچے اور مولانا خود جا کر ان کو تبریز سے لائے۔ چنانچہ خود مثنوی میں اس واقعہ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

ساربانا ساز بکشا ز اشتران　　شور تبریزست و کوئے دلستاں

فرفردوس است این پالیز را　　شعشۂ عرش ست این تبریز را

ہر زمانے فوج روح انگیز جان　　از فراز عرش بر تبریزیان

یہ عجیب بات ہے کہ سپہ سالار نے جو بقول خود ۴۰ برس تک مولانا کی خدمت میں رہے شمس تبریز کی نسبت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ رنجیدہ ہو کر کسی طرف نکل گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا، لیکن اور تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ان کو اسی زمانے میں جبکہ وہ مولانا کے پاس مقیم تھے، مولانا کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔

نفحات الانس میں ہے کہ خود مولانا کے صاحبزادے علاؤالدین محمد نے یہ حرکت کی۔

نفحات الانس میں شمس کی شہادت کا سنہ ۶۴۵ھ لکھا ہے غرض شمس کی شہادت یا غیبوبت کا زمانہ سنہ ۶۴۴ھ اور سنہ ۶۴۵ھ کے بیچ میں ہے، شمس کی شہادت نے مولانا کی حالت بدل دی۔

تذکرہ نویسوں نے گو تصریح نہیں کی لیکن قرائن صاف بتاتے ہیں کہ شمس کی ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اسی طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے جس طرح پتھر میں آگ

ہوتی ہے، شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے اُن کی پرجوش غزلیں مثنوی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی ہے
مدت تک مولانا کو شمس کی جدائی نے بیقرار و بے تاب رکھا۔ ایک دن اسی جوش و خروش کی
حالت میں گھر سے نکلے، راہ میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی دکان تھی، وہ چاندی کے ورق
کوٹ رہے تھے۔ مولانا پر ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا، وہیں کھڑے ہو گئے اور وجد
کی حالت طاری ہو گئی۔ شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے یہاں تک کہ بہت
سی چاندی ضائع ہو گئی لیکن انھوں نے ہاتھ نہ روکا، آخر شیخ باہر نکل آئے اور مولانا نے ان کو
آغوش میں لے لیا اور اس جوش و مستی میں دوپہر سے عصر تک یہ شعر گاتے رہے۔

یکے گنجے پدید آمد ازیں کانِ زرکوبی — زہے صورت زہے معنی زہے خوبی زہے خوبی

شیخ صلاح الدین نے کھڑے کھڑے دوکان لٹوادی اور دامن جھاڑ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے وہ
ابتدا سے صاحب حال تھے۔ سید برہان الدین محقق سے ان کو بیعت تھی اور اس لحاظ سے مولانا کے
ہم استاد اور مولانا کے والد کے شاگرد تھے۔

مولانا کو صلاح الدین کی صحبت سے بہت کچھ تسلّی ہوئی، نو برس تک مسلسل ان سے
صحبت گرم رہی۔ مولانا صلاح الدین کی شان میں نہایت ذوق و شوق سے غزلیں اور اشعار
لکھتے تھے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

مطربا اسرار ما را باز گو — قصّہائے جاں فزا را باز گو
ما دہاں بر بستہ ایم از ذکر او — تو حدیث دل کشا را باز گو
چون صلاح الدین صلاح جان ماست — آں صلاح جانِ ما را باز گو

مولانا کے پرانے رفیقوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک زرکوب جس کو لکھنا پڑھنا تک نہیں آتا تھا
مولانا کا نہ صرف ہمراز و ہمدم بن گیا ہے بلکہ مولانا اس سے اس طرح پیش آتے ہیں جس طرح
مرید پیر کے ساتھ۔ سخت شورش برپا کی اور شیخ صلاح الدین سے بری طرح پیش آنا چاہا لیکن
جب حریفوں کو معلوم ہوا کہ مولانا کا تعلق ان سے منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے باز آئے۔ مولانا نے
اپنے صاحبزادے سلطان ولد کا شیخ صلاح الدین کی صاحبزادی سے عقد بھی کر دیا تھا کہ اختصاص
باطنی کے ساتھ ظاہری تعلقات بھی مستحکم ہو جائیں۔ سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دس برس مولانا اور

شیخ کی صحبتیں گرم رہیں۔ بالآخر ۶۶۴ھ میں شیخ بیمار ہوئے اور مولانا سے درخواست کی کہ دعا فرمایئے کہ اب طائرِ روح قفسِ عنصری سے نجات پائے۔ تین چار روز بیمار رہ کر وفات پائی۔ مولانا نے تمام رفقاء اور اصحاب کے ساتھ ان کے جنازے کی مشایعت کی اور اپنے والد کے مزار کے پہلو میں دفن کیا، مولانا کو ان کی جدائی کا نہایت سخت صدمہ ہوا۔ اسی حالت میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے

اے ز ہجران و فراقت آسمان بگریستہ　　دل میانِ خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا نے حسام الدین چلپی کو جو معتقدانِ خاص میں تھے ہمدم و ہمراز بنایا اور جب تک زندہ رہے انہی سے دل کو تسکین دیتے رہے مولانا ان کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے کہ لوگوں کو گمان ہوتا تھا کہ شاید ان کے مرید ہیں۔ وہ بھی مولانا کا اس قدر ادب کرتے تھے کہ پورے دس برس کی مدت میں ایک دن بھی مولانا کے وضو خانے میں وضو نہیں کیا۔ شدت کے جاڑے پڑتے ہوتے اور برف گرتی ہوتی۔ لیکن گھر جا کر وضو کر آتے۔ حسام الدین ہی کی درخواست اور استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔

۶۷۲ھ کی بات ہے کہ مولانا کا مزاج ناساز ہوا۔ اکمل الدین اور غضنفر کہ اپنے زمانے کے جالینوس تھے۔ علاج میں مصروف ہوئے لیکن نبض کا یہ حال تھا کہ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ ہے۔ آخر تشخیص سے عاجز آکر مولانا سے عرض کی کہ آپ خود مزاج کی کیفیت سے مطلع کریں، مولانا مطلق متوجہ نہیں ہوتے تھے لوگوں نے سمجھا اب کوئی دن کے مہمان ہیں۔

بیماری کی خبر عام ہوئی تو شہر عیادت کے لئے ٹوٹا۔ شیخ صدر الدین جو شیخ محی الدین اکبر کے تربیت یافتہ اور روم و شام میں مرجع عام تھے تمام مریدوں کو ساتھ لے کر آئے۔ مولانا کی حالت دیکھ کر بے قرار ہوئے اور یہ دعا کی کہ خدا آپ کو جلد شفا دے۔ مولانا نے فرمایا شفا آپ کو مبارک ہو۔ عاشق اور معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور میں نور مل جائے۔ شیخ روتے ہوئے اُٹھے، مولانا نے یہ شعر پڑھا:۔

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہے ہمنشیں دارم　　رخِ زرّین من منگر کہ پائے آہنیں دارم

شہر کے تمام امراء علماء مشایخ اور ہر طبقے و درجے کے لوگ آتے تھے اور بے اختیار چیخیں مار مار کر روتے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہو گا؟ اگرچہ مولانا کے بڑے صاحبزادے

سلطان بہاؤالدین ولد سلوک و تصوّف میں بڑے پایہ کے شخص تھے۔ لیکن حسام الدین چلپی کا نام لیا، لوگوں نے دوبارہ سہ بارہ پوچھا پھر یہی جواب ملا۔ چوتھی دفعہ سلطان ولد کا نام لے کر کہا کہ آپ ان کے حق میں کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ وہ پہلوان ہے اس کو وصیّت کی حاجت نہیں

مولانا پر ۵۰ دینار کا قرضہ تھا مریدوں سے فرمایا کہ جو کچھ موجود ہے ادا کر کے باقی قرض خواہ سے بحل کرالو، لیکن قرض خواہ نے کچھ لینا گوارا نہ کیا۔ مولانا نے فرمایا الحمد للہ اس سخت مرحلے سے رہائی ہوئی۔ چلپی حسام الدین نے پوچھا کہ آپ کے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا۔ فرمایا صدرالدین، یہ وصیّتیں کر کے جمادی الثانی ۶۷۲ھ کی پانچویں تاریخ یکشنبہ کے دن غروب آفتاب کے وقت انتقال کیا۔

رات کو تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کیا گیا۔ صبح کو جنازہ اٹھا۔ بچے، جوان، بوڑھے، امیر غریب، عالم، جاہل، ہر طبقے اور ہر فرقے کے آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور چیخیں مار مار کر روتے جاتے تھے۔ ہزاروں آدمیوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عیسائی اور یہودی تک جنازے کے آگے آگے انجیل اور توریت پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ وقت جنازہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے اُن کو بلا کر کہا تم کو مولانا سے کیا تعلق، بولے کہ یہ شخص اگر تمہارا محمدؐ تھا تو ہمارا عیسٰیؑ اور موسٰیؑ تھا۔ صندوق جس میں تابوت رکھا تھا، راہ میں چند دفعہ بدلا گیا اور اس کے تختے توڑ کر تبرک کے طور پر تقسیم کئے گئے شام ہوتے ہی جنازہ قبرستان میں پہنچا۔ شیخ صدرالدین نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے، آخر قاضی سراج نے نماز پڑھائی، چالیس دن تک لوگ مزارات کی زیارت کو آتے رہے۔

مولانا کا مزار مبارک اُس وقت سے آج تک بوسہ گاہ خلائق ہے ابن بطوطہ جب قونیہ پہنچا ہے تو وہاں کے حالات میں لکھتا ہے کہ مولانا کے مزار پر بڑا لنگر خانہ ہے جس سے صادر و وارد کو کھانا ملتا ہے۔

مولانا کا سلسلہ

مولانا کا سلسلہ اب تک قائم ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ان کے فرقہ کے لوگ جلالیہ کہلاتے ہیں۔ مولانا کا لقب چونکہ جلال الدین تھا اس نشان کے انتساب کی وجہ سے یہ نام مشہور ہوا ہو گا لیکن آجکل ایشیائے کوچک، شام مصر اور قسطنطنیہ میں اس فرقہ کو مولویہ کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں جب کوئی داخل ہونا چاہتا ہے تو قاعدہ یہ ہے کہ ۱۰۰۱ دن چار پائیوں

کی خدمت کرتا ہے، ۴۰ دن فقراء کے دروازے پر جھاڑو دیتا ہے، ۴۰ دن آب کشی کرتا ہے، ۴۰ دن فراشی، ۴۰ دن ہیزم کشی، ۴۰ دن طباخی، ۴۰ دن بازار سے سودا سلف لانا، ۴۰ دن فقراء کی مجلس کی خدمت گزاری، ۴۰ دن داروغگی۔ جب یہ مدت تمام ہو چکتی ہے تو غسل دیا جاتا ہے اور تمام محرمات سے توبہ کرا کے حلقے میں داخل کرلیا جاتا ہے اس کے ساتھ خانقاہ سے لباس (وہی جامہ) ملتا ہے اور اسمِ جلالی کی تلقین کی جاتی ہے۔

مولانا کے معاصرین

اسلام کو آج تیرہ سو برس ہوئے اور اس مدت میں اس نے بار ہا بڑے بڑے صدمات اٹھائے لیکن ساتویں صدی میں جس زور کی اس کو ٹکر لگی کسی اور قوم یا مذہب کو لگتی تو پاش پاش ہو کر رہ جاتا۔ یہی زمانہ ہے جس میں تاتار کا سیلاب اٹھا اور دفعتہً اِس سرے سے اُس سرے تک پھیل گیا۔ سینکڑوں ہزاروں شہر اجڑ گئے کم از کم ۹۰ لاکھ آدمی قتل کر دیئے گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بغداد جو تارک اسلام کا تاج تھا اس طرح برباد ہوا کہ آج تک سنبھل نہ سکا۔ یہ ۶۱۵ھ میں تاتار سے اٹھا اور ساتویں صدی کے آخر تک برابر بڑھتا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اسلام کا علمی دربار اسی اوج و شان کے ساتھ قائم رہا۔ محقق طوسی، شیخ سعدی، خواجہ فریدالدین عطار، عراقی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ محی الدین ابن عربی، صدرالدین قونوی، یاقوت حموی، شاذلی ابن الاثیر، مورخ ابن الفارض، عبداللطیف بغدادی، نجم الدین رازی، سکاکی، سیف الدین آمدی، شمس الائمہ کردری، محدث ابن الصلاح، ابن النجار مورخ بغداد، ضیا ابن بیطار، ابن حاجب، ابن القفطی، صاحب تاریخ الحکما، خونجی منطقی، شاہ بوعلی قلندر، زملکانی وغیرہ اُسی پُر آشوب عہد کی یادگار ہیں۔

سلطنتیں اور حکومت مٹتی جاتی تھیں، لیکن علم و فن کے حدود وسیع ہوتے جاتے تھے اسی زمانہ میں محقق طوسی نے ریاضیات کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور یاقوت حموی نے قاموس الجغرافیہ لکھی، ضیا ابن بیطار نے بہت سی دوائیں دریافت کیں۔ شیخ سعدی نے غزل کو معراج پر پہنچایا۔ ابن الصلاح نے اصولِ حدیث کو مستقل فن بنایا۔ سکاکی نے فن بلاغت کی تکمیل کی۔

شاہ بوعلی قلندر پانی پتی جن کو تمام ہندوستان جانتا ہے مدت تک مولانا کی صحبت میں رہے اور ان سے مستفید ہوئے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی جو شیخ سعدی کے پیر تھے ان سے بھی

مولانا کی صحبتیں رہیں۔ شیخ سعدی کا گزر اکثر بلادِ روم میں ہوا ہے۔ بوستان میں ایک درویش کی ملاقات کی غرض سے روم کے سفر کا جو ذکر کیا ہے اس سے اگرچہ قیاس ہوتا ہے کہ ضرور مولانا سے ملے ہوں گے لیکن روایتوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مناقب العارفین میں لکھا ہے ایک دفعہ والیٔ شیراز شمس الدین نے شیخ سعدی کو ایک رقعہ لکھا کہ ایک صوفیانہ غزل بھیج دیجئے تاکہ میں اس سے غذائے روحانی حاصل کروں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ کسی خاص شاعر کی قید نہیں چاہے کسی کی ہو۔ اسی زمانے میں مولانا روم کی ایک نئی غزل قوالوں کے ذریعہ سے پہنچی تھی۔ شیخ نے وہی بھیج دی، اس کے چند شعر یہ ہیں۔

ما بہ فلک بودہ ایم۔ یار ملک بودہ ایم	باز ہماں جا رویم باز۔ کہ آں شہر ماست
ہر نفس آواز عشق میرسد از چپ و راست	ما بہ فلک مے رویم۔ عزم تماشا کراست
ما ز فلک برتریم۔ و ز ملک افزوں تریم	زیں دو چرا نگذریم۔ منزل ما کبریاست

شیخ نے یہ بھی لکھا کہ بلادِ روم میں ایک صاحب حال پیدا ہوا ہے۔ یہ غزل اسی کے ترانۂ حقیقت کا ایک نغمہ ہے شمس الدین نے غزل دیکھی تو عجب حالت طاری ہوئی۔ خاص اس غزل کے لئے سماع کی مجلسیں منعقد کیں اور بہت سے ہدیے اور تحفے دے کر شیخ سعدی کو مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ چنانچہ شیخ قونیہ میں آئے اور مولانا سے ملے، علامہ قطب الدین شیرازی، محقق طوسی کے شاگرد رشید تھے۔ درۃ التاج ان کی مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے فلسفہ کے کل اجزاء فارسی میں نہایت جامعیت سے لکھے ہیں۔ وہ مولانا کی خدمت میں امتحان لینے کی غرض سے آئے اور حلقہ بگوش ہو گئے۔ ان کی ملاقات کی روایتیں مختلف ہیں۔

اخلاق و عادات

مولانا جب تک تصوّف کے دائرے میں نہیں آئے، ان کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی شان رکھتی تھی۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلباء بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا۔ مناظرہ اور مجادلہ جو علماء کا عام طریقہ تھا۔ مولانا اس میں اوروں سے چند قدم آگے تھے سلاطین اور امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ان کی صوفیانہ زندگی کس تاریخ سے شروع ہوتی ہے لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ وہ بہت پہلے سید برہان الدین

محقق کے مرید ہوچکے تھے اور نو دس برس تک ان کی صحبت میں فقر کے مقامات طے کئے
تھے اصل میں مولانا کی صوفیانہ زندگی شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے۔ درس
تدریس افتا اور افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ لیکن وہ پچھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی ورنہ
وہ زیادہ تر تصوف کے نشے میں سرشار رہتے تھے۔

ریاضت اور مجاہدہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں۔ ان کا بیان
ہے کہ میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا قصداً
لیٹتے نہ تھے۔ نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

چہ آساید بہ ہر پہلو کہ خسپد　　　کسے کز خار دارد او نہالیس

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار
سے ٹیک کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ بے تکلف ہو کر سو جائیں۔ وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود
اٹھ بیٹھتے اور ذکر و شغل میں معروف ہو جاتے۔ ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ خفتند و من دل شدہ را خواب نبرد　　　ہمہ شب دیدۂ من بر فلک استارہ شمرد
خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز نابد　　　خواب من زہر فراق تو بنوشید و بمرد

روزہ اکثر رکھتے تھے۔ آج تو لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ لیکن معتبر رواۃ کا
بیان ہے کہ متصل دس دس بیس بیس دن کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلے کی طرف مڑ جاتے اور چہرے کا رنگ بدل جاتا، نماز میں
نہایت استغراق ہوتا تھا۔ سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول
عشاء کے وقت نیت باندھی اور دو دو رکعتوں میں صبح ہو گئی۔ مولانا نے ایک غزل میں
اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے۔ مقطع میں لکھتے ہیں:۔

بخدا خبر ندارم چو نماز میگذارم　　　کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں
سے تر ہو گئی۔ جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم ہو کر یخ ہو گئے لیکن وہ اسی طرح نماز میں
مشغول رہے۔ حج والد کے ساتھ ابتدائی عمر میں کر چکے تھے اس کے بعد غالباً اتفاق نہیں ہوا۔

مزاج میں انتہا درجے کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین اور امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہ رکھتے تھے۔ جو چیز آتی اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلپی حسام الدین کے پاس بھجوا دیتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے۔ جس دن گھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے' معمول تھا کہ ہمہ وقت منہ میں ہلیلہ رکھتے تھے اصلی سبب معلوم نہیں' لوگ طرح طرح کے قیاس لگاتے تھے چلپی نے لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے کہا مولانا ترکِ لذآت کی وجہ سے یہ بھی نہیں چاہتے کہ منہ کا مزا بھی شیریں رہے' فیاضی اور ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عبا یا کرتا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتے' اسی طرح سے کرتہ عبا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

باوجود عظمت و شان کے نہایت درجے بے تکلف متواضع اور خاکسار تھے ایک دفعہ جاڑوں کے دن میں حسام الدین چلپی کے پاس گئے چونکہ نا وقت ہو چکا تھا اور دروازے سب بند ہو گئے تھے وہیں ٹھہر گئے۔ برف گر گر کر سر پر جمتی رہی۔ لیکن اس خیال سے کہ لوگوں کو زحمت نہ ہو نہ آواز دی نہ دروازہ کھٹکھٹایا صبح کو بوّاب نے دروازہ کھولا تو حالت دیکھی۔ حسام الدین کو خبر کی وہ آکر پاؤں پر گر پڑے اور رونے لگے۔ مولانا نے گلے سے لگا لیا اور ان کی تسکین کی۔

ایک دفعہ بازار میں جا رہے تھے لڑکوں نے دیکھا تو ہاتھ چومنے کے لئے بڑھے آپ کھڑے ہو گئے۔ لڑکے ہر طرف سے آتے اور ہاتھ چومتے جاتے۔ مولانا بھی اُن کی دلداری کے لئے ان کے ہاتھ چومتے جاتے۔ ایک لڑکا کسی کام میں مشغول تھا اس نے کہا مولانا ذرا ٹھہر جائیے میں فارغ ہولوں مولانا اس وقت تک وہیں کھڑے رہے کہ لڑکا فارغ ہو کر آیا دست بوسی کی عزّت حاصل کی۔

ایک دفعہ سماع کی مجلس تھی اہل محفل اور خود مولانا پر وجد کی حالت تھی۔ ایک شخص نے خودی کی حالت میں تڑپا تو مولانا سے جا کر ٹکر کھاتا چند دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ لوگوں نے بزور اس کو مولانا کے پاس سے ہٹا کر دور بٹھا دیا۔ آپ نے ناراض ہو کر فرمایا "شراب اس نے پی ہے اور بدمستی تم کرتے ہو"۔

قونیہ میں گرم پانی کا ایک چشمہ تھا مولانا کبھی کبھی وہاں غسل کے لئے جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہاں کا قصد کیا خدام پہلے جا کر ایک خاص جگہ متعیّن کر آئے لیکن قبل اس کے مولانا وہاں پہنچیں

چند آدمی پہنچ کر نہانے لگے۔ خدام نے اُن کو ہٹانا چاہا لیکن مولانا نے خدام کو ڈانٹا اور چشمے میں اسی جگہ سے پانی لے کر اپنے بدن پر ڈالنا شروع کیا جہاں جذامی نہا رہے تھے۔

ایک دفعہ معین الدین پروانہ کے گھر میں سماع کی مجلس تھی۔ کرجی خاتون نے شیرینی کے دو طبق بھیجے، لوگ سماع میں مشغول تھے اتفاق سے ایک کتّے نے طبق میں آکر منہ ڈال دیا۔ لوگوں نے کتّے کو مارنا چاہا۔ مولانا نے فرمایا کہ اس کی بھوک تم لوگوں سے زیادہ تیز تھی اس نے کھایا تو اسی کا حق تھا۔

ایک دفعہ حمام میں گئے اور فوراً باہر نکل آئے لوگوں نے سبب پوچھا۔ فرمایا کہ میں جو اندر گیا حمامی نے ایک شخص کو جو پہلے سے نہا رہا تھا میری خاطر سے ہٹانا چاہا اس لئے میں باہر چلا آیا۔

مولانا جس زمانے میں دمشق میں علوم کی تحصیل میں مصروف تھے ایک دن مولانا کے والد شیخ بہاؤالدین کا ذکر چھڑا فقہا نے کہا کہ یہ شخص خواہ مخواہ سلطان العلماء کہلاتا ہے وہ اپنے آپ کو متقدمین جتاتا ہے۔ مولانا چپکے سنتے رہے۔ صحبت کے ختم ہونے کے بعد ایک شخص نے ان فقہا سے کہا کہ "آپ لوگوں نے ایک شخص کے باپ کو اسی کے سامنے برا کہا۔ شیخ بہاؤالدین مولانا کے والد ہیں" فقہا نے مولانا سے جا کر معذرت کی۔ مولانا نے فرمایا، تمھیں معذرت کی ضرورت نہیں میں بار خاطر ہونا نہیں چاہتا۔

ایک دفعہ مولانا کی زوجہ کرا خاتون نے اپنی لونڈی کو سزا دی۔ اتفاق سے مولانا بھی اسی وقت آ گئے۔ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اگر وہ آقا ہوتی اور تم اس کی لونڈی تو تمھاری کیا حالت ہوتی، پھر فرمایا کہ درحقیقت تمام آدمی ہمارے بھائی بہنیں ہیں۔ کوئی شخص خدا کے سوا کسی کا غلام نہیں۔ کرا خاتون نے اسی وقت اس کو آزاد کر دیا اور جب تک زندہ رہیں غلاموں اور کنیزوں کو اپنا جیسا کھلاتی اور پہناتی رہیں۔

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے۔ ایک تنگ گلی میں ایک کتّا سرِ راہ سو رہا تھا جس سے راستہ رک گیا تھا۔ مولانا وہیں رک گئے اور دیر تک کھڑے رہے ادھر سے ایک شخص آرہا تھا اس نے کتّے کو ہٹا دیا۔ مولانا نہایت آزردہ ہوئے اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سرِ راہ لڑ رہے تھے اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے

ایک نے کہا کہ او لعین! تو ایک کہے گا تو دس سنے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ "بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہہ لو۔ مجھ کو اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے" دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

ایک دفعہ قلعہ کی مسجد میں جمعہ کے دن وعظ کی مجلس تھی۔ تمام امراء اور علماء حاضر تھے۔ مولانا نے قرآن مجید کے وقائق اور نکات بیان کرنے شروع کئے۔ ہر طرف سے بے اختیار واہ، واہ سبحان اللہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس زمانہ میں وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ قاری قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھتا تھا اور واعظ انہی آیتوں کی تفسیر بیان کرتا تھا۔ مجمع میں ایک فقیہہ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے ان کو حسد پیدا ہوا کہ آیتیں پہلے سے مقرر کر لی جاتی ہیں ان کے متعلق بیان کرنا کون سی کمال کی بات ہے۔ مولانا نے ان کو خطاب کر کے کہا کہ آپ کوئی سورۃ پڑھیے میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں انھوں نے سورۃ والضحیٰ پڑھی، مولانا نے اس سورہ کے وقائق اور لطائف بیان کرنے شروع کئے تو والضحیٰ کے واؤ سے متعلق اس قدر شرح وبسط بیان کیا کہ شام ہو گئی۔ تمام مجلس پر ایک وجد کی حالت طاری تھی، فقیہہ صاحب ایسے سرشار ہوئے کہ کپڑے پھاڑ ڈالے اور مولانا کے قدموں پر گر پڑے اس جلسے کے بعد مولانا نے پھر وعظ نہیں کہا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر میری شہرت بڑھتی جاتی ہے۔ میں بلا میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں، لیکن کیا کروں کہ کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی۔ مثنوی میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:-

خویش را رنجور سازی زار زار   تا ترا بیروں کنند از اشتہار
اشتہار خلق بند محکم ست   در رہ ایں از بند آہنیں کے کم ست

ایک دفعہ شیخ صدر الدین قونوی کی ملاقات کو گئے۔ شیخ نے بہت تعظیم وتکریم سے لیا اور اپنے سجادہ پر بٹھایا۔ آپ ان کے سامنے دو زانو ہو کر مراقب بیٹھے۔ حاضرین میں سے ایک درویش نے جس کا نام حاجی کاشی تھا مولانا سے پوچھا کہ فقر کس کو کہتے ہیں۔ مولانا نے جواب نہ دیا، تین دفعہ اس نے یہی سوال کیا، مولانا پھر بھی چپ رہے اور اٹھ کر چلے آئے تو شیخ نے کاشی کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ بے ادب! یہ کیا سوال کا موقع تھا؟ چپ رہنے سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ الفقیر اذا عرف اللہ کل لسانہٗ۔ یعنی فقیر جب خدا کو پہچان لیتا ہے تو اس کی

زبان بند ہوجاتی ہے۔

ایک دفعہ مدرسہ اتابکیہ میں بڑا مجمع تھا۔ شمس الدین ماردینی مسندِ درس پر درس دے رہے تھے۔ قاضی سراج الدین و شیخ صدر الدین دائیں بائیں تشریف رکھتے تھے، تمام امراء مشائخ اور علماء ترتیب سے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً مولانا کسی طرف سے آنکلے اور سلام علیک کر کے فرش کے کنارے جہاں نقیب کھڑا ہوتا ہے بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر معین الدین پروانہ اور مجد الدین اتابک اور دیگر امراء اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر مولانا کے پاس آ بیٹھے۔ قاضی سراج الدین بھی اٹھ کر آئے اور مولانا کے ہاتھ چوم کر بڑی خوشامد سے مسند کے قریب لا کر بٹھایا۔ شمس الدین ماردینی نے بہت عذر خواہی کی اور کہا کہ ہم سب آپ کے غلام ہیں۔

سراج الدین تونوی بڑے رتبے کے فاضل تھے لیکن مولانا سے ملال رکھتے تھے۔ کسی نے ان سے کہا مولانا کہتے ہیں کہ تہتّروں مذہبوں سے متفق ہوں، انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو بھیجا کہ مولانا سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ کا یہ قول ہے اور اگر وہ اقرار کریں تو ان کی خوب خبر لینا۔ اس نے بھرے مجمع میں مولانا سے سوال کیا۔ آپ نے کہا ہاں یہ میرا قول ہے۔ اس نے مغلّظہ گالیاں دینی شروع کیں مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ جو آپ نے فرمایا، میں اس سے بھی متفق ہوں، وہ شرمندہ ہوکر چلا گیا۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ اوحد الدین کرمانی گو شاہد باز تھے لیکن پاکباز تھے، مولانا نے کہا کہ "درساختے کردے وگذشتے" یعنی کر کے توبہ کی ہوتی۔ تو نفس میں انکسار اور خضوع کی کیفیت زیادہ ہوتی معاش کا طریقہ یہ تھا کہ اوقات کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا۔ چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضے میں فتویٰ لکھا کرتے تھے۔ مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گو میں کسی حالت میں ہوں ضرور خبر کرو تاکہ یہ آمدنی مجھے حلال ہو۔ چنانچہ معمول تھا کہ عین وجد اور مستی کی حالت میں بھی مرید دوات اور قلم ہاتھ میں لئے رہتے تھے اس حالت میں کوئی فتوے آجاتا تو لوگ مولانا سے عرض کرتے اور مولانا اسی وقت جواب لکھ دیتے۔

ایک دفعہ اسی حالت میں فتویٰ لکھا۔ شمس الدین ماردینی نے اس فتوے کی تغلیط کی۔ مولانا نے سنا تو کہلا بھیجا کہ فلاں کتاب کے فلاں صفحہ میں یہ مسئلہ موجود ہے، چنانچہ لوگوں نے تحقیق کی تو مولانا نے جو کہا تھا وہی نکلا۔

مولانا کے زمانے میں کیقباد المتوفی ۶۳۴ھ غیاث الدین کیخسرو بن کیقباد المتوفی ۶۴۲ھ رکن الدین قلیج ارسلان یکے بعد دیگرے قونیہ کے تخت سلطنت پہ بیٹھے۔ یہ سلاطین مولانا کے والد اور خود مولانا کی خدمت میں خاص ارادت رکھتے تھے۔ اکثر حاضر خدمت ہوتے کبھی کبھی شاہی محل میں سماع کی مجلس منعقد کرتے اور مولانا کو تکلیف دیتے۔ رکن الدین کے دربار میں سیاہ سفید کا مالک معین الدین پروانہ تھا جو دربار میں حجابت کے عہدے پر مامور تھا۔ اس کو مولانا سے خاص عقیدت تھی اور اکثر نیاز مندانہ حاضر ہوتا، لیکن مولانا کو بالطبع امرا و سلاطین سے نفرت تھی۔ صرف حسن خلق کی وجہ سے اُن سے مل لیتے تھے۔ ورنہ ان صحبتوں سے کوسوں بھاگتے تھے۔

ایک دفعہ ایک امیر نے معذرت کی کہ اشغال سے فرصت نہیں ہوتی اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں۔ معاف فرمائیے گا۔ فرمایا کہ معذرت کی ضرورت نہیں میں آنے کی نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں۔

ایک دفعہ معین الدین پروانہ چند اور امرا کے ساتھ ملاقات کو گیا، مولانا چھپ بیٹھے۔ معین الدین کے دل میں خیال گزرا کہ سلاطین اور امراء اولوالامر ہیں اور قرآن مجید کی رو سے اُن کی اطاعت فرض ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا باہر آئے سلسلۂ سخن میں فرمایا کہ ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی شیخ ابوالحسن خرقانی کی ملاقات کو گیا، درباریوں نے آگے بڑھ کر شیخ کو خبر کی لیکن ان کو خبر نہ ہوئی۔ حسن میمندی جو وزیر تھا اُس نے کہا کہ حضرت قرآن مجید میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ آیا ہے اور سلطان تو اولوالامر ہونے کے ساتھ عادل اور نیک سیرت بھی ہیے شیخ نے فرمایا مجھ کو ابھی اطیعوا اللّٰہ سے فرصت نہیں کہ اطیعوا الرسول میں مشغول ہوں، اولوالامر کا کیا ذکر ہے۔

معین الدین اور تمام امراء یہ حکایت سن کر رونے لگے اور اٹھ کر چلے گئے۔ مولانا پر اکثر استغراق وجد اور محویت کی حالت طاری رہتی تھی، بیٹھے بیٹھے یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوتے اور رقص کرنے لگتے۔ کبھی کبھی چپکے کسی طرف نکل جاتے اور ہفتوں غائب رہتے، لوگ ہر طرف ڈھونڈتے پھرتے، آخر کسی ویرانے میں پتہ لگتا۔ مریدان خاص وہاں سے جا کر لاتے، سماع کی مجلسوں میں

کئی کئی دن گزر جاتے کہ ہوش میں نہ آتے، راہ میں چلے جارہے ہیں کسی طرف سے کوئی آواز کانوں میں آگئی، وہیں کھڑے ہو گئے اور مستانہ رقص کرنے لگے، معمول تھا وجد کی حالت میں جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر قوالوں کو دے ڈالتے۔ مریدوں میں خواجہ مجدالدین نام ایک امیر صاحب مقدرت تھا۔ وہ ہمیشہ کپڑوں سے کئی کئی صندوق مہیا رکھتا تھا، مولانا جب کپڑے اتار کر دے ڈالتے تو وہ فوراً نئے لاکر پہنا دیا کرتا۔

معین الدین پروانہ نے ایک فاضل کو قونیہ کا قاضی کرنا چاہا، انھوں نے تین شرطیں پیش کیں۔ رُباب (باجہ کا نام ہے) سرے سے اٹھا دیا جائے۔ عدالت کے پُرانے تمام اہلکار نکال دیئے جائیں اور نئے جو مقرر ہوں ان کو حکم دیا جائے کہ کسی سے کچھ لینے نہ پائیں۔ معین الدین نے اور شرطیں منظور کیں لیکن پہلی شرط اس وجہ سے قبول نہ کی کہ خود مولانا رباب سنتے تھے قاضی مذکور بھی ہٹ کے پورے تھے قضا کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، مولانا نے سنا تو فرمایا کہ رباب کی ادنیٰ کرامت یہ ہے کہ فاضل صاحب کو بلا میں پڑنے سے بچالیا۔

ایک دن سلطان ولد نے شکایت کی کہ تمام صوفیہ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں لیکن ہمارے حلقے والے رات دن خواہ مخواہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ مولانا نے کہا۔ ہزار مرغیاں ایک مکان میں رہ سکتی ہیں لیکن دو مرغ ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

تغزل کے امام

مولانا نے عقیدت میں شمس تبریز کے نام سے ایک دیوان لکھا ہے۔ اس میں کم و بیش پچاس ہزار شعر ہیں۔ لیکن یہ صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں۔

غزل کی عام مقبولیت اور دلآویزی کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس میں مجاز کا پہلو غالب رکھا جائے اور اس قسم کے حالات اور معاملات بیان کئے جائیں جو ہوس پیشہ عشاق کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں لیکن مولانا کے کلام میں حقیقت کا پہلو اس قدر غالب ہے کہ رندوں اور ہوس بازوں کو جو غزل کی اشاعت اور ترویج کے نقیب ہیں۔ اپنے مذاق کے موافق بہت کم سامان ہاتھ آتا ہے۔

مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے، اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ وہ فطرتاً پُرجوش طبیعت رکھتے تھے، شمس تبریزی کی صحبت نے اس نشے کو اور تیز کردیا تھا۔ ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص محبت کے نشے میں چُور رہے۔ مولانا کی اکثر غزلیں کسی خاص حالت میں لکھی گئی ہیں اور اس وجہ سے ان غزلوں میں ایک ہی حالت کا بیان چلا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی ایک خاص حالت یہ تھی کہ جوش و مستی میں اکثر رات بھر جاگا کرتے تھے اس کو ایک غزل میں اس طرح ادا کرتے ہیں

دیدہ خوں گشت و خوں نمی خسپد — دِل من از جنوں نمی خسپد
مرغ و ماہی زمن شدہ حیران — کایں شب روز چوں نمی خسپد
پیش ازیں در عجب ہمی بودم — کاسمانِ نگوں نمی خسپد
آسماں خود کنوں زمن خیرہ است — کہ چرا ایں زبوں نمی خسپد
عشق بر من فسونِ اعظم خواند — دل شنید آں فسوں نمی خسپد

یا مثلاً نماز میں ان پر جو بےخودی طاری ہوتی اس کو ایک غزل میں ادا کرتے ہیں:-

چوں نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے — منم و خیال یاری۔ غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم — در مسجدم بسوزد، چو در و رسد اذانے
عجباً نماز مستاں تو بگو درست ہست آں — کہ نداند او زمانے، نہ شناسد او مکانے
عجباً دو رکعت ست ایں عجباً چہارم ست ایں — عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
در حق چگونہ کوبم؟ کہ نہ دست ماند و نے دل — دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر نہ دارم چو نماز مے گذارم — کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

یا مثلاً توحید کی حقیقت میں اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

باز شیرے با شکر آمیختند — عاشقاں با یک دگر آمیختند
روز و شب را از میاں برداشتند — آفتابے با قمر آمیختند
رنگ معشوقاں و رنگِ عاشقاں — جملہ ہمچوں سیم و زر آمیختند
رافضی انگشت در دنداں گزید — چوں علی را با عمر آمیختند

چوں بہارِ سرمدیٔ حق رسید — شاخ خشک و شاخ تر آمیختند

فنا و بقاؔ

تصوف کے مقامات میں دو مقام آپس میں متقابل ہیں فنا و بقا مقامِ فنا میں سالک پر خضوع مسکینی اور انکسار کی کیفیت غالب ہوتی ہے، بخلاف اس کے بقاء میں سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے، مولانا پر بہ نسبت زیادہ غالب رہتی تھی۔

مرزا غالب، مولانا کے ایک شعر پر جو بقا کی حالت کا ہے سر دھنا کرتے تھے وہ شعر یہ ہے:

بہ زیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

حضرت ابوسعید، ابوالخیر نے رباعی میں تصوف اور طریقت کے خیالات ادا کئے اور یہ پہلا دن تھا کہ فارسی شاعری میں ذوق اور وجد و مستی کی رُوح آئی دولتِ غزنویہ کے زمانہ میں حکیم سنائی نے حدیقہ لکھی، جو نظم میں تصوف کی پہلی تصنیف تھی۔ حدیقہ کے بعد خواجہ فریدالدین عطار نے متعدد مثنویاں تصوف میں لکھیں جن میں سے منطق الطیر نے زیادہ شہرت پائی۔ مثنوی مولانا روم اسی سلسلہ کی خاتم ہے۔

اربابِ تذکرہ لکھتے ہیں کہ حسام الدین چلپی نے مولانا سے درخواست کی کہ منطق الطیر کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے، مولانا نے فرمایا کہ خود مجھ کو بھی رات یہ خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزوں ہوئے۔ بشنواز نے چوں حکایت میکند الخ

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین چلپی کو بہت دخل ہے اور درحقیقت یہ نایاب کتاب انہی کی بدولت وجود میں آئی، وہ مولانا کے مریدانِ خاص میں سے تھے اور مولانا اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پیر طریقت اور استاد کا ذکر ہے، مثنوی کے چھ دفتر ہیں اور بجز دفتر اول کے ہر دفتر ان کے نام سے مزیّن ہے۔

دفتر سوم میں لکھتے ہیں:-

اے ضیاء الحق حسام الدین بیار — ایں سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار
برکشا گنجینۂ اسرار را — در سوم دفتر بہل اعذار را

مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک

نہیں ہوئی۔ مقبولیت کی ایک اور بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ علماء و فضلاء نے مثنوی کے ساتھ جس قدر اعتناء کی اور کسی کتاب کے ساتھ نہیں کی۔

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں کسی میں ایسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے۔ جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فارسی پر موقوف نہیں اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر علماء اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک مبالغہ کیا کہ یہ مصرعہ تک کہا کہ ہست قرآں در زبانِ پہلوی۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔

نکتہ آفرینی مولانا نے مثنوی میں اپنے اشعار میں ایسے پیچیدہ اور دقیق نکتے بیان کئے ہیں جن کا جواب نہیں۔ مثلاً یہ کہ دل جو کہ ایک جوہر نورانی ہے انسان دراصل اسی کا نام ہے۔ یہ پارۂ گوشت جو صنوبری شکل کا ہے۔ یہ اصل دل نہیں ہے۔ اس مضمون کو مولانا اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست	دل فرازِ عرش باشد نے بہ پست
در گلِ تیرہ یقیں ہم آب ہست	لیک ازاں آبت نباید آب دست
زانکہ گر آب ست مغلوبِ گل ست	پس دلِ خود را مگو کایں ہم دل ست
مرکشدی تو کہ من صاحب دلم	حاجتِ غیرے ندارم واصلم
آنچناں کہ آب در گل درکشد	کہ منم آب و چرا جویم مدد
خود روا داری کہ ایں دل باشد ایں	کہ مرد در عشق شیر و انگبیں
لطف شیر و انگبیں عکس دل ست	سرخوشی آں خوش از دل حاصل ست
پس بود دل جوہر و عالم عرض	سایہ دل چوں بود دل را غرض
باغہا و سبزہا در عین جاں	بر بروں عکسش چو در آب رواں
آئینہ دل چوں شود صافی و پاک	نقشہا بینی بروں از آب و خاک
صورتی بے صورتی بیحد و عیب	ز آئینہ دلِ تافت موسیٰ از جیب

گرچہ آں صورت نگنجد در فلک — نہ بہ عرش و فرش و دریا و سمک
زانکہ محدود است و معدود است ایں — آئینہ دل خو نباشد ایں چنیں
روزن دل گر گشادست و صفا — مے رسد بے واسطہ نورِ خدا

یا مثلاً فرماتے ہیں۔

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے علاج نخوت و ناموس ما — اے تو افلاطون و جالینوس ما
عشق خواہد کیں سخن بیروں بود — آئینہ غماز نبود چوں بود
وحی آمد سوئے موسیٰ از خدا — بندۂ ما را چرا کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی — یا برائے فصل کردن آمدی
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ایم — ہر کسے را اصطلاحے دادہ ایم
در حقِ او مدح و در حقِ تو ذم — در حقِ او شہد و در حقِ تو سم
ما بروں را ننگریم و قال را — ما دروں را بنگریم و حال را
موسیا آداب داناں دیگر اند — سوختہ جان و رواناں دیگر اند
خون شہیداں را ز آب اولیٰ تر است — ایں گنہ از صد ثواب اولیٰ تر است
ملتِ عشق از ہمہ دیں ہا جدا ست — عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست
پائے استدلال خود چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود
گر بہ استدلال کارِ دیں بُدے — فخرِ رازی راز دارِ دیں بُدے
آں خلیفہ گفت کائے لیلیٰ توئی — کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی — گفت خامش شو کہ مجنوں نیستی

خالق و مخلوق کا ربط باہم

الٰہیات کے مسائل میں اکثر متکلمین امکانات ثابت کرنے سے کام لیتے ہیں، لیکن امکان کو ایسے دلائل سے ثابت کرتے ہیں جو دل میں جانشین نہیں ہوتے، بلکہ ان سے صرف طباعی اور زور آوری کا ثبوت ملتا ہے، حالانکہ امکان کے ثابت کرنے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ مثالوں

کے ذریعہ سے ثابت کیا جائے۔ اسی بنا پر مولانا نے اسی طریقۂ استدلال کو اختیار کیا۔ وہ ان دقیق مسائل کو ایسی نادر اور قریب الفہم تمثیلوں سے سمجھاتے ہیں جن سے بقدر امکان انکی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔

مثلاً یہ مسئلہ کہ خدا کا تعلق عالم سے اور روح کا تعلق جسم سے اس طرح ہے کہ نہ اس کو متصل کہہ سکتے ہیں اور نہ منفصل۔ نہ قریب نہ بعید، نہ داخل نہ خارج، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بظاہر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مولانا اس کو اس طرح تمثیل کے ذریعہ سمجھاتے ہیں۔

قرب بیچون است عقلت را بہ تو — آں تعلق ہست بیچوں اے عمو
اتصالے بے تکیف بے قیاس — ہست ربّ الناس را با جانِ ناس
زانکہ فصل و وصل نبود در رواں — غیر فصل و وصل نندیشد گماں!
نیست آں جنبش کہ در اصبع ترا ست — پیش اصبع یا پسش یا چپ و راست
از چہ رہ مے آید اندر اصبعت — کا صبعت بے او نہ داند منفعت
نور چشم و مردمک در دیدہ است — از چہ رہ آید؟ بغیر از شش جہت
این تعلق را خرد چوں پے برد — بستۂ فصل ست و وصل ست ایں خرد
تاب نورِ چشم با پیہ است جفت — نورِ دل در قطرۂ خونی نہفت
شادی اندر گردہ۔ و غم در جگر — عقل چوں شمع درونِ مغز سر
رائحہ در انف و منطق در لسان — لہو در نفس و شجاعت در جنان

حاصل یہ کہ آنکھ میں قوتِ باصرہ۔ ناک میں شامہ۔ زبان میں گویائی۔ دل میں شجاعت یہ تمام چیزیں اس قسم کا تعلق رکھتی ہیں جس کو نہ متصل کہہ سکتے ہیں نہ منفصل۔ نہ قریب، نہ بعید اسی طرح روح کا تعلق جسم سے اور خدا کا تعلق مخلوقات سے ہے۔

دعوے بھی دلیل بھی

یا مثلاً یہ امر کہ بعض دعوے عین دلیل ہوتے ہیں اس کی مثال یہ دی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ ایک کاغذ پر لکھ کر پیش کرے کہ میں لکھنا جانتا ہوں تو یہ دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی ہے، یا مثلاً کوئی شخص اگر عربی میں کہے کہ میں عربی زبان جانتا ہوں تو خود یہ دعویٰ دلیل ہوگا۔

یا بہ تازی گفت یک تازی زباں | کہ ہمیدانم زبان تازیاں !
عین تازی گفتنش معنے بود | گرچہ تازی گفتن اش دعویٰ بود

ہست بھی نیست بھی

یا مثلاً یہ مسئلہ کہ عارف کامل کو باقی اور فانی دونوں کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف اعتبار سے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ

چوں زبانہ شمع پیشِ آفتاب | نیست باشد ہست باشد در حساب
ہست باشد ذات او تا تو اگر | بر نہی پنبہ بسوزد - آں شرر
نیست باشد روشنی ند ہد ترا | کردہ باشد آفتاب اور افنا
در دو صد من شہد یک اوقیہ خل | چوں در افگندی و در وے گشت حل
نیست باشد طعم خل چوں مے چشی | ہست اک اوقیہ فزوں چوں میکشی

شمع کی لو آفتاب کے آگے ہست بھی ہے اور نیست بھی، ہست اِس لحاظ سے کہ اگر اس پر روئی رکھ دو تو جل جائے گی اور نیست اس لئے کہ اس کی روشنی نظر نہیں آتی اسی طرح من بھر شہد میں اگر تولہ بھر سرکہ ڈال دو تو سرکہ کا مزہ بالکل نہیں معلوم ہوگا، لیکن شہد کا وزن بڑھ جائے گا اِس لحاظ سے سرکہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے اسی طرح عارفِ کامل جب فنا فی اللہ کے مرتبہ میں ہوتا ہے تو ہست بھی ہوتا ہے اور نیست بھی ۔

کہانیوں میں اخلاقی مسائل

مثنوی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ فرضی حکایتوں کے ضمن میں اخلاقی مسائل کی تعلیم کا جو طریقہ مدت سے چلا آتا تھا - مولانا نے اسے کمال تک پہنچا دیا - مولانا نے ان حکایتوں میں نفس انسانی کے جن پوشیدہ اور دور از نظر عیوب کو ظاہر کیا ہے عام لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ہیں - پھر ان کو ادا اس طرح کیا ہے کہ ہر شخص حکایت پڑھ کر بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ یہ خاص میرا ہی ذکر ہے - چنانچہ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں -

(۱) ایک حکایت ہے کہ شیر اور صحرائی جانوروں میں یہ معاہدہ ٹھہرا کہ وہ ہر روز شیر کو گھر بیٹھے ان کی خوراک پہنچایا کریں گے - پہلے ہی دن جو خرگوش شیر کی خوراک کے لئے

متعین کیا گیا۔ وہ ایک دن کی دیر کر کے گیا۔ شیر غصّے میں بھرا بیٹھا تھا۔ خرگوش گیا تو اس نے دیر کی وجہ پوچھی۔ خرگوش نے کہا میں تو اسی دن چلا تھا۔ لیکن راہ میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا۔ میں نے اس سے بہتیرا کہا کہ میں حضور کی خدمت میں جاتا ہوں لیکن اس نے ایک نہ سُنی۔ بڑی مشکل سے ضمانت دے کر مجھ کو چھوڑا۔ شیر نے بپھر کر کہا کہ وہ شیر کہاں ہے میں اس کو ابھی چل کر سزا دیتا ہوں۔ خرگوش آگے آگے ہو لیا اور شیر کو ایک کنوئیں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کہ حریف اس میں ہے۔ شیر نے کنوئیں میں جھانکا اور اپنے ہی عکس کو اپنا حریف سمجھا۔ بڑے غصّہ سے حملہ آور ہو کر کنوئیں میں کود پڑا۔

(۲) یہ مضمون کہ انسان کو اپنے عیب نظر نہیں آتے اور دوسروں کے عیب اچھی طرح نظر آتے ہیں۔ اخلاق کا متداول مسئلہ ہے اور اس کو مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ انجیل میں اس کو یوں بیان کیا ہے کہ اے بنی آدم تو اوروں کی آنکھ کی پھلّی دیکھتا ہے لیکن اپنی آنکھوں کا شہتیر نہیں دیکھتا۔ لیکن مولانا نے اس کو جس پیرائے میں ادا کیا ہے سب سے بڑھ کر مؤثر طریقہ ہے۔ شیر نے جب اپنا عکس کنوئیں میں دیکھا تو بڑے غصّہ سے اس پر حملہ کیا۔ لیکن اس کو یہ خیال نہ آیا کہ میں خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہوں۔ ہماری بھی یہی حالت ہے ہم دوسروں میں جو عیوب دیکھتے ہیں ہم کو نہایت بدنما معلوم ہوتے ہیں ہم کو اُن سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ہم نہایت سختی سے اس کی برائی بیان کرتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں خیال کرتے کہ یہی عیب خود ہم میں بھی موجود ہے اور اس بناء پر ہم خود اپنے آپ کو بُرا کہہ رہے ہیں۔

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد | ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

(۳) آں یکے از خشم مادر را بہ کُشت | ہم بہ زخم خنجر و ہم زخم مشت
آں یکے گفتش کہ از بد گوہری | یاد ناوردی تو حقّ مادری
ہے تو مادر را چرا کشتی بگو | خود بگو تا چہ بدی کرد است او
گفت کارے کرد کاں عار وے است | کشتمش کاں خاک ستار وے است
متہم شد با یکے زاں کشتمش | عرقِ خوں در خاک گور آغشتمش
گفت آنکس را بکش اے محتشم | گفت پس ہر روز مردے را کشم؟
کشتم او را رستم از خونہائے خلق | نائے او بزم بہ است از نائے خلق

نفسِ تست آں مادر بد خاصیت — کہ فسادِ اوست در ہر ناحیت
پس بکش او را کہ بہر آں دنی — ہر دمے قصد عزیزے میکنی
از وے ایں دنیائے خوش بر تست تنگ — از پئے او حق و با خلق جنگ

(۴) میل مجنوں پیش آں لیلیٰ رواں — میل ناقہ از پسِ کرہ اش دواں
یک دم از مجنوں ز خود غافل بُدے — ناقہ گردیدے و واپس آمدے
عشق و سودا چونکہ پر بودش بدن — مے نبودش چارہ از بے خود بدن
لیک ناقہ بس مراقب بود و چست — چوں بدیدے او مہارِ خویش سست

قصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ مجنوں لیلیٰ سے ملنے کے لئے چلا۔ سواری میں اونٹنی تھی جس نے حال ہی میں بچہ دیا تھا۔ مجنوں جب لیلیٰ کے خیال میں محو ہوتا تھا اونٹنی کی مہار ہاتھ سے چھوٹ جاتی تھی۔ اونٹنی یہ دیکھ کر کہ مجنوں غافل ہے، بچہ کی کشش سے گھر کا رُخ کرتی تھی۔ گھڑیوں کے بعد مجنوں کو ہوش آتا تھا تو اُس کا رُخ پھیرتا تھا اور لیلیٰ کے گھر کی طرف ے چلتا تھا۔ لیکن دو ہی چار کوس کے بعد پھر محویت طاری ہوتی اور اونٹنی پھر گھر کا رُخ کرتی۔ اسی کشمکش اور تنازع میں مہینوں گزر گئے اور ایک منزل بھی طے نہ ہوئی۔ یہ حکایت لکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ انسان کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہے وہ روح اور نفس کی کشش میں مبتلا ہے۔

جاں کشاید سوئے بالا بالہا — در زدہ تن در زمیں چنگالہا
ایں دو ہمرہ یکدگر را راہ زن — گمرہ آں جاں کو فرو ناید ز تن
میلِ جاں در حکمت ست و در علوم — میلِ تن در باغ و راغ ست و کُرُم
میل جاں اندر ترقی و شرف — میلِ تن در کسبِ اسباب و علف

(۵) کسب اور کوشش کے مقابلے میں اہلِ توکل جن جن چیزوں پر استدلال کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں، مولانا نے ایک ایک کو بیان کیا اور ان کا جواب دیا، پھر کوشش اور جہد کی افضلیت پر جو دلیل قائم کی وہ اس قدر پُر زور ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ کہ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے نوکر یا غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مقصد کیا ہے اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت اللہ نے دی ہے تو

اس کا صرف یہی مقصد ہو سکتا ہے کہ ہم ان آلات سے کام لیں اور اپنے ارادے اور اختیار کو عمل میں لائیں اس بناء پر توکل اختیار کرنا گویا خدا کی مرضی اور ہدایت کے خلاف کرنا ہے، باقی توکل کی جو فضیلت شریعت میں وارد ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک کام میں جب کوشش کرو تو کوشش کے نتیجے کے متعلق خدا پر توکل کرو، کیونکہ کوشش کا کامیاب ہونا انسان کی اختیاری چیز نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ ہے۔

ذات باری

خدا کے اثبات کے مختلف طریقے ہیں اور ہر طریقہ ایک خاص گروہ کے مناسب ہے پہلا طریقہ یہ ہے کہ آثار سے مؤثر پر استدلال کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خطابی ہے اور عوام کے لئے یہی سب سے بہتر ہے۔ یہ صاف نظر آرہا ہے کہ عالم ایک عظیم الشان کل ہے۔ جس کے پُرزے رات دن حرکت میں ہیں، ستارے چل رہے ہیں، دریا بہہ رہا ہے، پہاڑ آتش فشاں ہیں، ہوا جنبش میں ہے، زمین نباتات اُگا رہی ہے، درخت جھوم رہے ہیں، یہ دیکھ کر انسان کو خود بخود خیال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی پُرزور ہاتھ ہے جو ان تمام پُرزوں کو چلاتا ہے، اس کو مولانا اس طرح ادا کرتے ہیں۔

دست پنہاں و قلم بیں خط گذار	قلم لکھ رہا ہے لیکن ہاتھ چھپا ہوا ہے
اسپ در جولان و ناپیدا سوار	سوار کا پتہ نہیں لیکن گھوڑا دوڑ رہا ہے
پس یقین در عقل ہر دانندہ است	ہر سمجھ دار یہ یقین رکھتا ہے
اینکہ با جنبیدہ جنبانندہ است	کہ جو چیز حرکت کرتی ہے اس کا حرکت دینے والا ضرور ہوتا ہے
گر تو آں را مے نہ بینی در نظر	اگر تم اس کو آنکھوں سے نہیں دیکھتے
فہم کن اما بہ اظہار اثر	تو اس کے اثر کو دیکھ کر سمجھو
تن بہ جاں جنبد نہ می بینی تو جان	بدن جو حرکت کرتا ہے جان کی وجہ سے کرتا ہے
لیک از جنبیدن تن جاں بداں	تم جان کو نہیں جان سکتے تو بدن کی حرکت سے جان کو جانو

مادہ پرستوں کے نزدیک ادراک کا ذریعہ صرف حواس ظاہر ہیں، جو چیزیں حواس ظاہری کی مدرکات سے بظاہر خارج معلوم ہوتی ہیں مثلاً کلیات اور مجردات ان کے ادراکات کا ذریعہ بھی حواس ہی کے محسوسات ہیں، انہی محسوسات کو قوت ذہنی خصوصیت سے مجرد کرکے کلی اور مجرد

بنا لیتی ہے لیکن حضرات صوفیہ کے نزدیک انسان میں ایک خاص قوت ہے جو حواس ظاہری کے توسط کے بغیر اشیاء کا ادراک کرتی ہے، چنانچہ مولانا فرماتے ہیں۔

پنج حسے ہست جز این پنج حس	ان پانچ حواس کے سوا اور بھی پانچ حواس ہیں۔
آں چو زرِ سرخ واین حسہا چو مس	یہ حواس تانبے کی طرح ہیں اور وہ سونے کی طرح
حس ابداں قوت ظلمت میخورد	حواس جسمانی کی غذا ظلمت ہے
حس جاں از آفتابے مے چرد	اور حاسۂ روحانی کی غذا ایک آفتاب ہے
آئینہ دل چو شود صافی و پاک	دل کا آئینہ جب صاف ہو جائے تو
نقشہا بینی بروں از آب و خاک	ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو آب و خاک سے پاک ہیں
پس بدانی چونکہ رستی از بدن	جب تم جسم سے بری ہو جاؤ گے
گوش و بینی چشم مے تاند شدن	تو جان لوگے کہ سامعہ و شامہ آنکھ کا کام بھی دے سکتی ہیں
فلسفی کو منکر حنانہ است	فلسفی جو حنانہ کے واقعہ سے انکار کرتا ہے
از حواس انبیاء بیگانہ است	وہ انبیاء کے حواس سے بے خبر ہے
پس محلِ وحی گردد گوش جان	روح کے کان وحی کا محل ہیں
وحی چہ بود؟ گفتن از حسِّ جاں	وحی کس چیز کا نام ہے؟ حس مخفی کے ذریعہ کہنا

یہ ادراک انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اولیاءؒ اور اصفیاء کو بھی حاصل ہوتا ہے لیکن فرق مراتب کے لحاظ سے اصطلاح یہ قرار پاگئی ہے کہ انبیاءؑ کی وحی کو وحی کہتے ہیں اور اولیاء کی وحی کو الہام۔

علم لدنّی تمام حکماء اور علماء کے نزدیک ادراک کا ذریعہ حواس ظاہری اور باطنی یعنی حافظہ، تخیل، حسِ مشترک وغیرہ ہیں۔ لیکن اربابِ تصوف کے نزدیک ان وسائل کے سوا ادراک کا ایک اور بھی ذریعہ ہے، حضرات صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ مجاہدہ، ریاضت، مراقبہ اور تصفیۂ قلب سے ایک اور حاسّہ پیدا ہوتا ہے، جس سے ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو حواس ظاہری و باطنی سے معلوم نہیں ہوتیں، امام غزالی نے اس کی یہ تشبیہ دی ہے کہ مثلاً ایک حوض ہے جس میں نلوں اور جدولوں کے ذریعہ سے باہر پانی آتا ہے، یہ گویا علوم ظاہری ہیں لیکن خود حوض کی تہہ میں ایک سوت بھی ہے جس سے پانی فوارے کی طرح اچھلتا ہے اور حوض میں آتا ہے یہ علم باطنی ہے، یہی علم ہے جس کو علم لدنّی اور

کشف اور علم غیبی کہتے ہیں اور یہی علم ہے جو انبیاء اور اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔
انبیاء اور اور اولیاء میں فرق یہ ہے کہ انبیاء کے اندر میں یہ علم نہایت کامل اور فطری ہوتا ہے
یعنی مجاہدہ اور ریاضیت کا محتاج نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے اولیا کو مجاہدات اور ریاضات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔
مولانا فرماتے ہیں کہ ارباب ظاہر کا اس سے منکر ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ مسائل فلسفہ سے
انکار کرتا ہے یا اس کے سمجھنے سے قاصر ہے چنانچہ مختلف مقامات پر مولانا فرماتے ہیں :۔

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک   نقشہا بینی بروں از آب و خاک
پنج حسے ہست جز ایں پنج حس   آں چو زرّ سرخ و ایں حسہا چو مس
اے بہ پردہ رخت حسہا سوئے غیب   دست چو موسیٰ بروں آور ز جیب
خویش را صافی کن از اوصاف خود   تا بہ بینی ذات پاک صاف خود
بینی اندر دل علوم انبیاءؑ   بے کتاب و بے معید و اوستا
بے صحیحین و احادیث و رُوات   بلکہ اندر مشرب آب حیات
رومیاں آں صوفیانند اے پسر   نے ز تکرار و کتاب و نے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہ ہا   پاک ز آز و حرص و بخل و کینہ ہا
علّت دیدن مداں پیہ اے پسر   ورنہ خواب اندر نہ دیدی کس صُور
نور را با پیہ خود نسبت نہ بود   نسبتش بخشد خلاّق ودود
پس چو آہن گرچہ تیرہ ہیکلی   صیقلی کن صیقلی کن صیقلی
صیقل عقلت بداں دادہ است حق   کہ بداں روشن شود دل را ورق

صحّتِ خیال

یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تصوف دراصل تصحیح خیال کا نام ہے یعنی جو خیال قائم کیا جائے وہ اصل حالت بن جائے مثلاً اگر توکل کا مقام در پیش ہو تو یہ حالت طاری ہو جائے کہ انسان تمام عالم سے قطعاً بے نیاز ہو جائے اس کو صاف نظر آئے کہ جو کچھ ہوتا ہے بحکم تقدیر ہوتا ہے جس طرح کٹ پتلیوں کے تماشے میں جس شخص کی نظر تاروں پر ہوتی ہے اس کو نظر آتا ہے پتلیاں گو سینکڑوں کی طرح حرکت کر رہی ہیں لیکن ان کو فی نفسہٖ حرکت میں مطلق دخل نہیں ہے بلکہ یہ تمام کرشمے اس کے ہیں جو تاروں کو حرکت دے رہا ہے اسی طرح عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے ایک چھپے بازی گر کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔

اس امر کو سب جانتے لیکن جس شخص پر یہ حالت طاری ہوتی ہے وہ درحقیقت تمام عالم سے بے نیاز ہوجاتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ اس کی قوت ارادی سلب ہوتی جاتی ہے اور وہ بالکل اپنے آپ کو رضائے الٰہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ایک صوفی نے کسی سے پوچھا کیسی گزرتی ہے۔ لیے کہ آسمان میری ہی مرضی پر حرکت کرتا ہے۔ ستارے میرے ہی کہنے کے موافق چلتے ہیں۔ زمین میرے ہی حکم سے دانے اگاتی ہے۔ بادل میرے ہی اشاروں پر برستے ہیں۔ سائل نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیونکر؟ فرمایا کہ میری کوئی خواہش نہیں بلکہ جو کچھ وقوع میں آتا ہے وہی میری خواہش ہے اس لئے جو کچھ ہوتا ہے میری ہی خوشی کے موافق ہوتا ہے۔ اسی بنا پر فنا کی یہ حقیقت ہے کہ سالک اپنی ہستی کو بالکل مٹا دے اور ذاتِ الٰہی میں فنا ہوجائے۔ یہی مقام ہے جس میں منصور نے انا الحق اور حضرت بایزید بسطامی نے سبحانی ما اعظم شانی کہا تھا اور اس حالت میں ایسا کہنا محل الزام نہیں۔ محمود شبستری نے اس نکتے کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ سے سمجھایا ہے، وہ کہتے ہیں:۔

روا باشد انا الحق، از درختے	چرا نبود، روا از نیک بختے

یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ نے درخت پر جو روشنی دیکھی تھی وہ خدا نہ تھا لیکن اس سے آواز آئی کہ اَنَا رَبُّکَ یعنی میں تیرا خدا ہوں، جب ایک درخت کو خدائی کا دعویٰ اس بنا پر جائز ہے کہ وہ خدا کے نور سے منور ہوگیا تھا۔ تو انسان جو قدرتِ الٰہی کا سب سے بڑا مظہر ہے، ایک خاص مقام پر پہنچ کر کیوں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا۔

مولانا نے اس مقام کو مختلف تشبیہوں سے سمجھایا ہے عوام کو اعتقاد ہے کہ انسان پر جب کبھی کوئی جن مسلط ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ جو کچھ کہتا ہے یا کرتا ہے وہ اس جن کا قول فعل ہوتا ہے، جب جن کے تسلط میں یہ حالت ہوتی ہے تو نور الٰہی جس شخص پر چھا جائے اس کی یہ حالت کیوں نہ ہوگی۔

اس سے زیادہ صاف تشبیہ یہ ہے کہ انسان شراب کی حالت میں جب کوئی بدمستی کی بات کہتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت یہ شخص نہیں بولتا شراب بول رہی ہے۔

در سخن پرواز داز نو یا کہن	تو بگوئی "بادہ گفت ست این سخن"
بادہ را مے بود این شر و شور	نورِ حق را نیست این فرہنگ و زور
گرچہ قرآن از لبِ پیغمبر است	ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

مولانا نے ایک اور مسئلہ میں سمجھایا ہے وہ یہ کہ لوہا جب آگ میں گرم کیا جاتا ہے در سرخ ہو کر آگ کا ہمرنگ بن جاتا ہے تو گو وہ آگ نہیں ہو جاتا لیکن اس میں تمام خاصیتیں آگ کی پائی جاتی ہیں یہاں تک کہتے ہیں کہ آگ ہو گیا، فنا فی اللہ کے مقام میں انسان کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کو ایک اور پیرائے میں ادا کیا ہے۔

نان مُردہ چوں حریفِ جاں بود — زندہ گردد ناں وعینِ آں شود
در نمک زار ارخر مردہ فتاد — آں خری و مردگی یک سو نہاد
ایں نمک زارِ جسوم ظاہر است — خود نمک زار معانی دیگر است

چونکہ یہ مقام اگرچہ فنا سلوک کا سب سے آخر اور سب سے افضل تر مقام ہے مولانا نے بار بار مختلف موقعوں پر اس کی شرح کی ہے اور بیان کیا ہے کہ جب تک یہ مرتبہ حاصل نہ ہو عشق اور محبت الٰہی نا تمام ہے اور یہی مرتبہ ہے جس کو صوفیہ توحید سے تعبیر کرتے ہیں۔

چوں انائے بندہ لا شد از وجود — پس چہ باشد تو ببند لشیں اے جحود
چوں برہوم از حواس بوالبشر — حق مرا شد سمع و ادراک و بصر
ہست معشوق آنکہ او یک تو بود — مبدء و ہم منتہایت او بود
تا ز زہر و از شکر تو نگذری ! — از گلِ وحدت کجا بوئے بری
صبغۃ اللہ ہست رنگ خمِ ہو — رنگہا یک رنگ گردد اندر او
طالب ست و غالب ست آں کردگار — کز ہستی ہا بر آرد او دمار
تا نہ داند غیر او در کار گاہ — مَن عَلَیہا فان بری با شد گواہ

باوجود اس کے کہ مولانا وحدت وجود کے قائل اور مقام فنا میں مستغرق تھے تاہم ان کا یہ مذہب ہے کہ یہ مقام ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے جس شخص پر یہ حالت طاری نہ ہو اس کو یہ الفاظ استعمال نہ کرنے چاہئیں چنانچہ فرعون اور منصور کا اختلافِ حالت اسی پر مبنی ہے۔

آں انا بیوقت گفتن لعنت ست — واں انا در وقت گفتن رحمت ست

از :- علامہ شبلی نعمانی تلخیص - سوانحِ عمری مولانا رومؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صوفیائے کرامؒ
کے
ملفوظات کی ادبی تاریخ اور ان کا معنوی جائزہ

مریدانِ باصفا کی رشد و ہدایت اور تزکیۂ نفس کی خاطر، بزرگانِ طریقت اور اربابِ صفا کا ہمیشہ سے یہ معمول رہا ہے کہ خدمت میں باریاب ہونے والوں کے قلوب کو وہ پاس انفاس ذکر خفی و جلی اور دوسرے مشاغل کی تعلیم سے اصلاحِ باطن کی طرف متوجہ کر دیتے تھے تاکہ وساوس و خطراتِ نفس سے محفوظ رہیں اور سلوک کے دشوار گزار راستے میں اُن کو کوئی گزند نہ پہنچ سکے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مرید جرأت لب کشائی کرتا اور راہ سلوک میں اُسکو جو دشواریاں پیش آتیں؛ اُن کی عقدہ کشائی کا مرشد سے خواہاں ہوتا اور شیخ یا مرشد اس سلسلے میں اس کی رہنمائی فرماتا اور اس کی دشواریوں کا حل تجویز فرماتا، تاریخ تصوف اور تذکرہ اولیاء میں ایسے بے شمار واقعات موجود ہیں، جن کی تلخیص کو ان چند اوراق میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اِن پاک مجالس اور مقدس صحبتوں میں تمام تر گفتگو کا موضوع، خدا دوستی، حق طلبی حق شناسی یادِ الٰہی اور خلق خدا کی خدمت ہی ہوتا تھا، اِن طالبانِ حق کو دنیا کے مخصوص سے نہ کوئی غرض تھی اور نہ دنیاوی معاملات سے کچھ مطلب، اسی لئے اِن کی مجالس میں دنیا اور کارو بار دنیا کبھی دخل نہیں پاتے تھے دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اِنزوا، گوشہ نشینی اور خلوت گزینی کا شوق اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ اِن خلوت کدوں میں، مستغرقِ ذکر و فکر مرشد والا کے حضور میں کسی دوسرے کو باریابی کا موقع بمشکل ہی میسر آتا تھا، یہ حضرات مراقبہ، تذکر اور تفکر میں اس طرح منہمک ہوتے تھے کہ "ماسوی اللہ" سے اُن کے تمام رشتے قریب قریب منقطع ہی ہوتے تھے، یہی باعث

تھا کہ ان قرونِ اولین میں مجالسِ تذکیر عام نہیں تھیں، جب کسی مخلص اور مقرّب مرید کو حضورِ شیخ میں باریابی کا موقع نصیب ہوگیا تو سخن ہائے حکمت آگیں اور کلماتِ حق شناسی کے کچھ جواہر اس کے دامن میں آجاتے تھے اور یہی اس کے لئے سرمایۂ اُخروی ہوتا تھا۔

اِن بزرگانِ طریقت نے تیسری صدی ہجری میں تصنیف و تالیف کی طرف اپنی توجہ کا رُخ موڑ دیا تھا، ان حضرات کی تصانیف کا موضوع توجہ الی اللہ، ذکر الٰہی، ذکر الٰہی کے آداب، اتباعِ شریعت اور پیرویٔ خیر الانام ہوتا تھا، آپ تصوف کی اولین تصانیف کا اگر مطالعہ کریں تو آپ پر یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی میں یہاں تصوف کی ابتدائی اولین کتاب سے چند عنوانات پیش کر رہا ہوں جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ان تصانیف میں اِن حضرات کا نصب العین کیا تھا۔

حضرت حارث المحاسبیؒ (۱۶۵ھ-۲۴۳ھ) تیسری صدی ہجری کے ایک عظیم المرتبت بزرگ ہیں، آپ کی کتاب، کتاب "الرعایۃ" کے نام سے مشہور ہے، اس کتاب میں شیخ حارث المحاسبیؒ نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

محاسبۂ نفس، توبہ کرنے والے مشاہیر حضرات، توبہ کا طریقہ، ریا اور اس کی مختلف صورتیں، اخلاص کی اہمیت اور افادیت، خلوص کے ساتھ احکام الٰہی کی اطاعت، نیت اور اس کی اہمیت اعمال، (اعمالِ حسنہ کا پوشیدہ رکھنا بہتر ہے یا ظاہر کرنا، عُجب و تکبر، تواضع، فریبِ نفس، حسد اور اس کی برائیاں، سالک اپنی زندگی کس طرح اسلامی سانچے میں ڈھال سکتا ہے "

یہ تمام عنوانات ۶۱ ابواب پر مشتمل ہیں، عنوانات پر نظر ڈالئے، کتاب الرعایہ" اسلامی زندگی کا ایک مرقع اور فضائل اخلاق یا اسلامی اخلاق کا ایک دستور العمل ہے۔

حضرت حارث محاسبی رحمتہ اللہ علیہ نے "کتاب الرعایۃ" کی تصنیف سے صوفیائے کرام میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کر دیا۔

چنانچہ آپ کے بعد تیسری صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتب تصوف بصراحت ذیل ہیں،

نام کتاب	مصنف	وفات
کتاب الصدق	حضرت شیخ ابوسعیدؒ خراز	۲۸۶ھ ہجری
رسائل جنید	سید الطائفہ شیخ جنید بغدادیؒ	۲۹۸ھ ہجری

چوتھی صدی ہجری میں صوفیائے کرامؒ نے جو کتب تصنیف فرمائیں وہ یہ ہیں۔

نام کتاب	مصنف	وفات
کتاب المواقف والمخاطبات	شیخ محمد بن الجبارؒ النفری	۳۵۴ھ ہجری
کتاب اللمع	طاؤس الفقراء ابونصر سراج	۳۷۸ھ ہجری
کتاب التعرف	حضرت ابوبکر ابن ابی اسحاقؒ کلابادی	۳۸۵ھ ہجری
قوت القلوب	حضرت شیخ ابوطالبؒ مکی	۳۸۶ھ ہجری

ان تمام کتب مذکورہ کی زبان عربی ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں موضوع تصوف پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، ان کتب میں حضرت شیخ ابوالقاسم قشیریؒ (م ۴۶۵ھ) کا رسالہ قشیریہ اور حضرت شیخ علی بن عثمان الہجویریؒ یعنی حضرت داتا گنج بخش قدس اللہ سرہ کی کشف المحجوب نے بڑی شہرت حاصل کی، کشف المحجوب تصوف میں پہلی گرانقدر کتاب ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی۔

ابن ندیم نے "الفہرست" میں تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تصوف کے موضوع پر لکھی جانے والی چند اور کتب کے نام بھی لئے ہیں لیکن وہ کتب ابتک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں اور نہ ان کے مخطوطات کی نقول عام طور پر دستیاب ہیں، اس لئے یقین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ ان کتب کے مخطوطات کہاں کہاں موجود ہیں، اس لئے میں نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تصنیف ہونے والی ان کتب ہی کا ذکر کیا ہے جو کمیاب ہیں لیکن دستیاب ہیں۔

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ کا تعلق قرن پنجم ہجری سے ہے (۳۵۷ھ ۴۴۰ھ) آپ نے بھی صوفیائے چہارم ہجری کی طرح تصنیف پر قلم اٹھایا اور جب اس کا تکملہ کر چکے تو یہ کہہ کر نعم الدلیل انت والاشتغال بالدلیل بعد الوصول محال۔ (اے کتاب تو ایک اچھی دلیل معرفت ہے لیکن

مرتبۂ وصول پر پہنچنے کے بعد دلیل میں مشغول ہونا، محال ہے) سخت کاوش سے لکھی ہوئی کتاب کو زمین میں دفن کر دیا، لیکن دنیائے تصوّف میں آپ پہلے شیخ طریقت ہیں جن کے ارشادات (ملفوظات) کو جمع کیا گیا ہے، اگرچہ یہ ملفوظات آپ کے وصال کے تقریباً دو سو سال بعد معرضِ تحریر میں آئے اور اس کی نقول لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچیں، آپ کے ان ملفوظات کو آپ کے نبیرہ شیخ کمال الدین محمد بن ابی روح اللہ بن ابی سعید ابوالخیرؒ نے اوائل قرن پنجم ہجری میں تالیف کیا اور اس کتاب کا نام "سخنانِ ابوسعید ابوالخیر" رکھا لیکن اس کتاب کا صرف باب چہارم اور پنجم ملفوظاتِ شیخ پر مبنی ہے اور یہی دو ابواب حقیقت میں "ملفوظات" کا نقطۂ آغاز ہیں، ان ملفوظات کی زبان فارسی ہے۔

سخنانِ ابوسعید ابوالخیرؒ کے بعد تقریباً دو ڈھائی سو سال تک ملفوظات کی دنیا پر ایک خاموشی طاری رہی، اس مدت میں موضوعِ تصوّف پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں اور ان میں سے بہت سی کتب آج دستیاب بھی ہیں، حقیقت یہ ہے اور میں یہ حقائقِ تاریخی کی بنا پر عرض کر رہا ہوں کہ "ملفوظات" کی تدوین اور نگارش کے اعتبار سے اس برصغیر پاک و ہند میں جتنا کام ہوا وہ سرزمین عراق و عجم اور دوسرے ممالک ورائے ہند میں نہ ہو سکا اس کے اسباب و علل کو بیان کرنا میرا موضوع نہیں ہے اور نہ اس مختصر مقدمے میں اس بحث کی گنجائش ہے۔

حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے بعد آپ صوفیانِ عجم و عراق میں اگر ملفوظات کی تلاش کریں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی، قرنِ ہفتم ہجری میں، صرف حضرت شیخ مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہٗ کے ملفوظات فیہ مافیہ کے نام سے آپ کو ملیں گے، ان کی نایابی اور دستیابی کی داستان فیہ مافیہ کے مقدمہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے تفصیل سے لکھی ہے یعنی یہ ملفوظات بھی نایاب تھے اور دنیا کے کتب خانوں میں صرف چند قلمی نسخے موجود تھے، رامپور (بھارت) کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ مولانا دریا آبادی مرحوم کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے بڑی کاوش کے بعد

ارباب طریقت کے سامنے اس متاعِ گراں بہا کو پیش کرنے کا فخر حاصل کیا۔

عراق عجم میں ملفوظات کی نگارش پر عدم توجہ کا موجب خاص یہ تھا کہ وہاں صوفیائے کرام اور ارباب طریقت کی توجہ تصوف کے موضوع پر مستقل تصانیف کی نگارش پر مبذول رہی، اگرچہ ان حضرات کا بھی یہ معمول تھا کہ ان کی مجالس رشد وہدایت میں اکثر رموز تصوف اور اسرارِ طریقت وحقائق معرفت کی توضیح وتشریح کی جاتی تھی لیکن اُن کو جداگانہ طور پر ضبط تحریر میں نہیں لایا جاتا تھا، اس کے برعکس برصغیر پاک وہند میں تصوف کے موضوع پر قلم بہت کم اٹھایا گیا اور ملفوظات کی تدوین وتالیف پر توجہ زیادہ مبذول رہی۔

پانچویں صدی ہجری میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "کشف المحجوب" کے بعد اس برصغیر پاک وہند میں تصوف کے موضوع پر بہت کم کتابیں لکھی گئیں، اگر کچھ کتابیں اس دور کی موجود بھی ہیں تو وہ مشائخ سلف کی تصانیف کے تراجم ہیں یا موضوعِ تصوف پر کچھ رسائل ہیں، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس برصغیر میں ان حضرات کی توجہ زیادہ تر تبلیغ اسلام کی طرف مبذول رہی اور اپنے اپنے سلسلۂ طریقت کی توسیع اور مریدوں کی تربیت پر کام کیا، یہی تربیت دراصل ملفوظات کی اصل ہے یعنی مجلسِ تذکیر وارشاد میں شیخ کے ارشادات کو کوئی مرید باصفا اور عقیدت کیش ضبط تحریر میں لاتا رہتا تھا اس کے بعد تاریخ ہائے مجالس کی قید کے ساتھ موضوعِ تقریر کی مناسبت سے اُن تقاریر کی تدوین کر لی جاتی تھی پھر بعد تالیف و تدوین وہ شیخ کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کر دیئے جاتے تھے، پیرو مرشد جہاں ضرورت ہوتی ان مقامات پر حک واصلاح فرما دیتے پھر اس مجموعہ کی نقلیں بااجازت شیخ کی جاتی تھیں اور وہ نقول وابستگانِ سلسلہ کے ہاتھوں میں پہنچ جاتیں اور وہ اس سے مستفید ومستفیض ہوتے رہتے، یہی نقول، نقل در نقل کے مرحلہ سے گزر کر ملک کے طول وعرض میں عام ہو جاتیں، چنانچہ اس ملک میں مشائخ چشتیہ، سہروردیہ، شطاریہ اور قادریہ سلاسل کے بزرگوں کے ملفوظات کا ایک وسیع اور گرانقدر سرمایہ مخطوطات یا بعد کو مطبوعہ شکل میں آج تک محفوظ ہے

ناقدین تاریخ تصوف نے بعض ملفوظات کو الحاقی بھی کہا ہے، اس موضوع پر میں یہاں بحث نہیں کرنا چاہتا، میں ذیل میں برصغیر پاک و ہند کے مشہور ملفوظات کا ذکر کروں گا، جن میں زیادہ تر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور بعض مخطوطات کی صورت میں ہیں لیکن ان کی حیثیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

حضرت مشائخ عظام (نور اللہ مرقدہم) کے ملفوظاتِ گرامی

نام ملفوظات	صاحب ملفوظات	مرتب ملفوظات	سال ترتیب و تدوین	زبان ملفوظات
۱۔ حالات و سخنانِ شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ	شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ چشتی	شیخ کمال الدین محمدؒ نبیرۂ شیخ ابوسعیدؒ	۵۱۵ھ	فارسی
۲۔ انیس الارواح	حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ مرشد حضرت خواجہ اجمیریؒ	حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی سجزی اجمیری	۵۸۲ھ	فارسی
۳۔ گنج الاسرار	حضرت خواجہ عثمانؒ ہارونی	حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی	۶۱۱ھ	فارسی
۴۔ دلیل العارفین	حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری	حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ اوشی	۶۱۴ھ	فارسی
۵۔ فوائد السالکین	حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ اوشی	حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ	۶۲۰ھ اور ۶۳۰ھ کے مابین	فارسی
۶۔ راحت القلوب	حضرت فریدالدین مسعودؒ گنج شکر	حضرت شیخ نظام الدینؒ اولیاء دہلوی	۶۵۵ھ	فارسی

۷۔ سرور الصدور	حضرت شیخ حمید الدین رح ناگوری	شیخ فیروز الدین نبیرہ حضرت شیخ حمید الدین ناگوری	۶۹۶ھ	فارسی
۸۔ فوائد الفواد	حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا	شیخ امیر علاء حسن سجزی	۷۰۷ھ	فارسی
۹۔ فیہ مافیہ	حضرت شیخ مولانا جلال الدین بلخی رومی	شیخ سلطان بہاء الدین ولد المعروف بہ سلطان ولد	۷۱۱ھ	فارسی
۱۰۔ افضل الفوائد	حضرت شیخ المشائخ نظام الدین اولیاء	امیر خسرو دہلوی	۷۱۳ھ	فارسی
۱۱۔ سیر الاولیاء	حضرت شیخ نظام الدین اولیاء دہلوی	شیخ سید محمد بن مبارک علوی کرمانی معروف بہ امیر خورد	۷۴۲ھ بین ۷۳۰ھ	فارسی
۱۲۔ خیر المجالس	حضرت شیخ نصیر الدین محمود روشن چراغ دہلی	شیخ حمید قلندر	سال نامعلوم	فارسی
۱۳۔ مفتاح العاشقین	حضرت شیخ نصیر الدین محمود روشن چراغ دہلی	شیخ محب اللہ خلیفہ شیخ نصیر الدین محمود	سال نامعلوم	فارسی
۱۴۔ خلاصۃ الالفاظ یا جامع العلوم	حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت	شیخ ابو عبد اللہ علاء الدین علی	سال نامعلوم (ملفوظات ۷۸۰ھ تا ۷۸۲ھ)	فارسی
۱۵۔ سراج الہدایہ	حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت	شیخ احمد برنی	(نسخہ مکتوبہ ۱۰۱۰ھ)	فارسی
۱۶۔ معدن المعانی دو جلدیں	حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری	شیخ زین بدر عربی	ملفوظات ۷۴۹ھ تا ۷۵۱ھ	فارسی

۱۷۔ مخ المعانی و مغز المعانی	حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ	شیخ شہاب الدین عماد		فارسی
۱۸۔ خوانِ پُرنعمت	حضرت مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ	زین بدر عربی۔	ملفوظات ۷۴۶ھ تا ۷۵۱ھ	فارسی
۱۹۔ انوار المجالس	حضرت سید محمد الحسنی المعروف بہ بندہ نواز گیسو درازؒ	سید محمد اکبر حسینی	۸۰۲ھ	فارسی
۲۰۔ جوامع الکلم	حضرت سید محمد الحسینیؒ معروف بہ بندہ نواز گیسو درازؒ	سید محمد اکبر حسینی	۸۰۵ھ	فارسی
۲۱۔ لطائف اشرفی	حضرت سید اشرف جہانگیرؒ سمنانی	حاجی نظام غریب یمنیؒ	نامعلوم	فارسی

لطائف اشرفی کی تاریخ تدوین و تالیف قلمی نسخہ پر مرقوم نہیں ہے، میرے مطالعہ سے قلمی نسخہ گزرا ہے اس پر ۱۰۸۰ھ مرقوم ہے اور اس مخطوطہ کے راقم خاندان اشرفیہ کے ایک بزرگ سید اولاد حسین صاحب ہیں جو حضرت سید عبد الرزاق رحمتہ اللہ علیہ المعروف بہ نور العینؒ کے نبیرہ ہیں۔

میں نے جن ملفوظات کی سطور بالا میں صراحت کی ہے ان میں اکثر ملفوظات مطبوعہ ہیں اور بعض کے اُردو تراجم بھی ہو چکے ہیں بعض مخطوطات کی شکل میں ہیں ان تمام ملفوظات میں لطائف اشرفی کا قلمی نسخہ کافی ضخیم ہے، مذکورہ بالا ملفوظات کے علاوہ بھی ہمارے متعدد مشائخ کرام صاحب ملفوظات گزرے ہیں، ان میں ملفوظات حضرت شاہ فخر الدین دہلوی قدس سرہ، ملفوظات حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ، ملفوظات حضرت شاہ نور محمدؒ مہاروی، ملفوظات حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ، ملفوظات حضرت شاہ حافظ جمالؒ صاحب بھی مشہور و معروف ہیں، بہت ممکن ہے کہ ان ملفوظات کے علاوہ بھی بعض بزرگان طریقت اور مشائخ کرام کے

ملفوظات بھی موجود ہوں لیکن میں اُن سے باخبر نہیں ہوں اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کر سکا قصداً میں نے کسی کے ذکر سے بے اعتنائی نہیں برتی ہے، البتہ مشائخ کرام اور صوفیائے کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے مکتوبات معرفت آگیں کا ذکر میں نے قصداً نہیں کیا ہے کہ وہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور انکی گراں پایگی کے اظہار کے لئے متعدد صفحات درکار ہوں گے۔

اس مضمون کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں مذکورہ ملفوظات میں سے ہر ایک کے موضوعات پیش کر سکوں، اس لئے میں ان ملفوظات کے مشمولہ موضوعات کے بارے میں ایک مختصر جائزہ پیش کر رہا ہوں، یہ موضوعات ان تمام ملفوظات میں مشترک ہیں، میں یہ موضوعات بطور حصر پیش نہیں کر رہا ہوں کہ ان موضوعات کے سوا بھی اور بہت سے ایسے موضوعات ہیں، آپ کو بعض ملفوظات میں ان موضوعات کے علاوہ بھی بہت سے موضوع ملیں گے جو مرشد گرامی نے رشد و ہدایت کے لئے ارشاد فرمائے یا املا کرائے وہ ایک تخصیص کا پہلو ہوگا اور میرے پیش کئے جانے والے موضوعات میں عمومیت کا پہلو ہے اور تمام ملفوظات میں قریب قریب مشترک ہیں۔

ان تمام گرانقدر و گرانمایہ ملفوظات میں سب سے زیادہ زور اتّباعِ شریعت پر دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اتّباعِ شریعت کے بغیر تصوف کی دنیا میں قدم بھی نہیں رکھا جا سکتا، یہی اتّباعِ شریعت، "طریقت" میں اصل اصول ہے اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں تمام شیوخ طریقت اور مرشدانِ گرامی قدر نے جمیع آدابِ طریقت اور معرفت میں اسی کو مقدّم رکھا ہے اور سب سے پہلا حکم، احکام خداوندی کی بجا آوری اور حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی، راہ معرفت میں پہلا قدم ہے، اس سے ہٹ کر اگر کوئی دعویٰ کیا جائے تو محض باطل ہے۔

شیوخِ طریقت کی تصنیفات، ان کے گرانقدر ملفوظات میں اوّلیت اسی موضوع اتباعِ شریعت کو حاصل ہے اور معرفت و طریقت کا یہی پہلا سبق ہے، اس خصوص میں

اور زیادہ کیا عرض کروں، حضرت سعدی شیرازی کا یہ شعر اس سلسلہ میں بڑی جامعیت کا حامل ہے۔

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز نخواہد بمنزل رسید

اب میں آپ کے سامنے دنیائے طریقت و معرفت کے اُن موضوعات کو پیش کر رہا ہوں جو عموماً تمام ملفوظات میں مشترک ہیں اور جو سالک کو منزلِ مقصود پر پہنچاتے ہیں اور وہ یہ ہیں،

ذکر الٰہی، محبتِ الٰہی، محبت سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم، اتباع سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم، آدابِ شریعت اور اُن کا پاس، آداب صحبت، عبادت اور اس کی فضیلت ذکر میں معروفیت و محویت، حضرات صوفیہ کے شب و روز کے معمولات، پاس انفاس، اوراد علم و ادب، علوم دینی کی تکمیل، حسن اخلاق، خدمت خلق، معرفت نفس، تقویٰ، مشاہدہ، مکاشفات، اشغال، مواجید و مراقبہ، حقائق و محاسبہ، مجاہدہ، خشیتِ الٰہی، بیم و رجا، توبہ، ورع، زہد، فقر، شکر، خوف، توکل، کمالِ توکل، محبت کے محرکات، اُنس، جذبہ، قبض و بسط، سُکر و صحو، تفرید و تجرید، خلوت نشینی اور اس کے آداب اصول، غیب و شہود، ذوق و شوق، محاضرہ و مکاشفہ، تلوین تکوین۔

ان میں بعض احوال ہیں اور بعض مقامات، یہ صرف چند موضوعات ہیں جو میں نے پیش کئے ہیں ورنہ اس قبیل کے صدہا موضوعات ہیں جو مختلف مجلسوں میں مرشدان گرامی کی زبان صدق ترجمان سے ملفوظ ہوئے اور بعض کو املا کرایا تاکہ مریدان باصفا کو طریقت کے رموز اور اس کے آداب اور مراحل و کوائف سلوک سے آگاہی حاصل ہو جائے اور اپنے اوقات ان میں صرف کر سکیں، یہی صورت حال مکتوب کی ہے، ان بزرگوں کے مکتوب کے سلسلہ میں جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں اس مقدمہ میں کچھ عرض نہیں کر سکوں گا، اس سے صرف نظر کرتا ہوا آپ کے سامنے "فیہ ما فیہ" کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں گا کہ یہ چند صفحات اس گرانقدر ملفوظات سے متعلق ہیں۔

ملفوظاتِ حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہ

فیہ مافیہ

کا

ادبی اور عارفانہ مقام

قارئین کرام ! آپ ملفوظات کی مختصر تاریخ میں یہ مطالعہ کر چکے ہیں کہ "فیہ مافیہ" حضرت عارف باللہ مولانا جلال الدین رومی نور اللہ مرقدہ کے ملفوظاتِ گرامی کا مجموعہ ہے اور چودھویں صدی ہجری میں یہ گرانقدر کتاب منصۂ شہود پر آئی ہے "تاریخ تصوف در اسلام کے مصنف ڈاکٹر قاسم غنی کتب تصوف کے ضمن میں رقمطراز ہیں۔

"کتاب فیہ مافیہ، عبارت از تقریر ہائے است کہ مولانا رومؒ در مجالس خود بیان فرمودہ و مریداں بقید کتابت درآوردہ اند، موضوع آں تقریرات مواقیع عارفانہ و مسائل مربوط باخلاق و تصوف است۔

این کتاب در سال ہزار و سی صد و سی و سہ (۱۳۳۳ھ) ہجری قمری در طہران (تہران) و در سال ہزار و سیصد و ہجدہ ہجری قمری شمسی در شیراز بطبع رسیدہ"

یعنی، کتاب فیہ مافیہ سے مراد مولانا رومؒ کی وہ تقریریں ہیں جو انھوں نے اپنی مجالس میں کی ہیں اور ان تقریروں کو آپ کے مریدوں نے تحریر کر لیا تھا، ان تمام تقریروں کا موضوع معرفت ہے یا اخلاقی مسائل ہیں۔

یہ کتاب (فیہ مافیہ) ۱۳۳۳ھ ہجری قمری میں طہران سے اور ۱۳۱۸ھ ہجری شمسی میں شیراز میں طبع ہوئی ہے۔ "تاریخ تصوف در اسلام"

فاضل دانشمند ڈاکٹر قاسم غنی کے بیان کے مطابق مولانا عبدالماجد دریاآبادی مرحوم کے دریافت شدہ نسخہ سے پہلے طبع ہوئی ہے اور جس کی دریافت، اس کے متعدد نسخوں سے متن کے مقابلہ اور تصحیح میں مولانا دریاآبادی نے جو کاوش کی ہے اس کا تفصیلی ذکر

انھوں نے "فیہ مافیہ" کے معارف پریس (اعظم گڑھ) سے طبع ہونے والے نسخہ کے دیباچہ میں کر دیا ہے، اس کوشش و کاوش کے لئے ادب دوست حضرات خصوصاً سالکانِ طریقت و معرفت ان کے ممنون ہیں، اگرچہ مولانا عبدالماجد کی دریافت سے چند سال پہلے یہ کتاب طہران میں طبع ہو چکی تھی لیکن حیرت ہے کہ برصغیر کے محققین اور مورخین ادبیات فارسی اس سے بے خبر ہیے، اس قدیم نسخہ کی دریافت اور طباعت و اشاعت سے قبل بس اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ کی تصنیف نثر میں بھی ایک کتاب ہے، لاعلمی کی بناء پر کوئی اس کو آپ کے مکتوبات کا مجموعہ کہتا تھا، کوئی باوجود اس ادّعا کے کہ یہ ایک نثر کی کتاب ہے۔ اس کو منظومات کا جامہ پہناتا تھا۔

اس سلسلہ میں دو ناقدین ادبیات فارسی کا یہ بیان آپ کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگا۔

ادبیات فارسی کے عظیم مورخ اور ناقد اور شعر العجم جیسی بلند پایہ کتاب کے مصنف مولانا شبلی مرحوم "سوانح مولانا روم" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"فیہ مافیہ" ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروآنہ کے نام لکھے ہیں، یہ کتاب بالکل نایاب ہے، سپہ سالار نے اپنے رسالہ میں ضمناً اس کا ذکر کیا ہے، مولاناؒ کے دیوان کا ایک مختصر سا انتخاب ۱۳۰۹ھ ہجری میں امرتسر میں چھپا ہے اس کے خاتمے میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں تین ہزار سطریں ہیں۔"

چونکہ مولانا شبلی کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری تھی اس لئے انھوں نے "فیہ مافیہ" کو مکتوبات کا مجموعہ قرار دیا تھا، ان کو اس سلسلہ میں معذور سمجھنا چاہیئے۔

دوسری رائے مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جلال الدینؒ (رومی) نثر کے ایک رسالہ کے مصنف ہیں جس کا نام فیہ مافیہ ہے جو تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے اور جس میں زیادہ تر معین الدین پروآنہ سے رومی

کا خطاب ہے، اس رسالہ کے قلمی نسخے نایاب ہیں۔"

بہت حیرت کی بات ہے کہ پروفیسر نکلسن، اس کو نثر کی کتاب کہتے ہیں اور پھر تین ہزار ابیات پر مشتمل بتاتے ہیں، بہرحال بیسویں صدی سے قبل نہ ایران میں اور نہ اس برصغیر میں اس کتاب کا سراغ لگ سکا اور نہ اس کا کوئی نسخہ کسی کے ہاتھ آیا حسن اتفاق سے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کو یہ نسخہ دستیاب ہوگیا، اس کے بعد دوسرے نسخوں کی تلاش، ان کی دستیابی، مختلف نسخوں سے ان میں دستیاب شدہ متن کا تقابل اور اس کی تصحیح میں انھوں نے جو کچھ کاوش کی، اس کی داستان طویل ہے، معارف پریس اعظم گڑھ (بھارت) کے مطبوعہ نسخہ فیہ مافیہ میں اس کی تفصیل ہے

پیش نظر ترجمہ اسی معارف پریس کے مطبوعہ نسخہ ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۷ھ ہجری شمسی کا ترجمہ ہے، اس کمال طباعت سے معلوم ہوتا ہے کہ معارف پریس میں فیہ مافیہ کی طباعت تہران کی اشاعت سے پندرہ سال بعد ہوئی، فاضل مصحح نے جو دیباچہ تحریر فرمایا ہے اس کی تحریر کا سال بھی یہی ہے یعنی ۱۹۲۸ء۔

"فیہ مافیہ" کا ادبی مقام

حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہ کی شاہکار تصنیف مثنوی معروف بہ مثنوی معنوی یا مثنوی مولانا روم پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مستشرقین نے بھی دل کھول کر داد دی ہے اور اس کو سراہا ہے۔ فارسی، ترکی اور اردو زبانوں میں اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور دنیائے تصوف میں تو اس کی جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صوفیائے کرام کے یہاں اس کا درس دیا جاتا تھا اور اب بھی اس کی قدر و منزلت کا وہی عالم ہے۔ طریقت میں وہ سلوک کا ایک دستور العمل ہے۔

"فیہ مافیہ" کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صرف مولانا عبدالماجدؒ کے رشحات قلم ہیں، اُن سے پہلے بس اتنا ہی لکھا گیا ہے کہ "یہ مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ کی ایک نثری تصنیف ہے" اس سے زیادہ اور لکھا ہی کیا جاتا جبکہ یہ تصنیف نایاب تھی، دنیا کے صرف چند کتب خانوں

میں اس کے قلمی نسخے موجود تھے، اس لئے جب کتاب ہی سامنے نہ ہو تو اس کے بارے میں لکھا ہی کیا جائے، اب جبکہ مولانا دریاآبادی کی کوشش سے یہ کتاب ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے اس لئے اب موقع ہے کہ قارئین سے اس کا تعارف کما حقہ کرایا جائے۔

جیسا کہ آپ کے علم میں آچکا ہے کہ یہ کتاب حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ کے ملفوظات ہیں، حضرت مولانا کی مجلس گرامی خواص و عوام کا مرجع تھی، ارباب علم و فضل اور اصحاب حال آپ کی مجلس میں شرکت اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے تھے، امرائے سلطنت بھی مجلس میں باریابی اپنے لئے موجب عزت و افتخار سمجھتے تھے، اِن امراء و ارباب سلطنت میں معین الدین پروانہ کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔

معین الدین پروانہ حاکم قونیہ شاہ رکن الدین قلیج ارسلان (سلطانِ روم) کا حاجب اور مملکت کے سیاہ و سپید کا مالک تھا، حضرت مولانا رومی کا حد درجہ معتقد اور ارادتمند تھا، حضرت مولانا کو بھی اس سے خاص تعلق خاطر تھا اور اس حد تک کہ وہ آپ کا منہ بولا بیٹا تھا، آپ کی مجالس میں اکثر و بیشتر حاضر رہتا، مولانا کی خدمت میں انتہائی خلوص اور ارادت کا اظہار کرتا، اکثر حضرت مولانا رومیؒ بھی دنیا والوں سے بے تعلقی کے باوصف امیر پروانہ کی دلجوئی کے لئے اس کی دولت سرا میں تشریف لے جاتے وہ سراپا نیاز بن کر آپ کا استقبال کرتا۔

"فیہ مافیہ" میں اکثر ارشادات ایسے ہیں جن میں معین الدین پروانہ سے خطاب ہے یا ان کے سوالات کے جوابات ہیں لیکن یہ سوالات اور ان کے جوابات امور دنیاوی سے متعلق نہیں ہیں بلکہ وہ رموز طریقت و معرفت ہیں یا منہاجِ شریعت سے ان کا تعلق ہے معین الدین پروانہ کے علاوہ بھی دوسرے حاضرین مجلس سے بھی حضرت مولاناؒ نے خطاب فرمایا ہے، لیکن اِن حضرات کے نام نہیں لئے گئے ہیں، اکثر مقامات پر حضرت مولاناؒ نے اپنے مربّی اور مرشد طریقت حضرت سید برہان الدین محقق ترمذی کا بھی ذکر کیا ہے، جس

طرح فیہ مافیہ میں معین الدین پروانہ کو باعتبار خطاب ایک مخصوص اور بلند مقام حاصل ہے کچھ ایسی ہی صورت حال حضرت شیخ مخدوم شرف الدین منیری قدس اللہ سرہٗ کے مکتوبات میں امیر شمس الدین حاکم چوٹسہ (بہار، ہندوستان) کی ہے، بیشتر مکتوبات شیخؒ آپ کے نام ہیں اور واضح طور پر آپ کا نام لیا گیا ہے، معین الدین پروانہ (حاکم قونیہ) کی طرح امیر شمس الدین بھی حضرت شرف الدین کا جاں نثار عقیدت مند تھا۔

فیہ مافیہ کی زبان اور انداز بیان

حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ کی مادری زبان فارسی تھی، مثنوی روم مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ (بھارت) پر آپ کا ایک مختصر دیباچہ یا پیش لفظ ترکی زبان میں ہے، عربی زبان پر کامل دسترس آپ کو اس لئے حاصل تھی کہ حضرت مولانا ایک عالم متبحر تھے ایک فرید عصر فقیہ تھے۔ شوریدگیٔ حال سے پہلے درس و تدریس اور فتویٰ نویسی آپ کا خاص اور ہمہ وقتی مشغلہ تھا (افسوس کہ مولانا کے فتاویٰ کی تدوین نہیں کی گئی اس لئے ان کے بارے میں کچھ عرض کرنا دشوار ہے) آپ کے درس میں صاحبانِ علم و فہم شریک ہوتے تھے، فقیہانِ روزگار آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے استفادہ کرتے تھے، جس طرح آپ ایک عظیم فقیہ تھے اسی طرح ایک محدث علّام اور مفسر بے مثال بھی تھے، علوم و فنونِ اسلامی پر آپ کے عبور اور آپ کے پائگاہ علم کا یہ عالم تھا کہ آپ سرآمد علمائے روزگار اور سرخیل فضلائے زمانہ تھے۔

جواہر المضیئہ (طبقات الحنفیہؒ) کے مشہور زمانہ مولف علامہ عبدالقادر قریشی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے۔

"کانَ عالماً بالمذاهب واسعًا الفقه عالِماً بالخلاف وانواع العلوم

یعنی، آپ مذاہب اربعہ کے عالم، فقہ میں ہمہ داں، خلاف و جدل کے ماہر تھے اور دوسرے علوم و فنون پر کامل دسترس رکھتے تھے۔"

لیکن اس تبحر علمی کے باوجود آپ کے ملفوظات کی زبان نہایت سادہ اور اثر آفرین ہے، مرصع و

سجع زبان آپ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی اور آپ اس ارشاد والا پر عمل پیرا تھے "کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم" "لوگوں سے ان کے مبلغ عقل کے مطابق کلام کرو"، چونکہ آپ کے فرمودات وارشادات گرامی کا مقصود اور اُن کی غایت یہ ہوتی تھی کہ حاضرین مجلس جس میں صاحبان علم و فضل بھی ہوتے تھے اور کم سواد حضرات بھی جو فرطِ عقیدت کی بناء پر آپ کی مجلس کی حاضری اور ارشادات گرامی کی سماعت کو اپنے لئے وجہ نازش وافتخار سمجھتے تھے پس ان کم سواد حضرات کے افادہ کے لئے آپ عام فہم زبان استعمال فرماتے تھے۔

آپ کے ملفوظات کا اوّل سے آخر تک یہی رنگ اور انداز بیان ہے البتہ جگہ جگہ "مصطلحات تصوف" کے باعث آج ایسے مقامات و ارشادات عسیر الفہم ہوں لیکن اس وقت نہ تھے کہ حاضرین مجلس میں سب ہی اصحاب ذوق اور معرفت کی چاشنی سے آشنا تھے، پس ایسے مقامات کو آپ فہم سامع کے لئے چھوڑ دیتے تھے اور اُن کی توضیح وتشریح نہیں فرماتے تھے، فیہ مافیہ میں بہت سے ایسے جملے موجود ہیں کہ اُن کا لفظی ترجمہ مطالب کی عقدہ کشائی نہیں کرسکتا، وہاں توضیح کے بغیر معنی و مفہوم سے استفادہ ناممکن ہے اس لئے مترجم نے وہاں توضیح وتشریح سے کام لیا ہے۔

"فیہ مافیہ" کی نثر کا ایک اسلوبِ خاص طرز زبان یا سبک نگارش کہہ لیجئے، ایسا ہے جس میں حضرت مولانا رومیؒ قدس سرہ العزیز منفرد ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ بات سے بات پیدا کرتے جاتے ہیں، اس اسلوب نے طرز ادا میں ایک خاص دلکشی پیدا کردی ہے، ترجمہ کے قارئین مطالعہ کے وقت اس نکتہ خاص کو پیش نظر رکھیں، جب ہی اس انداز بیان سے لذت اندوز ہوسکیں گے

حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ نے جس دور میں مثنوی معنوی کی نگارش پر قلم اٹھایا تھا اور مجالس تذکیر وموعظت میں آپ کے دم قدم سے رونقیں آئیں وہ دور مقفّیٰ و مسجّع نگارش اور انداز بیان کا دور تھا، مصنفین صرف تصنیف ہی میں اس رنگ کو نہیں اپناتے تھے بلکہ روزمرہ اور ہر وقت کی گفتگو میں بھی اسی طرز کو اختیار کرتے تھے لیکن "فیہ مافیہ" کا (جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کرچکا ہوں) انداز بیان، موعظت اور تکلم کا رنگ عام فہم ہے، چونکہ حضرت مرشد رومیؒ

کا مطمع نظر، نصب العین اور مدعائے خاص یہی ہوتا تھا کہ حاضرین مجلس گفتگو سے بصیرت اندوز ہوں اس لئے آپ نے کلام میں ہمیشہ سادگی کے اصول کو اپنایا۔

قارئین! یہ واضح رہے کہ "ملفوظات" کسی مخصوص موضوع کے تحت کسی ایک مجلس سے مختص نہیں ہوتے ہیں بلکہ ہر ایک مجلس میں متنوع موضوعات پر مرشد گرامی یا صاحب ملفوظات اپنے خیالات کا اظہار فرماتا ہے، یہ وصف آپ تمام مجموعہ ہائے ملفوظات میں موجود پائیں گے کہ مرشد گرامی نے کسی ایک موضوع پر گفتگو شروع فرمائی جو کبھی سوال کے جواب میں ہوتی کبھی خود مرشد گرامی کی طرف سے بطریق موعظت اور پھر بات سے بات نکلتی چلی جاتی۔

مرشد گرامی کی مجلس میں چند ایسے عقیدت کیش موجود ہوتے جو ان ارشادات کو ضبط تحریر میں اسی وقت لے آتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ملفوظات کا کوئی کاتب، کلمات قدسیہ کے اعادہ کی درخواست کرتا اور مرشد گرامی اس نکتہ کی وضاحت فرما دیتے اور ارشاد گرامی کو باحسن وجوہ املا کرا دیتے کبھی اس میں کچھ اضافہ فرما دیتے اور ارشاد ہوتا کہ اس وضاحت کو بھی تحریر کر لو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بعض کاتبان ملفوظات اس وقت ہی ان ارشادات کو قلمبند کرنے کا موقع نہ پاتے تو کسی اور موقع اور وقت پر محض اپنی یادداشت سے مرشد کے فرمودات کو قلم بند کرتے۔ ایسے مواقع پر وہ یہ وضاحت کر دینا اپنا فرض سمجھتے کہ "تقریباً ان الفاظ میں مرشد نے فرمایا"، ایسے مقامات گرامی قدر مجموعہ ملفوظات، "لطائف اشرفی" میں بہت ہیں، جہاں مرتب جامع ملفوظات نے خود یہ وضاحت کر دی ہے کہ "تقریباً می فرمودند" لیکن "فیہ ما فیہ" میں ایسا نہیں ہے۔

فیہ ما فیہ کے موضوعات

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ملفوظات کا موضوع ایک یا چند عنوانات و مضامین نہیں ہوتے بلکہ مجلس ارشاد میں مرشد گرامی پر جو کیفیت یا جذبہ طاری ہوتا ہے یا جو حال اس وقت وارد ہوتا ہے یا جس مقام پر وہ متمکن ہوتا ہے اسی کی توضیح و تفسیر اس کی تقریر کا موضوع بن جاتی ہے یا وہ "ملفوظ" کسی سوال کا جواب ہوتا ہے،

حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہ کے "ملفوظات" میں یہ صورت موجود ہے، عام طور پر اصلاح نفس، خدمت خلق، جہاد فی سبیل اللہ، محبت واطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اطاعت خداوندی، ذکر باری تعالیٰ حضرت مرشد رومیؒ کے ملفوظات کے عام موضوع ہیں اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مولانا رومیؒ کا تبحر علمی، آپ کی روحانیت کا اعلیٰ مقام آپ کو اکثر اس طرف مائل کر دیتا تھا کہ آپ ایک نکتہ سے یا ایک موضوع سے متعدد موضوع ہائے سخن پیدا فرما دیتے تھے اور اس خصوصیت میں آپ منفرد ہیں،

حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ نے روایات سے بہت کم استفادہ کیا ہے، آپ کا کلام نصوص قرآنی اور ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤید، مبرہن اور مدلل ہوتا ہے آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ قرآن حمید اور احادیث شریفہ کی روشنی میں فرماتے ہیں یا مشائخ متقدمین کے اقوال سے اس کی تائید پیش کرتے ہیں۔

آپ کے کلام میں جو زور، اثر آفرینی، دلنشینی، اور سوز و گداز ہے وہ آپ کی طبیعت کا خاصہ ہے، حضرت شمس تبریزیؒ کی ملاقات اور صحبت نے آپ کو سراپا سوز و گداز و از سرتاپا سوز و ساز بنا دیا تھا اس لئے آپ جو کچھ فرماتے وہ اسی سوز دروں کا نتیجہ ہوتا تھا اور اسی سوز کی بدولت آپ کی مجلس بھی سوز و گداز کا مرقع ہو جاتی تھی۔

فیہ ما فیہ کا عارفانہ مقام

"فیہ ما فیہ" کے عارفانہ مقام کے بارے میں کیا عرض کروں کہ یہ ارشادات گرامی حضرت مولانا رومی قدس اللہ سرہٗ کے سوز دل کے شرارے ہیں، وہ روحانی کیفیات ہیں جو سوز و گداز کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد ان پر ہر وقت طاری رہتی تھیں اور وہ جذبات شعر کے سانچے میں ڈھل کر ایک آہ بن جاتی تھیں، ان آہوں سے اگر آپ گداز دل پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی غزلیں زیر مطالعہ کیجئے (جو کلیات شمس میں موجود ہیں) اسی گداز کی خاکستر میں دبی دبی چنگاریاں مجلس ارشاد میں باریاب ہونے والے حضرات کے لئے ملفوظات کے پیکر میں آپ کی زبان معارف

ترجمان سے نکلتی ہیں۔

عالم وجد وکیف میں آپ ایسے ایسے نکات طریقت ومعارفِ حقیقت پیش فرماتے اور"حال ومقام" کی بلندیوں پر پہنچ کر اس طرح نغمہ سرا ہوتے تھے کہ جب تک دل سوز دروں سے نہ جل رہا ہو اور محبت حقیقی کے جذبات موجزن نہوں ان مقامات اور معارف سے باخبر ہونا بہت دشوار ہے اس وجہ سے آپ کو گاہے گاہے پیرایۂ تمثیل کا سہارا لینا پڑتا تھا، مثنوی معنوی (مثنوی مولانا روم) میں جو نکات پیرایہ تفصیل سے آراستہ وپیراستہ ہوئے، ملفوظاتِ گرامی میں وہ توضیحات وتصریحات آپ کو نہیں ملیں گی بلکہ وہ ایسے معارف ونکاتِ معرفت ہیں، جو قلت وقت کے باعث اعجاز واجمال کے پیرایہ میں معرض بیان میں آئے ہیں۔

حضرت مولانا رومیؒ کے جلالِ علمی اور کمالِ روحانی کے باعث لب کشائی کی جرأت صرف ندیمانِ خاص کو ہوتی تھی، چند ہی ایسے مقربانِ بارگاہ تھے جو استفسار کی جرأت کر لیا کرتے تھے اور حضرت والا مرتبت بدیدۂ گریاں اور دلِ بریاں سوزِ دل کی آویزشوں کے ساتھ سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی نوائے دلربا ودلنشین میں اس سوال کا جواب مرحمت فرما دیا کرتے تھے، جواب میں تخصیص کے بجائے ایک عموم ہوتا تھا، آپ جواب میں سوال کے حصر سے گزر کر تصریح وتشریح کے لئے کئی کئی عنوانات پیدا فرما دیتے تھے، اس کا باعث یہ تھا کہ روحانی سرشاریاں اس طرح آپ پر طاری رہتی تھیں کہ موضوع مسئولہ تک جواب کو محدود رکھنا آپ کے لئے ممکن نہیں رہتا تھا، بات سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی تھی اور ایک سرِ معرفت کے ضمن میں بہت سے اسرار معرفت سے پردہ اٹھتا چلا جاتا تھا

اخلاص، عبادت، فضائل اخلاق سے آراستگی، رذائل اخلاق سے اجتناب، عشق ومحبت کی کیفیات، درد وجذبہ سرشت انسانی کا تجزیہ، مقامات خوف، طلب کے لئے واسطہ، عبادت اور راز ونیاز، اسلام ورہبانیت، اولیاء اللہ کا مقام، فتوحات کی غایت، آپکے ملفوظات کا موضوعِ عمومی ہوتے تھے،

میں نے ان سطور بالا میں صرف چند موضوعات کو پیش کیا ہے، اس ترجمہ کی فہرست مضامین پر نظر

ڈالئے آپ کو موضوعات کا تنوع نظر آئے گا۔

آپ چونکہ ایک عالم متبحر تھے، اس لئے حدیث، معتقدات، ایمانیات، تفسیر آیات کلام الٰہی اور توضیحات احادیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ایسے اخلاقی مباحث جو صالح اور پاکیزہ حیات انسانی کا زیور ہیں، اکثر وبیشتر آپ کے ملفوظات کا موضوع ہوتے تھے۔

سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت آپ کے سوز و دروں کا اصل سرمایہ تھی، تفسیر آیات قرآنیہ میں جگہ جگہ اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ آپ نے گرامی قدر ملفوظات میں ایسے ایسے نکات شریعت، طریقت اور معرفت بیان فرمائے ہیں کہ روح صالح وجد میں آجاتی ہے اور وجدان سوز و گداز محبت میں ڈوب جاتا ہے، حق یہ ہے کہ آپ کے گرانمایہ ملفوظات کے سلسلہ میں یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کا مصداق ہے، قارئین کرام ملفوظات کے اس ترجمہ کے مطالعہ کے بعد میرے قول کی تصدیق فرمائیں گے۔

از:- مولانا شمس الحسن شمس بریلوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمۂ مقدمہ

بدیع الزماں فروزانفر

بعد از حمد و صلوٰۃ :-

اللہ رب العالمین، جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ، نے اپنے کمال عنایت سے جب راقم الحروف کو حضرت مولانا جلال الدین محمد مشہور بہ مولویؒ کے زندہ و تابندہ، حکمت و موعظمت کے جواہر سے مالا مال، حق و صداقت اور معرفت سے بھرپور، کلمات روحانی کے مطالعے کی توفیق عطا فرمائی اور شرف مطالعہ نصیب ہوا تو میں نے اپنی عمر عزیز کے بائیس۲۲ سال غور و فکر میں صرف کئے، مولانا کی تصانیف و ملفوظات اور خاص طور سے مثنوی کے اشعار کو سمجھنے میں جو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کے لئے شارحین رموز نے در عقدوں کو حل کرنے والوں اور داد تحقیق دینے والوں نے کشف معانی والہام مطالب کے حصول میں عمریں صرف کر کے ایسے ایسے ذخیرے جمع کر دیئے ہیں جن کی امداد و اعانت اور رہنمائی بڑے کام نکالتی ہے میں نے بھی ان سے مدد لی اور بعض عقدے حل بھی ہوئے لیکن بعض اسرار و رموز ایسے تھے جو سلجھنے کی بجائے اور الجھ جاتے یا پردۂ خفا میں رہ جاتے۔ اس موقع پر یہ مقولہ مجھے یاد آیا کہ "قرآن کے معنے خود قرآن سے پوچھو" اور معاً میرا ذہن

اس جانب متوجہ ہو گیا کہ مثنوی کے اسرار و رموز خود مثنوی سے اور مولانا کی دوسری تصانیف سے معلوم کئے جائیں، یا اس کو یوں کہئے کہ درد کا درماں وہیں تلاش کرنا چاہیئے جہاں درد پیدا ہوا ہے لہٰذا میں نے مثنوی کے مشکل مضامین کو حل کرنے کے لئے خود مولانا کے رشحات قلم کو سمیٹنا شروع کیا مثلاً دیوان شمس، فیہ ما فیہ، مجالس سبعہ اور مکتوبات وغیرہ یکجا کئے اور مشکل مقامات کے اشارات و کنایات کی تلاش میں مشغول ہو گیا۔ لیکن ان کتابوں سے استفادہ کرنے میں ایک اور دشواری پیش آئی۔ فیہ ما فیہ اور کلیات کا مطالعہ کرتے وقت یہ محسوس ہوا کہ پہلے ان کتابوں کا موازنہ اصل (خطی) نسخوں سے کر کے ان کی صحت کی ضمانت حاصل کی جائے پھر اصل مقصد کی جانب رجوع کیا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے میں نے ضروری خیال کیا کہ فیہ ما فیہ کے تمام مطبوعہ اور قلمی نسخے جمع کئے جائیں مگر یہ کام میں نے شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ مہم اتنی آسان نہیں ہے جتنی ابتداء میں نظر آئی تھی پھر خبر ملی کہ اس کتاب فیہ ما فیہ کا ایک نسبتہً معتبر نسخہ کتابخانہ ملی میں موجود ہے تو میں نے اس نسخے کو حاصل کرنے کی کوشش کی، کتابخانہ ملی (قومی لائبریری) کے ارباب حل وعقد کے تعاون سے جلد ہی یہ نسخہ میرے ہاتھ آ گیا اور فاضل دوست آقائے دکتور محمد معین نے (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی عنایت خاص سے نوازے) یہ وعدہ کر لیا کہ اس کتاب کا طہران کے مطبوعہ نسخے سے مقابلہ کرنے کے لئے وہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحات ضرور نکالیں گے۔ چنانچہ بڑی محنت اور توجہ سے اس کا مقابلہ ہوا مگر اس مقابلے سے واضح ہوا کہ اس نسخے کے ناقل نے جابجا اپنی غیر معمولی قابلیت کا مظاہرہ بھی فرمایا ہے۔ اس میں ناروا تصرفات بھی کئے ہیں، کہیں ردّوبدل سے کام لیا ہے، کہیں تحریف کی ہے، کہیں کچھ عبارتوں کا، کلمات کا اور اشعار کا اضافہ بھی اپنی طرف سے اصل متن میں روا رکھا ہے اور نہایت ہی غیر

مناسب انداز سے ان کو داخلِ کتاب کیا ہے جس سے بنیاد کلام تک الٹ کر رہ گئی ہے، اس بنا پر قدیم نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہوئی۔

۱۳۲۶ھ کے اوائل میں کتابخانۂ ملّی کے نسخے سے موازنہ و مقابلہ ختم ہی کیا تھا کہ فیہ ما فیہ کا ایک اور نسخہ دستیاب ہوا جس پر کتابت کا سال ۸۸۸ھ درج تھا اور یہ بظاہر کتابخانۂ ملّی کے نسخے سے بھی قدیم تھا۔ مگر ان دونوں نسخوں کا موازنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کے مندرجات میں بڑا فرق ہے۔ کتابخانۂ ملّی کا نسخہ اپنے سالِ کتابت کے لحاظ سے اگرچہ مؤخر تھا لیکن صحّت کے اعتبار سے قابل ترجیح ٹھہرا۔ اس نسخے کی کتابت کرنے والے کی جانب سے اس میں اضافے اور ترمیم و تصرف نے بہت کم راہ پائی تھی اور نقل کنندہ کو دستبرد کا موقع زیادہ نہیں ملا تھا یہ دیکھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا۔ جبتک کوئی ایسا قابل اعتماد نسخہ نہ مل جائے جو حضرت مولانا کے زمانے کا یا کم از کم اس سے قریب ترین دور کا ہو اس سلسلے میں میرے عزیز دوست گرامی قدر آقائے تقی تفضّلی نے میری بہت مدد کی۔ وہ اُس زمانے میں مجلس شورائے ملّی کے کتابخانے کے معاون مدیر تھے۔ انھیں نے مجھ کو بتایا کہ استنبول (ترکی) کے کتب خانوں میں ایسے تین نسخے موجود ہیں جو حضرت مولانا کے زمانے سے قریب ترین وقت میں نقل کئے گئے ہیں لہذا طہران یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد نے یہ طے کیا کہ اس کتاب فیہ ما فیہ کی تصحیح اور مقابلہ و موازنہ کے بعد اس کی طباعت کا اہتمام اس طرح کیا جائے کہ اس میں اغلاط کا اور حکّ و اضافہ کا کوئی شبہہ باقی نہ رہے، تو میں نے دانشگاہ طہران کے دبیر فاضل دوست آقائے دکتور خانلری سے رجوع کیا ان سے گفتگو کی تو انھوں نے انتہائی محنت و مشقت اور توجہ سے کام لے کر ترکی سے ان نسخوں کی فوٹو کاپیاں

منگوا کر میرے سپرد کیں اور میرے کام کو آسان کردیا کہ ان نسخوں کو سامنے رکھ کر میں اپنے نسخے کو درست کرلوں۔ بلکہ انھوں نے اور بھی امکانی معاونت فرمائی جب کہیں میں اس قابل ہوا کہ ایک تصحیح شدہ نسخہ طباعت کے لئے پیش کرسکوں۔ مقابلہ و تصحیح کے وقت راقم الحروف کے پاس جو نسخے موجود تھے ان کی تفصیلات یہ ہیں:-

(۱) وہ قلمی (خطی) نسخہ جو کتابخانۂ فاتح استنبول میں محفوظ ہے (اس کی حاصل کردہ فوٹو کاپی)۔ یہ نسخہ استنبول کے کتب خانہ کی فہرست میں ص ۲۷۶ پر مندرج ہے اس کا سائز ۷/۱۲×۲/۷اہے اور خطِ نسخ (عربی) ۲۰۵ اوراق یعنی ۴۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر صفحے پر پندرہ سطریں ہیں۔ کتاب فیہ ما فیہ کی اصل عبارت تو ۱۹۳ اوراق میں مکمل ہوگئی ہے، مگر یہاں سے اخیر تک چند فصلیں بہاء الدین ولد کی کتاب معارف کی بھی مرقوم ہیں۔ فیہ ما فیہ کا یہ نسخہ جو راقم الحروف کے ہاتھ میں ہے۔ قدیم ترین ہے، اس کی کتابت کی تاریخ یکم ذی الحجہ ۷۱۶ھ ہے اور اس طرح یہ نسخہ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ کی وفات کے چوالیس سال، پانچ ماہ پچیس روز بعد لکھا گیا ہے۔ حضرت مولانا کی وفات پانچ جمادی الاُخریٰ ۶۷۲ھ کو ہوئی تھی کتاب کے آخر میں خود نقل کنندہ نے یہ عبارت لکھی ہے۔

> بندۂ ضعیف، محتاج رحمت خداوندی، حسن بن شریف قاسم بن محمد بن حسن سمرقندی، الحنفی الہمامی المولوی نے کتابت کی۔ بتاریخ یکم ذی الحجہ ۷۱۶ھ۔

نیز پہلے اور دوسرے ورق پر اسی تحریر میں جو مکمل طور پر قلمی کتاب کی تحریر کے مماثل ہے۔ حضرت مولانا کا پدری و مادری نسب نامہ بھی درج ہے لیکن اس کے مندرجات صحت کے حامل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں دوسرے ورق پر اس صفحے میں جو کتاب کی جلد کی پشت کہلاتا ہے یہ عبارت لکھی ہوئی

"ھذا کتاب فیہ ما فیہٗ از گفتار مولانا سلطان العارفین، نور اعین
المحبّین محبوب قلوب المتقین"[1] ۔۔۔ الاولیاء فی العالمین ۔۔۔
الحق والملّتہ والدّین وارث الانبیاء والمرسلین، افاض اللہ انوارہ
علی کافتہ الانام الی یوم القیام آمین یارب العالمین"
اور اسی صفحے کے کنارے پر تازہ تر لکھے ہوئے یہ کلمات بھی ملیں گے:۔
"کتاب النصائح لجلال الدین، بخط عرب ۱۵"
یہ نسخہ جیسا کہ ورق ۱۷۷ کے حاشیئے میں متن ہی کی سی تحریر میں مکتوب ہے کہ "قوبلت بالاصل" (اصل سے اس کا مقابلہ کیا گیا ہے) یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت مولانا کی مجلس میں جو معاصر نقل نویس موجود تھے ان میں سے کسی ایک کی لکھی ہوئی نقل سے مقابلہ ہوا ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض آیات قرآنی کے لکھنے میں اور دوسرے کلمات کی کتابت کرنے میں یہ غلطیوں سے پاک نہیں ہے، اور فیہ ما فیہ میں جو عربی فصلیں موجود تھیں وہ بھی اس میں مرقوم نہیں ہیں اور بعض عبارتیں ایسی ہیں۔ جس میں تسلسل کا فقدان ہے۔ ان سے مطلب پورا نہیں ہوتا۔ البتہ کاتب (ناقل) کا نام اور کتابت کی تاریخ اس میں درج ہے جب کہ موجودہ اشاعت کے صـ۱۷۳ پر اس کی بابت اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مگر اس نسخے کو باوجود نقائص کے صرف اس گمان پر کہ قدیم ہے اور اس احتمال کی بنا پر کہ اس کا مقابلہ اصل نسخے سے ہو چکا ہے، طباعت کے مراحل سے گزارا گیا تھا۔ اس لئے میں نے جہاں بھی اس کا ذکر کیا ہے "اصل" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کتاب کے رسم الخط میں جو اہم خصوصیات نظر آتی ہیں اس کے چند نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔
(الف) اس نسخے میں آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ دال اور ذال کے درمیان فرق برقرار رکھا گیا ہے یعنی دال کو بغیر نقطے کے اور ذال کو نقطے کے ساتھ

(۱) اس قسم کے اشارے جہاں پر ہیں سمجھنا چاہیے کہ اصل کتاب میں مٹ گئے ہیں۔

لکھا گیا ہے۔

(ب) کہ اور چہ موصولہ کو ہر جگہ کہ اور چہ لکھا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی ہائے غیر ملفوظ کسی لفظ کے ساتھ استعمال ہوئی ہے وہ اس طرح لکھی گئی ہے جیسے "بلکہ" کو "بلک" "ایں کہ" کو "اینک" اور "آنچہ" کو "آنچ" اور "ہر چہ" کو "ہرچ" وغیرہ لکھا گیا۔ اس مطبوعہ نسخے کا بھی یہی انداز تحریر ہے۔

(ج) پ (تین نقطے والی) جس کو یائے فارسی کہتے ہیں، اور ب (ایک نقطے والی) جس کو بائے عربی کہتے ہیں، دونوں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، دونوں ایک ہی نقطے کے ساتھ لکھی گئی ہیں،

(د) اسی طرح "ج" اور "چ" میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، ایک ہی نقطہ دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح کاف اور گاف کو بھی یکساں لکھا گیا ہے۔

(ہ) بعض مقامات پر "د" کی جگہ "ت" بھی استعمال کی گئی ہے جیسے "دیدید" کو "دیدیت" اور "نومیدید" کو نومیدیت" لکھا گیا ہے۔

(و) "بینایی اور" دانایی" جیسے کلمات کو "بیناى" اور "داناى" لکھا گیا ہے یعنی جہاں دو "ی" ہونی چاہئیں وہاں ایک ہی "ی" کافی سمجھی گئی البتہ "ی" کے نیچے دو نقطے لگا دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری جگہوں پر "ی" کو نقطے کے بغیر ہی لکھا گیا ہے۔

(ز) فارسی زبان میں "می" جو استمرار و تسلسل کے اظہار کیلئے آتا ہے وہ بیشتر لفظ سے ملائے بغیر لکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ملا کر لکھتے ہیں۔

موجودہ طباعت میں "ب" - "ھ" اور "ن" کا انداز تحریر تو جاری ہے لیکن "الف" اور "جیم" اور "دال" اور "واؤ" کے تحت جو باتیں بیان ہوئی ہیں ان کی رعایت نہیں کی گئی ہے بلکہ معمول کے مطابق فارسی

املا پر کتابت ہوئی ہے۔

(۲) فاتح استنبول کے کتب خانے کا وہ نسخہ جو وہاں ۵۴۰۸ پر محفوظ ہے اور جس کی فوٹو کاپی میرے سامنے ہے اس کا سائز ۶/۱۴×۲۱ ہے۔ یہ خط نسخ میں ہے اس کی تحریر روشن اور بہت بہتر ہے۔ پچاسی اوراق پر مشتمل ہے یعنی ۱۷۰ صفحات اس کے ہیں اور ہر صفحے پر ۲۳ سطریں ہیں۔ اس نسخے کی تاریخ کتابت "روز جمعہ چہارم رمضان ۷۵۱ھ" ہے یعنی یہ نسخہ حضرت مولانا کی وفات کے اناسی سال تین ماہ بعد کا ہے۔ کتابت کرنے والے نے کتاب کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے:۔

"اتفق الفراغ من تحریر هذہ الاسرار الجلالیه فی التربة المقدسة یوم الجمعه رابع شهر رمضان المبارک عام احدی وخمسین وسبعمائة، وانا الفقیر الی الله الغنی بهاء الدین المولوی العادل السرای احسن الله عواقبه۔ آمین یارب العالمین"

(یعنی اس کتاب اسرار جلالیہ کی کتابت سے فراغت مقبرۂ مقدسہ میں جمعہ کے دن ماہ مبارک رمضان کی چوتھی تاریخ کو ۷۵۱ھ میں حاصل ہوئی۔ میں ہوں اللہ بے نیاز کا فقیر و محتاج بندہ بہاء الدین مولوی (ساکن) عادل سرائے، اللہ تعالیٰ اس کا انجام بخیر فرمائے۔ آمین یارب العالمین)

اور اصل کتاب دوسرے صفحے سے شروع ہو کر ورق ۸۲ پر تمام ہوئی ہے باقی اوراق پر حضرت مولانا کی بعض غزلیں ہیں اور بعض متفرق فوائد ہیں جو عربی زبان میں ہیں۔ ان اوراق کے حواشی پر اصل خط میں حضرت مولانا کی رباعیات بھی "الف" کی ردیف سے لے کر "ہ" کی ردیف تک مرقوم ہیں۔ ہر ورق پر آٹھ رباعیاں ہیں اور اس طرح رباعیوں کی تعداد ۶۴۸ ہوتی ہے۔ اس نسخے کو جو قدامت حاصل ہے۔ اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے

کہ حضرت مولانا کی رباعیات کی تصحیح و اشاعت میں جو دوسروں کی رباعیات کے ساتھ خلط ملط ہیں اور استنبول اور ایران میں طبع بھی ہوئی ہیں، یہی نسخہ ماخذ بنا ہے اور اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس نسخے کے پہلے صفحے کی پشت پر یہ عبارت درج ہے:۔

''وقف مرحوم چلپی زادہ مولانا درویش محمد۔ کتاب مجموع یتعلق
نبصائح و مواعظِ و امورِ مختلفۃ فی فنونِ مختلفۃ بالفارسی''
(یعنی یہ کتاب ایک مجموعہ ہے۔ اس کا تعلق نصیحتوں سے اور
مواعظ سے ہے اور مختلف فنون کے مختلف امور سے ہے
فارسی زبان میں)۔

اوپر جو ابجد ہوز کی ترتیب سے کچھ باتیں درج کی گئی ہیں، ان میں سے ''ہ'' کو چھوڑ کر باقی تمام باتیں اس نسخے میں، اصل نسخے کے رسم الخط اور خصوصیات املا کے مطابق ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنے زمانے میں رونما ہونے والے جن حوادث کا ذکر کیا ہے یا اپنی مجلس میں پیش آنے والے واقعات کی نسبت اشارے کئے ہیں، ان کے احوال کا اور جن اشخاص کا تذکرہ ضمناً یا صراحتہً متن میں کیا ہے ان کے ناموں کا تعین بھی کاتب کی توضیحات سے ہوتا ہے کیونکہ کاتب نے اپنے نسخے کی نقل اس نسخے سے کی ہے جس کی کتابت حضرت مولانا کے عہد میں ہوئی تھی۔ کتاب کے آخری حصے میں کاتب نے یہ لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کی نقل تربتِ مقدسہ یعنی حضرت مولانا کی قبر مبارک کے قریب بیٹھ کر اختتام کو پہنچائی ہے، اس عبارت سے یہ دلیل بھی قائم کی جا سکتی ہے کہ یہ نسخہ اس نسخے کی نقل ہے جو حضرت مولانا کے مزار پر بطور تبرک رکھا گیا تھا۔

یہ نسخہ کامل اور صحیح ہونے کے لحاظ سے نہایت معتبر ہے اور فیہ ما فیہ کی تصحیح کے سلسلے میں اصلی نسخے کے ساتھ ملا کر رکھا جائے تو استفادے کے لائق ہے اسی بناء پر اس کو ''نسخہ ح'' سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا یہ ماسٹر کاپی (MASTER COPY) ہے

(۳) استنبول کے کتب خانہ سلیم آغا میں ایک خطی (قلمی) نسخہ اور محفوظ ہے جس کا سائز ۱۲×۸ ہے، یہ نسخہ خطِ نسخ میں ہے اور اس کی تحریر بہت عمدہ اور واضح ہے۔ کُل اکانوے اوراق یعنی ایک سو بیاسی صفحات مشتمل ہے، اور ہر صفحے میں اکیس سطریں ہیں اس کی فوٹو کاپی بھی میرے سامنے ہے۔ اس نسخے میں کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے۔

لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقل آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کے بعد کی نہیں ہے۔ اس نسخے میں ورقِ اوّل کے بعد کا ورق غائب ہے اس کے علاوہ اور کوئی خامی اس میں نہیں ہے۔ اس کے آخر میں "نسخہ ح" سے فاضل دو فصلیں اور درج ہیں جن کو میں نے ملحقات میں رکھا ہے پھر بھی یہ نقل صحت و اعتماد کے لحاظ سے اصل نسخے اور نسخہ ح" کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔ رسم الخط کی خصوصیات میں یہ نقل بھی مذکورہ نسخوں کی مماثل ہے بجز اس کے اس نقل کی کتابت میں دال اور ذال کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا البتہ بائے فارسی کو ہر جگہ تین نقطوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

میں نے عربی فصلوں کی تصحیح میں اور دوسرے اختلافات کی اصلاح میں اسی نسخے سے مدد لی ہے اور کتاب کے اور دوسرے مقامات کی تائید میں بھی اسی کی حمایت حاصل کی ہے۔

(۴) وزارت فرہنگ کے اداروں میں سے ایک کتابخانۂ ملّی ہے وہاں بھی ایک خطّی (قلمی) نسخہ محفوظ ہے۔۱۳×½ ۱۷ اس کا سائز ہے اور چار سو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس کے ہر صفحے پر پندرہ سطریں ہیں تحریر درمیانہ خط نسخ میں ہے مگر یہ درج نہیں ہے کہ یہ نسخہ تحریر میں کب آیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کتابت نویں صدی ہجری کے وسط میں کسی وقت ہوئی ہے اس کے بعض صفحات کے کنارے پر "بلغ" کا لفظ لکھا ہوا ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قدیم نسخے سے اس کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس کے

ورقِ اوّل کی پشت پر یہ عبارت مرقوم ہے "من کتب الفقیر الی عفو اللہ الصمد پیر، محمد بن شیخ شمس الدین محمد الانسی عفا اللہ عنہم بالنبی و آلہ"
(یعنی اللہ صمد و بے نیاز کی بخشش کے محتاج و فقیر، پیر محمد بن شیخ شمس الدین محمد الانسی کی کتابوں میں سے یہ کتاب ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل کے طفیل اپنی بخشش سے نوازے اور درگزر فرمائے) اور صفحۂ اوّل و دوم کے حاشیے پر یہ اشعار بھی لکھے ہوئے ہیں:-

(۱) گر تو خواہی حل مشکل اے پسر — در کتاب فیہ مافیہ[1] درنگر
(اے بیٹے! اگر تو اپنی مشکلات کا حل معلوم کرنا چاہتا ہے تو کتاب فیہ مافیہ کا مطالعہ کر)

(۲) در طریق اولیائے نیک ذات — فیہ مافیہ است حل مشکلات
(ستودہ صفات اولیاء کے "طریقے" میں حلِ مشکلات کا اصل نسخہ فیہ مافیہ ہے)

(۳) کتاب فیہ ما فیہ — لطیف فی معانیہ
(یہ ایک کتاب ہے جس کے اندر وہ کچھ ہے جو اس میں ہے، یہ (کتاب) اپنے مفہوم و معنے کے اعتبار سے لطافت کی حامل ہے)

تطیب نفس قاریہ — ویا بشری[1] معانیہ
(یہ اپنے قاری کے دل کو مسرور کرتی ہے؛ مبارک ہو، اس کے مطالب کا کیا کہنا)

(۴) این کتاب لطیف خوب ادا — فیہ مافیہ حضرت منلا[2]
(حضرت ملا (یعنی مولوی معنویؒ رومی) کی یہ کتاب فیہ مافیہ لطافت کی حامل اور اپنی طرز ادا میں منفرد ہے

کردہ تحقیق شاہراہ ھدیٰ — قدس اللہ سرہ ابداً
(حضرت مولانا نے شاہراہ ہدایت کی نشاندہی فرمائی ہے اللہ تعالیٰ ان کی

---

(۱) اس مصرع میں ایک حرف گر رہا ہے
(۲) ملا اور منلا - اصل اس کی مولیٰ ہے ترکوں نے اسی کو ملا کر دیا ہے، وہ کہتے ہیں قاضی ملا یعنی قاضی مولا اور گفتگو کے وقت مولانا کا لقب دیتے ہیں بحوالہ (الاقرب) المغید جزء اول استاد عبدالرحمٰن کاشغری ندوی

روح کو ہمیشہ پاک صاف اور مقدس رکھے۔)

۵ کتاب فیہ مافیہ لطیف فی معانیہ

(کتاب فیہ مافیہ معانی و مطالب کے اعتبار سے لطافت انگیز ہے)

فمن لم یرض مافیہ فبول الکلب فی فیہ

(اگر کوئی شخص اس کے مندرجات سے خوش نہ ہو تو اس کے منہ میں کتّے کا پیشاب۔

(۶) کتاب فیہ آیات علی الحق ودلالات

(اس کتاب کے اندر حق تعالیٰ کی جانب رہنمائی کرنے والی آیات اور نشانیاں ہیں)

فمن یعمل بما فیہ یلاقیہ سعادات[1]

(جو شخص اس کے مندرجات پر عمل کرے گا۔ اس کو سعادتیں اور خوش بختیاں حاصل ہوں گی۔)

(۷) کتاب فیہ مافیہ لطیف فی معانیہ

(یہ کتاب فیہ مافیہ، اپنے معانی و مطالب کے اعتبار سے لطافت کی حامل ہے)۔

فمن یعمل بما فیہ فشہد الغیب فی فیہ[2]

(کوئی شخص اگر اس کے مندرجات پر عمل پیرا ہو جائے تو غیبی حلاوتیں اس کے منہ میں ہوں گی۔)

یہ نسخہ جدید دور کا نقل کردہ ہے لہٰذا اس میں اِملا (اور انداز تحریر) کی کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ کہ راقم الحروف نے آغاز کار میں طہرانی مطبوعہ نسخے کا مقابلہ اس نسخے سے کیا

---

[1] یلاقیہ سعادات: لفظ سعادات جمع ہے سعادۃ کی اور یہ لفظ مونث ہے اس بنا پر یلاقیہ مذکر کا صیغہ نہیں آنا چاہیے تھا۔

[2] الشہد، عسل النحل: عربی میں شہد کو عسل کہتے ہیں اور ہم لوگ شہد کہتے ہیں، البتہ عربی میں اس شہد کو کہتے ہیں جس کو موم سے ابھی نچوڑا نہ گیا ہو، اس کی جمع شہاد ہے۔

تھا، موجودہ متن کی تصحیح میں بھی متعدد مقامات پر اس نسخے سے استفادہ کیا ہے۔

(۵) ایک خطّی نسخہ اور بھی ہے جو راقم الحروف کا مملوکہ ہے اس کا سائز ۱۸×۲۵ ہے، اوراق دو سو ترانوے (۲۹۳) ہیں اور صفحات پانچ سو چھیاسی (۵۸۶) ہر صفحے پر تیئیس (۲۳) سطریں درمیانہ خط نسخ میں ہیں، تحریر صاف اور روشن ہے آسانی سے پڑھی جاتی ہے، یہ نسخہ ۸۸۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس کے پہلے ورق سے دو سو اکیس (۲۲۱) تک حضرت مولانا کے مناقب شمس الدین افلاکی کے مرتب کردہ ہیں۔ پھر اصل کتاب ورق ۲۲۲ سے شروع ہو کر ۲۹۳ پر تمام ہوتی ہے اور یہی کتاب فیہ مافیہ ہے۔ کاتب نے دو مقامات پر اپنا نام لکھا ہے اور کتابت کی تاریخ بھی درج کی ہے، ایک تو ورق ۲۲۱ پر جہاں کتاب مناقب ختم ہوتی ہے، یہ عبارت مرقوم ہے کہ:-

"تمام شد کتاب مناقب العارفین علی ید العبد الضعیف النحیف المحتاج الی رحمۃ اللہ الغنی محمود بن محمد الصوفی المرغانی روز شنبہ بیست و پنجم ماہ شوال ۸۸۶ سنہ سبع و ثمانین"

(یعنی کتاب مناقب العارفین بندۂ ضعیف و نحیف اپنے خدائے بے نیاز کی رحمت کے محتاج، محمود بن محمد الصوفی المرغانی کے ہاتھوں اتمام کو پہنچی۔ روز شنبہ بتاریخ ۲۵ ماہ شوال ۸۸۷ھ

اس عبارت کے نیچے ایک مہر بھی لگی ہوئی ہے مگر وہ مہر اتنی خراب ہو چکی ہے کہ اس کی عبارت پڑھنے میں نہیں آتی۔ اس کے بعد ہی ہندسے کی صورت میں (۸۸۷) بھی لکھا ہوا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کاتب کی تحریر میں نہیں ہے۔

دوسرے ورق ۲۹۳ پر کتاب فیہ مافیہ کے آخر میں اس طرح لکھا ہے:-

"تمّت (کذا)[1] الکتاب بعون الملک الوہاب علی ید العبد

[1] لفظ تمّت پر "کذا" لکھ کر مقدمہ نگار نے اشارہ کر دیا ہے کہ لفظ کا استعمال غلط ہو گیا ہے۔ عربی میں کتاب مونث نہیں ہے۔ اس لئے تمّت کی جگہ "تمّ" ہونا چاہئے۔

الضعيف النحيف المحتاج الى رحمت (كذا) الله الملك
اللطيف محمود بن محمد الصوفی المرغالی فی التاریخ روز
دوشنبہ دوم ماہ محرم سنتہ ثمان وثمانین وثمانمایہ"

اس سے معلوم ہوا کہ حصہ اوّل یعنی مناقب کی کتابت کے دو ماہ سات روز بعد حصہ دوم یعنی اصل کتاب فیہ ما فیہ اختتام پذیر ہوئی تھی۔

اور ورق اوّل کی پشت پر حضرت مولانا کے والد ماجد کی اور ان کے عزیز دوستوں کی ولادت و وفات کی تاریخیں بھی درج ہیں، نیز کچھ متفرق اشعار بھی لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ صحت کے لحاظ سے چنداں قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے یا جس نسخے سے اس کو نقل کیا گیا تھا اُس کے کاتب نے، مشکل مقامات پر بیجا تصرفات کئے ہیں اور بعض مواقع پر تو مثنوی وغزلیات کے اشعار تک اصل متن میں شامل کر دیئے ہیں اور ستم یہ ہے کہ) ایک پوری فصل بھی جو انا فتحنا کی تفسیر پر مشتمل ہے کتاب میں داخل کر دی ہے حالانکہ یہ کسی قلمی نسخے میں نہیں ہے، میں نے اس فصل کو ملحقات میں درج کیا ہے۔

(۹) ایک اور قلمی نسخہ فاضل دوست آقائے ڈکتور مہدی بیانی کا ہے اور جدید تر زمانے کا ہے اس کی تاریخ کتابت ۱۳۰۸ھ قمری ہجری میں ہوئی ہے مگر یہ نسخہ اغلاط سے پُر ہے۔ اس کے کاتب نے آخر میں یہ عبارت لکھی ہے:-

تم الکتاب بعون الملك الوهاب علی ید العبد الذلیل ابراهیم
بن حاجی میرزا عبد الباقی اعتضاد الاطباء الطهرانی۔ نقله
عن خط محمد حسین تفرشی بن محمد رضی، نقله عن خط محمود
بن محمد الصوفی المرغالی، و نقله عن خط الشیخ الکامل شیخ
علاء الدوله بن یونس بن الطاهر بن محمود بن احمد السمنانی
السندی، و تاریخه سنته سبع و سبعین و ثمانمایه، فی لیل
رمضان سنته ۱۳۰۸ در دار الخلافه طهران "

(یعنی یہ کتاب رب العالمین مالک یوم الدین کی امداد و اعانت سے بندۂ عاجز ابراہیم بن حاجی میرزا عبدالباقی، اعتضاد الاطباء طہرانی کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کتاب کا یہ نسخہ محمد حسین تفرشی بن محمد رضی کی تحریر سے نقل کیا گیا ہے انھوں نے محمود بن محمد الصوفی المرغابی کی تحریر سے نقل کیا تھا اور انھوں نے شیخ کامل شیخ علاء الدولہ بن یونس بن الطاہر بن محمود بن احمد سمنانی سندی کی تحریر سے نقل کیا تھا۔ جس کی تاریخ کتابت ۸۷۷ھ تھی۔ اس کی آخری نقل شب ماہ رمضان ۱۳۰۸ھ کو دار الخلافہ طہران میں مکمل ہوئی۔)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نسخہ جس کی کتابت ۸۸۶ھ میں بتائی گئی ہے وہ بھی اسی کاتب کی تحریر میں ہے جو راقم الحروف کے نسخے کا ناقل تھا، یہ بات اس کے نام و نسبت اور تاریخ سے روشن ہے، اس کتاب کے آخر میں ایک مختصر فصل مقالات شمس الدین تبریزی سے نقل کی گئی ہے۔

(۷) ایک نسخہ ہندوستان کا مطبوعہ بھی ہے جو ۱۹۲۸ء میلادی میں اعظم گڑھ میں چھپا تھا جس کی سند اُن سات قلمی نسخوں تک پہنچائی گئی ہے جو استنبول اور ہندوستان کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور جن میں سب سے قدیم وہ نسخہ ہے جو ۱۱۰۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہندوستان کا یہ نسخہ جو ۱۹۲۸ء میں طبع ہوا ہے۔ طہران کے مطبوعہ نسخے پر ترجیح رکھتا تو ہے مگر قابل اعتماد نہیں کیونکہ اس کی بنیاد قدیم تر نسخوں پر نہیں ہے۔ نقل کنندہ کے تصرفات اس میں بھی موجود ہیں اور ایسے اضافے بھی نظر آتے ہیں جو قطعاً و یقیناً حضرت مولانا کے بیان کردہ نہیں ہیں نہ ان کے انداز و طرز نگارش سے کوئی مطابقت رکھتے ہیں۔

(۸) ایک نسخہ طہران کا چھپا ہوا بھی ہے جو ۱۳۳۳ھ میں طبع ہوا تھا اور جس پر نہایت ہی عالمانہ مقدمہ مرحوم حاجی شیخ عبداللہ حائری کا لکھا ہوا ہے علامہ حائری کا تعلق سلسلہ نعمۃ اللّٰہی (علاقہ گناباد) سے تھا۔ اس کے علاوہ فیہ مافیہ کے نسخے میں سلطان ولد کی کتاب معارف بھی شامل ہے۔

کتاب فیہ ما فیہ کے یہ تمام نسخے جن کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے ان کو دیکھئے تو ان میں سے ایک نسخہ بھی صحت و قدامت کے لحاظ سے اصل نسخے اور نسخۂ ح کے پائے کو نہیں پہنچتا۔ بہت سے مقامات پر ان میں جو اختلافات ملتے ہیں ان میں بعض کلمات کا فرق پایا جاتا ہے اور اشعار کے بھی اضافے ہیں، ان کے بارے میں قوی ترگمان یہی ہے کہ کاتبوں نے تصرف کیا ہے اور ناقلوں نے اپنی "سلیقہ مندی" دکھائی ہے۔ اسی بنا پر راقم الحروف نے تصحیح کتاب کیلئے دو بنیادیں قرار دی ہیں، ایک تو یہ کہ اصل نسخے کو ابتدا سے اُس مقام تک جہاں جاکر یہ ختم ہوا ہے (یعنی اسی طبع کے ص۱۷۳ تک) اس کو متن میں رکھا جائے اور نسخۂ ح کے اختلاف کو حاشیے میں جگہ دی جائے۔ البتہ جہاں جہاں اصل نسخے پر ترجیح کی صورت نظر آئی یا مفہوم کی تکمیل کا تقاضا ہوا۔ نیز وہ عربی فصلیں جو اصل نسخے میں تو نہیں ہیں مگر تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں موجود نظر آتی ہیں اور قرائن بھی قوی ہیں کہ ان کا انتساب حضرت مولانا کی جانب درست ہے تو ان کو نسخۂ ح سے لے کر شامل کتاب کر لیا ہے، اور کتابخانۂ ملی و کتابخانۂ سلیم آغا کے نسخوں سے ان کا مقابلہ بھی کر لیا ہے، ص۱۷۳ سے جہاں اصل نسخہ ختم ہوتا ہے کتاب کے تمام مطالب بے کم و کاست نسخۂ ح سے نقل کر لئے ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی بعض اختلافات کو نسخۂ سلیم آغا اور نسخۂ ملی سے لے کر حاشیہ کی صورت میں درج کر دیا ہے۔ پھر اس کے اولین مقابلے میں گرامی مرتبت دوست، فاضل دانشمند، آقائے محمد تقی مدرس رضوی پروفیسر طہران یونیورسٹی (کثّر اللہ امثالہ) کی اعانت و امداد سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور ۱۳۲۶ھ میں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مقابلے کی مہم سر ہوگئی تو بعض لغات کی شرحیں اور تعبیریں، حدیث نبوی کے اشارے اور لوازم، بزرگوں کے اقوال و امثال اور عربی و فارسی اشعار کی وضاحتیں، نیز کچھ دوسرے فوائد کا اظہار، بالخصوص جن کا تعلق مطالب متن سے ہے اور

جو مثنوی معنوی سے مطابقت بھی رکھتے ہیں، اپنے فہم قاصر اور تلاش ناقص کے مطابق ان سب کو مرتب کر کے بطور تعلیق (یعنی تشریح و توضیح کی صورت میں) کتاب کے ساتھ منسلک کر دیا تاکہ مطالعہ کرنے والے بہت سے اور مختلف مدارک ماخذ کے کھنگالنے سے بے نیاز ہو جائیں اور تحقیق و تدقیق کی راہ میں دور و دراز کی مشقت اٹھانے سے عمر عزیز کے قیمتی لمحات محفوظ ہو جائیں میں نے مزید سہولت کے لئے فہرست احادیث نبوی کی کلمات مشائخ کی، امثال کی، عربی و فارسی اشعار کی اور نوادر لغات و تعبیر کی الگ الگ تیار کر دی ہے، بلکہ جن عورتوں اور مردوں کے نام آئے ہیں اور منازل و مقامات اور قبائل کے تذکرے ہوئے ہیں ان سب کو حوالوں کے ساتھ مرتب کر دیا ہے اور کتابوں کی تفصیل بھی دے دی ہے۔ یہ تمام چیزیں فاضل دوست آقائے دکتور ذبیح اللہ صفا (ایدہ اللہ) جیسے لائق قابل اور پاکیزہ قلب جو ان نے فراہم کیں اور جزو کتاب بنیں تب کہیں یہ کتاب اشاعت پذیر ہونے کی منزل پر پہنچی۔

میں اس موقع پر اس کتاب کا مطالعہ کرنے والوں سے عرض پرداز ہوں کہ یہ ایک خوان غیبی ہے اور اس کو ایک ایسے بزرگ نے اپنے ہاتھوں سے چنا ہے جو مردان حق اور اولیائے الٰہی میں شمار ہوتا تھا۔ جب آپ اس خوان علمی سے فوائد معنوی کا ایک لقمہ بھی اٹھائیں اور جام فرحت و سرور سے آسودہ خاطر ہوں تو اس خوان نعمت کا ایک ریزہ اور اس جام (جہاں نما) کا ایک جرعہ مجھ جیسے محروم و بے نصیب و فتادۂ خاک کی روح تشنہ کام کے نام پر بھی چھلکا دیں اور دعائے خیر سے یاد فرمالیں۔

مقدمہ کے اختتام پر اگر میں یہ بھی عرض کر دوں تو بے محل نہ ہوگا کہ اصل نسخے کی پشت پر تو اس کتاب کا نام "فیہ ما فیہ" لکھا ہے اور نسخۂ ح کے خاتمے پر اس کا نام "الاسرار الجلالیہ" لکھا ہے، ظاہر ہے کہ یہ کتاب حضرت مولانا کی وفات

کے بعد مرتب ہوئی ہوگی، خود مولانا کے زمانہ حیات میں، ان کی جو مجلسیں منعقد ہوتی ہونگی اور محاضرات و مذاکرات ہوتے ہوں گے اور جو فصلیں تحریر میں آتی ہونگی ان کا اضافہ پچھلی فصلوں پر ہوتا جاتا ہوگا، کتاب کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی ہوگی لہذا یہ تصور کرنا کہ اس کا نام فیہ ما فیہ خود حضرت مولانا نے رکھا ہوگا قابل قبول نہیں ہوسکتا، گمان یہی ہوگا کہ یہ نام اس قطعے سے اخذ کیا گیا ہے جو (شیخ اکبر) محی الدین ابن عربی کی کتاب فتوحات مکیہ میں درج ہے وہ قطعہ دیکھئے یہ ہے:۔

كتاب فيه ما فيه　　　بديع في معانيه

(یہ کتاب وہ ہے جس میں وہ کچھ ہے جو اس میں ہے (یہ کتاب) اپنے معانی و مطالب میں ندرت کی حامل ہے۔)

اذا عاينت ما فيه　　　رأيت الدر يحويه

(اگر اس کے مندرجات کا معاینہ کروگے تو دیکھوگے کہ موتی ہی موتی بکھرے ہوئے ہیں (ہر طرف)

یہ قطعہ فتوحات مکیہ مطبوعہ بولاق کی دوسری جلد میں ص۷۷ پر مرقوم ہے، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کا نام (صرف فیہ ما فیہ نہیں ہے بلکہ) مذکورہ بالا قطعے کا پورا مصرعہ اس کا نام ہے۔ (یعنی کتابٌ فیہ ما فیہ)

اس قطعے کے مشابہ اور بھی چند قطعات ہیں جن کو کتابخانۂ ملّی کے نسخے سے میں نے اس مقدمہ میں نقل کرلیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "کتاب فیہ ما فیہ، کا مصرعہ تدریجاً صرف "فیہ ما فیہ" ہوکر رہ گیا۔

ابن عربی کے اشعار میں "فیہ ما فیہ" کی تعبیر بار بار استعمال ہوئی ہے، مثلاً ذیل کے ابیات میں دیکھئے:۔

الذات تشهد في المجلى وليس لنا　　　حكم عليها بنعت لم يزل فيه

(ذات باری تعالیٰ کے جلوے ہر جگہ نظر آتے ہیں لیکن ہم ان تجلیوں کا وصف

بیان کرنے کے مجاز نہیں ہیں، وہ جہاں بھی ہوں :۔

الاتحولها ، الاتبدّ لها　　موکل مجلی وهذا فیه مافیه

البتہ ان تجلّیوں کا تغیّر اور تبدّل جو ہر جگہ جاری و ساری ہے بس انھیں کا تذکرہ کر سکتے ہیں اور اس میں وہی کچھ ہے جو اس کے اندر ہے۔

(یہ اشعار دیوان محی الدین مطبوعہ ہندوستان کے صـ۱۲۶ پر موجود ہیں)

فان انت لخونا عین تجاولنا　　فالحشر یجمعنا وفیه مافیه

(اگر کسی جاسوس نے آکر ہمارے درمیان تفرقہ ڈال دیا ہے تو ڈال دے یوم حشر بہر حال ہمیں یکجا کر دے گا اور اُس دن ہوگا جو اس میں ہوگا - دیوان صـ۱۶۴)

الله یشفی فؤادی اذ رأی جسدی　　عین الصدی وهو یبکی فی تشفیه

(اللہ تعالی میرے بدن کو پیاس کی شدت میں مبتلا دیکھ کر میرے قلب بریاں کو شفا بخشے تو سہی لیکن قلب بریاں کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی شفا پا بی پر اور بھی روتا تڑپتا ہے۔)

لصحبة سلفت مابین قالبه　　وبینه وهو امرٌ فیه مافیه

یقیناً وہ (عجیب) صحبت تھی جو ماضی میں، قالب و روح کے درمیاں رہ چکی ہے مگر یہ ایسا معاملہ ہے جس میں وہی کچھ ہے جو اس کے اندر ہے (کیا کہنے اس کیفیت کے) (دیوان صـ۲۲۹)

اگر اس کتاب نے حضرت مولانا کے زمانہ ہی میں اس نام سے شہرت پائی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت مولانا کے قریبی دور کے ان دو نسخوں میں جو ظاہر ہے کہ قونیہ ہی میں لکھے گئے اور خود مولف کے زمانے کے لکھے ہوئے نسخوں سے نقل کئے گئے ہیں اس کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا۔

مقدمے کے اختتام پر ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے گرامی قدر دوست آقائے مہدی الکیا تانی کا خاص طور پر شکریہ ادا کروں۔ موصوف مجلس شورائے ملّی کے ادارۂ بازرسی کے صدر ہیں اور ان کے مشاغل اس قدر زیادہ ہیں

کہ ان کو مشکل ہی سے فرصت مل سکتی تھی مگر اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب کی تصحیح اور طباعت کی نگرانی کے سلسلے میں بے اندازہ زحمتیں گوارا کیں۔ اس کا بڑا سبب خدمتِ زبان کا جذبہ نیز حضرت مولانا کی روح پاک سے ان کی عقیدت و ارادت ہے۔ دعا ہے کہ علوم و معارف کے فروغ اور کتابوں کی اشاعت کی مہم میں اللہ تعالیٰ اپنی گوناگوں توفیق ان کے شامل حال رکھے اور ان کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے۔

کتاب فیہ ما فیہ کا یہ مقدمہ پنج شنبہ کی صبح دوسری ماہ خرداد ۱۳۳۰ شمسی مطابق ۱۷ شعبان ۱۳۰۷ قمری کو بندۂ ناچیز بدیع الزماں فروزانفر کے ہاتھوں اختتام کو پہنچا۔ (اللہ تعالیٰ اسے راستی و درستی کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیشہ صحیح راستے پر رکھے۔)

(جدید ایرانی نسخے کا مقدمہ)

از:- قلم آقائے فروزانفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علےٰ رسولہ الکریم

علماء اور امراء کی صحبت

حدیث: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم شر العلماء من زار الامراء و خیر الامراء من زار العلماء نعم الامیر علےٰ باب الفقیر و بئس الفقیر علےٰ باب الامیر
(صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برا عالم وہ ہے جو امراء کی صحبت اختیار کرے اور بہتر امیر وہ ہے جو علماء کی خدمت میں حاضری دے، یعنی اچھا امیر وہ ہے جو فقیر کے آستانہ پر حاضر ہو اور برا فقیر وہ ہے جو امیر کے دروازہ پر جائے، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر درست فرمایا ہے

عوام اس حدیث کے معنی غلط سمجھتے ہیں

عوام نے اس حدیث کے معنی یہ مراد لئے ہیں کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ عالم کسی امیر کی خدمت میں حاضری دے اگر وہ ایسا کریگا تو اس کا شمار برے عالموں میں ہوگا۔ اس کے معنی فی الحقیقت وہ نہیں ہیں جو لوگوں نے سمجھے ہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عالموں میں برا شخص وہ ہے جو امراء کی مدد حاصل کرے اور اس کا استحکام مرتبت اور برتری امراء کا مرہون منت ہو، یا امراء کی وجہ سے اس کی صلاح و فلاح ہو اور ان کے خوف سے نیک کام کرے یا اس کی نیت یہ ہو کہ امراء مجھے ان کاموں کا صلہ دیں گے یا احترام کریں گے اور وہ دوسروں سے کرائیں گے، یا جاہ و منصب سے مجھے نوازیں گے، پس ایسے عالم نے محض امراء ہی کی وجہ سے خود کو سنوارا اور جہالت ترک کر کے عالم بنا اور اس نے جہل سے علم کی منزل میں انہیں کی وجہ سے قدم رکھا ہے اور عالم ہو کر ان کے خوف یا ریاست کی وجہ سے امراء کا ادب کرنے پر مجبور ہوا ہے اور اگر ایسے طریقہ پر چلتا ہے کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو یا ناکام اس کو امراء کی صحبت سے احتراز ممکن نہیں ہوتا پس کوئی عالم ان خصوصیات کا حامل ہوگا اگر امیر اس کے پاس آئے یا وہ امیر کے پاس جائے اس حالت میں وہ زائر (زیارت کرنے والا) ہوگا اور امراء کی حیثیت مزور کی ہوگی اس کے برعکس وہ عالم ہے جو امراء کے سہارے ان کے لئے مسند علم پر متمکن نہیں ہوا ہے بلکہ اولاً و آخراً اس نے حصول علم اللہ رب العلمین کی

خوشنودی کی خاطر کیا ہے اور اس کی جدوجہد ثواب اور اجر کی نیت سے ہے (کیونکہ یہ عین فطرت اور سرشت کے مطابق ہے) اور اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو جیسا کہ مچھلی کی مثال ہے کہ وہ بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اور اس کے علاوہ اس کی زندگی کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یہی کیفیت اس عالم کی ہونی چاہیئے کہ اس کے پاس سیاسی بصیرت ہو اس کا مبرانہ انداز ہو، امراء اور رؤسا کا رعب اس پر طاری نہ ہونا چاہیئے بلکہ امراء اور رؤسا اس کے رعب علم سے خود مرعوب ہوں۔ نہ صرف امراء بلکہ عوام میں بھی اس کا بھرم اور وقار ہو اور وہ اپنے علمی فیوض سے دوسروں کی امداد و اعانت کرے اور دوسرے لوگ ایسے کاموں میں اس کی تقلید کریں۔ اگر یہ وہ عالم اپنے منصب و مقام سے آگاہ ہو یا نہ ہو۔

اگر ایسا (با صلاحیت) عالم امیر و رئیس کے پاس جائے بھی تو اس کی حیثیت زائر کی نہ ہوگی۔ بلکہ امیر کی حیثیت زائر کی ہوگی۔ اور عالم مزور ہوگا۔ کیونکہ ہر حالت میں امیر اس سے کسب فیض کریگا اور اس کی امداد و اعانت کا طالب ہوگا اور خود وہ عالم اس امیر و رئیس سے مستغنی ہوگا جیسا کہ آفتاب دنیا کو روشنی پہونچاتا ہے اور عمومی طور پر اس کا کام بخشش ہے وہ پتھروں کو لعل و یاقوت کی شکل میں بدلتا ہے۔ پہاڑوں میں چاندی سونا، تانبا اور لوہا پیدا ہونے کا سبب بنتا ہے، زمین سے سبزہ اگاتا ہے درختوں کو قسم قسم کے میوے عطا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا کام عطا ہے، دیتا ہے اور دیتا رہتا ہے اور بکھیرتا رہتا ہے خود کچھ نہیں لیتا۔ اس کی داد و دہش پر عرب کی یہ مثال صادق آتی ہے۔ نحن تعلمنا ان نُعطی وما تعلمنا ان ناخذ ہم نے عطا کا سبق پڑھا ہے طلب کا درس نہیں پڑھا ہے اس کو مثال سے سمجھیں کہ اگر عالم اس صفت کا حامل ہوگا تو اس کی حیثیت مزور کی ہوگی زائر کی نہیں۔ خالق کائنات نے فرمایا ہے، اپنے علم قوت و قدرت پر بھروسہ نہ کرو اور میری ذات کو عالم، قوی و قادر جانو۔ تاکہ تمہیں غیر (اللہ) کی مدد اور امراء و سلاطین کے سامنے التجا کرنے سے محفوظ فرمادوں پس تم کہو ایاك نعبد وایاك نستعین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)۔

ایک دلنشین نکتہ | یہاں میرا دل چاہتا ہے کہ میں ایک آیت کی تفسیر

اور تشریح کروں اگرچہ یہ اس گفتگو سے متعلق نہیں ہے (بلکہ جملۂ معترضہ کے طور پر بیان کرتا ہوں)۔ اللہ رب العلمین نے کتاب مجید میں فرمایا ہے یاایہا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسریٰ (اے نبی علیہ السلام) آپ ان قیدیوں کو بتادیں جو آپ کے قبضہ میں ہیں۔ ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یوتکم خیرا مما اخذ منکم ویغفر لکم واللہ غفور رحیم کہ اگر اللہ رب العلمین تمہارے دلوں میں خیر پائیگا تو جو کچھ تم سے لیا گیا۔ اس سے بہتر عطا فرماوے گا اور تمہاری مغفرت فرمادے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

واقعۂ اسیرانِ بدر

مذکورہ بالا آیت کی شان نزول یہ ہے کہ سید المرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے کافروں کو (غزوۂ بدر میں) شکست فاش دی اور کارزار جنگ باہم قتل و غارت گری کے بعد بہت سے کافر قید ہوئے انہیں اسیر کیا گیا اور ہاتھوں میں رسیاں باندھ کر میدان جنگ سے لایا گیا۔ ان اسیروں میں رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بھی تھے۔ یہ قیدی رات بھر اپنی ذلت و رسوائی اور اسیری پر مصروف گریہ رہے اور رات بھر ان کو یہ خوف دامن گیر رہا کہ صبح ہم سب کو قتل کردیا جائیگا۔ ان کو اپنی زندگی کی امید نہیں رہی تھی۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کی جانب دیکھا تو رُخ انور پر مسرت و شادمانی کے آثار نمودار ہوئے اور آپ مسکرا دیئے۔ ان قیدیوں نے آپس میں کہا کہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں بشری صفات ہیں حالانکہ یہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ مجھ میں بشری صفات نہیں ہیں لیکن ان کا یہ دعویٰ سچ نہیں ہے۔ دیکھو ہماری قید و بند کی صعوبت پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ جیسا کہ دنیا کے نفس پرست دشمن پر فتح حاصل کر کے ان کو مقہور و مجبور دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ دلوں کا حال جاننے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قلبی کیفیات کو معلوم کر کے ان اسیروں سے فرمایا تم کس گمان میں ہو حاشا و کلّا میری مسرت کا وہ سبب نہیں جو تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں اس حال میں دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ حقیقتاً میری مسرت کا سبب یہ ہے کہ میں اپنی (نبوی خصوصیات کی وجہ سے) نظروں سے وہ منظر دیکھ رہا ہوں کہ میں ایک قوم کو گندگی سے

اور دوزخ سے اور سیہ کاروں کے حلقوں سے نکال کر رسیوں اور زنجیروں میں جکڑ کر جنت کے باغوں اور دار الامان میں کھینچے لئے جا رہا ہوں مگر اس قوم کو اس کا احساس نہیں کہ انہیں مصیبت کی جگہ سے نکالا جا رہا ہے، مجھے تمہاری اس بات پر ہنسی آ رہی ہے۔ تمہیں وہ بصیرت حاصل نہیں جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے اور جو کچھ میں بتا رہا ہوں تم اس کو نہیں دیکھ سکتے اور اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ عجبت من قوم یقادون الی الجنۃ بالسلاسل۔ مجھے اس قوم پر تعجب ہے جنہیں پابہ زنجیر کر کے جنت کی طرف لایا جا رہا ہے۔

بدر کے موقع پر کفار کے مزعومات

سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حکم ربّی یہ ہے کہ ان اسیروں کو یہ بتا دیا جائے کہ انہوں نے پہلے تو لشکر جمع کیا، جاہ و حشم، شان و شوکت، طاقت و قوت کا مظاہرہ کیا اور جاہ و حشم پر بھروسہ کر کے بیٹھ گئے اور کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے۔ تم اپنی اس طاقت و قوت کے زعم میں اتنے مغرور ہو گئے کہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ ہم مسلمانوں کو شکست دے کر مقہور و مغلوب کر دیں گے۔ تم کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ تھا کہ تم کسی دوسرے کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ غرض یہ کہ تم نے اپنی مزعومات کو پورا کرنے کے لئے جو کچھ بھی کیا قدرت الٰہی نے اس کو تلپٹ کر دیا۔ تم بھول گئے تھے کہ سب سے بالا اور قادر و توانا ہستی بھی موجود ہے۔

اب جب کہ تم پر خوف کی کیفیت طاری ہے، لیکن تم نے اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار نہیں کیا ہے تم اپنی زندگی سے ناامید ہو گئے ہو۔ اب تمہیں اپنی ذات پر قدرت و قوت حاصل نہیں رہی ہے تو اب تم مجھے قوت و شوکت کی حالت میں دیکھو اور خود کو میرے سامنے مقہور جانو تاکہ تمہارے کام آسان ہو جائیں مگر خوف کی حالت میں مجھ سے امید قطع نہ کرو۔ کیونکہ میں اس بات پر قادر ہوں کہ تم کو اس خوف سے نکال دوں اور ہر طرح سے بے خوف کر دوں۔

وہ ہستی جو سفید گائے کے پیٹ سے کالا بچہ پیدا کر سکتی ہے اس کو یہ قدرت بھی ہے کہ سیاہ گائے سے سفید بچہ پیدا کر دے۔ آیت قرآنی شاہد ہے۔ تولج اللیل فی النھار و تولج النھار فی اللیل و تخرج الحیّ من المیّت و تخرج المیّت من الحیّ (آل عمران ع ۳ پ ۳)

یعنی وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے "۔ اب جبکہ تم اسیری کی حالت میں ہو تو میری ذات سے مایوس نہ ہو تاکہ تمہاری دستگیری کروں کیونکہ انہ لاییأس من روح اللہ الا القوم الکفرون (اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی مایوس نہیں ہوتا (سورہ یوسف ع ۱۰)۔

اب حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے قیدیو! اگر تم اپنی پچھلی روش سے باز آجاؤ امید اور خوف دونوں حالتوں میں میری طرف رجوع کرو اور ہر حال میں میرے قہر سے ڈرتے رہو تاکہ میں تمہیں اس خوف سے چھڑا دوں اور تم کو وہ مال و متاع جو تلف و تاراج ہو گیا ہے نہ صرف اس کا نعم البدل عطا فرمادوں گا بلکہ اس سے بھی زیادہ دونگا۔ اس کے علاوہ تمہاری مغفرت فرماؤں گا۔ دنیا و آخرت کی دولتوں کو تم سے مقرون اور ملحق کر دونگا۔

جناب عباس کی توبہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمام گفتگو کو سن کر جناب عباس رضؓ نے فرمایا اب میں توبہ کرتا ہوں اور جس حالت میں تھا اس سے روگردانی کرتا ہوں۔ چچا کی یہ بات سن کر رحمت عالمؐ نے دریافت فرمایا کہ تم توبہ و انابت کا اظہار تو کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں ضمانت طلب کرتا ہے۔

دعوئے عشق کردن آسان است لیک آنرا دلیل و برہان است

(عشق کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے لیکن اس دعویٰ کے لئے دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے)

جناب عباس رضؓ نے سید عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا آپ فرمائیں مجھ سے اس سلسلہ میں کیا ضمانت طلب کی جاتی ہے۔ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس جو مال باقی بچا ہے ایثار کر کے وہ اسلامی لشکر کو دیدو کہ لشکر اسلام کو تقویت حاصل ہو جائے۔ اور یہی تمہارے ایمان اور نیک نفسی کی دلیل ہوگی۔ جناب عباس رضؓ نے فرمایا کہ اب میرے پاس بچا ہی کیا ہے سب کچھ تو ختم ہو گیا حتیٰ کہ پرانی چٹائی بھی نہ رہی۔ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی آپ راہِ راست پر نہیں آئے اور اپنے موقف سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے۔ اب میں بتاؤں کہ آپ کے پاس کتنا مال ہے اور کہاں رکھا ہے۔؟ کس کے سپرد کیا ہے؟ اور کہاں کہاں چھپایا ہے۔؟ جناب عباس رضؓ نے کہا حاشا وکلا ایسا نہیں

ہے لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، سنیئے! کیا آپ نے اتنا مال (اپنی بیوی) ام الفضل کے سپرد نہیں کیا ہے اور فلاں جگہ دیوار میں دفن نہیں کیا ہے؟ اور ان سے یہ نہیں کہا ہے کہ اگر میں واپس آگیا تو خود اس مال میں تصرف کروں گا لیکن اگر میں اس جنگ سے واپس نہ آؤں تو اتنا مال فلاں کام میں خرچ کرنا، اتنا فلاں شخص کو دیدینا اور اتنا مال اپنے خرچ میں لانا۔
عباس بن عبدالمطلب نے جب تفصیل کے ساتھ رقم کی بابت سنا تو انگشت شہادت اٹھا کر اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا اور سچے دل کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ کہنے لگے، اے اللہ کے سچے رسولؐ! میں سمجھتا تھا کہ آپ کا اقتدار و اختیار سابق میں گزرنے والے حکمرانوں ہامان و شداد کی طرح انقلاب زمانہ کا نتیجہ ہے لیکن اب جبکہ آپ نے اس مال کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے تو مجھے اندازہ ہوگیا اور حقیقت ظاہر ہوگئی کہ آپ کا اقبال و اقتدار عطائے الٰہی اور عطیۂ ربانی ہے۔
یہ سنکر رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اب آپ نے صحیح بات کہی ہے اور آپ کے باطن میں جو تشکیک و شبہات کی زنار پڑی ہوئی تھی وہ ٹوٹ گئی ہے اور اس کے ٹوٹنے کی آواز میرے کانوں میں بھی آگئی ہے آپ میرے ظاہر کی طرف توجہ کرتے ہیں لیکن اللہ رب العالمین نے میرے باطن کو سماعت کی صلاحیت عطا فرمائی ہے اور جو بھی شک، شرک و کفر کی زنار کو توڑتا ہے اس کے ٹوٹنے کی آواز میرے باطنی کان میں آجاتی ہے اور یہ بات واضح ہوگئی اب آپ سیدھے ہوئے اور ایمان لے آئے۔

مولاناؒ کی امیر پروانہ کو نصیحت

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امیر پروانہ کو یہ واقعہ سنایا اور ان سے کہا کہ پہلے تو تم اسلام کے لئے ڈھال بن گئے تھے تاکہ اسلام پر فدا ہو جاؤ۔ اور اپنی عقل و فہم و فراست کو اسلام کی بقاء اور اسلام کی تبلیغ و توسیع کے کام میں لاؤ تاکہ اسلام کو استحکام حاصل ہو۔

لہ معین الدین سلیمان بن مہذب علی دیلمی معروف بہ امیر پروانہ: آپ سلجوقی سلاطین کے وزراء میں سے تھے مولانا رومی کے خاص عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ فیہ مافیہ میں اکثر جگہ آپ سے خطاب ہے۔

لیکن جب تم نے اپنی رائے کو فوقیت دی اور اس پر اعتماد کر لیا نہ تو حق کو دیکھا نہ یہ سمجھے کہ سب کچھ حق کی جانب سے ہوتا ہے تو حق تعالیٰ نے تمہارے اس اعتماد اور خود پسندی کو کمزوری کا سبب بنا دیا اور تمہاری ساعی کو اسلام کی کمزوری کا سبب کر دیا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ تم نے (خود اعتمادی کی وجہ سے) تاتاریوں سے اس لئے دوستی کی اور رشتہ استوار کیا تاکہ شامیوں اور مصریوں کو شکست دیکر مغلوب کر سکو! اور اسلامی حکومت کو تباہ کر دو، تو یہی سبب جو سابق میں اسلام کے استحکام کا موجب تھا اب اسلام کی کمزوری کا سبب بن گیا۔ اب اس حال میں تم اللہ تعالیٰ کے سامنے انابت و توبہ کرو، صدقہ دو تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس حالتِ بد سے بچالے، تم رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہو کہ تمہیں اس نے طاعت سے ہٹا کر معصیت میں مبتلا کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہیں تمہاری طاعت کے غرور نے اس معصیت میں مبتلا کیا ہے۔ اب تم اس معصیت میں بھی نجات و فلاح کی امید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑو، گریہ و زاری کرو۔ توبہ و انابت اختیار کرو۔ اس خالق کائنات کو یہ قدرت ہے کہ جس نے اس طاعت سے معصیت کی تخلیق فرمائی، وہ اس معصیت سے طاعت کو پیدا فرمادے گا۔ تاکہ تمہیں اس عمل پر ندامت کا احساس ہو جائے اور ایسے اسباب مہیا ہو جائیں کہ تم دوبارہ اسلام کی قوت و کثرت کا سبب بن سکو امید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑو کیونکہ (انہ لاییأس من روح اللہ الا القوم الکفرون۔ (رحمتِ خداوندی سے کافروں کے سوا کوئی اور مایوس نہیں ہوتا)۔

اس تقریر کے بعد مولانا نے فرمایا کہ اس تفسیر سے غرض یہ تھی کہ امیر پروانہ سنبھل جائے اور تضرع و زاری کرے تاکہ جس بلند مرتبہ سے وہ انحطاط کی منزل پر آ گیا ہے اس سے نجات حاصل ہو جائے اور وہ اس حالت میں اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو تو اللہ تعالیٰ بہترین حالات پیدا کرنے والا ہے۔ وہ اچھی شکلیں ظاہر فرماتا ہے حالانکہ شکم مادر میں وہ شکلیں اچھی نہیں ہوتی ہیں۔ یہ عمل اس لئے ہوتا ہے کہ انسان مغرور نہ ہو جائے اور یہ نہ سوچے کہ میرے کام اور میری رائے ہی نے اچھے حالات پیدا کئے ہیں۔ اور میرے اعمال اچھی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔

دیکھو! اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس روشن و تاباں اور منور کرنے

والی البصیرت کے باوجود بارگاہِ احدیت میں عرض کیا کرتے تھے۔ ارنی الاشیاء کما ھی ؛ خداوندا مجھے چیزوں کو ان کی اصل شکل میں دکھلا دے۔ کسی چیز کو تو اچھا کر کے دکھاتا ہے لیکن درحقیقت وہ زشت اور بد صورت ہوتی ہے۔ اور کسی چیز کو بری شکل میں ظاہر فرماتا ہے لیکن درحقیقت وہ بری نہیں ہوتی اس طرح ہمیں چیزوں کو ان کی اصل شکل میں دکھادے تاکہ ہم کسی دامِ فریب میں نہ پھنسیں اور گمراہی کا شکار نہ ہوں؛

اب اگرچہ تیری رائے بہتر اور واضح ہے لیکن اسکی رائے سے بہتر نہیں اور اس نے ایسا ہی بتایا ہے لہٰذا اب تو ہر صورت اور رائے پر اعتبار نہ کر بلکہ زاری کر اور ڈر تا رہ۔ میرا کہنا صرف اتنا ہی تھا کیونکہ تو اپنی رائے اور ارادے کے مطابق اس آیت کی تفسیر و تشریح کرتا تھا کہ اس وقت ہم اپنا جو لشکر لے جا رہے ہیں اس کے بارے میں یہ نہ چاہیئے کہ ہم اپنی رائے کے مطابق اس پر مکمل اعتماد کر لیں۔ اور اگر ہم شکست سے دوچار ہو جائیں تو بھی خوف اور بیچارگی کے عالم میں بھی اس سے امید کو منقطع نہ کرنا چاہیئے [1]

فصل

حقیقت اپنی جانب متوجہ کرتی ہے

ایک شخص نے میرے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مولانا تو عمومی طور پر کسی کی طرف توجہ نہیں فرماتے میں نے جواب میں کہا کہ اس شخص کو میرا خیال ہی اس طرح میرے قریب لایا ہے اور میرے اس خیال نے تو اس سے یہ دریافت نہیں کیا کہ تو کیسا ہے؟ کس حال میں ہے؟ بغیر میرے کچھ کہے اس کو یہی خیال یہاں کھینچ لایا ہے۔ اگر میری حقیقت اس کو بغیر گفتگو کے اپنی جانب متوجہ کرے یا کسی دوسری جگہ لے جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

بات حقیقت کا پرتو یا اس کی شاخ کی طرح ہے جب سایہ نے اسے اپنی جانب

---

[1] اس لیئے کہ لشکر کا لیجانا ایک عمل ظاہری ہے اور یہ عمل صائب اور درست ہے یا نہیں سکا جاننے والا صرف خداوند تعالیٰ ہے اگر ہمکو شکست کا سامنا کرنا پڑے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ ہماری رائے درست نہیں تھی لیکن امید کا دامن اس صورت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے۔

متوجہ کرلیا تو حقیقت کا کیا عالم ہوگا وہ تو بدرجہ اولیٰ اپنی جانب متوجہ کرلیگی۔ بات تو ایک ذریعہ اور بہانہ ہے انسان کو وہ جزو مناسب کھینچتا ہے جو اس کے اندر ہو نہ کہ بات۔ بات کا بالفعل کوئی اثر نہیں ہے بلکہ یوں کہیں کہ لاکھ معجزے اور کرامتیں دیکھنے کے بعد بھی اگر نبی اور ولی کی ذات کے ساتھ کوئی قدر مشترک اور مناسبت نہ ہو تو اس معجزہ اور کرامت کے دیکھنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

یہی وہ قدر مشترک ہے جو اس کو جوش اور بیقراری کی کیفیت میں رکھتی ہے مثال سے یوں سمجھیں کہ گھاس میں اگر کشش اور کہربائی کا جزو نہ ہو تو وہ کہربا کی طرف ہرگز نہ کھنچے گی وہ قدر مشترک ان دونوں کے درمیان موجود ہے لیکن نظر نہیں آتی۔

انسان کو کسی چیز کا خیال ہی اس چیز کی جانب لے جاتا ہے۔ مثلاً باغ کا خیال باغ کی جانب لیجاتا ہے اور دوکان کا خیال دوکان کی طرف۔ لیکن ان خیالات میں ایک دھوکا بھی چھپا ہوا ہے، دیکھتے نہیں کہ تم کہیں جاتے ہو اور پشیمان ہوتے ہو کہتے ہو میرا خیال تھا کہ بھلا ہوگا مگر بھلا نہ ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیالات چادر کی مثال ہیں، اور آدمی چادر میں لپٹا رہتا ہے، چادر ہٹ جائے تو حقائق سامنے آجائیں مگر یہ تو قیامت ہی ہوگی۔ قیامت میں پشیمانی کی گنجائش کہاں؟ بات یہ ہے کہ جو چیز تمہیں کھینچتی ہے وہ صرف حقیقت ہے کوئی اور چیز نہیں۔ تم نے پڑھا ہوگا یوم تبلی السرائر (جس دن تمام راز جانچے جائیں گے) (تو یہ دن قیامت کا ہوگا)، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ کھینچنے والی قوت صرف ایک ہے مگر تم کو متعدد نظر آتی ہے۔ کیا تم اس حقیقت سے واقف نہیں ہو کہ انسان کو سیکڑوں انواع واقسام کے چیزوں کی آرزو ہوتی ہے جو نواکہ وانواع واقسام کے کھانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ کبھی وہ شوربا چاہتا ہے کبھی سنبوسہ کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی حلوہ، قلیہ، میوہ، خرما یا انجیر کی طلب محسوس کرتا ہے۔ اس خواہش میں بظاہر تعدد نظر آتا ہے حالانکہ اصل حقیقت صرف ایک چیز ہے یعنی بھوک۔ انسان کا پیٹ جب کسی چیز سے بھر جاتا ہے تو پھر ان چیزوں میں سے کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طلب دس یا سو کی نہ تھی بلکہ صرف ایک

ہی چیز کی تھی جس نے اس کی بھوک کو ختم کر دیا ہے۔ وما جعلنا عدّتھم الا فتنۃ الآیۃ (سورۂ مدثر رکوع ۲) اور نہیں رکھا ان کا تعداد مگر آزمائش کے لئے (اس کے تعدد میں فتنہ ہی فتنہ ہے) مخلوق کی یہ تعدد پسندی ایک فتنہ ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک ہے اور وہ سَو ہیں۔ یعنی ولی کیلئے ایک کا عدد استعمال کرتے ہیں جب کہ کثیر مخلوق کے لئے سَو اور ہزار سے زیادہ کا عدد استعمال کرتے ہیں۔ (الاولیاء کنفس واحدۃ اولیاء ایک ... جان ہیں)

تو کثرت عظیم فتنہ ہے۔ یہ نظریہ اور یہ خیال کہ مخلوق کو کثیر تعداد میں سمجھتے ہیں اور اسکو ایک خیال کرتے ہیں۔ اس میں بہت بڑی آزمائش ہے وما جعلنا عدتھم الا فتنۃ۔ کون سے سَو کون سے پچاس اور کون سے ساٹھ۔ ایک توم بے دست دپا، بے ہوش و بے جان ہے جو طلسم اور پارہ کی طرح جنبش کرتی ہے۔ اب تم اس کو ساٹھ یا سَو یا ہزار سے تعبیر کرو اور اسے ایک سے۔ بلکہ اسکو یوں کہیں کہ یہ تعدد توم و اشخاص کچھ بھی نہیں۔ گو وہ ہزار لاکھ، کروڑ ہوں، کہاوت ہے کہ قلیلٌ اذا عدّوا کثیرٌ اذا شدّوا (الگ الگ گنو تو کم ہیں مگر وابستگی اور وحدت ہو تو زیادہ ہیں اور سب پر بھاری) یعنی مخلوق جس میں کثرت تعدد ہے اگر غور کرو تو وہاں کثرت تعدد وہ ایسے لوگ ہیں جو مجبور و بے دست و پا، بیجان اور بیہوش ہیں اور جس کو تم ایک خیال کر رہے ہو وہ اپنی قوت و قدرت کے باعث ہزاروں لاکھوں سے زیادہ ہے اور وہ جن کو ہزاروں لاکھوں سمجھا تھا بالکل ہیچ و لوچ ہیں۔

تمثیل ایک بادشاہ نے ایک سپاہی کو سَو روٹیاں عطا کیں۔ بادشاہ کے اس عمل پر لشکری بہت چیں بر جبیں ہوئے۔ لیکن بادشاہ نے اپنے دل میں سوچا کہ وقت آئیگا کہ میری اس عنایت کا ثمرہ ظاہر ہوگا۔ اور میں اس حیثیت میں ہونگا کہ تمہیں اپنی داد و دہش پر مطمئن کر سکوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ جنگ کے موقع پر سارے لشکری بھاگ گئے اور وہ سپاہی جس کو بادشاہ نے سَو روٹیاں دی تھیں تنہا لڑتا رہا تب بادشاہ نے بتایا کہ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ میری نوازش کی وجہ کیا تھی۔

خود غرضی اور غرض سے مبرا ہو جائے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی قوت ممیزہ کو خود غرضی اور اغراض سے مامون اور محفوظ

رکھے اور دین میں اپنے یار کا جویاں رہے۔ کیونکہ دین ہی دوست شناسی کا ذریعہ ہے اور بس۔
لیکن اگر اپنی عمر کو بے تمیزوں کے ساتھ بسر کیا تو قوت ممیزہ کمزور ہو گئی اور اب ممکن نہیں کہ دین کے دوست کو آسانی سے پہچانا جائے کیونکہ تو ایسے جسم کی پرورش کرتا رہا ہے جس میں قوت ممیزہ نہیں تھی اور قوت ممیزہ ایک صفت ہے جو انسان میں اس طرح موجود ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ دیوانہ بھی دوسرے صاحب عقل و شعور انسانوں کی طرح جسم ہاتھ پاؤں تو رکھتا ہے لیکن قوت ممیزہ یعنی عقل و شعور سے عاری ہوتا ہے۔ وہ پاک و ناپاک میں امتیاز نہیں کرتا۔ بلکہ نجاست کو اٹھا کر کھا لیتا ہے اگر اس کے وجود ظاہری میں تمیز اور پہچان کا مادہ ہوتا تو وہ نجاست کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

اس مثال سے ہم نے یہ سمجھا کہ قوت ممیزہ یا تمیز ایک پاکیزہ اور لطیفۂ باطنی ہے جو تیرے اندر موجود ہے لیکن تو دن رات جسم بے تمیز کی پرورش میں مشغول رہتا ہے۔ اب بہانہ کرتا ہے کہ تمیز اسی جسم کے ساتھ قائم ہے۔ کیا وجہ ہے کہ تو پوری طرح جسم کی دیکھ بھال اور اس کی نشوونما کی طرف متوجہ تو رہا اور اس اصل جوہر یعنی قوت ممیزہ کو تو نے یکسر فراموش کر دیا ہے حالانکہ وہ اسی کی وجہ سے قائم ہے اور یہ اس کی وجہ سے قائم نہیں۔ یہ جوہر لطیف ایک نور ہے جو آنکھ کان اور جسم کے دوسرے دریچوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر یہ دریچے نہ ہوتے تو وہ دوسرے دریچوں سے ظاہر ہوتا اور اس کی مثال ایسی ہے کہ تو سورج کو تلاش کرنے کے لئے چراغ لے کر آیا ہے کہ اس چراغ کی روشنی میں آفتاب کو دیکھونگا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چراغ کے بغیر بھی سورج ظاہر ہوتا اور چراغ کی احتیاج نہ ہوتی۔ لہٰذا ذات حق تعالیٰ سے امید منقطع نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کی رحمت سے کافر ہی مایوس ہوتے ہیں اور امید سَرِ راہِ ایمنی اور نیکوئی ہے۔ اگر تو راہ پر گامزن نہیں ہے تو کم از کم راستہ پر تو نظر رکھ۔ اس کا اعتراف نہ کر کہ میں نے کجروی اختیار کی ہے۔ راہِ راست کو سامنے رکھ کوئی کجی باقی نہیں رہے گی۔ سچائی اور صداقت، و راستی عصائے موسوی کی طرح ہیں اور یہ کجی و بے راہ روی (عصائے موسیٰ کے مقابل) سحر کی مثال ہیں۔ جب موسوی حقانیت سامنے آتی ہے تو ٹیڑھے ترچھے پن سب کو نگل لیتی ہے۔

اگر تو نے برائی کی ہے تو خود سے کی ہے۔ تیرا ظلم بھلا اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے

مرغے کہ بداں کوہ نشست و برخاست

بنگر کہ دراں کوہ چہ افزود و چہ کاست

ایک پرندہ پہاڑ پر بیٹھا اور اڑ گیا دیکھنا اس کی وجہ سے پہاڑ میں نہ کوئی کمی ہوئی نہ اضافہ جب تم راستی اختیار کرو گے تو تمام کجرویاں ختم ہو جائیں گی۔

امید کو کسی حال میں نہ چھوڑنا۔

بادشاہ کی ہم نشینی خطرہ کا سبب ہوتی ہے

بادشاہوں کی ہم نشینی اس وجہ سے خطرناک نہیں کہ اس میں جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ارے جان تو جانے والی چیز ہے ہی، آج گئی یا کل گئی۔ خطرہ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و اقتدار کے نشہ میں چور ہوتے ہیں اور ان کی کیفیت اژدھے کی سی ہوتی ہے۔ جو کوئی بھی صاحب اقتدار کے پاس بیٹھتا ہے ان سے دوستی اور مودت کا رشتہ استوار کرتا ہے، ان کے عطیات قبول کرتا ہے تو ان نوازشات اور مہربانیوں کے بعد یہ بات بھی لازمی ہوگی کہ ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے اور چار و ناچار اپنی رائے کے خلاف ان کی رائے کو قبول کیا جائے اور اس کے خلاف کچھ بھی نہ کہا جائے، اور یہ بات خطرناک ہے۔ کیونکہ اس طرز عمل سے دین کو نقصان پہونچتا ہے اور جب تم ان کی جانب متوجہ رہو گے تو دوسرا رخ جس کو عمل سے تعبیر کرتے ہیں اس سے تم بیگانہ ہو جاؤ گے۔ اور جب تک تم اس راہ پر گامزن رہو گے وہ معشوق تم سے ناراض رہے گا اور جب تک تم دنیا (اور دنیا والوں) سے صلح کیے رہو گے اس کی برہمی قائم رہے گی۔ من اعان ظالماً یسلطہ اللہ علیہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی ظالم کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ جب تک کہ تم اس کی جانب جارہے ہو تو بانہ اسی طرح ہے یعنی جب اس کی طرف چلے تو انجام کار اسی کو تم پر مسلط کر دیا جائے گا۔

دریا پر پہونچکر صرف پانی پر قناعت کرنا

افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت دریا کے کنارے پہونچکر ایک کٹورہ یا ایک لوٹے پانی پر قناعت کرلی جاتی ہے حالانکہ دریا سے پانی کے علاوہ اور بھی کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے اسمیں موتی ہوتے ہیں۔ بیشمار دوسری قیمتی چیزیں موجود ہیں۔ دریا سے صرف پانی ہی لے لینا تو کافی نہیں اور عقلمند انسان اپنے اس عمل پر کیا فخر کرسکے گا! اس نے کونسا پالا مارا ہے۔ مثال سے اس طرح سمجھیں کہ یہ دنیا جھاگ کے مانند ہے اور بہتا ہوا دریا اولیاء اللہ کے علوم کی طرح ہے اور یہ کسی کو کیا معلوم کہ موتی کس جگہ ہے۔ اور یہ دنیا بھی بے حقیقت تنکوں سے بھری ہوئی دریا کے جھاگ کی طرح ہے لیکن دریا کی موجوں کی گردش اور دریا کا جوش اور ہوا کے زور سے اٹھنے والی اس کی لہریں اس کیفیت کو ایک پُرکیف منظر بنادیتی ہیں جس طرح

زین للناس حب الشھوٰت من النسآء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسوّمۃ والانعام والحرث ذٰلک متاع الحیوٰۃ الدنیا

(آل عمران ع ۲۰)

انسان کو پسندیدہ چیزوں مثلاً بیویوں بیٹوں سونے چاندی کے ڈھیروں سدھے ہوئے گھوڑوں مویشیوں اور کھیتوں کی محبت خوشنما کرکے دکھائی گئی یہ سب دنیا کا عارضی سازو سامان ہے۔

(آل عمران ع ۲۰)

اللہ رب العلمین نے اس آیت کریمہ میں "زُیّن" کا لفظ استعمال کیا ہے جو اس بات کا آئینہ دار ہے کہ یہ چیزیں اصل میں خوبصورت نہیں ہیں بلکہ انہیں خوبصورت بناکر پیش کیا گیا ہے اور اس کی یہ خوبیاں کہیں سے مستعار لی گئی ہیں۔ یعنی یہ دنیا تو ایک مٹھی بھر کھوٹا سونا ہے بالکل بے قدر اور بے قیمت۔ البتہ ہم نے اس پر سونے کا ملمع چڑھا دیا ہے جو "زین للناس" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

انسان کی حقیقت

آدمی اللہ تعالیٰ کا اُصطرلاب ہے۔ اسطرلاب سے بروج فلکی کی کیفیت، سیاروں کی چال اور ستاروں کی تاثیر کا پتہ چلتا ہے۔ اسطرلاب کو جاننے اور سمجھنے کے لئے تو ایک ماہر علوم نجوم کی ضرورت

ہے۔ اگر یہی اصطرلاب ایک کنجڑے یا پنساری کے پاس ہو تو وہ اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کیا استفادہ کر سکتا ہے۔ وہ اس اصطرلاب کے ذریعہ احوالِ فلکی ان کے دور و گردش، بروج کی کیفیت ان کے اثرات اور تبدیلیوں کو کیا جان سکتا ہے۔ بس ایک منجم کے لئے ہی یہ اصطرلاب سود مند ہو سکتا ہے (کنجڑے یا پنساری کے لئے نہیں)۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ (جس نے اپنے آپ کو پہچانا اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی) اس پر دال ہے۔ جس طرح یہ اصطرلاب واضح طور پر احوالِ فلکی کا آئینہ دار ہے اسی طرح انسان کا وجود جس کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ لقد کرمنا بنی آدم (ہم نے بنی آدم کو بزرگی عطا فرمائی) حق تعالیٰ کا اصطرلاب ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ نے اس کو اپنی ذات کا عالم و دانا بنایا ہے۔ پس وہ اپنی ذات کے اس اصطرلاب کے ذریعہ حق تعالیٰ کے جمال اور اس ذاتِ بیچوں کی تجلی ہر لحظہ اور ہر لمحہ مشاہدہ کر یگا کہ اس کا جمال اس آئینۂ وجود سے کسی وقت اور کسی لمحہ خالی نہیں ہوتا (جمالِ الٰہی کی تجلی آئینۂ ذات میں ہر وقت متجلی رہتی ہے)۔

اللہ رب العلمین کے خاص بندے

حق جل شانہٗ کے ایسے بندے بھی ہیں جو حکمت، معرفت اور کراماتوں کے لباس میں ملبوس ہیں۔ اگرچہ عام مخلوق کے پاس ایسی نظر نہیں جو ان کو پہچان سکے کہ انہوں نے غیرت کے باعث اپنے فضل و کمال اور معرفت کو چھپا رکھا ہے۔

متنبی کا مشہور شعر ہے ۔

لبس الوشی لا متجملات
ولکن کی یصن بہ الجمالا

٭

مقصود زیوروں سے نہیں زینتِ جمال
بلکہ چھپا رہے ہیں وہ اپنے جمال کو

فصل

استغراق عبادت کی روح ہے

چونکہ حضرت مولانا رومیؒ نے امیر پروانہ کو مغلوں اور تار تاریوں سے ملنے اور ان کی معاونت پر تہدید فرمائی تھی اس سلسلہ میں امیر پروانہ نے حقیقت حال کو واضح کرنے کے لئے عرض کیا میرے جسم و جان شب و روز خدمتِ شاہی میں مصروف رہتے ہیں اور ان مصروفیات کے باعث مجھے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ یہ کام بھی درحقیقت اللہ ہی کے کام ہیں چونکہ یہ اسلام اور مسلمانوں کی سلامتی کے لئے ہیں، تم نے اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیا ہے تاکہ مسلمان امن و عافیت کے ساتھ مصروف طاعت و عبادت ہوں اس لئے یہ کام بھی کارِ خیر میں شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کو اس کارِ خیر کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ اور نیک کاموں کی طرف اس قدر مصروفیت بھی اس کی عنایت کی دلیل ہے جب خدمت بندگان خدا میں کسی قسم کا نقص و کمی پیدا ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارے حال پر اس کی وہ عنایت باقی نہیں رہی اور اس کی مشیت کو یہ بات پسند نہیں کہ ایسے امور عظیم تم سے سر زد ہوں اور تم کو اس کا ثواب حاصل ہو اور بلند درجات نصیب ہوں۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھو کہ جب حمام کو گرم کیا جاتا ہے تو اس کو گرم کرنے کے لئے گوبر کوڑا کرکٹ گھاس وغیرہ کو جلا کر گرم کیا جاتا ہے اور اس کو گرم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اسباب مہیا فرمائے ہیں کہ بظاہر یہ گھاس کوڑا کرکٹ دیکھنے میں بہت ہی کریہہ المنظر ہیں لیکن حمام کے حق میں یہ ایک فضل و کرم ہے کہ وہ ان چیزوں سے گرم ہو جاتا ہے اور مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔

احترام کیلئے موقع و محل درکار ہے

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ چند احباب مولاناؒ

کی خدمت میں حاضر ہوئے مولاناؒ نے ان سے معذرت فرماتے ہوئے کہا کہ اگر میں تمہاری تعظیم کے لئے کھڑا نہ ہو سکوں اور تم سے احوال دریافت نہ کروں تو یہ بھی ایک گونہ احترام ہو گا کیونکہ احترام کے لئے موزوں اور مناسب وقت کی احتیاج ہوتی ہے۔ حالت نماز میں والد محترم یا بھائی کی مزاج پرسی اور ان کی تعظیم کرنی مناسب نہیں۔ اسی طرح حالت نماز میں دوستوں اور احباب سے بے التفاتی ہی عین التفات ہوگی، کیونکہ اگر نمازی ان مہمانوں سے قطع نظر کرتے ہوئے نماز میں اشتغال وانہماک باقی رکھے گا تو اس کے اس عمل سے یہ مہمان مورد عتاب نہ ہوں گے اور یہ عدم توجہی ان کے حق میں سبب رحمت ہوگی کیونکہ نمازی نے ایسے عمل سے احتراز کیا ہے جو ان مہمانوں کے لئے سبب عتاب وعقاب بن سکتا تھا۔

نماز کے علاوہ تقرب کا ذریعہ

احباب نے سوال کیا کہ نماز کے علاوہ تقرب حق کا اور کون سا ذریعہ ہے؟ آپ نے فرمایا نماز اور صرف نماز اور نماز بھی اپنی شکل میں تنہا نہیں کیونکہ نماز تو ایک گونہ قالب کی طرح ہے اس لئے یہ نماز بھی تو اوّل وآخر رکھتی ہے جس طرح کہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہا ہوتی ہے اور جس چیز میں ابتداء وانتہا ہو اس کو قالب کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نماز کی ابتداء تکبیر تحریمہ ہے اور نماز کا آخر سلام ہے

شہادت صرف زبان سے کافی نہیں

شہادت (اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ) کے لئے صرف زبانی اقرار کافی نہیں کیونکہ اس میں بھی آغاز (حرفی) اور اختتام (حرفی) ہے اور جو چیز حرف وصوت کے جامہ میں ہو اس کا اوّل اور آخر ضرور ہوتا ہے اور وہ صورت اور قالب ہے لیکن جان بے کیف وکم اور لا متناہی ہوتی ہے اور وہ اوّل وآخر میں مقید نہیں ہے، ایسی نماز صرف انبیاء علیہم السلام نے ادا فرمائی ہے، اور جس نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی نماز ادا فرمائی ہے اسی کا یہ ارشاد ہے؛

لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی	میرے اور خالق برحق کے ساتھ ایک ایسا وقت
فیہ نبی مرسل ولا ملک	بھی آتا ہے اور ایک ایسی منزل بھی آتی ہے جس میں

مقرب ۔ (حدیث) نہ کسی نبی مرسل کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ کسی مقرب فرشتے کی۔

اس ارشادِ گرامی سے میں نے یہ سمجھ لیا کہ جانِ نماز تنہا یہ ہئیت نماز نہیں ہے ، بلکہ جانِ نماز وہ استغراق و بیخودی ہے جس میں یہ ظاہری صورتیں (ہئیات) الگ تھلگ رہ جاتی ہیں، اس حالت میں جبرئیل علیہ السلام کے دخل کی ، بھی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ نماز کے معنیٰ محض بھی اس میں نہیں سماتے۔

مولانا بہاءالدین کے استغراق کا ایک واقعہ

مولانا بہاء الدین رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ عالمِ استغراق میں تھے ۔ان کے احباب نے جب دیکھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے تو بعض احباب نے مولانا کو نماز کی جانب توجہ دلائی لیکن مولانا کے استغراق کی کیفیت برقرار رہی تو اکثر مریدین و احباب نے نماز پڑھنی شروع کردی البتہ دو افراد ایسے تھے جنھوں نے مولانا کی متابعت میں نماز میں تاخیر کردی ۔ نماز میں مشغول ہونے والے ایک مرید جس کا نام خواجگی تھا ان کو کشف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ تمام لوگ جو نماز میں مشغول ہیں مع امام جماعت کے ان کا رُخ سمت قبلہ کے مخالف ہے اور وہ دو مرید جو شیخ بہاؤالدین کی متابعت میں جماعت میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ مصروف نماز ہیں اور ان کا رُخ سمت قبلہ کی طرف ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے شیخ کی متابعت کی تھی اور شیخ قدس سرہٗ من وتوکی منزل سے گزر چکے تھے، اور "موتوا قبل اَنْ تموتوا (مر جاؤ مرنے سے پہلے) کے مصداق وہ نورِ حق میں فنا ہو چکے تھے اب وہ خود کہاں تھے وہ تو نورِ حق بن چکے تھے۔ان متابعت نہ کرنے والے نمازیوں کے ساتھ یہ کیفیت اس لئے ہوئی کہ انھوں نے مولانا کی متابعت نہ کی تھی اور نورِ حق سے پیٹھ پھیر لی تھی۔ اور جو نورِ حق سے پیٹھ پھیر لیتا ہے اس کا منہ دیوار ہی کی جانب ہوا کرتا ہے اس لئے حقیقتاً انھوں نے سمت قبلہ کی جانب پیٹھ کی تھی ،کیونکہ ایسا فرد (جو نورِ حق بن جائے تو وہ) جانِ قبلہ

بن جاتا ہے آخر یہ مخلوق جو قبلہ کی جانب منہ کرتی ہے اس کعبہ کی بنیاد ایک نبی نے رکھی ہے جو قبلہ عالم ہو گئے ہیں لہذا اگر انسان کی ذات قبلہ بن جائے تو اس کی متابعت بطریق اولیٰ ضروری ہو گی کیونکہ بنائے قبلہ ان ہی سے ہوئی ہے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل اور نماز

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا لیکن نہیں آئے۔ صحابی نے عرض کیا، میں نماز میں مشغول تھا۔ آپ نے فرمایا کیا میں نے تم کو بلایا نہ تھا؟ انھوں نے عرض کیا میں مجبور تھا۔[1]

یہ واقعہ بیان فرما کر مولانا نے فرمایا بہتر ہے کہ تم ہر وقت مجبور ہی رہو اور قدرت ہوتے ہوئے بھی خود کو مجبور و بیکس سمجھو۔ جس طرح کہ قدرت نہ ہوتے ہوئے بھی سمجھتے ہو۔ کیونکہ تمہاری قدرت کے اوپر اور اس سے بالا بھی ایک قدرت ہے اور تمہاری حیثیت اس قدرت کے تابع ہے اور تمہاری ہستی ہر حال میں دو حصوں میں منقسم ہے، کبھی مجبور محض اور کبھی با اختیار لہذا اس کی قدرت پر نظر رکھتے ہوئے خود کو بیچارہ اور مجبور بے دست و پا، عاجز و مسکین ہی سمجھتے رہو۔ مگر در انسان کا تو ذکر ہی کیا ہے، بیشتر چیتے، گھڑیال، ناگ جیسے خونخوار حیوان بھی اس کے حضور اور اس کی قدرت کے سامنے لرزاں و ترساں ہیں، آسمان و زمین سب مجبور اور اس کے حکم کے تابع اور اس کے مسخر ہیں۔ وہ بادشاہ عظیم ہے' اس ذاتِ باری کا نور آفتاب و ماہ کے نور کی طرح نہیں ہے کہ چاند اور سورج کے نور کے سامنے تو ہر چیز اپنی جگہ پر قائم ہے۔ لیکن جب اس کا نور بے پردہ ہوگا اس وقت نہ آسمان باقی رہے

---

[1] یہ واقعہ احادیث میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ ایک صحابی کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا وہ نہ آئے اس وقت آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ۔ الخ. سورۃ الانفال ۹) جس میں وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم کو اگر حالت نماز میں بھی اللہ کے رسول بلائیں تو تم بلا کسی تردد کے حضور کے بلانے پر حاضر ہو جاؤ کیونکہ نماز و عبادت سب کچھ حضور ہی سے ہے اور عبادت کو حضور کے حکم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ (ترمذی شریف)

گا اور نہ یہ زمین ۔ نہ آفتاب باقی رہے گا نہ چاند، سوائے اس کی ذات کے کوئی چیز باقی نہیں رہے گی ۔ جیسا کہ فرمایا:۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (اس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے)

قربِ خداوندی کے وقت دوسروں کی یاد

ایک بادشاہ نے ایک درویش سے درخواست کی جب آپ رب کی تجلی سے متجلی ہوں اور مقام قرب حاصل ہو تو مجھے بھی یاد رکھیں،" درویش نے جواب دیا جب میں مقام قرب میں ہوتا ہوں اور اس کی تجلیاں مجھ پر جلوہ فگن ہوتی ہیں تو اس وقت مجھے اپنی ہی یاد نہیں آتی میں تم کو کیسے یاد کر سکوں گا ۔ پھر مولانا نے فرمایا لیکن جب اللہ رب العلمین کسی کو منتخب کر کے اسے اپنی ذات میں مستغرق فرماتا ہے تو اگر کوئی بندہ والے شخص کا دامن پکڑ لے اور اس سے کشود کار کا طالب ہو تو یہ برگزیدہ ہستی بارگاہ الٰہی میں اس کی کشود کار کی بابت سفارش نہ بھی کرے تب بھی حق تعالیٰ اس کی آرزو پوری فرما دیتا ہے،

قرب والے کس طرح کشود کار کرتے ہیں؟

فرمایا کہ ایک واقعہ اس طرح منقول ہے کہ کسی بادشاہ کا ایک نہایت مقرب اور خاص الخاص خادم تھا جب وہ بادشاہ کے پاس جاتا تو ضرورت مند اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کو رقعوں اور پرچوں پر لکھ کر اس کو دے دیتے تاکہ وہ انھیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے ان کی حاجت روائی کا انتظام کرائے یہ خادم خاص ان تمام پرچوں کو ایک خریطہ میں رکھ لیتا تھا لیکن جب وہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو اس کے جمال کی تاب نہ لا کر اپنے ہوش و حواس کھو دیتا اور بیہوش ہو کر گر جاتا ۔ محبت و عقیدت کے طور پر بادشاہ یہ سوچتا کہ یہ میری محبت میں مدہوش ہوا ہے لہٰذا وہ اس کی جیبیں اور خریطہ دیکھتا اور وہ سارے رقعے اور پرچے نکال کر ان کی پشت پر ان کے بارے میں احکام صادر کر دیتا اور پھر انھیں دوبارہ اس کے خریطہ میں رکھ دیتا! وہ ان درخواست گزاروں میں سے کسی کی درخواست

کو ، نہ کرتا ، بلکہ ان کی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی عطا کرتا لیکن وہ امرا و خواص جو بادشاہ کے سامنے جاکر اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے تھے ان کو یہ حوصلہ نہ ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کے سامنے لوگوں کی حاجتوں کو پیش کریں لیکن اگر وہ کسی کی درخواست ہزار منت و سماجت کے بعد لے بھی جاتے تو سو میں سے ایک دو ہی کی درخواست منظور ہوتی اور سو میں سے ایک دو کی مقصد برآری ہوتی ۔

فصل

انسان کا دنیا میں مقصودِ حقیقی

فراموش نہ کرنے والی چیز مولانا کی خدمت میں ایک حاضر باش نے عرض کیا کہ میں یہاں ایک چیز بھول گیا ہوں ۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو فراموش کرنی نہیں (اس کو بھولنا نہیں چاہیئے) اگر تم تمام چیزوں کو یاد رکھو اور ان کے مطابق کام کرو اور اس ذات کو جو بھولنے کے لائق نہیں ہے نہ بھولو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے (اور اگر اس کو بھول گئے اور باقی تمام باتوں کو یاد رکھا اور ان کے مطابق کام کیا تو غضب ہے تم نے کچھ بھی نہ کیا)

اسی طرح انسان دنیا میں ایک مقررہ کام کے لئے آیا ہے اگر اس نے وہ کام نہیں کیا تو گویا کہ اس نے کوئی کام نہیں کیا۔

انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت و الارض و الجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا ٥ (احزاب ع ۹)

ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان اور پہاڑوں کو پیش کی لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور اس سے خوفزدہ ہوگئے لیکن انسان نے اس (امانت) کو اٹھا لیا بیشک وہ اپنے اس فعل میں بے خبر اور ظالم تھا ۔

ان امانتوں کو ہم نے کن کن کے سامنے پیش کیا لیکن وہ ان کو قبول نہ کر سکے۔ دیکھو اس سے ہزاروں دوسرے کام سرزد ہوتے ہیں۔ ان کے ادراک سے عقل عاجز ہے۔ پتھروں کو لعل و یاقوت میں تبدیل کرتا ہے، پہاڑوں کو سونے اور چاندی کی کانوں میں تبدیل کرتا ہے، نباتات اور زمین کو جوش میں لاتا ہے، قوتِ روئیدگی بخشتا ہے، زمین کو زندہ (سرسبز و شاداب) کر کے اس کو جنّت نظیر بناتا ہے۔

زمین کو دیکھو، بیجوں کو قبول کرتی ہے، درختوں کو اُگاتی ہے اور عیوب کو چھپاتی ہے اور ایسے صدہا عجائبات ہیں جن کا مفصل بیان نہیں کیا جا سکتا وہ ظاہر کرتی ہے۔

اسی طرح پہاڑ انواع و اقسام کی معدنیات پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ سب کچھ تو کرتے ہیں وہ کام نہیں کر سکتے جو ایک انسان انجام دیتا ہے کیونکہ کرامت انسان کو عطا کی گئی ہے، آسمانوں اور نہ زمینوں کو نہیں۔ خالقِ کائنات نے ولقد کرمنا بنی آدم (ہم نے بنی آدم کو اعزاز و اکرام عطا کیا ہے) فرمایا اور ولقد کرمنا السماء والارض۔ نہیں فرمایا۔ اس طرح انسان نے وہ کام انجام دیا جو نہ آسمانوں سے ہو سکا، نہ زمین سے اور نہ پہاڑوں سے اور اسی کارگزاری کی وجہ سے اس کے ظلم اور جہل کی نفی ہو گئی (جس کے بارے میں اوّلاً کہا گیا تھا)

یہاں اگر تو یہ کہے کہ اگر میں وہ ایک کام نہیں کرتا تو کیا ہے؟ اس کے علاوہ تو اور بہت کام کر لیتا ہوں (تو سن اور توجہ کر) انسان کو ان دوسرے کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے تو اس کو اس مثال سے اس طرح سمجھ کہ اگر تو ہندی فولاد کی ایسی تلوار خریدے جس کی مثل شاہی خزانہ میں بھی نہ ہو اور اس کو قصاب کا بُغدا بنا کر کہے کہ میں تلوار کو بیکار بنا کر نہیں رکھنا چاہتا یا سونے کی دیگ میں تو شلغم پکائے حالانکہ اس سنہری دیگ کے بدلے ہزاروں معمولی دیگیں آسکتی ہیں۔ یا ایک جوہر دار مرصّع چھری سے تو کھونٹی کا کام لے اور یہ کہے کہ میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اس سے کھونٹی کا کام لوں اور ٹوٹے ہوئے خشک کدو کو اس سے لٹکاؤں تو سو دینار قیمت رکھنے والی چیز سے یہ کام لینا کونسی دانشمندی ہے؟ کیا افسوس اور

تعجب کی بات نہیں کیونکہ کھونٹی کا کام ایک لکڑی یا معمولی قیمت کی کیل سے بھی لیا جاسکتا ہے۔

انسان کی قیمت عظیم ہے اللہ رب العلمین نے تو تیری قیمت بہت عظیم مقرر فرمائی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:۔

ان اللّٰہ اشتری من المومنین انفسہم واموالہم بانّ لہم الجنۃ (توبہ ع ۱۴) — اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔

تو بقیمت برابر جانی — چہ کنم قدرِ خود نمی دانی

تو قیمت میں جان کے برابر ہے، کیا کروں کہ تو خود اپنی قدر نہیں جانتا۔

مصرع:۔ مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

خود کو سستا مت بیچ کیونکہ تیری قیمت بہت زیادہ ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے اوقات کو تمہارے نفوس کو تمہارے اموال اور تمہارے روزگار کو تم سے خرید لیا ہے۔ اگر ان کو میری راہ میں تم نے خرچ کر دیا یا (جان) میرے سپرد کر دی تو اس کے بدلہ میں ہمیشہ باقی رہنے والی جنت تم کو ملے گی اور یہی میرے یہاں تمہاری قیمت ہے لیکن اگر تم خود کو دوزخ کے ہاتھ فروخت کردو تو خود اپنے آپ پر ظلم کروگے۔ جس طرح سو دینار کی چھری کو کھونٹی کی جگہ استعمال کر کے اس میں کدو یا کوزہ لٹکا دیا[له]۔

علم کے حصول کا مقصد اس تمہید کے بعد ہم اصل مقصد کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ تم یہ بہانے اور حیلہ طرازی کرتے ہو کہ ہم تو خود کو بلند مقاصد کے حصول کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں اور علوم فقہ، حکمت، منطق، نجوم اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں آخر یہ سب تو تمہارے ہی لئے ہے۔

اگر فقہ کی تعلیم ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی تمہارے ہاتھ سے روٹی نہ چھینے اور جسم سے کوئی کپڑے نہ اتروائے اور تمہیں کوئی قتل نہ کرے اور تم سلامت رہو۔

له فقراء اور درویش اپنے کشکول جو کدو ئے خشک سے بناتے ہیں، کھونٹی میں لٹکا دیتے ہیں۔

یا نجوم و فلکیات کا علم کہ آسمانی گردشیں اس کے زمین پر اثرات، دنیا میں گرانی و ارزانی امن و خوف وغیرہ معلوم ہوتے ہیں تو تمام امور کا تعلق بھی تمہارے حال و احوال سے ہے اور تمہارے لئے ہے، ستاروں کی سعادت و نحوست جو تمہارے طالع سے تعلق رکھتی ہے وہ تمہارے لئے ہے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ ان سب علوم کی اصل تم خود ہو اور تمام علوم تمہاری ہی فرع ہیں۔

جب تمہاری فروع میں اس قدر تفاصیل ہیں اور عجائب اور بے انتہا بوقلمونیاں ہیں تو اس سے تم اندازہ کر لو کہ تمہاری اصل کا کیا حال ہو گا۔ جب تمہاری فروع کے لئے عروج و نزول سعد و نحس وغیرہ بات ہیں تو تمہاری اصل کے لئے عروج و نزول، سعد و نحس اور نفع و ضرر کس منزل اور بلندی پر ہونگے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ فلاں روح یہ خاصیت رکھتی ہے اور اس سے یہ کیفیات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ یہ کچھ کر سکتی ہے۔

کھانے اور سونے کے علاوہ اور کام بھی ہیں

یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ تمہارے لئے اس خورد و خواب کے علاوہ کچھ اور غذا بھی ہے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (جس سے سرکارِ دو عالم کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے) ابیت عند ربی یطعمنی ویسقینی ۔ میں اپنے رب کے ساتھ رہتا ہوں اور وہی مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

حیف کہ اس عالم میں تم نے اصل غذا کو بھلا دیا ہے اور تم ایسی غذاؤں کے چکر میں پڑ گئے ہو جو تن پروری کا سبب ہوتی ہیں اور اس شان سے کچھ تمہارا تن گھوڑے کی طرح ہے اور یہ دنیا اس کے لئے اصطبل کی مانند ہے۔ غور کرو کہ گھوڑے کی خوراک سوار کے لئے کار آمد نہیں ہوتی (اس کی نعمت بالکل جدا ہے) مگر تم اپنے اسپ تن ہی کو عمدہ خوراک اور عیش و آرام دے رہے ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم پر حیوانیت کا غلبہ ہے۔ تم شہسوار ہوتے ہوئے گھوڑوں سے پیچھے رہ گئے ہو اور عالم بقا کے امراء اور عمائدین کی صفوں میں تمہارے لئے کوئی مقام نہیں رہا ہے۔ اگرچہ تمہارا دل وہاں لگا ہوا ہے لیکن چونکہ تم پر جسم کا غلبہ ہے اس لئے تم اس کے محکوم بن گئے ہو اور

اس کی قید میں ہو۔ اس کی مثال مجنوں کے اس واقعہ سے ملتی ہے۔

مثال ایک مرتبہ مجنوں اونٹ پر سوار ہو کر لیلیٰ کی جانب چلا جب تک ہوش و حواس میں رہا اونٹ کو صحیح سمت میں چلاتا رہا لیکن جب لیلیٰ کے تصوّر میں مستغرق ہو گیا تو نہ تو اپنا ہوش رہا اور نہ اونٹ کا خیال اتفاق سے مجنوں کے گاؤں میں اونٹ کا بچہ رہ گیا تھا اس لئے جب اونٹ نے یہ محسوس کیا کہ سوار میری طرف سے غافل ہو گیا ہے تو اُس نے گاؤں کو واپسی کا سفر شروع کر دیا اور جب مجنوں کو ہوش آیا تو اونٹ دو تین روزہ واپسی کی راہ طے کر چکا تھا اسی طرح تین ماہ اس راہ میں گزر گئے آخر کار مجنوں نے یقین کر لیا کہ میری اس مصیبت کا باعث یہ اونٹ ہے یہ خیال کر کے مجنوں اونٹ پر سے اتر گیا اور پا پیادہ ہی سفر پر روانہ ہو گیا۔ یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

ھوی ناقتی خلفی وقدّامی ھوای — وانّی وایّاھا لمختلفان

ناقہ کا محبوب (بچہ) پیچھے رہ گیا ہے، جبکہ میرے محبوب کی منزل آگے ہے وا افسوس کی بات یہ کہ دونوں کی منزل جدا ہے

مدح و ثنا کے سلسلہ میں ایک بحث

مولانا فرماتے ہیں کہ محقق وقت سیّد برہان الدین ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے آ کر کہا کہ فلاں شخص آپ کی تعریف کر رہا تھا میں نے کہا کہ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون شخص ہے اور اس میں یہ صلاحیت بھی ہے کہ وہ مجھے پہچان سکے اور میری تعریف کرے۔ اگر اس نے میری باتوں سے مجھے پہچانا ہے تو اس کی معرفت درست نہیں کیونکہ نہ تو یہ باتیں دائمی ہیں اور نہ حروف وصوت ہمیشہ رہنے والے ہیں اور نہ یہ لب و دہن باقی رہیں گے۔ یہ تمام کے تمام عارضی ہیں اور اگر اس نے مجھے میرے افعال سے پہچانا ہے تب بھی میں یہی کہوں گا کہ یہ افعال بھی ماسبق میں ذکر کی ہوئی چیزوں کی طرح فنا ہو جانے والے ہیں۔ اگر اس نے میری ذات کی معرفت حاصل کی ہے تب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں صلاحیت ہے کہ وہ میری تعریف

کر سکے اس نے جو تعریف کی ہے وہ میری ہی تعریف ہے[1]۔ اور اس نکتہ کو اس مثال سے سمجھو کہ ایک بادشاہ نے اپنے شاہزادے کو چند صاحبانِ علم و ہنر کے سپرد کیا تھا کہ اس کو علم نجوم و رمل وغیرہ میں ماہر و کامل کر دیں۔ ان اساتذہ نے شاہزادہ کو ان تمام علوم میں کامل تو کر دیا لیکن اس کی حماقت اور بے وقوفی برقرار رہی۔ ایک دن بادشاہ نے شاہزادہ کا امتحان لینے کی غرض سے اپنی مٹھی میں انگوٹھی لے کر دریافت کیا بیٹا! بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ بیٹے نے بتایا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک گول چیز ہے جو زرد رنگ کی ہے اور جوف دار ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ تم نے نشانیاں تو بالکل ٹھیک بتائی ہیں، اب یہ بھی بتا دو کہ وہ کیا چیز ہے؟ شاہزادہ نے کہا کہ وہ ایک چھلنی ہو سکتی ہے، بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ تم نے وہ نشانیاں تو جن کو آسانی سے دریافت نہیں کیا جا سکتا تھا اپنے قوتِ علم کے زور سے ٹھیک ٹھیک بتا دیں لیکن یہ خیال نہ کیا کہ اتنی بڑی چھلنی میری مٹھی میں آ بھی سکتی ہے؟

مولاناؒ نے اس واقعہ کو سنا کر فرمایا (بلا تمثیل و تشبیہ ہم کہہ سکتے ہیں) کہ موجودہ زمانہ میں علمائے علوم کے سلسلہ میں موشگافیاں تو کرتے ہیں اور ان باتوں میں جو ان کی ذات سے متعلق نہیں، خاصا درک بھی رکھتے ہیں لیکن اصل چیز اور اہم نکتہ جو ان کی ذات سے متعلق ہے وہ ان کی خودی ہے اس کو وہ فراموش کئے ہوئے ہیں، علاوہ ازیں وہ دوسرے امور میں اپنے ادراک اور کمال کی وجہ سے حلّت و حرمت کا حکم بھی لگانے لگتے ہیں اور ان امور کے سلسلہ میں فتویٰ بھی صادر کر دیتے ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، یہ جائز ہے اور یہ ناجائز ہے، لیکن انھیں اپنی ذات کے بارے میں احساس نہیں ہوتا کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ جائز ہے یا ناجائز، پاک ہے یا ناپاک؟

انگشتری کا یہ جوف اور زردی، اس کے نقش و نگار وغیرہ اس کی ذات کے ساتھ عارضی ہیں جب اس کو آگ میں ڈالا جائے گا تو یہ تمام عوارض اپنی حیثیت کو ختم کر دیں گے صرف اس کی ذات

---

[1] سپہ سالارؒ نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن عبارت میں قدرے اختلاف ہے البتہ اس عبادت کا مفہوم بھی یہی ہے۔ سپہ سالارؒ حضرت مولانا رومیؒ کے مرید خاص تھے اور مدت مدید تک آپ کی صحبت میں رہے ہیں سپہ سالارؒ کی یہ تالیف مولانا رومیؒ کی پہلی سوانح عمری ہے۔

ان سب سے علیحدہ ہو جائے گی صاف، ستھری۔

لوگ اپنے کلام قول و فعل کی صورت میں جن چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں ان کا تعلق جوہر کے ساتھ نہیں ہوگا بلکہ یہ سب عرض ہوں گے، ان تمام عوارض کے بعد باقی رہنے والی چیز ذات ہی ہے اور اس کی نشانیاں اسی طرح ہیں، یہ تمام باتیں بتاتے تو ہیں اور ان کی تشریح و توضیح بھی کرتے ہیں لیکن آخر میں فیصلہ اسی طرح سناتے ہیں جس طرح شاہزادہ نے بادشاہ سے یہ کہہ دیا تھا کہ تمہاری مٹھی میں چھلنی ہے، کیوں کہ انھیں اصل کا علم نہیں ہے، اور نہ اپنی ذات کا علم رکھتے ہیں نہ وہ جانتے ہیں کہ وہ کونسا پرندہ ہیں اور نہ میرے بارے میں ان کو علم ہے کہ میں کونسا پرندہ ہوں، طوطی ہوں یا بلبل ہوں۔ اگر وہ مجھ سے یہ کہیں کہ تم کوئی اور آواز نکالو تو میرے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ میرا الکلم اور زبان یہی ہے اس کے علاوہ دوسری آواز نکالنا میرے لئے ممکن نہیں۔ برخلاف اس کے کہ جس نے مختلف آوازیں نکالنا سیکھی ہوں باوجودیکہ وہ خود پرندہ تو نہیں ہے بلکہ صیاد ہے اور پرندوں کا دشمن ہے پھر بھی وہ مختلف انداز میں اس طرح آوازیں نکالتا ہے تاکہ پرندے اس کو پرندہ سمجھیں کیونکہ وہ اصل آواز کی بجائے دوسری آوازیں نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جب وہ یہ آوازیں نکالتا ہے تو وہ اس کی اصل آواز نہیں ہوتی بلکہ وہ عارضی اور مستعار آوازیں ہوتی ہیں۔ اس کی مثال اس چور کی سی ہے جو دوسروں کے گھروں سے مال اٹھا لاتا ہے اور وہی دکھاتا ہے۔

فصل

تواضع

امیر پروانہ نے عرض کیا کہ مجھے توقع تو نہ تھی کہ حضرت مولانا تشریف ارزانی فرمائیں گے[1] مجھے تو یہ خیال بھی نہ تھا کہ میں اس قابل ہوں اور مجھے اس لائق سمجھا جائے گا مجھے تو یہ چاہیئے کہ میں ملازمین اور خدمت گاروں کی طرح ہمیشہ دست بستہ آپ کی خدمت میں حاضر رہوں کہ

---

[1] مولانا عبدالماجد کے مرتبہ نسخہ "فیہ ما فیہ" میں "تشریف نہ فرمود" چھپا ہے، صحیح یوں ہے "تشریف ارزانی فرمود" اسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مترجم

ہیں ابھی اس لائق نہیں ہوا ہوں، بایں ہمہ آپ کی جانب سے یہ کس قدر عظیم عنایت و مہربانی ہے یہ معروضہ سن کر مولاناؒ نے فرمایا کہ تمھارا یہ کہنا اس بات کا غماز ہے کہ تم عالی ہمت ہو۔ ہر چند کہ تمھارا مرتبہ بہت عظیم ہے اور تم عظیم الشان امور کی انجام دہی میں مشغول رہتے ہو، بایں ہمہ اپنے علو ہمت کے باعث خود کو قاصر سمجھتے ہو اور موجودہ صورتحال سے خوش نہیں ہو اور اپنی ذات کے لئے تم نے بہت سی باتیں ضروری قرار دے لی ہیں۔ اگرچہ ہمارا دل ہمیشہ تمھاری طرف متوجہ رہتا ہے لیکن ہم نے چاہا کہ ہم تمہارے دیدار سے مشرف ہوں تو اچھا ہے کیونکہ عالم اسباب میں صورت اور شکل بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تمثیل کے طور پر یوں سمجھ لو کہ اعتبار کو مغز (اصل) کے ساتھ ایک مشارکت حاصل ہے لیکن جس طرح بغیر مغز کے کام نہیں بن سکتا اسی طرح چھلکے اور پوست کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ تمثیل کے طور پر یوں سمجھ لو کہ اگر چھلکا اتار کر دانہ کو زمین میں بویا جائے تو وہ نہیں اُگے گا لیکن اگر دانہ کو اس کی اصل شکل میں مع چھلکے کے بویا جائے تو وہ اُگے گا اور جس کا وہ دانہ ہے اس کا پودا ظاہر ہوگا اور آخر میں عظیم درخت کی شکل اختیار کرے گا۔ اس تمہید کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کیفیات میں جسم کو بھی اہمیت حاصل ہے اور یہ "ضرورت" کی منزل ہے جو نہایت اہمیت کی حامل ہے جس کے بغیر کام انجام نہیں پاتا اور مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

اے خدا کی قسم: معنی ہی اصل ہے، اگر شخص کے سامنے جس نے معنی کو سمجھ لیا ہو اور خود سراپا معنی بن گیا ہو اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ
رکعتان من الصلوٰۃ خیر من الدنیا و ما فیہا۔ یعنی نماز کی دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہیں۔
۲ دو رکعتوں کی یہ اہمیت ہر شخص کے نزدیک نہیں ہوگی بلکہ اس کی اہمیت کا وہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر اس کی ۲ دو رکعتیں فوت ہو جائیں تو اسے اتنا شاق ہو کہ اگر دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس کی ملک ہوتا اور یہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تب بھی اس پر اتنا شاق نہ گزرتا (جتنا ان ۲ دو رکعتوں کا فوت ہونا)۔

زاہد کون ہوتا ہے ایک درویش کی ایک بادشاہ سے ملاقات ہوئی تو بادشاہ نے اُس سے کہا "اے زاہد کیا حال ہے"؟ درویش نے بادشاہ سے کہا "زاہد میں نہیں تم ہو" بادشاہ نے کہا کہ میں زاہد کس طرح ہو سکتا ہوں جب کہ دنیا میری ملک ہے" زاہد نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے دنیا آخرت اور تمہارا یہ ملک تو میری ملکیت ہے اور تمام عالم میرے قبضہ میں ہے۔ تم تو بس اچھے لباس اور عمدہ غذاؤں پر قناعت کر چکے ہو۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ جس طرف منہ کرو گے جلوۂ الٰہی پاؤ گے۔

یہی وہ شکل ہے جو جاری وساری (رالهٰی) اور باقی ہے اور عشاق نے خود کو اس پر فدا کر رکھا ہے جس کا بدلہ طلب نہیں کرتے۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اوپر بیان کیا گیا ہے باقی جو عوام ہیں وہ چوپایوں کی طرح ہیں (یہ خواص ہی ہیں جو اینما تولوا فثم وجہ اللہ اور رکعتان من الصلوٰۃ خیر من الدنیا و ما فیہا کو سمجھ سکتے ہیں باقی تو العوام کالانعام کے زمرہ میں ہیں)

عجیب نکتہ مولانا نے پھر ارشاد فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ "انعام" کے زمرے میں ہیں، بانیہمہ مستحق انعام ہیں۔ اگرچہ یہ اصطبل (دنیا) میں ہیں لیکن داروغہ اصطبل کے منظورِ نظر ہیں کہ وہ جب چاہے ان کو اصطبل سے نکال کر طویلۂ خاص میں لے جائے جس طرح اس کو عدم سے نکال کر وجود میں لایا۔ (طویلۂ عدم سے نکال کر طویلۂ وجود میں منتقل کیا اس کے بعد طویلۂ جماد سے طویلۂ نباتی میں منتقل کیا، طویلۂ حیوانی، طویلۂ انسانی اور وہاں سے طویلۂ ملکی میں۔ اسی طرح درجہ بدرجہ منتقل کیا جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے[1] نباتات کے طویلۂ میں منتقل کر دیا پھر نباتات سے حیوانات پھر لباس انسانی میں منتقل کر کے اور ایک منزل آگے بڑھا کر فرشتوں میں لایا گیا اس طرح غیر متناہی سلسلہ جاری رہا اور یہ غیر متناہی سلسلہ

[1] حضرت مولانا رومؒ نے تخلیق انسانی کے ان مراتب و منازل کو مثنوی معنوی میں کئی جگہ بیان فرمایا ہے مثنوی دفتر اول میں "آمدہ اول بہ اقلیم جماد" کے تحت اور مثنوی دفتر سوم میں "جواب عاشقاں عاذلاں" کے تحت "از جمادی مُردم و نامی شدم" کے تحت بیان کیا ہے اور ان عنوانات کے تحت ان آیات قرآنی کی تشریح کی ہے۔ ولقد خلقنا الانسان من سُلٰلۃٍ من طین تا خلقنا آخرؕ (سورۂ مومنون پارہ ۱۸ ع ۱)۔

اس لئے جاری ہوا تاکہ تم اقرار کرلو کہ طولیوں کا یہ طویل سلسلہ ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ طبقا عن طبق فما لھم لا یؤمنون (سورۃ انشقاق) درجہ بدرجہ (چڑھتے رہو گے) ان لوگوں کو کیا ہوا جو ایمان نہیں لاتے"۔ یہ منظر کشی اس لئے کی گئی ہے تاکہ آئندہ پیش آنے والے دوسرے طبقات کا تم اقرار کرلو۔ یہ اس لئے نہیں بتایا گیا ہے کہ تم انکار کرو اور یہ کہو کہ "صرف یہی ہے" ایک استاد فنکار در کاریگر اپنے فن کی نمائش اس لئے کرتا ہے کہ عوام اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرلیں اور دوسروں کے فن پارے جن کی نمائش نہیں کی گئی ہے ان کے بارے میں بھی اعتراف کرلیں اور ان پر ایمان لے آئیں۔

اس بات کو مثال سے اس طرح سمجھیں کہ ایک بادشاہ لوگوں کو خلعت و انعام سے سرفراز فرماتا ہے کہ اس سے دوسری چیزوں کی بھی توقع کی جائے اور یہی توقع تھیلیوں پر تھیلیاں دلواتی ہے، بادشاہ خلعت اس لئے نہیں دیتا کہ لوگ یہ سمجھیں اور کہیں کہ یہ تو بس اتنا ہی دے سکتا تھا اس سے زیادہ نہیں دے سکتا نہ اس کے پاس کچھ اور ہے بادشاہ کو اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ لوگ ایسا کہیں گے یا سمجھیں گے تو وہ ہرگز کسی کو انعام نہ دے۔

زاہد وہ ہے جس کی نظر آخرت پر ہو اور دنیا والے آخر یعنی اصطبل کی طرف دیکھنے والے ہیں لیکن وہ لوگ جو خاص الخاص اور (عارف) ہیں نہ آخر کو دیکھتے ہیں نہ آخر کو ان کی نظر ابتدائے حقیقی پر ہے اور وہ ہر کام کے آغاز کی معرفت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی دانشمند گیہوں کی کاشت کرتا ہے تو وہ یہ جانتا ہے کہ گندم ہی اُگے گا لہٰذا وہ شروع سے ہی انجام پر نظر رکھے ہوئے تھا جب اس نے جو اور چاول بوئے تو اس کو یہ یقین ہے کہ چاول یا جو ہی اگیں گے لہٰذا اس کو انجام کی فکر نہیں رہتی۔ ایسے جن کی نظر اوّل حیثیت پر ہی ہو تو ان کا تعلق نادر روزگار لوگوں میں سے ہوگا اور وہ لوگ متوسطین میں شمار ہونگے جن کی نظر انجام کار پر ہوتی ہے اور وہ لوگ جو آخر میں ہیں وہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔

درد (لگن یا جذبہ) کیا ہے؟ یہ درد ہی ہے جو ہر کام میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے جب تک انسان کے اندر لگن یا جذبہ پیدا نہیں ہوتا وہ اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ یعنی بغیر جذبہ کے کام ہوتا ہی نہیں، خواہ وہ کام عالمِ دنیا سے متعلق ہو یا عالمِ آخرت سے، سوداگری ہو یا تجارت، حکومت ہو یا قیادت، حصول علم ہو یا فلکیات کی تعلیم وغیرہ ان سب میں جذبہ اور لگن کی ضرورت ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ جب تک جناب مریم علیہا السلام کو دردِ زہ نہ ہوا آپ کھجور کے درخت کے پاس نہ گئیں۔ قرآن مجید کی یہ واضح آیت

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ (وہ دردِ زہ آپ (حضرت مریمؑ) کو کھجور کے درخت کے پاس لے گیا۔ (سورۂ مریم ع)

اس پر دال ہے کہ دردِ زہ ان کو درخت خرما تک لے گیا۔ یہی بات شعر میں اس طرح کہی گئی ہے۔

الم تر ان اللہ قال لمریم — الیک فہزی الجذع یسقط الرطب

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جناب مریمؑ سے فرمایا کہ درخت خرما کو ہلاؤ تو اس سے تر کھجوریں ملیں گی۔

ولو شاء ان تجنی الجذع من غیر ہزۃ — الیہا ولکن کل شیئی لہ سبب

لیکن اگر کوئی چاہے کہ کھجوریں بغیر درخت کو ہلائے مل جائیں تو سنو ایسا نہ ہوگا کیونکہ ہر کام کیلئے کوئی نہ کوئی سبب مقرر کر دیا گیا ہے، جناب مریمؑ کو دردِ زہ درخت تک لایا اور خشک درخت میوہ دار اور تر ہو گیا اس کو یوں سمجھو کہ انسانی جسم جناب مریمؑ کی طرح ہے اور ہم میں ہر شخص اپنے اندر ایک عیسیٰ رکھتا ہے جب ہمارے اندر درد اور لگن پیدا ہوتی ہے تو ہمارے باطن سے ہمارا عیسیٰ یعنی جذبہ جنم لیتا ہے اور اگر درد پیدا نہیں ہوتا تو وہ صفت جس کو ہم نے عیسیٰ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے واپس ہو کر اپنی اصل کی جانب لوٹ جاتی ہے اور ہم عمل سے محروم اور ان صفات وکیفیات کے حصول سے بے بہرہ رہتے ہیں۔

جاں از درون بفاقہ وطبع از برون ببرگ — دیو از خورش بہ تخمہ وجمشید ناشتا

(روح) تو جسم کے اندر فاقہ کا شکار ہے — اور باہر جسم کو ساز وسامان حاصل ہے

تو کیا فائدہ؟ اندرونی شیطان کثرتِ طعام سے ہیضہ کا شکار ہے اور جمشید (روح) بھوکا ہے۔

اکنوں بکن دوا کہ مسیح تو بر زمین است — چوں شد مسیح سوئے فلک فوت شد دوا

علاج کا یہی موقع ہے، اور علاج ممکن ہوگا کہ تیرا مسیحا زمین پر موجود ہے۔ جب مسیح آسمان پر

پہنچ جائے گا تو دوائی فوراً ختم ہو جائے گی (علاج ممکن نہ ہوگا)

فصل

ادراک اور شناخت

یہ گفتگو اس شخص کیلئے ہے جو گفتگو سن کر کسی بات کا ادراک کرنا چاہتا ہے اور جو بغیر سخن کے ہی ادراک کر سکتا ہے اس کے لئے بات کی کیا حاجت ہے، آخر یہ آسمان اور زمین سب کے سب اس شخص کیلئے جو ادراک کر سکتا ہے سخن ہی تو ہیں اور یہ سب سخن "کن فیکون" ہی سے پیدا ہوئے ہیں پس جو شخص نیچی آواز کو سن سکتا ہے اس کے لئے بلند آواز اور غوغا کی کیا حاجت ہے۔

ایک عربی زبان کا شاعر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا بادشاہ ترک تھا، وہ فارسی سے بھی نابلد تھا، اس شاعر نے بادشاہ کے لئے ایک نہایت شاندار قصیدہ کہا تھا اور سنانے لایا تھا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور جملہ اعیان و اُمراء حاضر تھے، جیسا کہ مقررہ قاعدہ ہے سب سب لوگ اپنے مقامات پر حسب منصب بیٹھ گئے تو شاعر اٹھا اور قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ادھر شاعر اپنا قصیدہ پڑھ رہا تھا ادھر بادشاہ ہر اچھے شعر پر سر ہلا کر اسے داد و تحسین سے نواز رہا تھا جن اشعار میں استعجاب کا منظر ہوتا تو اس کے چہرے پر تعجب کی کیفیت طاری ہو جاتی اور تواضع و انکسار کے موقع پر وہ اسی قسم کے تاثرات کا اظہار کرتا، امراء و حاضرین بادشاہ کی اس کیفیت کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ تو اس انداز میں اپنی حرکات سے شاعر کو داد دے رہا ہے جیسے یہ عربی سے واقف ہے اور اس قصیدہ سے محظوظ ہو رہا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس نے سالہا سال تک یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ عربی سے بھی واقف ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ اس طویل مدت میں ہم نے عربی زبان میں بادشاہ کی شان کے خلاف بہت سی باتیں کہی ہوں گی اور ہم سے بے ادبی بھی ہوئی ہوگی۔

اس واقعہ کے بعد تمام درباریوں نے متفق ہو کر آپس میں صلاح و مشورہ کیا اور بادشاہ کے ایک منہ چڑھے غلام کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ سے یہ معلوم کرے کہ وہ عربی زبان سے واقف ہے یا نہیں؟ اگر وہ عربی زبان سے واقف نہیں ہے تو قصیدہ سنتے وقت اس کا انداز تحسین ایسا کیوں کر تھا اور اشعار سن کر مختلف انداز کیونکر اختیار کرتا رہا۔ کیا اس کو الہام سے تعبیر کیا جائے یا کرامت سمجھا جائے۔

ایک دن بادشاہ شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ چونکہ اس کو بہت شکار ملا تھا اس لئے وہ بہت خوش تھا۔ غلام نے موقع کو مناسب خیال کر کے بادشاہ سے اس دن کے واقعہ کی بابت معلوم کیا تو بادشاہ غلام کے سوال پر ہنس کر کہنے لگا خدا کی قسم میں عربی زبان سے قطعاً واقف نہیں ہوں لیکن میں نے جو بر محل سر ہلا کر شاعر کو داد تحسین دی اس کی حقیقت یہ تھی کہ میں شاعر کے پڑھنے کے انداز سے شعر کا اندازہ کر لیتا تھا اور یہ سمجھ لیتا کہ شاعر کا مقصد اس شعر سے کیا ہے اور اسی کو تم نے میرے اندازِ شعر فہمی پر محمول کیا۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقصود اصل ہے اور شعر اظہار مقصود کا ذریعہ اور اس کی فرع ہے۔ اگر مقصود نہ ہوتا تو یہ شعر نہ کہا جاتا۔ پس اگر تم مقصود کو پالو تو یہ دوئی باقی نہ رہے۔ اصل تو ایک ہی ہے اور دوئی فرع میں ہوتی ہے۔

مشائخ کے مختلف طریقے

ان مثالوں کے بعد حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اگرچہ صورتوں کے اعتبار سے مشائخ کے طریقے اور ان کے احوال، اقوال مختلف ہیں لیکن ان سب کا مقصود ایک ہی ہے۔ جس کو خدا طلبی کہا جاتا ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں ہوا چلتی ہے تو اس سے قالین کا کونہ حرکت میں آتا ہے اور کمبل الٹنے پلٹنے لگتے ہیں اور خس خاشاک اڑنے لگتے ہیں یہی ہوا پانی کے حوض میں لہروں سے زرہ بنانے لگتی ہے درختوں، شاخوں اور پتوں کو رقصاں کر دیتی ہے اور یہ تمام احوال مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں لیکن حقیقت یا مقصود ایک ہی ہے اور ان سب کی جنبش صرف اور صرف ہوا کے سبب سے ہے (جنبش اور تحرک کے انداز و احوال مختلف ہیں)

ان تمام تمثیلوں کو سن کر امیر پروانہ نے کہا کہ واقعی ہم قصور دار ہیں۔ پروانہ کی بات سن کر مولاناؒ نے فرمایا۔ جس کسی کو یہ فکر ہو اور وہ اپنے آپ سے ناراض ہو اور اپنی ذات سے خوش نہ ہو اور یہ سوچے کہ میں کیسا ہوں اور ایسے کام کیوں کرتا ہوں اور مجھ سے ایسی حرکات کیوں سرزد ہوتی ہیں تو یہ عمل دوستی کا اظہار اور مرشد کی عنایت کی دلیل ہے (بقی الحبّ ما بقی العتاب (دوستی باقی رہتی ہے عتاب باقی نہیں رہتا)

ناز و عتاب اپنوں ہی پر ہوتا ہے۔ یہ کلیہ ہے کہ عتاب دوستوں ہی پر کیا جاتا ہے غیروں پر غصہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن عتاب بھی متفادت ہوتا ہے۔ (ہر ایک پر عتاب یکساں نہیں ہوتا اور نہ ہر ایک امر کو عتاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) جس کے اندر درد طلب ہے تو اس کو اس بات کی خبر ہو گی کہ یہ عتاب دلیل محبت عنایت ہے اور امر حق سے محبت کے باعث ہے اور اگر درد مقصود کسی کے اندر نہیں ہے اس پر عتاب کیا جائے اور اس میں درد پیدا نہ ہو تو اس سے ظاہر ہے کہ اس میں محبت کا فقدان ہے۔ غور کرو کہ قالین کو جھاڑنے اور صاف کرنے کے لئے اگر اس پر ضربات لگائی جائیں تو دانشور اس کو کسی عتاب سے تعبیر نہیں کریں گے لیکن اگر یہی قالین جھاڑنے والا اپنے محبوب کو اور فرزند کو اس طرح مارے تو اس کو عتاب سے تعبیر کیا جائے گا۔ اور یہی وہ محل ہے جہاں محبت کی دلیل ظاہر ہوتی ہے۔

اب اگر تم خود کو شرمندہ و پشیمان و پریشان دیکھتے ہو (پشیانی کا احساس تمہارے اندر موجود ہے) تو یہ (پشیمانی) دوستی اور عنایت کی نشانی ہے۔ اگر تم کو اپنے بھائی میں کوئی عیب نظر آتا ہے تو حقیقت میں وہ عیب خود تمہارے اندر ہے جو تم کو اپنے بھائی میں نظر آتا ہے۔ دنیا تو آئینہ کی طرح ہے جس میں تم کو اپنا عکس نظر آتا ہے۔ کیونکہ المومن مرآۃ المومن (بخاری) مومن مومن کا آئینہ ہوتا ہے۔ پس اس عیب کو خود سے دور کرو۔ کیونکہ وہ تم کو پسند نہیں ہے اور تمہاری یہ ناپسندیدگی خود اپنی ذات سے ہو گی۔

عکس سے دھوکا کھانا

کہا جاتا ہے کہ ایک ہاتھی کو پانی پلانے کے لئے چشمہ پر لایا گیا۔ جب اس کو پانی کے قریب لائے اور اس نے پانی میں اپنا عکس دیکھا تو وہ اسے دیکھ کر بھڑک اٹھا اور یہ سمجھا کہ وہ کوئی دوسرا ہاتھی ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اس کا خود اپنا عکس ہے۔ تمام بُرے اخلاق ظلم، کینہ، حسد، حرص، بے رحمی، تکبر، جو تمہارے اندر ہیں ان سے تم کو تکلیف بالکل نہیں ہوتی، لیکن جب ان کو تم دوسروں میں دیکھتے ہو تو تمہیں تکلیف ہوتی ہے اور ان کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اس طرح

تم خود ہی اپنی ذات سے بھاگتے ہو اور خود ہی رنجیدہ ہوتے ہو (یہ تمہارے ہی عیوب ہیں جن کو تم دوسروں میں دیکھ کر نالاں ہو) ایک مثال سے اس بات کو سمجھو! انسان اپنے دو، زخم اور پھنسی سے نفرت نہیں کرتا۔ بے تکلف وہ اپنی زخمی انگلیوں کو کھانے (شوربہ وغیرہ) میں ڈال دیتا ہے اور پھر اس کو چاٹتا ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کی کراہیت پیدا نہیں ہوتی لیکن اگر کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں ذراسی خراش دیکھ لے تو کراہیت کا اظہار کرتا ہے۔
پس یوں سمجھو کہ بُرے اخلاق بھی زخموں اور پھوڑوں کی طرح ہیں۔ اپنی حالت اگر ان بُرے اخلاق سے زبوں ہے تو اس سے نفرت و کراہیت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دوسرے میں ذراسی بھی خرابی نظر آئے تو انتہائی نفرت و کراہیت محسوس ہوتی ہے اور جس طرح تم اس سے بھاگتے اور دور رہتے ہو۔ اسی پر یہ قیاس کرو کہ وہ بھی تمہیں عیوب میں مبتلا دیکھ کر نفرت و کراہیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ کیونکہ فرمان (نبوی) ہے المومن مرآۃ المومن (مومن، مومن کے لئے آئینہ کی طرح ہے) اور اس ارشاد میں الکافر مرآۃ الکافر" (کافر کافر کا آئینہ ہے) نہیں فرمایا گیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کافر کے پاس وہ آئینہ نہیں بلکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس کو اپنے آئینہ ذات کا علم نہیں ہے۔

دریا میں اپنا عکس نظر آتا ہے

مثال کے طور اس کو اس حکایت سے سمجھیں کہ ایک بادشاہ دریا کے کنارے نہایت افسردگی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ امراء اور مقربین بھی بادشاہ کی اس افسردگی اور دل شکستگی سے ملول تھے اور خائف بھی تھے۔ وہ کسی طرح بھی بادشاہ کی افسردگی دور نہ کر سکے جس کی وجہ سے خوف میں اضافہ ہوتے لگا۔ آخر کار مقربین سے ایک ظریف الطبع اور بذلہ سنج نے اپنی امکانی کوشش کرلی کہ کسی طرح بادشاہ کو ہنسانے میں کامیاب ہوجائے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ بادشاہ اس اثنا میں مسلسل دریا کے پانی میں اپنا عکس دیکھتا رہا اور گردن نہ اٹھائی۔ بذلہ سنج مقرب نے تنگ آکر بادشاہ سے دریافت کیا کہ آپ مسلسل پانی میں

کیا دیکھ رہے ہیں۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں ایک دیوث کو دیکھ رہا ہوں۔ مقرب ظریف نے کہا کہ بادشاہ سلامت میں بھی اندھا نہیں ہوں۔ (مجھے بھی ایک دیوث پانی میں نظر آرہا ہے)

نتیجہ اس حکایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر تم کسی دوسرے میں کوئی خلقِ ذمیمہ دیکھتے ہو اور اس سے اذیت محسوس کرتے ہو تو دوسرا بھی اندھا نہیں ہے وہ بھی تمہارے ذمائم اخلاق کو اسی طرح دیکھ رہا ہے۔

انا کا خاتمہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں دو اناؤں کی گنجائش نہیں کیونکہ تم بھی اپنی ذات کو انا سے تعبیر کرتے ہو اور وہ بھی ذات کو "انا" فرماتا ہے۔ اب اس سلسلے میں ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔ یا تو اس کے سامنے فنا ہو جاؤ یا وہ تمہارے سامنے فنا ہو جائے۔ تاکہ دوئی ختم ہو لیکن یہ بات مدنظر رکھنی ہو گی کہ یہ بات تو خارج از امکان ہے ذہن میں بھی اور خارج میں بھی کہ وہ فنا ہو جائے کیونکہ اس کی صفت تو حیّ لایموت ہے (آیت قرآنی) هو الحی الذی لایموت (وہ ایسا زندہ ہے جس کو کبھی موت نہیں آئیگی۔) وہ تو اس لطف و کرم کا حامل ہے کہ اگر خارج از امکان نہ ہوتا تو وہ تمہارے لئے فنا ہو جاتا تاکہ دوئی کا خاتمہ ہو جائے! اب چونکہ اس کا فنا ہو جانا ممکن نہیں ہے لہٰذا دوسری شکل یہی باقی رہ جاتی ہے کہ تم فنا ہو جاؤ تاکہ اس کی تجلی تم پر ہو اور اس دوئی کا خاتمہ ہو جائے۔

اگر دو ہم جنس پرندوں کو ایک ساتھ باندھ دیا جائے تو ان دونوں کے دو دو مل کر چار پر ہو جائیں گے اس پر بھی وہ اڑ نہیں سکیں گے! اسلئے کہ دوئی قائم ہے لیکن اگر ایک زندہ پرندہ کے ساتھ تم مردہ پرندہ کو باندھ دو تو وہ اڑ سکتا ہے کہ اب اس صورت میں دوئی موجود نہیں ہے۔

آفتاب اس قدر مہربان ہے کہ وہ خفاش (چمگادڑ) کی خاطر فنا ہو جانے پر تیار ہو جائے لیکن چونکہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ پس وہ چمگادڑ سے مخاطب ہوتا ہے کہ اے خفاش میرا لطف تمام عالم کے شامل حال ہے، میں چاہتا ہوں کہ تجھ پر بھی اپنا لطف مبذول کروں، پس تو فنا

ہو جا کہ تیرا فنا ہونا بعید از امکان نہیں ہے تا کہ تو میرے نورِ جلال سے مستفید اور بہرہ مند ہو سکے اور اس خفاشی کی قید سے نکل آئے اور عنقائے قاف بن جائے۔

بارگاہِ الٰہی میں بندہ کی عرضداشت

بندگانِ خدا میں سے ایک بندہ کو یہ اہلیت حاصل ہوئی اور اس نے یہ ہمت کی کہ اپنے آپ کو دوست کی خاطر فنا کر دے اور اس کی دوستی میں مستغرق ہو کر بارگاہِ الٰہی میں عرض گزار ہوا کہ خداوندا! میرا دوست مجھے عطا کر دے۔ لیکن اس کی عرضداشت قبولیت حاصل نہ کر سکی اور ندا آئی کہ ہم اس کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن اس بندہ کی تفرع اور زاری جاری رہی۔ اس نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ خداوندا اس کی جو طلب تو نے میرے دل میں ڈال دی ہے وہ کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ بندہ قبولیت دعا کے لئے الحاح و زاری کرتا رہا۔ آخرکار بارگاہ الٰہی سے ندا آئی کہ اگر تو اپنی دعا کی قبولیت چاہتا ہے تو اپنا سر جدا کر دے اور نیست و نابود ہو جا۔ اس بندہ نے عرض کیا۔ بارِ الٰہا! میں اس بات پر راضی ہوں۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور دوست کی راہ میں سر قربان کر دیا اور اس کا مقصد حاصل ہو گیا۔ جب بندہ کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ وہ اپنی عمر عزیز کو جس کا امکان (جو تمام دنیا کی ابتداء سے آخر تک کی عمر کے برابر ہے) فدا کر دے تو کیا وہ خالقِ کائنات جو تمام الطاف و اکرام کا منبع ہے وہ ایسا کرم نہ فرمائے گا؟ لیکن یہ بات یاد رکھ کہ اس کی ذات ایسی ہے جس کو کبھی فنا نہیں وہ ازلی و ابدی ہے اور قابلِ فنا تو ہی ہے۔ لہذا تو ہی خود کو فنا کر دے۔ خود تو ہی "فنا ہو جا"۔

فصل

بلندی و پستی کیلئے معیار

ایک متکبر شخص آیا اور ایک بزرگ کی نشست سے بلند جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اسی اس حرکت کو دیکھ کر مولانا قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اس کے اس طرزِ عمل سے ان بزرگ کی شخصیت و حیثیت میں کیا فرق پڑا! اوپر بھی چراغ ہیں اور نیچے بھی چراغ ہیں۔ کیونکہ چراغ اگر بلندی

چاہتا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ یہ بلندی اس کو اپنی ذات کے لئے چاہیئے۔ بلکہ اس میں دوسروں کا فائدہ مقصود ہوتا ہے تاکہ اس کو بلند جگہ پر رکھنے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ روشنی حاصل کر سکیں ورنہ چراغ تو چراغ ہی رہے گا خواہ اسے نیچے رکھا جائے یا بلندی پر رکھا جائے۔ (وہ کچھ اور نہیں بن سکتا) اور جبکہ چراغ ایسا ہو کہ وہ آفتاب بدی ہو تو اس کے اوپر رکھنے یا نیچے رکھنے سے کیا تفاوت پیدا ہو سکتا ہے۔ ایسے حضرات اگر بلندی کے خواہاں ہوتے ہیں تو ان کا مقصود اور ان کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے۔ چونکہ عوام میں نہ اتنی بصیرت ہے اور نہ ان میں اتنی اہلیت و صلاحیت ہے کہ وہ ان حضرات کے مرتبہ کی رفعت کو دیکھ سکیں۔ پس ان حضرات کی خواہش ہوتی ہے کہ دنیا ہی کے دام سے (دنیا ہی کے طور طریقے استعمال کر کے) ان اہل دنیا کو گرفتار کر لیں اور اس طرح وہ حقیقی (دوسری) بلندی تک پہنچ جائیں اور آخرت کے دام میں آ جائیں۔ (بعض بزرگوں کے لئے صدر مقام یا بلند مقام پر بیٹھنا اس لئے نہیں ہے کہ ان کو اپنی بلندی اور رفعت کا اظہار مقصود ہے بلکہ وہ دنیا والوں کو دنیاوی طریقے ہی سے اپنا مطیع و منقاد بناتے ہیں اور آخرت کے راستے پر پہنچا دیتے ہیں۔)

فتوحات کا مقصد

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور دیگر شہروں کو اس لئے فتح نہیں کیا تھا کہ آپ کو ان فتوحات کی ضرورت تھی، بلکہ ان فتوحات کا مقصد یہ تھا کہ ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کو حیات نو بخشیں اور ان کی ہدایت و رہنمائی فرمائیں۔

هذا الكف معود بان يعطى و — یہ ہتھیلی تو عطا و بخشش کی عادی ہے اور

ماهو معود بان ياخذ — اس کو یہ عادت نہیں کہ وہ کچھ وصول کرے۔

یہ حضرات خلقت سے یہ تدبیر اس لئے کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان حضرات سے کچھ حاصل کر سکیں۔ دوسروں پر عطا و بخشش کریں اس لئے نہیں کہ یہ حضرات ان سے کچھ حاصل کریں۔

دو شخصوں کے عمل کا انداز

اگر کوئی عام شخص جانوروں کو خود کھانے یا فروخت کرنے کی غرض سے پکڑنے کے لئے جال لگائے تو اس کے اس عمل کو جانوروں کو دھوکہ دینے یا انھیں مکر کے ذریعہ پکڑنے کا عمل کہا جاتا ہے لیکن

اگر کوئی بادشاہ کسی انمول عجمی باز کو جو خود اپنی شکاری صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتا پکڑنے کے لئے جال لگائے تاکہ اس کو سدھانے اور تربیت دینے کے بعد اپنے بازو پر بٹھائے اور اسے شکار میں مشّاق کردے تو بادشاہ کے اس عمل کو کوئی بھی دھوکہ یا مکر سے تعبیر نہیں کرتا۔ حالانکہ عمل دونوں کے یکساں ہیں۔ (لیکن ایک کھلا مکر ہے اور دوسرا عمل تربیت کی تدبیر ہے)۔

اب دیکھو کہ بادشاہ کے اس عمل کو اس طرح تعبیر کیا جاتا ہے اس نے اس جانور کو اعزاز واکرام سے نوازا اور اس کو اپنے بازو پر بٹھا کر اس کی عزت افزائی کی ہے اس کو حیاتِ نو بخشی ہے۔ یا یوں کہیں گے کہ اس نے ایک پتھر کو لعل بنا دیا یوں کہیں گے کہ مردہ مٹی کو آدمی بنا دیا (بات ایک ہی ہے) اور اس سے زیادہ واضح طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر باز کو یہ علم ہوتا کہ اس کو اسیرِ دام کیوں کیا جا رہا ہے۔ تو وہ ہرگز جال اور اس کے اندر پڑے ہوئے دانہ کے واسطے یا لالچ کے باعث جال میں نہ پھنستا بلکہ دست شاہی پر بیٹھنے کے اعزاز کے حصول کے لئے اور شاہی تربیت حاصل کرنے کے لئے دل وجان کے ساتھ خود اس دام میں پھنس جاتا۔ اور پھر تربیت پاکر شاہی ہاتھ پر بیٹھ کر پرواز کرتا۔

اپنے علم کا غرور

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظاہری طور پر ایسی باتیں سنتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے بہت سی ایسی باتیں سُن رکھی ہیں۔ ہمارا باطن ایسی باتوں سے معمور ہے۔ وقالوا قلوبنا غلف بل لعنهم الله وہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب غلافوں کے اندر محفوظ ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی ہے۔

کافروں کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے دل تو ایسی باتوں کے غلاف ہیں (ان کے اندر یہ باتیں بھری پڑی ہیں۔) اور ہمارے دل اس طرح کی باتوں سے مملو اور پُر ہیں خالقِ کائنات نے ایسا کہنے والوں کے جواب میں فرمایا ہے کہ ان کا دعویٰ غلط ہے اور ان کے قلوب ایسی باتوں سے پُر نہیں بلکہ ان کے دل وسوسوں، شکوک، شرک اور خیالات فاسدہ سے معمور ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کے دل لعنتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت کی توضیح قرآن میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ

"بل لعنہم اللہ بکفرھم" بلکہ ان کے کفر کے سبب اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے"۔ کاش ان کے دل ان ہذیانات سے خالی ہوتے اور وہ اس قابل ہوتے کہ وہ ان (اچھی) باتوں سے کچھ قبول کر سکتے۔ لیکن وہ اس لائق ہیں ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ رب العلمین نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے۔ ان کی آنکھیں اصل کے بجائے کچھ اور ہی دیکھتی ہیں اور ان کو اصل رنگ کے بجائے کوئی اور ہی رنگ نظر آتا ہے۔ ان کو (جناب) یوسف کی جگہ بھیڑیا نظر آتا ہے اسی طرح ان کا حقیقت کے علاوہ کچھ اور ہی سنتے ہیں حکمت کی باتوں کے بجائے ان کو ہذیان اور بیہودہ باتیں سنائی دیتی ہیں

کان اور آنکھوں کے علاوہ قلوب کی حالت یہ ہے کہ وہ خیالات فاسدہ کا مسکن بکر رہ گئے ہیں۔ جن میں برائیوں اور برے خیالات کے سوا کچھ نہیں سماتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھیں کہ ان کے دلوں کی حالت سردی کے موسم جیسی ہے اور فاسد خیالات سردی کی وجہ سے تر در تر ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہوگئے ہیں اور موسم سرما کی سختی کی وجہ سے وہ جمع ہوگئے ہیں

ختم اللہ علی قلوبہم وعلی سمعہم ط — اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں، سماعتوں پر مہر ثبت فرمادی

وعلی ابصارھم غشاوۃ الایۃ (البقرہ رکوع ۱) — ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔

ان (عوام) کی حالت تو یہ ہے کہ ان کے قلوب کا ایسی باتوں سے لبریز ہونا تو درکنار انھیں ان باتوں کی عمر بھر ہوا بھی نہیں لگی اور نہ ان کو جو ایسی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ صرف یہی لوگ نہیں بلکہ ان کا خاندان اور ان کے اسلاف بھی ان باتوں سے محروم رہے ہیں۔

نیز ساری عمر نہ انھوں نے دیکھا نہ سنا نہ انھوں نے کبھی جن کی وجہ سے یہ اظہار تفاخر کر رہے ہیں اس کو مثال سے اس طرح سمجھیں کہ ایک کوزہ ہے جس کو رب تعالیٰ نے بعض کو بھرا ہوا دکھایا جس سے لوگوں کو سیرابی ہوئی اور بعضوں کو وہ کوزہ خالی نظر آتا ہے جس کی وجہ سے ان کے لب تشنہ رہتے ہیں۔ لہٰذا جب اس کے معاملہ میں تشنگی سے ہی واسطہ ہے تو اس کے بارے میں شکر کا کیا موقع کیونکہ شکر تو وہ ادا کریگا جس نے اس نعمت سے استفادہ کیا ہو اور اپنی تشنگی کو بجھایا ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے قبل رب ہیم نے ان کا تیلہ بنایا

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ "خمر طینۃ آدم اربعین یوماً" - آدم کو بنانے کے لئے حق تعالیٰ نے مٹی کو چالیس دن تک خمیر کیا پھر ان کے قالب جسمانی کو مکمل طور پر تیار کیا، اس کے بعد اتنی ہی مدت تک اسے زمین پر رہنے دیا۔ (یہ دیکھ کر) ابلیس ملعون نیچے اترا اور آدم کے جسم کے اندر داخل ہو گیا۔ انکی شریانوں کو اور رگوں کو خوب دیکھا بھالا۔ جن کے اندر خون جاری و ساری تھا اور دوسرے اخلاط بھی بھرے تھے۔ ابلیس نے اچھی طرح حضرت آدم کا جائزہ لیا۔ تو حضرت آدم نے کہا کہ ارے کوئی تعجب نہیں کہ یہ وہی ابلیس ہو سکتا ہے۔ جس کے بارے میں عرش کے نچلے پائے پر میں نے (لکھا) دیکھا تھا کہ پیدا ہونے والا ہے وہ ابلیس اگر دنیا میں ہے تو یہی ہے، والسلام علیکم، مجلس برخاست، اللہ تم سب کو اپنی سلامتی میں رکھے۔

فصل

اتابک کی تعریف

اتابک کا فرزند مولانا کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو مولانا نے اس سے فرمایا کہ تمہارے والد ہمیشہ مشغول بہ حق رہتے ہیں، ان کا اعتقاد ان پر غالب ہے اور یہ کیفیت ان کی باتوں سے ظاہر ہے، اب اسی کو دیکھو کہ جب رومیوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ اپنی لڑکیاں تاتاریوں کو دینا شروع کریں تو اس طرح سب خلط ملط ہو کے ایک ہو جائیں گے اور دین بھی ایک ہو جائے گا اور یہ جو ایک نیا دین مسلمانوں کا سامنے آیا ہے، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ بات اتابک کو معلوم ہوئی تو اتابک نے کہا کہ آخر دین کب ایک رہا ہے، دو یا تین تو ہمیشہ موجود رہے ہیں جنگ و پیکار اور جدال و قتال بھی ان کے درمیان جاری رہا ہے، تم لوگ دین کو آخر کس طرح ایک کرنا چاہتے ہو وہ بھی اپنے اس طریقے سے؟ جس کے بعد اتابک نے اس فتنے کا راستہ بند کیا۔

ایک تو سب قیامت ہی میں ہوں گے

اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا کہ دین تو وہیں جاکر ایک ہوگا۔ قیامت کے دن۔ یہاں تو ممکن نہیں ہے، یہ دنیا ہے، اس دنیا میں تو ہر ایک کی مراد الگ الگ ہوتی ہے، اور جدا جدا خواہشات ہوتی ہیں اس لئے یہاں ایک ہونا ممکن نہیں، قیامت ہی کے دن ممکن ہے وہیں سب ایک ہوں گے، سب کی نظر ایک ہی مرکز پر جمی ہوگی۔ سب کے کان ایک ہی بات سنیں گے اور سب کی زبانیں ایک ہی بات کہیں گی۔

آدمی تضادات کا مجموعہ ہے

ذرا غور سے دیکھو آدمی کے اندر تمہیں کتنی باتیں متضاد نظر آتی ہیں اس کے اندر چوہا بھی ہے اور پرندہ بھی ہے۔ کبھی پرندہ اپنے قفس کو بلندی کی جانب لے جاتا ہے، کبھی چوہا اسے پستی کی جانب کھینچتا ہے آدمی کے اندرون میں لاکھوں وحشی جانور مختلف اقسام کے چھپے ہوئے ہیں یہ سارے آدمی جب وہاں پہنچیں گے تو ان کے اندر کا چوہا بھی اپنی خصلت کو چھوڑ چکا ہوگا اور پرندہ بھی اپنی عادت سے دستبردار ہو چکا ہوگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد نہ تو بلندی مطلوب ہوگی نہ پستی، وہاں مطلوب کچھ اور ہی ہوگا اور اصل مطلوب جب سامنے آجائے گا تو پھر نہ تو بلندی کی طرف لپکنے کی حاجت باقی رہے گی نہ پستی کی طرف جانے کی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کسی شخص کی کوئی چیز کھو جاتی ہے تو وہ کبھی بائیں طرف اس کو ڈھونڈتا ہے کبھی داہنی طرف، کبھی سامنے دیکھتا ہے کبھی پیچھے۔ مگر جب چیز مل جاتی ہے تو پھر نہ تو وہ اوپر دیکھتا ہے نہ نیچے دیکھتا ہے، نہ بائیں جانب جھکتا ہے نہ داہنی جانب، نہ آگے جاتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ تو قیامت کا دن ایسا ہی ہوگا کہ تمام مخلوق کی نظر اس روز ایک ہی جانب لگی ہوگی اور سب کے سب یک زبان، یک گوش اور یک ہوش ہوں گے۔

جب مطلوب ایک ہو

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک باغ ہے یا ایک دکان ہے اور دس آدمی اس کے نفع نقصان میں شریک ہیں تو ان سب کی گفتگو ایک ہوتی ہے۔ غم ہوتا ہے تو سب کا غم ایک ہوتا ہے ۔ ان کی مشغولیتیں ہوتی ہیں تو وہ بھی سب ایک ہی چیز سے متعلق ہوتی ہیں کیونکہ ان سب کا مطلوب ایک ہے۔ ٹھیک اسی طرح قیامت کے دن سب کا معاملہ براہ راست حق تعالیٰ سے آپڑے گا۔ اس لئے سب کے سب وہاں ایک ہی دُھن میں ہوں گے اور سب ایک ہوں گے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھو کہ اس دنیا میں ہر شخص اپنی خواہش کے مطابق اپنے اپنے کام میں مشغول ہے کوئی عورت کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے تو کوئی مال کی محبت میں غرق ہے۔ کسی کو کمائی کی دھن ہے تو کسی کو حصول علم کی۔ اور سب کا خیال یہ ہے کہ میرے ذوق و شوق کا اور میری راحت و شادمانی کا سامان اسی میں ہے اور یہ بھی ایک طرح سے حق تعالیٰ کی رحمت ہی ہے، مگر جب وہاں پہنچے گا اور تلاش کرے گا تو نہیں پائے گا ادھر اُدھر بھاگے گا پھر گھڑی بھر کو ٹھہرے گا۔ اور کہے گا کہ ڈھونڈنے کی چیز تو وہ ذوق و شوق اور وہ رحمت ہے، میں نے شاید اچھی طرح نہیں ڈھونڈا آؤ پھر ڈھونڈیں اور وہ پھر اسی طرح سرگردانی میں رہے گا مگر نہ پائے گا، یہانتک کہ رحمت حق اپنے چہرے سے پردہ ہٹادے گی تب اسے معلوم ہوگا کہ اس رحمت کی تلاش کا راستہ وہ نہ تھا جس پر وہ چل رہا تھا۔

اللہ کے خاص بندے

لیکن اس دنیا میں اللہ کے ایسے بندے بھی موجود ہیں جو قیامت کا دن آنے سے پہلے ہی اسرار غیب کی چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں، امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہی بات تو اس طرح فرمائی تھی کہ لوکشف الغطا ما ازددت یقیناً (اگر پردہ اٹھا بھی دیا جائے جب بھی میرے اس یقین

ہیں جو مجھے حاصل ہے کسی قسم کا اضافہ نہیں ہوگا، یعنی جب مردے اٹھائے جائینگے اور قیامت ظاہر ہو جائے گی تب بھی جو یقین مجھے آج ہے وہی کل بھی ہوگا اس میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔

اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ فرض کرو، اندھیری رات ہے اور کچھ لوگ گھر کے اندر ہیں اور گھر کے اندر بھی کسی قسم کی روشنی نہیں ہے سب نماز کے لئے اٹھے اور جدھر جس کی سمجھ میں قبلہ کا رخ آیا اُدھر منہ کر کے کھڑا ہو گیا مگر جب تڑکا ہوگا اور روشنی ابھرے گی تو سب اپنی اپنی سمتوں سے مڑ کر قبلہ کی جانب منہ کر لیں گے۔ (یہی اصول ہے) لیکن وہ شخص جو اُس رات پہلے ہی رو بہ قبلہ تھا وہ کدھر پلٹے گا، دوسرے ہی لوگ ادھر منہ کر لیں گے جدھر اس شخص کا رُخ تھا۔ یہ کہنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ حق تعالیٰ کے ایسے بندے موجود ہیں جو اس دنیا کی شب تاریک میں اپنا چہرہ ہمیشہ اسی کی جانب رکھتے ہیں ماسوی اللہ کی جانب ان کا رُخ نہیں رہتا، وہ اس سے پھرا رہتا ہے اور ایسے ہی لوگ ہیں جن کے حق میں قیامت آنے والی نہیں بلکہ پہلے سے موجود ہے۔ یہ عنوان ایسا ہے جس کے بارے میں گفتگو کی کوئی انتہا نہیں ہے اس کی گہرائی کی کوئی تھاہ نہیں ہے۔ یہاں طلب گاروں کی مقدار طلب کے مطابق بات کہی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وان من شئی الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم (کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس میں سے ایک معیّن و معلوم مقدار کے مطابق ہی، اتارتے رہتے ہیں۔ (حجر، ع ۲)

ایک نکتہ حکمت باران رحمت کی طرح ہے۔ وہ اپنے منبع و مخزن میں بے انتہا موجود ہے لیکن ضرورت و حالات کے مطابق اس کو برسایا جاتا ہے خواہ موسم سرما ہو یا گرما۔ بہار کا موسم ہو یا خزاں کا۔ حالات و ضرورت کے مطابق کم و بیش بارش ہوتی ہے،

لیکن بارانِ رحمت کا جہاں سے نزول ہوتا ہے وہاں اس کا بیحد اور بے حساب ذخیرہ ہے۔
مثال سے اس طرح سمجھیں کہ عطار شکر یا ادویہ کو پڑیوں میں دیتے ہیں لیکن وہ شکر یا دوا ان کے پاس صرف اتنی ہی مقدار میں نہیں ہوتی جتنی کہ وہ دیتے ہیں بلکہ ان کے پاس یہ دونوں اشیاء اتنی مقدار میں ہوتی ہیں کہ وہ کاغذ میں نہیں سما سکتیں۔

قرآن کریم بیک وقت کیوں نہیں اُترا

معترضین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر کلمہ کلمہ (آیت، آیت) کیوں نازل ہوا اور مکمل صورت میں بیک وقت کیوں نازل نہیں ہوا۔
سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معترضین کے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ نادانو! یہ کیا کہتے ہو اگر قرآن مجید مجھ پر بیک وقت نازل ہو جاتا تو تاب برداشت نہ رہتی اور میں حیات ظاہری کے ساتھ موجود نہ رہتا اس لئے کہ واقف تھوڑے ہی سے بہت کچھ سمجھ لیتا ہے وہ ایک چیز سے بہت سی چیزوں کا ادراک کر لیتا ہے اور ایک سطر سے ہی بہت سے مضامین سے واقفیت حاصل کر لیتا ہے اس کو اس مثال سے سمجھیں کہ ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے اور باتیں کر رہی ہے ان میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو تمام حالات سے واقف ہے وہ ایک اشارہ ہی میں تمام بات کو سمجھ لیتا ہے اور واقعہ کی نوعیت کے مطابق اس کے حالات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے خوشی کی بات پر اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور خوف کی بات پر چہرہ کا رنگ زرد ہو جاتا ہے لیکن دوسرے حاضرین کو اس گفتگو سے صرف اتنے ہی واقعہ کی اطلاع ہوتی ہے، جتنا کہ انھوں نے سُنا ہے کیونکہ وہ پورے حالات سے واقف نہیں ہیں لیکن جو شخص کہ پورے حالات سے واقف تھا اس نے اس گفتگو سے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔
اس مثال کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ جب تم عطار کے پاس شکر لینے گئے تھے تو پہلے اس نے یہ دیکھا کہ تم کتنی رقم لیکر گئے ہو لہٰذا اس نے اسی حساب سے تم کو شکر دیدی یہاں قیمت سے مراد ہمت واعتقاد ہے اور ہر ایک خریداری ہمت و اعتقاد ہی کے مطابق ہوتی ہے۔ جب تم شکر خریدنے کے لئے جاتے ہو تو دوکاندار یہ دیکھے گا کہ تمہاری جیب میں شکر کی خریداری کے لئے رقم کتنی ہے؟ اور اسی لحاظ سے وہ تم کو شکر فراہم کرے گا۔ ایک پیمانہ

یا دو پیمانہ۔ لیکن اگر تم خریداری اتنی مقدار میں کرنے آئے ہو کہ بار برداری کے اونٹوں کی قطار
ساتھ ہے تو عطار یا دوکاندار کہے گا کہ بہت سے ناپنے والے بھی لاؤ کہ یہ بہت بڑا کام ہے ایک
یا دو ناپ سے کام نہیں چلے گا۔

اسی طرح بعض انسانوں کی حالت ہے کہ ان کی سیرابی کے لئے دریا بھی کافی نہیں ہوتے جبکہ
بعض کے لئے چند قطرے ہی کافی ہوتے ہیں۔ زیادتی ان کے حق میں مضر ہوتی ہے۔ اور یہ بات صرف علم و
حکمت کی دنیا کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ قاعدے دوسرے امور میں بھی جاری و ساری ہیں۔
دنیا میں مال و زر اور دفینوں کی بہتات تو ہے لیکن ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق دیا جاتا ہے کیونکہ
وہ زیادہ کی تاب نہیں رکھتا۔ کثرت عطا اس کو پاگل اور دیوانہ کر دیتی ہے اور اس پر
مزید اضافہ نقصان اور زیاں کا موجب ہوتا ہے، یہاں مجنوں اور فرہاد کی مثال بے محل نہ
ہوگی۔ کہ جو عشق میں پہاڑوں اور صحراؤں میں دیوانہ وار پھرتے تھے کہ جب عورت (لیلیٰ اور شیریں) کے
عشق کی کیفیت ان کی قوت برداشت سے باہر ہوگئی تو آپے سے باہر ہو گئے۔ اور دوسری مثال یہ کہ
جب فرعون کے پاس، اقتدار اور مال کی زیادتی ہوگئی تو اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا مگر ارشاد ہے
"وان من شیئ الا عندنا خزائنہ" یعنی کوئی اچھی اور بری چیز ایسی نہیں۔ ہے جو ہمارے
بے پایاں خزانہ میں موجود نہ ہو۔ لیکن ہم مخلوق کو ان کے حوصلہ کے مطابق عطا فرماتے ہیں مصلحت
اسی میں ہے۔"

بیشک یہ شخص (انا یا) مستغرق ہے۔ لیکن اغتی دکی [illegible] سے بے خبر ہے وہ اس بچہ کی طرح
ہے جس کو روٹی پسند ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا پسند ہے؟ (وہ روٹی کی پسندیدگی کی وجہ
اور علت سے بے خبر ہے) ذرا نامیات پر غور کرو (اگنے اور بڑھنے والی چیزوں کو دیکھو) درخت
پانی نہ ملنے کے باعث یعنی تشنگی سے زرد اور خشک ہو جاتے ہیں لیکن وہ تشنہ ہونے کے
باوجود تشنگی سے بے خبر ہیں۔ (کہ تشنگی کیا چیز ہے) انسان کا وجود علم کی طرح ہے کہ پہلے اس کو
ہوا میں لہراتے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہر جانب سے عقل، فہم، غصہ و غضب، حلم و کرم،
خوف و رجا اور ان جیسے بے شمار حالات اور بے حد و حد صفات کو پیدا فرما کر (جس کا علم صرف

اسی کو ہے) بہت سے لشکر اس علم کے نیچے جمع فرما دیتا ہے۔ جو کوئی شخص دور سے اس فضا کو دیکھتا ہے اس کو صرف ایک علم ہی نظر آتا ہے (اس کے نیچے جو صفات و احوال کے لشکر جمع ہیں وہ اس کو نظر نہیں آتے) لیکن جو شخص اس علم کے نزدیک پہونچ کر دیکھتا ہے تو اس کو اس جھنڈے کے نیچے ایک مخلوق (بیشمار جمعیت) نظر آتی ہے۔ یہ دوری اور نزدیکی جس کا میں نے ذکر کیا ہے مسافت کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ جو عاقل ہے اسے صرف تن نظر آتا ہے اور جو صاحب فہم اور دانشور ہے وہ جان لیتا ہے کہ اس ایک وجود میں کتنی خوبیاں اور کیسے کیسے گوہر پوشیدہ ہیں (وہ صفات و احوال کے لشکروں سے واقف ہو جاتا ہے)

ہر امر کی نسبت حق کی طرف درست ہے

ایک شخص حضرت مولاناؒ کی خدمت میں (مدت دراز کے بعد) حاضر ہوا تو مولاناؒ قدس سرہٗ نے فرمایا کہاں تھے؟ ہم تو تمہارے مشتاق تھے۔ اس نے جواب دیا کہ کچھ ایسا ہی اتفاق پیش آ گیا تھا (جس کے باعث اتنی مدت تک حاضر نہ ہو سکا) مولاناؒ نے فرمایا کہ ہم بھی یہ دعا کرتے رہے کہ یہ اتفاق فراق زائل ہو جائے۔ ایسا اتفاق جو فراق کا موجب ہو پیش نہیں آنا چاہیئے۔ لیکن خدا کی قسم یہ سب کچھ حق کی طرف سے ہے۔ ہر چیز کی نسبت حق کی طرف درست اور نیک ہی ہے خواہ ہماری نسبت سے وہ درست نہ ہو۔ فقراء اور صاحبان دل کا یہ فرمانا درست ہے کہ ہر بات کی نسبت حق کی طرف درست اور منتج بکمال ہے (اس میں نقص نہیں ہے) لیکن مخلوق کی نسبت کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ زنا اور پاکی بے نمازی اور نماز، کفر اور اسلام، شرک اور توحید ان تمام کی نسبت خالق سے درست اور نیک ہے لیکن یہی امور یعنی زنا، دزدی، کفر اور شرک جب ہم سے منسوب ہو جاتے ہیں تو وہ بد ہیں ان کی نسبت ہماری ذات سے ہونے کے باعث بد ہو جاتی ہے اور توحید و نماز و خیرات ہماری نسبت سے نیکی میں شمار ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ کے ملک میں کمانیں، زنداں اور دار بھی ہے اور اس کے پاس خلعت، مال، املاک، حشم، عیش و عشرت، طبل و علم تمام چیزیں موجود ہیں اور بادشاہ کی ذات سے منسوب ہونے کی وجہ سے بہت خوب ہیں۔ جس طرح خلعت اس کے کمال ملکی میں داخل ہے اسی طرح دار و زنداں بھی اس کے کمال ملکی میں شامل ہیں۔ لیکن مخلوق کی

نسبت سے دارِ خلعت یکساں نہیں ہیں۔ دار انسانی نسبت سے نہایت ناپسندیدہ ہے
اور خلعت بکمال درجہ پسندیدہ

فصل

ایمان اور نماز

ایک شخص نے عرض کیا کہ نماز سے افضل کیا چیز ہے؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اس سوال کے جواب متعدد ہیں پہلا جواب تو یہ ہے کہ روحِ نماز نماز کی ہیئت ظاہری اور اس کی قرأت وغیرہ سے بہتر ہے۔ دوسرا یہ کہ ایمان نماز سے بہتر ہے کیونکہ نماز شب و روز میں پانچ وقت فرض ہے۔ جبکہ ایمان فریضۂ دوامی ہے یعنی ہر وقت فرض ہے اور نماز کسی عذر سے ساقط بھی ہو جاتی ہے اس میں رخصت تاخیر بھی ہے جیسا کہ "عورتوں کے ایام" اس کے علاوہ اور بہت سی صورتوں میں جو عورتوں کیلئے مخصوص ہیں (حیض و نفاس وغیرہ) جبکہ ایمان کے لئے ایسا نہیں ہے اسی بناء پر ایمان کو نماز پر فضیلت اور اولیت حاصل ہے کیونکہ ایمان کسی عذر کی وجہ سے ساقط نہیں ہوتا اور نہ اس کو کسی وجہ سے مؤخر کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ ایمان بغیر نماز کے نافع ہے جبکہ نماز بغیر ایمان کے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور نافع نہیں ہے جس طرح منافقین کی نماز کہ وہ ان کے لئے کسی طرح بھی نافع نہیں تھی، ہر دین و ملت میں نماز کا طریقہ مختلف رہا ہے۔ لیکن کسی دین میں بھی ایمان تبدیل نہیں ہوتا۔ (ہر دین میں ایمان غیر متبدل رہتا ہے) ایمان کے احوال و قبلہ وغیرہ تبدیل نہیں ہوتے۔ ہاں دوسرے فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق سامع کے ظرف اور استعداد کے مطابق ہی ظاہر کئے جاتے ہیں۔ جس طرح اس ارشاد باری سے ہویدا ہے۔ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ "اور کوئی چیز نہیں جو ہمارے خزانہ میں نہ ہو، لیکن ہم کسی چیز کو نازل نہیں کرتے مگر اس کے اندازہ کے مطابق" اسی طرح اس فرق کو بھی فہم سامع کے بقدر ظاہر کیا جاتا ہے جیسے خمیر گر کے سامنے آٹے کی حیثیت ہوتی ہے کہ وہ اس کی استعداد (اور ظرف پذیرائی) کے بقدر اس میں پانی ملاتا ہے۔ یہی حال سامع

کاہے کہ بقدر ظرف اس پر ظاہر کیا جاتا ہے۔

شعر:-

چشم بدگر کس نگرد من چکنم　　از خود گلہ کن کہ رو شنائیٔ توئی

(میری آنکھ اگر تیرے سوا کسی دوسرے پر نہیں پڑتی تو میں مجبور ہوں (مجھ سے گلہ نہ کر) بلکہ خود اپنی ذات سے شکایت کر کہ میری آنکھ کی روشنی تو تو ہی ہے۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ دوسری جانب نظر نہ اٹھنے کا مفہوم یہ ہے کہ سننے والا سوائے تیرے کسی کی بات سننا ہی نہیں چاہتا تو میرا اس میں کیا قصور ہے؟ کیونکہ اس کی نگاہ کا مرکز تو تیری ہی ذات ہے اور اس کی وجہ اور دلیل یہ ہے کہ تو اپنی ذات کے ساتھ الجھا ہوا ہے اور تو نے اپنی ذات سے رہائی حاصل نہیں کی ہے کہ اگر اپنی قیدِ خودی سے رہائی حاصل کر لیتا تو یہ بصیرت و بصارت ہزار گنا بڑھ جاتی۔

ایک شخص کی ذات پر تبصرہ

سنو! ایک شخص نہایت لاغر و ضعیف اور بدرو تھا وہ دبلے پن میں پرندہ سے بھی حقیر نظر آتا تھا اور اس کی بدصورتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بدصورت بھی اس کو بدصورت سمجھتے تھے اس کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ وہ اس سے تو بہتر ہیں حالانکہ اس بدصورت کو دیکھنے سے پہلے دوسرے بدصورت لوگوں کو یہی خیال ہوتا تھا کہ کوئی شخص بدصورتی میں ان سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے۔

یہ بدصورت شخص بادشاہ کے ایک وزیر کے بارے میں سر دربار بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا اور بے ہودہ زبان استعمال کرتا تھا۔ وزیر اس کی باتیں سن کر کڑھتا اور افسردہ ہوتا یہاں تک کہ ایک دن وزیر نے عاجز آکر بھرے دربار میں کہہ دیا کہ یہ شخص جو اس طرح لاف زنی کرتا ہے میں نے اس پر بہت احسان کئے ہیں اس کی پرورش کی ہے اس کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھایا ہے یہ میرے خوانِ نعمت کا پروردہ ہے اور میری ہی وجہ سے آج یہ اس منزل پر ہے لیکن احسان فراموشی دیکھو کہ میرے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے؟ وزیر کی یہ باتیں سن کر وہ بدصورت شخص اٹھا اور درباریوں سے یوں مخاطب ہوا:۔

اے اراکینِ دولت اور امرائے سلطنت! میرا یہ ولی نعمت درست کہتا ہے۔ میں بے شک اس کا

پروردہ ہوں اور اسی کی وجہ سے میری یہ عزت افزائی ہوئی ہے لیکن اس کی نعمتوں سے پرورش پانے کی وجہ سے میں اس قدر حقیر اور کمزور ہوں اگر میری پرورش کسی دوسرے خوانِ نعمت سے ہوتی تو میری صورت اور قد و قامت کے علاوہ میری قدر و قیمت اس سے زیادہ اور کہیں بہتر ہوتی اس کا کہنا یہ ہے کہ اس نے مجھے خاک سے اٹھا افلاک تک پہنچایا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کاش یہ مجھے خاک سے نہ اٹھاتا یا لیتنی کنت ترابا کاش میں مٹی ہوتا۔ اگر کوئی دوسرا میری اتنی عزت افزائی کرتا تو میری حیثیت اتنی مضحکہ خیز نہ ہوتی۔

تربیت کنندہ اور تربیت پذیرندہ

یہ حکایت سنانے کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کسی مردِ حق اور ولیؒ کامل سے تربیت پاتا ہے اور اس سے تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کی روح بالیدگی حاصل کرتی ہے اور طاہر و مطہر ہو جاتی ہے اس کے برخلاف جب کوئی شخص کسی فریب کار اور ریاکار کے پھندے میں پھنس جاتا ہے اور اس سے تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہی باتیں اخذ کرتا ہے جو مربّی کے اندر ہوتی ہیں اور اس کی روح میں بالیدگی کی بجائے افسردگی آجاتی ہے۔ اس کی کیفیت وہی ہو جاتی ہے جو مذکورہ بالا کمزور اور عاجز و غمگین شخص کی ہوئی تھی کہ وہ افسردہ ضعیف اور کمزور رہ گیا تھا۔ (اور اب پڑھو:۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ (بقرہ ع ۳۴)

اور جن لوگوں نے نافرمانی کی (کافر ہوئے) ان کے دوست شیاطین ہیں جو انہیں روشنیوں سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

سرشتِ انسانی

انسان کی اصل و بنیاد اور سرشت و نہاد میں اللہ تعالیٰ نے تمام علوم ودیعت فرما دیئے ہیں انسانی روح نامعلوم اشیاء اور مغیبات کو جو پردۂ غیب میں ہیں اسی طرح دکھاتی ہے جس طرح صاف ستھرے پانی کی تہ میں

سنگریزے یا مٹی وغیرہ ہیں کہ وہ بھی دکھائی دیتے ہیں اور جو کچھ پانی کے
اوپر ہے وہ بھی نظر آتا ہے یہ بات حق تعالیٰ نے آدمی کے جوہر میں رکھی ہے
اور بغیر کسی وسیلے اور تعلیم کے رکھی ہے، لیکن پانی جب مٹی کی یا کسی رنگ کی آمیزش
قبول کر لیتا ہے تو اس کی یہ خاصیت جاتا اور اس کی یہ دانش فراموش ہو جاتی
ہے۔ حق تعالیٰ نے انبیاء و اولیاء کو اس دنیا میں اسی لئے بھیجا ہے کہ یہ نکتہ آدمی
کو یاد دلائیں۔ ان انبیاء و اولیاء کی حیثیت صاف ستھرے اور شفاف پانی
کی ہے۔ وہ بہت بڑا مجموعۂ آب اور دریائے حیات ہیں۔ اب اگر کوئی حقیر
رنگدار، میلا اور گدلا اور تیرہ و تار پانی اس سے آملتا ہے اور اس کے دائرے
میں آجاتا ہے تو وہ بھی اپنی خرابی سے میلے پن سے، اور دوسرے رنگ و اثر سے
جو عارضی طور پر اس کو لاحق ہو گیا تھا۔ نجات پا لیتا ہے، صاف ستھرا ہو جاتا ہے
تب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ میری تو اصل و سرشت ہی صاف ستھری تھی، گدلاپن
میلاپن، سیاہیاں، خرابیاں اور رنگوں کی آمیزش سب باہر کی تھیں، خارجی
تھیں اصلی نہیں تھیں اور انہوں نے اسے اپنی اصلی حالت یاد آجاتی ہے۔ جو ان
عوارض کے لاحق ہونے سے پہلے اس کی تھی، وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ھذا
الذی رزقنا من قبل (یہ صاف ستھری کیفیت تو وہی ہے۔ جو پہلے ہمیں عطا
ہوئی تھی)، تو یہ انبیاء و اولیا (اصل میں) "مذکر" ہیں اسی پہلی کیفیت کو یاد
دلانے اور تازہ کر دینے والے، وہ کسی شخص کے جوہر ذاتی میں کوئی نئی چیز
نہیں ڈالتے۔ اب جس "آب حقیر" نے گدلے اور مٹیالے مختصر پانی نے، اس "آب بزرگ"
کو پہچان لیا اور محسوس کر لیا کہ میں تو اسی دریائے صاف کا جز ہوں تو وہ
لپکتا ہے اور اس سے آملتا ہے اس کے برخلاف وہ آب حقیر اور وہ جوہر جس
نے اس "آب بزرگ" کو نہیں پہچانا بلکہ اس کو اپنے سے الگ کوئی "غیر جنس"
تصور کر کے بدستور اپنی تیرگی میں بدرنگیوں میں منہ چھپائے، مٹی میں
ملا پڑا رہا تو وہ کبھی دریائے صاف و شفاف کی جانب نہیں لپکتا اور نہ

آگے بڑھ کر اس سے ملتا ہے، یہ کیفیت ہی اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی، وہ اس سے دور دور رہتا ہے۔ اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ما تعارف منہا ائتلف، وما تناکر اختلف (جس روح نے اس سے موانست و مناسبت پیدا کر لی وہ اس سے جا ملی اور پیوستہ ہو گئی اور جس نے بیگانگی اختیار کی وہ اس سے جدا ہو گئی بچھڑ گئی)

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لقد جاءکم رسول من انفسکم (تمہارے پاس رسول تمہیں میں سے آیا ہے۔ (تمہارا ہم نفس) یعنی یہ جو آب بزرگ (رود دریائے ذخار) ہے وہ اسی "آبِ خُرد" کی جنس سے ہے اسی کے نفس اور اسی کے جوہر سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو اپنے نفس اور اپنی جنس سے نہیں سمجھتا تو اس کی یہ بے گانگی "نفسِ آب" کی بیگانگی نہیں ہے بلکہ اُس آمیزش کی بیگانگی ہے جو "آبِ خُرد" میں ملی ہوئی ہے اور اس پر چھا گئی ہے، یہ عکس و اثر اسی آمیزش کا اور اسی قرینِ بد کا ہے جس کی وجہ سے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ میں آگے بڑھ کر "آب بزرگ" اور "دریائے ذخارِ نورانی" سے جا ملوں جو میرا ہی ہم نفس ہے اور میری ہی جنس سے ہے۔ تو یہ حقیقتاً اُس آبِ حقیر کا فرار آب بزرگ و دریائے ذخار سے نہیں ہے بلکہ خود اپنے نفس اور اپنی اصل سے ہے جس کی یہ حالت و کیفیت اس قرینِ بد کے غلبے کی وجہ سے کچھ ویسی ہی ہو جاتی ہے جیسی مٹی کھانے والے کی ہوتی ہے کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ مٹی کی جانب یہ میلان اس کی طبیعت میں داخل ہے یا اس کا سبب وہ علت و بیماری ہے جو اس کی طبیعت پر حاوی ہو گئی ہے۔

دو گواہوں کی حیثیت

ذرا غور کرو اگر جو شعر، حدیث یا آیت دلیل کے طور پر لائی جائے وہ ان دو شاہدوں یا دو گواہوں کی حیثیت میں ہوتی ہیں

جو تمام معاملات سے واقف ہوتے ہیں اور ہر موقع پر وہ اسی طرح منطبق ہوتی ہیں جس طرح کسی واقعہ کے صدور پر اس کے دیکھنے والے (شاہد) موجود ہوتے ہیں۔ یہ دونوں گواہ جب کسی گھر کے وقف پر یا کسی دوکان کی بیع پر یا نکاح وغیرہ پر جب گواہ بنائے جاتے ہیں گواہ کی صورت تو وہی ایک ہوتی ہے لیکن گواہی کے معاملات (معروضات) مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے مستفید فرمائے۔ یاد رکھنا کہ رنگ تو وہی ہے جو خون کا رنگ ہے اور خوشبو بھی وہی ہے۔ جو مُشک کی ہے۔

فصل

آرزوئے دیدارِ الٰہی

مولانا کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں صاحب یہ کہتے تھے کہ وہ آپ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں تاکہ (آپ کی تربیت اور توجہ سے وہ) خداوند تعالیٰ کا دیدار کر سکیں۔ اس تمنا کے بارے میں مولانا نے فرمایا کہ اس زمانہ میں یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکے اس کی وجہ یہ کہ اس کی یہ آرزو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے۔ اللہ تعالیٰ کے جمال کا نقاب اور اس کا حجاب ہے اس دور میں اللہ رب العٰلمین کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ تمام آرزوئیں، محبتیں، الفتیں اور شفقتیں جو مخلوق کو ودیعت ہوئی ہیں جن کا اظہار وہ ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کے ساتھ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں آسمان و زمین، باغات، مکانات، علوم و فنون، مشروبات و ماکولات کے ساتھ اپنی چاہت اور تعلق خاطر کا اظہار حق کے لئے ہی وہ کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں بمنزلہ نقاب کے ہیں۔ یعنی یہ سب نقاب و حجاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لوگ اس عالم سے گزرنے کے بعد جب کائنات کے بادشاہ کو بے نقاب دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ یہ تمام چیزیں نقاب و حجاب تھیں اور ان کا مطلوب حقیقت میں ایک ہی تھا۔ یعنی صرف اس کی ذات تھی تو اس وقت یہ تمام مشکلیں خود بخود حل ہو جائیں گی اور دل میں جو سوال و اشکال اس بارے میں تھے ان سب کا جواب مل جائے گا۔ اور یہ تمام باتیں ظاہر و باہر ہو جائیں گی اس بات کو یوں سمجھ لو کہ سردی کے موسم میں ہر شخص (حسب استطاعت) موٹے کپڑے اور پوستین وغیرہ پہن کر سردی سے نجات حاصل کرتا ہے یا تنور اور الاؤ یا کسی غار میں گھس کر سردی بچاؤ حاصل کرتا ہے یا کسی غار میں سرد ہواؤں سے بچنے کی خاطر پناہ حاصل کرتا

ہے۔اسی طرح نباتات کو دیکھو کہ ان پر بھی سردی اثر انداز ہوتی ہے۔ درختوں سے پتے گرتے ہیں گھاس خشک ہو جاتی ہے۔ درخت بے برگ و بار ہو جاتے ہیں، گویا درخت کے برگ و بار خود درخت کے باطن میں چھپ جاتے ہیں تاکہ موسم سرما کا آسیب ان تک نہ پہنچے لیکن جب موسم بہار آتا ہے تو تمام سوالات کے جوابات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ موت وحیات اور خزاں کے بعد روئیدگی اور سرسبزی و شادابی کے تمام سوالات یکبارگی حل ہو جاتے ہیں اور اس کے اسباب نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ گزرنے والے حالات کس سبب سے تھے اور جو بلا ان پر نازل ہوگئی اس کا موجب کیا تھا

حجابات کی مصلحت

خالق کائنات نے ان تمام حجابات کو اس مصلحت سے پیدا فرمایا ہے کہ اگر جمالِ حق بغیر حجاب و نقاب کے ظاہر ہو تو ہم میں اس سے نظر ملانے کی تاب و توان کہاں ہے اور اسی وجہ سے ہم اس سے محظوظ اور بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہم انھیں نقابوں اور حجابات کے توسط سے مقصود کو حاصل کرتے ہیں۔ آفتاب ہی کی مثال لے لو کہ اس کی روشنی میں ہم سب کچھ دیکھتے ہیں اور اچھے برے کی پہچان کرتے ہیں۔ اسی سے حرارت حاصل کرتے ہیں۔ اسی کی تمازت سے درختوں میں پھل لگتے ہیں اور پکتے ہیں اور اسی کی حرارت سے پھلوں میں شیرینی اور حلاوت آتی ہے۔ کانوں اور معادن میں زر و جواہر، لعل و یاقوت کی تولید اسی سورج کی حرارت کی رہینِ منت ہے۔ لیکن یہ تمام منافع اس کی قدر دوری کی وجہ سے ہیں۔ یہی آفتاب اگر قریب آجائے تو اس کی حرارت سے سب کچھ جل کر خاکستر ہو جائے اور کوئی فائدہ مرتب نہ ہو اور یہ تمام بھسم ہو جائے اور اہل دنیا جل کر راکھ ہو جائیں۔

تجلّی الٰہی اور کوہِ طور

غور کرو کہ جب خالق کائنات حجابات کے ساتھ تجلّی فرماتا ہے تو یہ پہاڑ سرسبز و شاداب پھولوں اور پھلوں اور درختوں سے مالامال ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب بے حجاب اس نے تجلّی فرمائی تو اس کی حیثیت اور حالت وہی ہو جائے گی۔ جو طور کی ہوگئی تھی کہ وہ (فروغ تجلّی) سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے؛

فلمّا تجلّی ربہ للجبل جعلہٗ دکاً (اعراف ع ۱۷) جب رب کریم نے کوہ (طور)

پر تجلی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔

ایک سائل کے سوال کا جواب

حضرت مولاناؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ آخر جاڑوں میں بھی یہی آفتاب ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کی تمازت اتنی حیات سوز نہیں ہوتی! آخر کیوں؟ مولاناؒ نے فرمایا یہاں صرف تمثیل پر محمول کیا گیا ہے۔ اس کے عوارض و عواقب سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ واقعہ کچھ اور رہا ہے اور مثال کچھ اور ہے۔ ہر چند کہ عقل اپنی جد و جہد سے اس کا ادراک نہیں کر سکتی لیکن بایں ہمہ عقل اپنی جد و جہد سے باز نہیں رہتی ہے۔ اگر وہ اپنی کوشش کو ترک کرے اور اپنی جد و جہد کو چھوڑ دے تو پھر وہ عقل و خرد نہیں ہے۔

عقل کی تعریف

عقل وہ ہے کہ جو ادراک باری تعالیٰ کے لئے شب و روز کوشاں مضطرب اور بیقرار رہے۔ حالانکہ ذاتِ باری نہ اس کے ادراک میں آ سکتی ہے اور نہ وہ قابل ادراک ہے۔ عقل پروانہ کی طرح ہے اور معشوق شمع کی طرح، جب پروانہ شمع پر گرتا ہے جل جاتا ہے اور اس طرح وہ خود کو ہلاک کر دیتا ہے اور اگر پروانہ کی طرح کوئی اور جانور ہو جو شمع کے نور سے سکون پائے لیکن خود کو شمع پر نثار نہ کرے تو ہم اس کو پروانہ نہیں کہیں گے! اسی طرح پروانہ نثار ہونے کے لئے شمع پر گرے اور وہ نہ جلے تو اسے شمع نہیں کہا جائے گا۔ بایں ہمہ پروانہ کو دیکھو کہ شمع اس کو جلا ڈالتی ہے اور پروانہ کو اس سے گزند پہنچتا ہے پھر بھی وہ شمع کے بغیر نہیں رہتا اور شمع کے گرد پھرتا ہے۔

انسان کہلانے کا مستحق

اسی طرح وہ انسان جو نورِ حق سے تکیہ ہوتا ہے لیکن نور حق کے لئے (پروانہ کی طرح) جد و جہد نہیں کرتا تو وہ انسان نہیں اور اگر وہ نور حق کا ادراک کرے تو سمجھ لو کہ جس کا اس نے ادراک کیا ہے وہ حق نہیں ہے۔ پس انسان وہ ہے جو اجتہاد سے کسی حال خالی نہ رہے اور جلال حق کے گرد (پروانہ کی طرح) پھرتا رہے اور مضطرب و بیقرار رہے اور حق وہ ہے جو اس اجتہاد کرنے والے مضطرب الحال و

بیقرار کو (شمع کی طرح) جلا ڈالے اور نیست کر دے اور کسی عقل کے ادراک میں نہ آسکے۔

فصل

کیفیات و احوال

امیر پروانہ کا بیان ہے کہ قبل ازیں کہ حضرت مولانا رومیؒ مجھ کو اپنے دیدار کا شرف عطا فرمائیں مولانا بہاء الدین نے مجھ سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ مولاناؒ کا حکم یہ ہے کہ امیر پروانہ میرے پاس ملاقات کے لئے نہ آئیں۔ مجھ پر کیفیات طاری رہتی ہیں۔ کبھی تو میں مصروف گفتگو ہوتا ہوں اور کبھی مطلق کلام نہیں کرتا۔ کوئی وقت ایسا ہوتا ہے کہ مجھے لوگوں کا خیال ہوتا ہے اور کبھی میں عزلت گزیں ہو جاتا ہوں۔ حیرت و استغراق کی کیفیت مجھ پر طاری رہتی ہے اگر امیر پروانہ ایسے وقت آجائیں کہ مجھے ان کی دلجوئی کی فرصت نہ ہو اور مجھے نصیحت کرنے کا موقع نہ ملے تو امیر پروانہ کو اس سے رنج ہوگا لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ جب ہمیں فرصت ہو اور حالات سازگار ہوں تو ہم ان سے ملنے اور انھیں فائدہ پہنچانے کے لئے خود اُن کے پاس چلے جایا کریں گے۔

امیر پروانہ کہتے ہیں کہ میں نے مولانا بہاؤالدینؒ ولد سے عرض کیا کہ ہم مولاناؒ کی خدمت میں اس لئے حاضر نہیں ہوتے کہ وہ ہماری طرف توجہ فرمائیں اور ان کا انہماک ہماری طرف ہو یا وہ ہم سے باتیں کریں بلکہ اس لئے کہ ہم کو شرفِ خدمت حاصل ہو اور ان کے خدمت گاروں کے زمرہ میں ہمارا بھی شمار ہو جائے اور جو معاملہ کہ اس وقت پیش آیا اور شیخ بہاؤالدینؒ نے میرے سلسلہ میں مولانا کا جو ارشاد نقل فرمایا اس سے مولاناؒ کو میری اصلاح مقصود تھی کہ جب میں حاضر ہوا تو مولاناؒ مشغول تھے اور مجھے ملاقات کا شرف نہ بخشا اور مجھے بہت دیر انتظار کرنا پڑا اس طرح مجھے احساس دلانا مقصود تھا کہ جب مسلمان اور نیکوکار مجھ سے ملنے آئیں تو میں ان کو انتظار کی زحمت سے بچاؤں اور فوراً ان کو شرف ملاقات بخشا کروں کیونکہ مولاناؒ نے مجھے انتظار کی صعوبت اور اس کی دشواریوں کا مزہ چکھا دیا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے مجھے انتظار کی تلخی سے آشنا کر دیا ہے اور مجھے تادیب فرمائی ہے کہ آئندہ ایسا نہ کروں کہ اپنے دربار میں دوسرے لوگوں کو اپنا منتظر رکھوں،

تاخیرِ قبولیتِ دُعا اور سببِ تاخیر

امیر پروانہ کی باتیں سُنکر مولانا نے فرمایا کہ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے بلکہ تم کو انتظار کرانا عین عنایت و نوازش تھی کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے "اے میرے بندہ! جب تو میری بارگاہ میں آہ و زاری کرتا ہے تو میری رحمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ میں دعا اور آہ و زاری کی حالت میں ہی تیری حاجت کو جلد قبول کرلوں اور تجھے فائز المرام کردوں لیکن تیری آہ و زاری مجھے پسند آتی ہے اور تیرے نالے مجھے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔" کہتے ہیں کہ دو فقیر ایک دروازے پر آئے ان میں سے ایک صاحب خانہ کا مطلوب و محبوب تھا۔ دوسرا بہت زیادہ مبغوض و معتوب۔ ایسے وقت میں مالک مکان اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ جلدی جا اور فلاں فقیر کو روٹی دے دے اور اس کو چلتا کرے اور دوسرا جو اس کا محبوب و مطلوب ہے اس کے بارے میں کہتا ہے کہ اس دوسرے گداگر سے کہہ دے کہ ابھی روٹی نہیں پکی ہے اس کے پکنے کا انتظار کر تجھے روٹی دی جائے گی۔ اس امیر کی بات سنانے کے بعد مولاناؒ نے فرمایا کہ ورنہ میرے دل میں یہ آتا ہے کہ میں دوستوں سے خوب ملوں اور ہم آپس میں ایک دوسرے سے مل کر فرح و سرور حاصل کریں۔

جب اس دنیا میں بہت سے باصلاحیت اصحاب جو باہم دوست ہیں اکثر و بیشتر ایک دوسرے کو دیکھتے اور ملتے رہتے ہیں، تو جب یہ لوگ حشر میں یکجا ہوں گے تو یہی دنیاوی شناسائی اور قوی ہوجائے گی اور ایسے لوگ اپنے دوستوں کو بہت جلد پہچان لیں گے اور سمجھ جائیں گے کہ یہی دوست ہیں جن سے دنیا میں ہماری دوستی اور ہمارا اختلاط تھا۔ پس یہ لوگ ایک دوسرے سے بڑی شادمانی اور انبساط کے ساتھ ملیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ ویسے تو یہ ہے کہ آدمی اپنے دوست کو اکثر گنوا بیٹھتا ہے۔

ذرا غور کرو! تمھاری ایک شخص سے دوستی ہے اور وہ تمھارا ایسا محبوب ہے گویا وہ تمھاری نظر میں یوسف کنعانی ہے۔ لیکن ایک فعل قبیح و ناگوار کے باعث وہ نظر سے گرجاتا ہے اور تم اس کو ہاتھ سے کھو دیتے ہو اور اس کی صفت یوسفی، صفت گرگی سے بدل جاتی ہے (یوسف کے بجائے وہ تم کو گرگ یوسف دریدہ معلوم ہونے لگتا ہے) اگرچہ صورت اس کی اب بھی وہی ہے (اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے) تم نے محض ایک فعلِ ناگوار کے باعث اس کو گنوایا۔ کل حشر میں ایک دوسری ذات سے بدل جائے گا۔ چونکہ دنیا میں اس کی اور تمہاری شناسائی گہری

نہیں تھی اور تم نے اس کی ذات میں ڈوب کر دوستی نہیں کی تھی پس حشر میں تم اس کو کس طرح شناخت کر سکو گے۔ مدعا یہ کہ ایک دوسرے سے ٹوٹ کر ملنا چاہیئے اور انسان کے اوصاف جمیلہ و ذمیمہ سے جو اس میں مستعار ہیں درگزر کر کے عین اس کی ذات سے دوستی کرنی چاہیئے اور اس کی ذات کا گہرا مشاہدہ کرنا چاہیئے کہ لوگوں کے یہ اوصاف ان کے اصلی اوصاف نہیں ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ تمھیں باہم ایک دوسرے سے اچھی طرح سے ملنا اور تعلقات کو استوار کرنا چاہیئے۔ تمھیں اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیئے کہ انسان میں اچھی اور بری صفتیں مستعار و عارضی ہیں ان سے صرف نظر کر کے اس کی ذات تک رسائی حاصل کرنی چاہیئے اور اس سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنی چاہیئے کیونکہ وہ صفات جو ایک دوسرے میں تلاش کرتے ہیں یا ایک دوسرے کی صفات کا تذکرہ کرتے ہیں ان کو صفت اصلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ وہ محض عارضی و مستعار ہیں۔

ایک شخص کا دعویٰ مردم شناسی

ایک صاحب نے کہا کہ میں فلاں شخص کو خوب جانتا ہوں اگر آپ چاہیں تو اس کی پہچان بھی بتادوں لوگوں نے کہا بتلایئے۔ دعویٰ کنندہ نے کہا کہ وہ میرا مالک مکان تھا اس کے پاس دو سیاہ گائیں تھیں۔ مخلوق کا یہ قول بھی اسی طرح ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں دوست کو دیکھا ہے اور ہم اس کی سرشت سے اچھی طرح واقف ہیں اور اس شخص کی شناخت کے لئے جو نشانیاں بتاتے ہیں وہ ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی کہ دو گایوں والے شخص کی شناخت کے طور پر بتائی گئی تھیں لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ یہ دونوں نشانیاں درست اور برمحل نہیں ہوتیں اور یہ اصلی شناخت کے کام نہیں آتیں۔ لہذا انسان کو چاہیئے کہ وہ دوسرے انسان کے معائب و محاسن سے صرفِ نظر کرے اور ان پر توجہ نہ دے۔ اس کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی ذات میں کیا خصوصیات اور کیا جوہر موجود ہیں۔ ان خصوصیات کا معلوم کرنا اور جاننا ہی اصل چیز ہے۔

اولیاءاللہ کا دعویٰ عشق الٰہی

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ مجھے سخت تعجب ان لوگوں پر ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ذات باری کے ساتھ عشق

ہے۔ عشق کا دعویٰ کرنے والے اس عالم کون ومکان میں اس ذات کے ساتھ اپنے دعوے میں کس طرح صادق ہو سکتے ہیں۔ جبکہ اس (ذات باری) کی نہ تو کوئی جگہ ہے نہ صورت نہ مکان اور نہ کوئی اس کا مثیل و شبیہ جس کو دیکھ کر اس کا قیاس کیا جا سکے۔ اس طرح یہ دعویٔ عشق و محبت کرنے والے اپنے دعوے محبت میں کس طرح راسخ العقیدہ ہو سکتے ہیں اور ان کا عشق کس چیز سے تائید اور قوت حاصل کرتا ہے کہ یہ لوگ شب و روز اسی کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ وہ شخص جو کسی کے ساتھ دوستی کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی معاونت حاصل کرتا ہے وہ مدد یا معاونت مادّی ہوتی ہے۔ مثلاً لطف و احسان، علم وغیرہ ذکر و فکر، شادی و غمی میں اس سے مدد حاصل کرتا ہے یہ تمام چیزیں دنیا میں مکانی حیثیت سے ماوراء ہیں یہ سب کی سب لامکانی ہیں لیکن وہ شخص ہر دم ان چیزوں میں معاونت کا طالب ہوتا ہے اور متاثر بھی ہوتا ہے لیکن اس عمل پر اس کو کوئی تعجب اور حیرت نہیں ہوتی البتہ وہ متعجب ہوتا ہے تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ عالم لامکان سے کس طرح فرح و سرور حاصل کرتے ہیں اور اس سے کس طرح مدد حاصل کرتے ہیں۔

ایک منکرِ خدا

ایک مفکر و دانشور جو اسی (مذکورہ) بات کا منکر تھا ایک مرتبہ بیمار ہوا اور علالت طوالت اختیار کر گئی۔ ایک صاحب معرفت اس کی عیادت کے لئے گئے اور اس سے دریافت کیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ دانشور کہنے لگا کہ صحت چاہتا ہوں۔ طبیب نے کہا کہ صحت کی صورت و شکل تو بتا دو تا کہ اس کو تمہارے لئے میں حاصل کر سکوں مفکر نے جواب دیا اس کی تو کوئی شکل و صورت ہے ہی نہیں میں کیا بتاؤں اس کے بارے میں تو کوئی مثال بھی نہیں دی جا سکتی اور آپ مجھ سے اس کی شکل و صورت کے بارے میں عبث سوال کرتے ہیں۔ صاحب دل نے کہا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ صحت کیا ہوتی ہے۔ دانشور نے کہا کہ اس سلسلہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب صحت ہوتی ہے تو میں طاقتور ہوتا ہوں۔ جسمانی اعتبار سے موٹا تازہ ہوتا ہوں میرا رنگ سرخ و سفید ہو جاتا ہے۔ تازگی اور شگفتگی ہر دم حاصل رہتی ہے۔

صاحب دل نے کہا کہ میں تو تم سے نفس صحت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا کہ اصل میں

صحت ہے کیا چیز؟ دانشور نے کہا کہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس کو مثال سے نہیں بتایا جا سکتا ہے تب ان بزرگ نے دانشور کی باتیں سُنکر کہا میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تم اپنے الحاد سے دست بردار ہو کر اسلام قبول کر لو تو میں تمہارا علاج کر کے تم کو صحت مند کر دوں گا۔

معانی اور حصولِ منفعت

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ جب یہ حقیقت بے مثال اور بیچوں ہے تو کیا انسان اس معنی و حقیقت سے استفادہ کر سکتا ہے۔ معلم انسانیت ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آسمان زمین بھی اسی حقیقت سے منفعت حاصل کرتے ہیں اسی معنٰی کلّی سے استفادہ کرتے ہیں مثال سے اس طرح سمجھو کہ جب تم یہ دیکھتے ہو کہ آسمان کی گردش، وقت پر بارش ہونا، موسم کی تبدیلی، سردی اور گرمی کا ہونا وقت کی تبدیلی، رات اور دن کا ہونا یہ سب درست ہے اور حکمت پر مبنی ہے۔ آخر یہ بے جان ابر وقت پر برسنا کیا جانے اور اس زمین کو دیکھتے ہو جو بنا تامّل نباتات اگاتی ہے اور ایک بیج سے دس دس بیج تم کو حاصل ہوتے ہیں آخر ان سب اعمال کو کرنے والی کوئی ذات ہی تو ہے ان تمام عمل کو اس دنیا کے حوالے سے دیکھو اور اس سے علم و دانش حاصل کرو جس طرح کہ تم انسان کے قلب سے مدد حاصل کرتے ہو اسی طرح انسان کی حقیقت اور اس کے معنی سے مدد حاصل کرو اور صورتِ عالم کے توسط سے معنیٔ عالم کو حاصل کرو۔

سرکارِ دو عالم کی زبانِ اطہر اور الفاظِ ربانی

مولانا فرماتے ہیں کہ جس وقت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر فرحت و سرور کا عالم طاری ہوتا اور آپ ذاتِ اقدس میں متغرق ہوتے تو ایسی حالت میں زبان مبارک سے بظاہر قال اللہ ادا ہوتا لیکن حقیقتِ حال میں وہ کلام الٰہی ہوتا تھا اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس درحقیقت درمیان میں نہ ہوتی تھی کیونکہ متکلم فی الحقیقت خالق و مالک ہوتا تھا ابتدا میں حضور علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا کہ مجھے ایسے نداز سے اس کے پہلے سابقہ نہیں ہوا تھا اس وقت تک آپ ایسی باتوں سے لاعلم اور ناواقف تھے لیکن جب کہ آپ سے اس قسم کا کلام ہونے لگا تو آپ جان گئے کہ اب آپ وہ نہیں ہیں، جو پہلے تھے اور یہ حق تعالیٰ کا تصرف ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا علم

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ولادت سے ہزاروں سال قبل کے واقعات و حالات سے دوسروں کو باخبر فرماتے تھے جو ماضی میں عالم انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ پیش آئے تھے اور خود حضور علیہ السلام کی تخلیق سے قبل واقع ہوئے تھے یعنی قصص الانبیاء۔ اسی طرح آپ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے مطلع فرماتے تھے اسی طرح آپ عرش وکرسی، خلاو ملأ جن سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود یا جو موجود تھا تمام چیزوں یا باتوں کی اطلاع دے دیا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ولادتِ مسعودہ سے کئی ہزار سال پہلے کے واقعات اور عرش وکرسی اور خلاو ملأ سے خبر دینا اس بات کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ حضور علیہ التحیۃ والثناء کا وجود مقدس حادث تھا۔ دلیل اگلی یہ ہے کہ ایک حادث قدیم کی خبر نہیں دے سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں خود نہیں کیا کرتے تھے بلکہ وہ خداوند تعالیٰ کا کلام ہوتا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے ادا ہوتا تھا "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (نجم ع ۱) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش کے مطابق کچھ نہیں فرماتے بلکہ آپ وہی کچھ فرماتے ہیں جو انکی جانب وحی ہوتا ہے۔

مسبب الاسباب سبب سے مستثنیٰ ہے

رب تعالیٰ آواز و حروف سے منزہ و مبرا ہے اور اس کا کلام حرف و آواز سے ماوراء ہے لیکن اپنے کلام کو حروف واصوات میں جس زبان میں جس طرح چاہتا ہے جاری فرما دیتا ہے۔ مثال کی دنیا میں اس طرح دیکھیں کہ راستوں اور سراؤں میں پانی کیلئے حوض بنائے جاتے ہیں اور ان میں کسی جانور یا انسان کا مجسمہ بنا دیا جاتا ہے اور اس مجسمہ کو حوض میں اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ اس کے منہ میں سے پانی نکل کر حوض میں گرتا رہتا ہے اس طرح گرنے والے پانی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ پانی پتھر کا مجسمہ خود نہیں نکال رہا بلکہ پتھر کا مجسمہ تو اس پانی کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔

مردم شناسی کا گُر

اگر تم کسی شخص کے بارے میں معلومات چاہتے ہو اور اس کے کوائف معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس سے گفتگو کرو۔ اس گفتگو سے تم اس کی اصل حیثیت اور حقیقت کا اندازہ کر سکو گے۔ لیکن اگر وہ عقلمند اور چالاک ہے اور اس کو

کسی نے اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے (کہ انسان اپنی گفتگو سے پہچانا جاتا ہے) تو وہ گفتگو میں نہایت محتاط رہے گا، تاکہ تم اس کی گفتگو کے انداز سے اس کی اصل حالت و کیفیت کا اندازہ نہ لگا سکو اور اس بات کو اس طرح سمجھو کہ ایک بچّہ نے جنگل میں اپنی ماں سے کہا کہ مجھے شب کی تاریکی میں یہاں ایک کالا بھوت نظر آتا ہے جس سے میں سخت خوفزدہ ہوں بچّہ کی ماں نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، جب تو اس بھوت کو دیکھے تو بلا خوف اس پر بھرپور حملہ کر دے اس وقت یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ تیرا تخیل ہے یا حقیقت ہے۔ بچّے نے ماں کی بات سن کر کہا اماں جان، آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن اگر اس سیاہ بھوت کی ماں نے بھی اس کو یہی تعلیم دی ہو گی تب میں کیا کروں گا؟

اس جملہ معترضہ کے بعد اب میں پھر اصل موضوع کی جانب رجوع کرتا ہوں کہ انسان کو پہچاننے کے سلسلے میں یہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اس کی گفتگو سے حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے لیکن اگر وہ شخص گفتگو ہی نہ کرے تو پھر اس کو کس طرح شناخت کیا جا سکتا ہے، آپ؏ نے فرمایا کہ تم اس کے سامنے خاموش رہو اور خود کو اس کے سپرد کر دو اور صبر کرو ممکن ہے کوئی جملہ اس کی زبان سے نکل ہی جائے اور اگر کوئی جملہ اس کی زبان سے نہ نکلے تو ممکن ہے کہ تمہاری زبان سے نکلنے والے کسی ایسے جملے سے جو تم نہ کہنا چاہتے ہو اور اسی بات سے تمہارے اندر سختی اور اندیشے پیدا ہو جائیں تب تم اپنی زبان سے نکلنے والی بات کے تاثرات سے اس کے بارے میں کچھ جان سکو گے کیونکہ یہ تاثرات اس شخص کا عکس اور اس کے احوال ہونگے جو تمہارے اندر ظاہر ہوتے ہیں جن کا اظہار تمہاری زبان سے ہوا ہے۔

اِتّقوا فراسۃ المؤمن کا عملی مظاہرہ

شیخ سرزری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ایک مرید کو زبردست بھوک لگی شیخ نے فرمایا فلاں شخص کیلئے بھنی ہوئی سری لاؤ۔ حاضرین نے عرض کیا کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ فلاں شخص بھنی ہوئی سری کی خواہش رکھتا ہے۔؟

شیخ نے فرمایا، تیس سال گزر چکے ہیں مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی۔ میں نے خود کو تمام خواہشات سے پاک و منزہ اور مبرّا کر لیا ہے اور میری کیفیت ایسی ہو گئی ہے جیسی کہ آئینہ، جس پر کوئی نقش نہیں ہے۔ جب بھنی ہوئی سری کا خیال میرے ذہن میں آیا اور مجھے اس کی خواہش ہوئی تو اس وقت

مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ فلاں شخص کی خواہش ہے کیونکہ آئینہ بغیر نقش کے تھا اور اگر اس میں کوئی شبیہ نظر آتی ہے تو وہ شبیہ اپنی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہوگی۔

چلہ کشی کے دوران ندائے غیبی

شیخ کی اس حکایت کو بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ ایک شخص اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے چلہ میں بیٹھا تھا۔ دورانِ چلہ اس نے ایک ندائے غیبی سنی کہ یہ مقصد بذریعہ چلہ کشی سے حاصل نہ ہوگا تم چلہ سے باہر آؤ تاکہ کسی بزرگ کی نظر تم پر پڑے اور تمہارا مقصود حاصل ہو جائے۔

اس شخص نے دریافت کیا کہ میں ان بزرگ کو کہاں تلاش کروں۔ جواب ملا جامع مسجد میں چلہ کش نے کہا جامع مسجد کے کثیر مجمع میں انھیں کس طرح پہچان سکوں گا؟ جواب ملا وہ خود تمھیں پہچان لیں گے تم جاؤ تو اور اُن کو پہچاننے کی علامت یہ ہے کہ جس شخص کی نظر پڑتے ہی تمہارے ہاتھ سے پانی کا لوٹا گر جائے اور ان کی نظر پڑتے ہی تم بے ہوش ہو جاؤ اسی شخصیت سے تمہارا مقصود پورا ہوگا تم سمجھ لینا کہ ان کی نظر تم پر پڑ گئی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے آفتابہ ہاتھ میں لیا اور مسجد کی صفوں کے درمیان گشت کرتے ہوئے لوگوں کو پانی پلانا شروع کر دیا۔ ناگہاں اس پر کیفیت طاری ہوئی۔ نعرہ لگایا، آفتابہ ہاتھ سے گر گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو خود کو مسجد کے ایک گوشہ میں پڑا ہوا پایا۔ اس وقت مسجد میں کوئی فرد موجود نہ تھا حتیٰ کہ وہ بزرگ بھی جن کی نظر پڑنے سے اس پر بے ہوشی طاری ہوئی تھی لیکن اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

بندگانِ خاص کی خصوصیات

دیکھو اللہ رب العٰلمین کے ایسے بندے بھی ہیں جو اپنی عظمت اور غیرتِ حق کی وجہ سے خود کو لوگوں پر ظاہر نہیں کرتے لیکن لوگوں کی حاجت برآری کر دیتے ہیں اور بڑے بڑے مقصد پورے کر دیتے ہیں لیکن ایسی عظیم ہستیاں بہت کم ہیں سائل نے سوال کیا کیا آپ کی خدمت میں اور آپ کے سامنے بھی ایسے لوگ آتے ہیں تو آپ نے جواب دیا میرا سامنا ہی نہیں میری محاذات "سامنا" تو عرصہ دراز سے فنا ہو چکی ہے اب تو جو کوئی بھی آتا ہے تو وہ اپنے اعتقاد کے سامنے آتا ہے جس کا اس نے اعتقاد کر رکھا ہے وہ (میرے سامنے نہیں آتا)

دنیا میں گھر کہاں؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے عرض کیا اگر اجازت ہو تو ہم آپ کے گھر آئیں؟ آپؑ نے جواب میں فرمایا دنیا میں، میرا گھر کہاں ہے؟ اور یہاں کس کا گھر ہے۔؟

ایک واقعہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ بالا مقولہ کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مسیح علیہ السلام جنگل میں تھے شدید بارش ہوئی آپؑ نے ایک غار میں پناہ لے لی۔ یہ غار ایک سیاہ گوش کا مسکن تھا۔ تھوڑی دیر کو بارش رکی اس وقت جناب مسیح علیہ السلام کے پاس وحی آئی کہ آپ اس غار سے باہر آجائیں۔ کیونکہ سیاہ گوش کے بچے آپ کی وجہ سے غار میں نہیں آرہے ہیں اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ بار الٰہا! سیاہ گوش کے بچوں کے لئے تو مامن اور مکان ہے لیکن ابن مریمؑ کے لئے نہ تو مکان ہے اور نہ کوئی پناہ گاہ۔

مذکورہ بالا واقعہ اور حضرت مولانا قدس سرہٗ

مذکورہ بالا حکایت نقل فرماتے کے بعد آپ نے فرمایا کہ سیاہ گوش کے بچوں کے لئے تو گھر کا انتظام ہے اور اس معشوق نے ان بچوں ہی کے لئے تم کو نکالا ہے پس تمہارا اگر کوئی گھر نہیں ہے تو کیا پرواہ کہ تم کو اس نکالنے والے نے اپنے اس لطف کی خلوت سے مخصوص کرلیا ہے کہ تم کو سیاہ گوش کے بچوں کے لئے نکالا جاتا ہے اس کی اس ادا کے بدلہ ہزاروں برج آسمان و بنیاد آخرت عرش و کرسی بھی صدقہ ہیں اور یہ اعزاز تخاطب اور نکالے جانے کا لطف خاص ان سب سے بڑھ کر ہے۔

امیر کی آمد اور ملاقات

مولاناؒ نے فرمایا جب امیر پروانہ میرے پاس ملاقات کے لئے آئے تو میں نے ان سے فوراً ملاقات نہیں کی۔ لیکن میرے اس طرز عمل سے ان کو دل شکستہ خاطر نہ ہونا چاہیئے تھا کیونکہ بلکہ مدیا تو میری عزت افزائی کا سبب ہوسکتی تھی یا ان کے لئے باعث اعزاز۔ اگر ان کا آنا میری عزت افزائی کے لئے تھا تو جتنی دیر انھوں نے میرا انتظار کیا اور میرے یہاں تشریف فرما رہے اتنی ہی میری عزت افزائی کی لیکن اگر وہ اپنی عزت افزائی کے لئے آئے تھے تو جتنی دیر انھوں نے میرا انتظار کیا خود ان کی عزت افزائی ہوئی اور وہ ثواب حاصل

کرتے رہے اور ان کے اعمالِ خیر میں اضافہ ہوتا رہا۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے کچھ افزوں ہو کر ان کو حاصل ہوا اس لئے ان کو مغموم نہیں ہونا چاہیئے۔

فصل

قلب اور اس کی گواہی

حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ العزیز نے فرمایا کہ ایک مقولہ مشہور ہے کہ دل ایک دوسرے کے گواہ ہوتے ہیں۔ ان القلوب الی القلوب شواھد ایک ضرب المثل ایک کہاوت ہے جو زبان زدِ عام ہے جس کے مفہوم و مصداق سے وہ آشنا بھی ہیں ورنہ بات کی کیا حاجت تھی اور جب دل گواہی دے تو زبان کی گواہی کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ آپ کی یہ گفتگو سن کر امیر یزدانہ نے کہا کہ بیشک یہ بات درست ہے کہ دل گواہی دیتا ہے لیکن دل کا انداز اور ہے۔ کان، آنکھ اور زبان کے انداز اپنی اپنی جگہ الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی اپنی ضرورت ہے تاکہ فوائد اور افزوں ہو جائیں۔

اس موقع پر مولانا قدس سرہٗ نے فرمایا کہ اگر دل مستغرق ہو جائے تو تمام کے تمام اعضائے انسانی اس میں محو ہو جاتے ہیں اور زبان کے محتاج نہیں رہتے۔ دیکھو لیلیٰ کا حسن اگرچہ رحمانی نہ تھا بلکہ گوشت پوست کا مجموعہ لیکن اس عشق میں ایسی کیفیت و محویت اور ایسا استغراق تھا اس نے مجنوں کو ایسا مستغرق کر دیا تھا کہ وہ ان ظاہری آنکھوں سے لیلیٰ کو دیکھنے کا محتاج نہ تھا اور نہ اس کے کلام کو کانوں سے سننے کی احتیاج تھی۔ کیونکہ وہ لیلیٰ کو اپنی ذات سے جدا ہی خیال نہ کرتا تھا اور اس شعر کا مصداق تھا۔

خیالک فی عینی و اسمک فی فمی   وذکرک فی قلبی فکیف تغیب

(تیرا تصور میری آنکھوں میں اور تیرا نام میرے لب پر ہے اور تیری یاد میرے دل میں ہے، پھر تو کس طرح مجھ سے جدا رہتی۔

عاشق کی کیفیت

جب مجازی عشق کی یہ کیفیت ہو اور جسمانی عاشق کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے معشوق کو خود سے جدا تصور نہیں کرتا اور اس کے احساسات مکمل طور پر معشوق میں مستغرق ہیں اس کی آنکھ کان اور قوت شامہ وغیرہ کوئی عضو بھی سوائے معشوق کے کسی اور حظ کا طالب نہ ہو سب اسی محبوب میں جمع اور موجود ہوں (انکی اپنی انفرادی حیثیت باقی نہ رہے) اگر ان اعضاء میں کوئی عضو بھی محبوب کے حسن و جمال یا اسکے کلام و قرب کی عطر بیزیوں سے محظوظ ہو تو تمام اعضاء اس حظ میں مستغرق ہو جائیں اور کسی دوسرے حظ کے طالب نہ ہوں۔ اگر احیاناً کوئی عضو ایسی حالت میں کسی دوسرے حظ کا طالب ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہو گا کہ اس عضو نے حظ سے اس قدر حصہ نہیں پایا جیسا کہ بہرہ یاب ہونے کا حق تھا۔ اس کا حظ ناقص و ناتمام رہا اور وہ حظ کامل میں مستغرق نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ دوسرے اعضاء کو اس میں کامل استغراق حاصل نہیں ہوا اس لئے اس کی حس کسی دوسرے حظ کی طلبگار ہے اور وہ دوئی چاہتی ہے۔ ہر حس کے لئے بہرہ اندوزی کے انداز مختلف ہیں حقیقی طور پر تمام حواس باہم مجتمع ہیں لیکن صوری طور پر جدا جدا ہیں اور جب ایک عضو کو استغراق تام حاصل ہو جاتا ہے تو تمام دوسرے اعضاء اس سے مستفید ہوتے ہیں اور اس کیفیت سے متکیف ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں شہد کی مکھی کی مثال سے حقیقت حال کو سمجھا جا سکتا ہے کہ جب وہ پرواز کرتی ہے تو اس کے تمام پر اور دوسرے اعضاء ہلتے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ شہد بنانے میں مصروف ہو جاتی ہے تو اس کے تمام اعضاء ساکن ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی حرکت نہیں کرتا۔

استغراق کی تعریف

استغراق کی تعریف یہ ہے کہ خودی فنا ہو جائے اور دوئی درمیان میں باقی نہ رہے۔ جد و جہد کی کیفیت ختم ہو جائے نہ عمل ہو نہ حرکت۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ایسی کیفیت پیدا ہو جائے جیسی کہ پانی میں ڈوبنے والے کی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس حالت میں اس سے جو عمل بھی ظاہر ہوتا ہے وہ ذاتی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ پانی کی وجہ سے ہوتا ہے اگر اس حالت میں وہ پانی میں ہاتھ پیر مارتا ہے تو اس کو غرق ہونا

نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر پانی میں ڈوبنے والا چیختا چلاتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں مجھے بچاؤ تو اس کو استغراق کی کیفیت نہیں کہیں گے۔

منصور اور انا الحق کا نعرہ

منصور کا دعویٰ انا الحق اسی مفہوم کی تفسیر ہے حالانکہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ منصور کا یہ دعویٰ بہت ہی عظیم اور عجیب دعویٰ ہے۔ حالانکہ انا العبد کہنا یعنی اپنے بندہ ہونے کا دعویٰ کرنا بڑی اور عظیم بات ہے اور انا الحق کا دعویٰ تو ایک عظیم تواضع کا مظہر ہے جب کہ عبدیت کا دعویٰ کرنے والا دوئی کا اظہار کرتا ہے ایک اپنی ذات کا اور دوسری ذات باری تعالیٰ کا۔ لیکن منصور کا دعویٰ انا الحق اپنی خودی کو ختم کرتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو فنا کرنا ثابت کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ میں تو ہوں ہی نہیں سب کچھ اسی کی ذات ہے اور اللہ رب العلمین کے علاوہ کوئی باقی رہنے والی ہستی نہیں میں تو عدم محض ہوں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ منصور کے دعوی میں کمال تواضع اور عجز ہے لیکن یہ بات لوگوں کے سمجھ میں نہیں آتی۔

بندہ اور بندگی

اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کرتا ہے تو یہ بندگی درمیان میں موجود ہے حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی ہے مگر وہ اس بندگی میں اپنی ذات کو بھی قائم رکھتا ہے اور ذات معبود بھی پیش نظر ہے کہ وہ اس کی عبادت کر رہا ہے۔ ایسا شخص غرقاب نہیں ہے غرقاب تو وہ ہے جس کا کوئی عمل ذاتی نہیں ہوتا بلکہ اس کا ہر عمل ہاتھ پاؤں ہلانا وغیرہ سب کچھ پانی کا عمل ہوتا ہے۔ مثال سے اس طرح سمجھیں کہ ایک شیر نے ایک ہرن کا تعاقب کیا تو ہرن بھاگ گیا مگر شیر نے اسے جا پکڑا اور وہ اس کے پنجہ میں آکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور بیہوش ہو کر شیر کے سامنے گر پڑا تو اب جو ہستی باقی رہی وہ صرف شیر ہی کی تھی۔ کیونکہ ہرن تو بیخود اور از خود رفتہ ہو گیا اب اس کی ہستی باقی نہیں رہی۔

استغراق حقیقی

استغراق کی تعریف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خوف کے علاوہ جو لوگوں پر شیر، چیتے اور ظالم سے طاری ہوتا ہے صرف اپنا خوف

طاری کر دیتا ہے (جو اللہ تعالیٰ سے خائف ہوتا ہے وہ پھر کسی سے خائف نہیں ہوتا) اور خداوند کریم اس کو خود اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اس پر اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ خوف بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اور امن بھی، عیش و طربؔ خور و خواب بھی حق تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتا ہے اور بیداری کے عالم میں اپنی آنکھوں سے شیر چیتے اور آگ کو دیکھتا ہے اور اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر چیتا یا آگ اس دنیا سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مصور ہو کر سامنے آگئے ہیں۔ اور اسی طرح وہ اپنے جمال جہاں آ کی زیارت اور بہترین حُسن جمال کے پردوں سے اپنا مشاہدہ کراتا ہے۔ اس کو باغ، روشنیاں، نہریں، حور و قصور، لذیذ کھانے، شربات، شہر و منازل اور قسم قسم کے عجائب کا مشاہدہ ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان اشیا کا تعلق اس دنیا سے نہیں بلکہ حق تعالیٰ نے ان کو اس کی نظروں کے سامنے مصور کر کے ظاہر کر دیا ہے اس وقت یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ایسے شخص کو خدا کا خوف ہے۔ اور یہ ساری کیفیت خوف خدا کی وجہ سے ہے۔ اس طرح اس کی ہر امید، راحت، مشاہدہ کا تعلق اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ خوف دنیاوی خوف نہیں رہتا۔ اور یہ بات دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ مشاہدہ کی وجہ سے ہے۔ جب حق نے یہ متعین فرما دیا کہ یہ تمام امور اسی کی جانب سے ہیں (ہمہ از دوست)

فلسفہ کی دلیل پائیدار نہیں ہے

اور فلسفی بھی اس بات کو سمجھتا ہے لیکن اس کی دلیل پائیدار نہیں ہوتی۔ اور وہ خوشی اور مسرت جو دلیل سے حاصل ہوتی ہے اس کو بقا نہیں ہوتی اور جب تک تم یہ دلیل و براہین پیش کرتے رہو گے تو حرارت خوشی اور مسرت باقی رہے گی۔ لیکن جب دلائل و براہین کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ مسرت اور گرمی بھی باقی نہیں رہتی۔ اس کو اس مثال سے سمجھو کہ ایک شخص ایک مکان کو دیکھ کر حالات اور واقعات سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ مکان کا کوئی تعمیر کرنے والا ہے۔ اور وہ نابینا نہیں بلکہ بصارت کی قوت رکھتا ہے وہ عاجز نہیں بلکہ قدرت رکھتا ہے۔ وہ معدوم نہیں وہ موجود تھا، وہ زندہ ہے مردہ نہیں اور تعمیر مکان سے قبل بھی تھا۔ انسان یہ سب کچھ جانتا ہے۔ یہ سب کچھ وہ دلیل کی بنا پر جانتا ہے اور دلیل

تم جانتے ہو کہ پائیدار نہیں ہوتی ۔ وہ جلد فراموش ہو جاتی ہے۔ خداشناسوں اور عارفوں نے ریاضتیں کیں اور بزرگوں کی خدمت میں مصروف رہے تب انہوں نے اس بنّا (معمارِ حقیقی، خالق کائنات) کو پہچانا اور عین الیقین سے اس کو دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود معمار (خالق کائنات) ہرگز ان کے تصوّر اور نظر سے غائب نہیں ہوا پس ایسا شخص ہی فانی مطلق کہلاتا ہے! اس کے حق میں گناہ گناہ نہیں ہوتا اور نہ جرم جرم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تو غریق اور مستہلکِ آب ہے (جو کچھ ہو رہا ہے پانی سے ہو رہا ہے غریق کی خود اپنی حرکت اور فعل نہیں ہے) جیسا کہ ہم اس سے قبل وضاحت کر چکے ہیں۔

ایک غلامِ مقرّب کا واقعہ

ایک بادشاہ نے اپنے تمام خادموں اور غلاموں کو حکم دیا کہ ہر ایک بلوریں پیالہ اپنے ہاتھ میں لے لے کہ ایک مہمان آنے والا ہے۔ یہی حکم اس نے اپنے خاص اور مقرّب غلام کو بھی دیا کہ تو بھی ایک بلوریں پیالہ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ لیکن جب بادشاہ نے اس کی طرف توجہ کی اور اس کی طرف دیکھا تو وہ غلامِ مقرّب بادشاہ کے دیدار سے اس طرح مست و بیخود ہو گیا کہ وہ بلوریں قدح اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ دوسرے غلاموں نے جب یہ حالت مشاہدہ کی تو انہوں نے خیال کیا کہ ایسا ہی کرنا چاہیئے' چنانچہ سب نے قصداً بلوریں پیالے اپنے ہاتھوں سے گرا دیئے۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا اور کہا تم نے یہ کیا حرکت کی۔ دوسرے غلاموں نے جواب دیا چونکہ آپ کے مقرّب غلام نے ایسا کیا تھا (اس لئے ہم نے بھی اسی کی طرح کیا) بادشاہ نے کہا کہ اے نادانو! میرے مقرب غلام نے وہ پیالہ نہیں توڑا تھا بلکہ وہ تو میں نے خود توڑا تھا (میری وجہ سے وہ ٹوٹا تھا)۔ بظاہر تو ایسا کرنا گناہ اور خطا کاری تھی لیکن وہ گناہ عین طاعت تھا۔ بلکہ تمام طاعتوں سے بڑھ کر تھا۔ چونکہ مقصود ان سب سے صرف وہی ایک مقرّب غلام تھا باقی تمام غلام تو اس کے متبع اور اس کے طفیلی تھے۔ اس لئے کہ وہ غلام مقرّب حقیقت میں بادشاہ کا حکم رکھتا تھا (بادشاہ تھا)۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی ہے کہ سب ہی بادشاہ (حقیقی) کے غلام ہیں۔ چونکہ وہ عین سلطان ہے پس دوسرے سب اس کے متبع

ہونگے جس کی ہم نے صراحت کی۔ پس اسی طرح تمام غلام حقیقی معنوں میں بادشاہ ہیں کہ وہ بادشاہ کے جمال سے متجلی اور مستنیر ہیں (لیکن وہ صورت کے اعتبار سے غلام ہیں مگر حقیقت میں بادشاہ ہیں)

ایک حدیث قدسی میں ارشاد ہے

لولاك لما خلقت الافلاك (اے پیغمبر اگر میں تم کو پیدا نہ کرتا تو زمین اور آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا) اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہی تو اناالحق ہے۔ یعنی اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے افلاک کو اپنے لئے پیدا کیا ہے اور یہ ارشاد فرمانا بھی اناالحق ہے۔ لیکن اس کی زبان دوسری ہے اور ایک دوسرے رمز و کنایہ میں ہے (ہر ایک اس رمز و کنایہ کو نہیں سمجھ سکتا)

بزرگان طریقت و معرفت اگر سو کلام سو مختلف اسلوب میں ادا کریں جب بھی وہ ایک ہی ہونگے (باعتبار معنی و حقیقت) چونکہ حق بھی ایک ہی ہے۔ اور اس کی راہ (طریقت) بھی ایک ہی ہے پھر دو باتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ البتہ ظاہری اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مخالف نظر آتی ہیں یہ تفرقہ اور دوئی ظاہری اعتبار سے ہے باطناً اور معناً وہ جمع ہے جس طرح کہا جائے کہ "خیمہ تیار کرو" تو کوئی شخص رسی بٹنے لگتا ہے۔ ایک شخص لکڑی کی میخیں تیار کرنے لگتا ہے۔ ایک خیمہ کا کپڑا بنتا ہے، ایک سیتا ہے پس یہ تمام احوال و کیفیات اگرچہ از روئے ظاہر مختلف ہیں لیکن معنی میں "جمع" ہیں اور سب ایک ہی کام کر رہے ہیں۔ یعنی خیمہ بنانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح اس دنیا کے احوال میں غور سے دیکھو! سب ہی خداوند تعالیٰ کی بندگی میں مصروف ہیں، خواہ فاسق ہو یا زاہد و صالح، عاصی ہو یا مطیع، کیا دیو کیا فرشتہ، سب اسی کی بندگی کر رہے ہیں۔ مثلاً بادشاہ چاہتا ہے کہ اپنے غلاموں کی آزمائش دنیاوی اسباب میں کرے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ کون ثابت قدم ہے اور کون گریز پا ہے، کون عہد کا پختہ ہے اور کون عہد شکن ہے۔ ان میں وفادار کون ہے اور بے وفا کون ہے؟ پس اس آزمائش کے لئے وسوسہ انگیز، ہیجان آفریں اسباب پیدا کرتا ہے تاکہ ثبات و عدم ثبات کا امتحان ہو جائے۔ اگر یہ وسوسہ انگیزی اور محرکات نہ ہوں تو ثبات کس طرح معلوم ہو۔

بادشاہ کی خواہش یہ ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تو وہ ہوا کو حکم فرماتا ہے، تاکہ وہ ثابت قدم اور غیر ثابت قدم کو علیحدہ کردے اور مچھر کو درخت اور باغ سے علیحدہ کردے۔ مچھر اڑ کر چلا جائے اور مچھر کے علاوہ جو کچھ ہے وہ باقی رہ جائے۔ (گویا مچھر غیر ثابت قدم اور گریز پا ہے۔ درخت اور باغ ثابت قدم رکھتے ہیں)۔

ثابت قدمی کیلئے امتحان

ایک بادشاہ نے اپنی کنیز سے کہا کہ خوب بناؤ سنگھار کرکے دوسرے غلاموں میں گھل مل جا تاکہ ان کے راز کا پتہ چل سکے۔ اگرچہ اس باندی کا عمل بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا (کہ بادشاہ کی ملک ہوکر دوسروں سے اختلاط کرے) لیکن اس کا عمل تو بادشاہ کی تعمیل ارشاد میں ہے (اس کا فعل ذاتی نہیں ہے)۔

اللہ کے مخلص بندوں نے خود کو جب اس دنیا میں دیکھا تو انہوں نے یہ بات نہ تو دلیل سے پہچانی اور نہ تقلید سے بلکہ بے پردہ اور بے حجاب اس بات کو دیکھا کہ تمام اچھے اور برے اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی اور طاعت بجالاتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:۔ "وَان من شیٔ الا یسبح بحمدہ" (بنی اسرائیل ع ۵) کوئی شیٔ ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید میں مصروف نہ رہتی ہو۔

پس اس طرح ان لوگوں کے حق میں تو یہی دنیا گویا قیامت ہے کیونکہ قیامت ایسا حال ہے کہ تمام مخلوق اللہ کی بندگی کرے۔ اور اس کی بندگی کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہو۔ اور یہ لوگ اس حال کا معائنہ ہر جگہ کرتے ہیں (یہ صورتِ حال دنیا میں ہمہ وقت موجود ہے)۔" لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً۔ اگر پردہ ہٹا بھی دیا جائے تو بھی وہ میرے یقین میں زیادتی کا سبب نہیں ہوگا۔

عارف و عالم کا فرق

لغوی اعتبار سے عالم کا مرتبہ عارف سے بلند ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے عالم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے عارف کا لفظ نہیں بولا جاتا عارف کے معنی یہ ہیں کہ وہ پہلے نہیں جانتا تھا اب جان گیا ہے۔ اور یہ معنی اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے لیکن عرفاً و اصطلاحاً عارف کا مرتبہ عالم سے زیادہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ عارف بغیر دلیل کے معلوم کرلیتا ہے

اور اس نے علم کو مشاہدہ اور معائنہ سے حاصل کر لیا ہے۔ عرف عام میں عارف اسی کو کہتے ہیں۔

عالم و زاہد کا موازنہ

کہا جاتا ہے کہ عالم مرتبہ میں زاہدوں سے بڑھ کر ہوتا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟ آخر یہ زاہد بھی اپنے علم کی وجہ سے زاہد بنا ہے ورنہ زہد بغیر علم محال ہے۔ جانتے ہو؟ زہد کیا ہے دنیا سے لاتعلقی برتنا تصور آخرت اور طاعت میں منہمک ہونا۔ ہونا تو یہ چاہئیے کہ وہ دنیا کی معرفت حاصل کرے زشتی اور بے ثباتی کو سمجھے آخرت کی کشش لطافت و ثبات اور بقا کے رموز کو سمجھے اور یہ سوچے کہ اب میں طاعت کس طرح انجام دوں کہ حق طاعت ادا ہو۔ یہ تمام گفتگو علم ہی سے تعلق رکھتی ہے چونکہ زہد بغیر علم کے محال، لہٰذا زاہد کو بھی عالم ہی کہیں گے اور ایسے زاہد و عالم سو زاہدوں سے برتر جو کہا جاتا ہے وہ درست ہے، لیکن ان دونوں کے فرق کی جانب توجہ نہیں کی کہ علم ظاہر کا عامل جب علم روحانی کی منزل پر پہنچا اور رب تعالیٰ نے اس پر کرم فرمایا تو یہ روحانی علم زہد اور علم ظاہری کے ثمرات سے ہی ہوگا اور ایسا عالم لاکھ زاہدوں سے برتر ہوگا۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک درخت لگایا، اس درخت نے پھل دیا تو ایسا درخت ان سو درختوں سے بہتر ہوگا جو پھل نہیں دیتے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ درخت ثمر دار نہ ہو سکیں۔ کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سی آفتیں آنی ممکن ہیں جو ان درختوں کے ثمر آور ہونے میں مزاحم ہو سکتی ہیں اور دوسری مثال یہ بھی ہے کہ وہ شخص جو سفر حج کے ارادہ سے گھر سے نکلا اور منزل مقصود تک رسائی حاصل کر لی اور حرم کعبہ کی زیارت سے مشرّف ہو گیا وہ شخص ان سینکڑوں حجاج سے بہتر سمجھا جائے گا جو ابھی تک منزل مقصود تک نہیں پہونچے ہیں۔ اور راہ میں ہیں۔ کیونکہ وہ اب تک اس خوف میں مبتلا ہیں کہ منزل مقصود تک پہونچ بھی سکیں گے یا نہیں۔؟

اس سلسلہ میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ "ایک حقیقت ہزار شکوک سے بہتر اور برتر ہے۔"

امیر نائب کا استفسار اور اس کا جواب

امیر نائب نے اس موقع پر عرض کیا کہ حضرت! وہ لوگ جو اب تک منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکے ہیں انہیں اپنے پہونچنے کی امید تو ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا امن اور خوف میں بہت فرق ہے۔ اور یہ فرق سب پر ظاہر ہے اور اس فرق کی تفصیل اور توضیح کی کیا ضرورت ہے۔ موضوع گفتگو امن ہی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ امن کے درجات میں بھی بہت عظیم فرق ہے انبیاء سابقین پر حضور علیہ السلام کو جن وجوہ کی بنا پر افضلیت حاصل ہے ان میں سے ایک وجہ امن بھی ہے حالانکہ انبیاء سابقین بھی امن کے داعی رہے ہیں۔ اور خوف کی منزل سے گزر چکے ہیں دیگر وہی بات جس کا تذکرہ ماسبق سطور میں کیا گیا ہے) کہ اس کے مختلف درجات ہیں۔ آیت قرآنی ہے:۔

ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات (زخرف ۳۲)

ہم نے بعض انبیاء کے درجے بعض سے بلند فرمائے ہیں۔

عالمِ خوف کے مقامات

(جس طرح امن کے سلسلہ میں درجات ہیں) عالم خوف میں بھی بہت سے درجات و مقامات ہیں جن کی نشاندہی ممکن ہے لیکن امن کے مقامات کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نشاندہی ممکن نہیں۔ جب عالم خوف پر نظر ڈالیں گے تو یہ دیکھیں گے کہ کون راہِ خدا میں کیا خرچ کر رہا ہے۔ ایک شخص راہِ خدا میں تن کی بازی لگاتا ہے تو دوسرا دھن قربان کر دیتا ہے اور کوئی جان کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ اسی طرح کوئی روزے رکھ کر عبادت کر رہا ہے۔ تو دوسرا نمازوں کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔ کوئی دس رکعتیں پڑھتا ہے تو کوئی سو رکعتیں ادا کرتا ہے۔ اس طرح ان کی منازل کا تصور اور تعین کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کی نشاندہی ممکن ہے جس طرح تونیہ سے قیصریہ تک کی مسافت اور اس کی منزلیں معین ہیں۔ مثلاً قیاد، ایروغ، اور سلطان وغیرہ مگر انطاکیہ سے مصر تک دریائی منازل کا تعین کرنا ممکن نہیں ان منازل کو صرف کشتی راں ہی جان سکتا ہے اور وہ ان منازل کے بارے میں بتاتا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ خشکی کے لوگ سمجھ نہیں سکیں گے۔

حضرت مولاناؒ کی یہ توجیہہ اور توضیح سُنکر ایبر ناشب نے کہا کہ اس تشبیہ بیان کو کچھ تو بتانا چاہیئے کیونکہ لوگ اگر پورے طور پر نہ سمجھ سکیں گے تو بھی کچھ نہ کچھ ان کی سمجھ میں آجائے گا اور وہ اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ واللہ اس بات کو اس طرح سمجھو کہ ایک شخص تاریک رات میں جاگ رہا ہے اور یہ خیال کر رہا ہے کہ میں دن سے قریب ہوتا جا رہا ہوں (کچھ دیر کے بعد دن ہو جائے گا) لیکن اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کس طرح دن تک رسائی ہو سکے گی۔ لیکن وہ دن کا منتظر ہونے کی وجہ سے دن کے قریب پہونچ جاتا ہے۔

اسی طرح ایک شخص تاریک رات اور ابر آلود موسم میں یک قافلہ کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے لیکن اس کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہونچا ہے۔ اور اب تک اس نے کتنی مسافت طے کی ہے لیکن جب دن نکلتا ہے تو اپنی طے کردہ مسافت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ اور کسی جگہ پہونچ ہی جاتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے حصول کے لئے آنکھیں ذرا دیر کو جھپکا لیتا ہے تو اس کا یہ عمل ضائع نہیں جاتا" فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ" (زلزال پ عم) جس نے رائی کے دانے کے برابر بھی نیک عمل کیا وہ اس کی جزا پائے گا۔

لیکن اگر باطن میں تاریکیاں اور حجابات ہیں تو پھر اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی مسافت طے کی ہے لیکن بعد میں حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ" الدنیا مزرعۃ الآخرۃ"۔ جو کچھ یہاں بوؤ گے آخرت میں وہی کاٹو گے۔ "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

دو مقدس نبیوں کی سیرت کی جھلکیاں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میں دو مختلف عادتیں تھیں۔ اول الذکر بہت ہنستے تھے۔ جناب یحییٰ علیہ السلام اکثر مصروف گریہ رہتے تھے۔ ایک دن حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ خالق کائنات کی تدابیر اور اس کے اسرار سے بے خوف ہو گئے ہیں جو اس طرح ہنستے رہتے ہیں! اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ آپ رب العالمین کے کرم اور اسکی بے پایاں اور لطیف عنایتوں سے غافل ہونے کے سبب روتے ہیں؟

اس موقعہ پر ایک عارف کامل نے حضرت مولانا سے سوال کیا - ان دونوں مقدس نبیوں میں کون بلند مرتبہ پر فائز ہے؟ مولانا نے فرمایا اس کا جواب تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی تعلیم فرما دیا ہے - (حسنہم بی ظنا یعنی انا عند ظن عبدی بی من آنجا ام کہ ظن بندہ من است۔ ہر بندہ کے ساتھ میری ایک صورت اور میرا خیال ہے۔ اور جو کوئی جس جگہ میرا خیال کرتا ہے میں اُس جگہ ہوتا ہوں۔ میں بندہ کا وہ خیال ہوں جو اس کے ساتھ ہوتا ہے اور اس حقیقت سے بیزار ہوں جہاں حق نہ ہو۔ اے میرے بندو! اپنے خیالات کو پاک کرو، کیونکہ تمہارے یہی خیالات میری جگہ اور میرا مقام ہیں۔ (یعنی بندہ میرے بارے میں جو خیالات رکھتا ہے اسی کے مطابق ہوتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میری رافت و کرم کا خیال کر کے ہنستے ہیں اور حضرت یحییٰ علیہ السلام میرے غضب سے ڈر کر روتے ہیں۔ ایک نے میرے لطف و کرم کا خیال کیا اور ایک نے میرے غضب و گرفت کا خیال کیا۔ دونوں حق پر ہیں[1]۔ پس اپنے خیال کو پاکیزہ بناؤ کہ یہی میرا مقام ہے۔

اب تم خود کو آزماؤ کہ رونے اور ہنسنے، روزہ و نماز، خلوت و جلوت میں کونسی چیز تمہارے لئے زیادہ نافع ہے۔ اور تمہارے احوال میں کونسی چیز زیادہ درست اور موزوں ہے اور کونسی کیفیت تم کو ترقی کی جانب لے جاتی ہے۔ لہٰذا اسی کو اختیار کرو۔" استفت قلبك وان افتاك المفتون" (حدیث) اپنے دل سے بھی فتویٰ لے اگرچہ مفتیوں نے فتوے دے رکھے ہوں معنوی اعتبار سے مفتی خود تیرے اندر پوشیدہ ہے۔ اور مفتیوں کے فتویٰ کو اپنے نفس کے سامنے پیش کر اور جو کچھ وہ فتویٰ دے اس کے مطابق عمل کر۔ اور یہ بات ایسی ہی ہے جس طرح کہ طبیب بیمار کے پاس آتا ہے تو وہ تمہارے اندرونی طبیب سے پوچھتا ہے اسی اندرونی طبیب کو مزاج سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کے اندر قوت مدافعت اور قبولیت ہے۔ بیرونی طبیب تم سے دریافت کرتا ہے

---

[1] اس مضمون کو مولانا نے مثنوی دفتر اول میں "دل نہادن مرد عرب بر التماس" کے زیر موضوع بیان فرمایا ہے۔

فلاں چیز کھائی تھی! اس سے تم کو طبیعت میں فرحت محسوس ہوئی تھی یا گرانی؟ پھر اس کی تشخیص وہی ہوتی ہے اندرونی طبیب تشخیص کرتا ہے اور اسی کے مطابق بیرونی طبیب کی تجویز ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل طبیب خود ہمارے اندر موجود ہے جس کو ہم نے مزاج سے تعبیر کیا ہے۔ جب یہ اندرونی طبیب ضعیف ہو جاتا ہے تو مزاج فاسد ہو جاتا ہے اور اس ضعف کی وجہ سے ہر چیز کو وہ معکوس دیکھتا ہے۔ ہر چیز کو کج دیکھتا ہے مثلاً شکر کو تلخ اور سرکہ کو میٹھا سمجھنے لگتا ہے۔

ایسی حالت میں ہم بیرونی طبیب کے محتاج ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ علاج معالجہ کرے اور پرانی طبیعت اور کیفیت عود کر آئے۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے اندرونی طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے تشخیص کراتا ہے۔ اسی طرح انسان کی معنوی مزاجی کیفیت ہے اور جب اندرونی کیفیت کمزور ہو جاتی ہے اور حواس باطنی جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ پس انبیاء علیہم السلام اور اولیاء رحمہم اللہ طبیب باطنی ہیں اور وہ مزاج کی معاونت کرتے ہیں تاکہ اس کا دل اور دین مستقیم ہو جائے۔ "ارنی الاشیاء کما ھی"۔ مجھے اشیاء اس طرح دکھا جیسی کہ وہ حقیقت میں ہیں (ان کی معاونت سے انسان حقیقت بین بن جاتا ہے)۔

انسان کیا ہے

انسان ایک عظیم چیز ہے اس کے اندر ہر چیز مکتوب ہے لیکن حجابات اور دنیاوی ظلمات اس کو نہیں چھوڑتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں اس علم کا مطالعہ کرے۔ ان مصروفیات کے حجابات اور تاریکیاں بہت ہیں۔ دنیا کی مختلف النوع تدبیریں، حیلے بہانے، دنیا کی آرزوئیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ لیکن تمام حجابات اور ظلمات کے باوجود (جو اسے گھیرے ہوئے ہیں) پھر بھی وہ کچھ نہ کچھ پڑھ لیتا ہے اور حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

غور کرو اور دیکھو کہ جب یہ حجابات اور ظلمتیں اور پردے ہٹ جاتے اور دور ہو جاتے ہونگے تو وہ کیا کیا معلوم کر لیتا ہوگا۔ اور پھر خود اپنی ذات سے کتنے علوم پیدا کر لیتا ہے۔ آخر یہ خیاطی سنادی، تجاری، لوہاری، سنار کا کام، علم نجوم، طب وغیرہ۔ اور حروف کی اقسام جو شمار و اندازہ سے زیادہ ہیں۔ وہ تمام کے تمام انسان کے ہی پیدا کردہ ہیں اور اسی سے ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ تمام

علوم وفنون پتھروں اور ڈھیلوں سے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔

ایک اور بات جو مشہور ہے کہ کوّے نے انسان کو مُردہ دفن کرنے کی تعلیم دی، یہ بھی انسانی تعلیم کا عکس تھا جو ایک پرندے سے ظہور میں آیا۔ انسانی ضرورت نے اس کو یہ فن سکھایا کہ حیوان انسان ہی کا جزو ہے اور جزو کو کل تعلیم نہیں دے سکتا۔

مثال سے اس کو اس طرح سمجھو کہ ایک شخص لکھنا چاہتا ہے لیکن معروف طریقے کے خلاف وہ قلم کو بائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ اگرچہ قلب مطمئن ہوتا ہے لیکن ہاتھ اس کا لرزتا ہے پھر بھی وہ دل کے حکم پر بائیں ہاتھ سے لکھتا ہے۔

امیر نائبؒ کے مولاناؒ کے بارے میں تاثرات

امیر نائب نے کہا کہ مولاناؒ ہمیشہ بلند پایہ گفتگو کرتے ہیں۔ مولاناؒ نے امیر کی یہ بات سن کر فرمایا گفتگو اہل سخن سے کبھی منقطع نہیں ہے۔ اور بات ہمیشہ اہلِ سخن تک پہونچتی ہے۔ اور اس کے ساتھ متصل رہتی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں اگرچہ درختوں پر برگ و بار نہیں ہوتے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کام میں مشغول نہیں ہوتے۔ یہ ہمیشہ مصروف کار رہتے ہیں۔

موسم کی کیفیات

موسم سرما آمدنی کا موسم ہے جب کہ موسم گرما خرچ کرنے کا زمانہ ہے اور آمدنی کو کوئی نہیں دیکھ پاتا۔ جب کہ خرچ پر سب کی نظریں پڑتی ہیں جب کوئی شخص مہمانوں کو مدعو کرتا ہے اور ان کی مدارات پر اخراجات کرتا ہے تو سب کی نظریں پڑتی ہیں۔ لیکن دیکھنے والوں کو اس کی آمدنی کا کوئی احساس نہیں ہوتا جو تھوڑی تھوڑی پس انداز ہوتی رہی تھی۔ اسطرح دیکھنے والے کو احساس نہیں ہوتا کہ اصل چیز آمدنی ہے اور اخراجات آمدنی کے بل بوتے پر ہی ہوتے ہیں۔ جب [illegible] سے تعلق خاطر ہوتا ہے ہم ہمیشہ اس کی جانب متوجہ رہتے ہیں، اور اس سے مصروف گفتگو رہتے ہیں۔ خواہ غیر موجودگی کا عالم ہو یا خموشی کا یا حضوری کی کیفیت ہو۔ اور اگر اس سے مصروف پیکار بھی ہوں اور ایک دوسرے پر طنز بازی بھی کرتے ہوں لیکن اس کے ساتھ مصروف کلام ہی ہوتے ہیں۔ اور ہم اس کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ اور اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اور جنگ تگ مارتے

ہیں تو ہماری مٹھی میں انگور کا خوشہ ہوتا ہے۔ اگر یقین نہیں تو مٹھی کھول کر دیکھ کہ وہ مویز ہی نہیں بلکہ عمدہ اور نفیس قسم کے موتی ہیں۔ (یعنی ہمارے ظاہری غضب یا بے التفاتی میں بھی در پردہ مہربانی اور التفات ہوتا ہے)

اہلِ علم کیسے کیسے معارف بیان کرتے ہیں

تم نے دیکھا ہے کہ صاحبانِ علم و بصیرت نظم و نثر میں کیسے کیسے لطیف نکتے بیان کر دیتے ہیں۔ ان کا جو میلانِ طبع اس طرف ہے اور ہماری جانب وہ جو متوجہ ہیں وہ معارف و حقائق اور حصول موعظت کی بنا پر نہیں ہے اس نوع کی چیزیں تو ہر جگہ موجود ہیں! اور بہت وافر ہیں بس جس وجہ سے وہ ہمیں دوست رکھتا ہے، وہ کوئی اور ہی بات ہے۔ اور وہ کچھ اور ہی دیکھ رہا ہے اور وہ چیز اس کو دوسروں سے حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

بادشاہ کا مجنوں سے استفسار

ایک بادشاہ نے مجنوں کو بلا کر اس سے کہا کہ اے مجنوں تجھے کیا ہوا ہے۔ اور تجھ پر کیا افتاد پڑی ہے۔ جو تو اپنی رسوائی کے درپئے ہے۔ اور خاندان، اعزہ، اقربا سب کو چھوڑ کر خانماں برباد ہوا ہے۔ اور تباہ حالی کو اپنا لیا ہے۔ تو نے لیلیٰ میں کیا دیکھا ہے اس میں تجھے کیا خوبی نظر آئی ہے۔ دیکھ میں تجھے دکھاؤں کہ حسن و جمال کیا ہوتا ہے اور حسین کیسے کہتے ہیں۔ میں ان حسینوں کو تجھے بخش دوں گا اور حسن و جمال کے ان پیکروں کو تیرے حوالہ کر دوں گا!

اس کے بعد بادشاہ نے بہت حسین و جمیل دوشیزاؤں کو بلایا اور مجنوں کے سامنے پیش کر دیا لیکن مجنوں نے ان کی جانب کوئی توجہ نہیں کی اور نہ گردن اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، بس خود کو دیکھتا رہا۔ بادشاہ نے کہا مجنوں یہ کیا ہے؟ گردن اٹھا اور انہیں دیکھ! مجنوں نے کہا مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے کیونکہ لیلیٰ کے عشق کی تلوار مجھ پر کھنچی ہوئی ہے۔ جیسے ہی میں اپنا سر اٹھاؤں گا لیلیٰ کے عشق کی تلوار سر قلم کر دے گی۔ مجنوں لیلیٰ کے عشق میں اس قدر مستغرق تھا۔ اور اس حال کو پہونچ گیا تھا کہ اس کے سوا اور کسی کی طرف گردن اٹھانے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ اور لیلیٰ کا عشق اس کے لئے شمشیر کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

جو اسے کسی دوسری جانب گردن اٹھانے ہی نہیں دیتا تھا۔ آخران حسین کنیزوں کے لب ورخسار، چشم و ابرو تھے۔ (جن کی خوبصورتی کے قصیدے پڑھے جاتے تھے۔) لیکن مجنوں نے لیلیٰ میں آخر کیا بات دیکھی تھی جس کی وجہ سے وہ مبہوت ہو کر رہ گیا تھا (وہی بات امیر میری ذات میں دیکھ رہے ہیں جس کے باعث وہ دوسروں کی طرف متوجہ نہیں ہیں)۔

فصل

خدمت خلق ہی اصل شئے ہے؛

مولاناؒ نے امیر پروانہ سے فرمایا۔ ہم تمہارے مشتاق ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ تم مخلوقِ الٰہی اور رعایا کی فلاح میں مشغول ہو اس لیے ہم دوری کی مشقت برداشت کر لیتے ہیں۔ امیر نے کہا کہ یہ تو میرا فرض تھا۔ رعب ودبدبہ کی دہشت اب باقی نہیں رہی۔ اس لئے آئندہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوںگا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ تم میرے پاس آؤ یا میں تمہارے پاس پہنچوں اس میں کوئی فرق نہیں ہے (دونوں باتیں یکساں ہیں) تمہارے لطف وکرم سے یہ ایک ہی بات ہے۔ یہ زحمتیں زحمتیں نہیں ہیں بلکہ رحمت ہیں لیکن چونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم آج کل خیرات وحسنات میں بہت مشغول ہو (رعایا کی فلاح وبہبود کے کاموں میں حد سے زیادہ مصروف ہو) لہٰذا ہم خود تمہاری ملاقات کو آئیں گے۔

بہرحال اس وقت بات یہ ہو رہی تھی کہ ایک شخص عیالدار ہے اور دوسرا عیالدار نہیں ہے تو اس سے لیکر اس کو دے رہے ہیں (مالدار سے حکومت جزیہ۔ زکوٰۃ اور عشر وصول کر کے اس بے عیال کو دیتی ہے) لیکن ظاہر میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ عیالدار سے لیکر غیر عیالدار کو دینے کے کیا معنی؟ لیکن حقیقت کی نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ صاحب العیال خود اس صفت کا حامل نہیں ہے۔ اور اس کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ صاحب دل حضرات میں ایک صفت ہوتی ہے اگر وہ کسی پنہاں مصلحت کی وجہ سے کسی کو مارتا ہے اور اس کے سر کو، ناک کو، منہ کو زخمی اور لہولہان کر دیتا ہے تو ظاہر میں ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ پٹنے والا مظلوم ہے لیکن حقیقت اس کے برخلاف ہے اور مارنے والا درحقیقت مظلوم ہے اور وہ پٹنے والا ظالم ہے۔ اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ مارنے والا ایک نعمت مہنا،

کا حامل ہے اور مستغرق حق ہے۔ پس مارنے والا دراصل مالک حقیقی ہے اور (بظاہر) مارنے والے کا عمل حق تعالیٰ کا عمل تھا۔ اس لئے اس کو ظالم نہیں کہہ سکتے۔ کہ خداوند تعالیٰ ظالم نہیں ہے[1] جس طرح رحمت عالم وعالمیاں صلے اللہ علیہ وسلم نے کافروں سے جنگ و جدال کیا اور اس جنگ و جدال میں کافروں کا خون بہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے غزوات فرمائے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظالم نہیں تھے۔ حقیقت میں ظالم وہ کافر تھے۔ اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم تھے۔ اس کو اس مثال سے سمجھو کہ ایک مغربی شخص ہے جو مغرب میں مقیم ہے اور متمول اور صاحب زر و جواہر ہے۔ اور ایک مشرق کا رہنے والا ہے۔ وہ مغرب میں آیا ہے۔ بظاہر اسے مسافر کہنا چاہیئے لیکن حقیقت میں وہ مسافر (غریب) نہیں کہ یہ دنیا ایک گھر کی طرح ہے اب اگر کوئی گھر کے ایک کونہ سے دوسرے کونہ میں چلا جائے تو وہ مسافر نہیں کہلاتا۔ البتہ اگر وہ مغربی شخص جو صاحب جواہر ہے (بغرض تجارت و کاروبار) گھر سے باہر نکلے تو اس کو مسافر کہہ سکتے ہیں جس طرح فرمایا کہ "الاسلام بدأ غریبًا" (بدأ الاسلام غریبًا) اسلام کی ابتداء مسافرت سے ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ مشرق کی ابتداء مسافرت سے ہوئی (المشرق بدأ غریبًا) جس طرح رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (کفار کے مقابلہ پر) جو کشت و خون فرمایا اور غزوات میں مشغول ہوئے تو معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظالم نہیں تھے بلکہ درحقیقت وہ کافر ہی ظالم تھے۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم ہیں کو اس مثال سے سمجھو کہ مغرب کا ایک صاحب کمال باشندہ ہے اور ایک یہ مشرقی بشرقی کو غریب نہیں کہا جائیگا کیونکہ وہ مشرق سے مغرب میں آیا ہے۔ دوران سفر اس نے اپنی ضروریات کی کفالت کی ہے)

مظلوم کون ہوتا ہے؟

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ احد میں (نعوذ باللہ) شکست ہوئی تب بھی آپؐ مظلوم تھے۔ اس کے برخلاف دوسرے غزوات میں آپؐ نے جب اپنے دشمنوں کو شکست دی اس وقت بھی آپؐ مظلوم تھے کیونکہ دونوں حالتوں میں حق آپؐ ہی کے ساتھ تھا۔ اور مظلوم وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ حق ہو۔

رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو اسیران بدر کی حالت پر رحم آیا تو وحی الٰہی آئی :-

---

[1] مثنوی دفتر اول "جواب گفتن علی رضی اللہ عنہ" کے زیر عنوان اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

کہ اے اسیرو! اگر تم اسیری کی حالت میں پابند سلاسل ہوتے ہوئے نیک نیت رکھو تو حق تعالےٰ تمہیں رہائی عطا فرمائے گا۔ اور تمہارے نقصانات کی تلافی فرمائے گا۔ بلکہ اس سے دوگنا دے گا۔ اس کے علاوہ آخرت میں دو اور خزانے عطا فرمائے گا۔ ایک وہ جو تم سے لے لیا گیا اور ایک آخرت کا خزانہ۔ آخرت میں غفران و رضوان عطا فرمائے گا۔ اس کی توفیق خیر اور عمل سے ہوتی ہے۔ حضرت مولاناؒ کا یہ ارشاد سن کر امیر نے دریافت کیا کہ جب بندہ کوئی عمل کرتا ہے تو وہ توفیق اور خیر اس کے عمل سے ہوتی ہے یا عطائے الٰہی کے باعث ہوتی ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا یہ عطائے الٰہی اور توفیق الٰہی ہے لیکن حق تعالیٰ نے اپنے انتہائی لطف و کرم سے اس کی نسبت بندہ کی طرف کردی ہے (وہ توفیق اور عمل کی نسبت بندہ کو عطا فرما دیتا ہے) اور فرماتا ہے یہ دونوں تیری طرف سے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد فرماتا ہے۔ "جزاءً بما کانوا یعملون"۔ (یہ اچھا بدلہ ہے اس کا جو تم کرتے رہے ہو)۔ جب اللہ تعالیٰ ایسا لطف و کرم فرماتا ہے تو جو کوئی طلب حقیقی کے ساتھ اس خالق و مالک کی جانب رجوع ہوگا وہ مطلوب کو پائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ طلب بغیر رہبر و رہنما کے نہ ہو۔

طلب مقصود کیلئے واسطہ اور وسیلہ ضروری ہے

جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوا چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریائے نیل میں راستہ بنا، ایسا راستہ کہ اس سے گرد اٹھ رہی تھی۔ اور انہوں نے اس کو عبور کرلیا۔ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت سے انکاری ہوئے (عتاب الٰہی میں گھر گئے) تو چالیس سال تک صحرائے سینا میں سرگرداں رہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: "اربعین سنۃً یتیھون فی الارض" (مائدہ ۲۶) وہ چالیس سال تک زمینوں میں بھٹکتے رہے۔

اس طرح سالار ان کے امور کا نگراں اور ان کے مصالح کا جویا اور ان کے امور میں کوشاں رہتا ہے۔ اور اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ تمام افرادِ ملت اس کے مطیع و فرمانبردار اور اس کے تابع فرمان ہیں! اس کو مثال سے اس طرح سمجھو کہ لشکری یا فوجی امیر کے فرمانبردار اور اس کے مطیع ہوتے ہیں تو امیر ان کی

فلاح و صلاح کی سوچتا ہے لیکن جب یہ لشکری امیر کی اطاعت سے منہ موڑ لیں تو وہ کیونکر ان کی صلاح و فلاح کی جانب توجہ کرے گا۔ اور اپنی عقل ان کی بھلائی میں استعمال کریگا۔

جسم انسانی اور عقل

بس یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ عقل جسم انسانی میں امیر اور قائد کی طرح ہے! اور جب تک جسم کی رعایا اس کی مطیع اور فرمانبردار رہتی ہے تو تمام کام بحسن و خوبی انجام پاتے رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ مطیع نہیں رہتے تو فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ دیکھو جب کسی پر شراب کا نشہ طاری ہو جاتا ہے تو جسم کی رعایا یعنی اس کے اعضاء ہاتھ پیر اور زبان وغیرہ کس طرح فساد برپا کرتے ہیں۔ دوسرے روز جب شراب کا نشہ اتر تا ہے تو اسے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے کہ میں نے نشہ کی حالت میں ایسا کیوں کیا؟ کسی کو مارا، کسی کو گالی دی اور ایسی حالت میں اصلاح اس وقت ممکن ہے جب کہ اس خطہ میں کوئی سربراہ یا کوئی نگراں موجود ہو جس کی نگرانی کو سب قبول کرلیں۔ پس عقل اسی حالت میں اپنی جسمانی رعایا کی اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے جب کہ تمام اعضا اس کے مطیع ہوں۔ مثلاً اگر کہیں جانے کا ارادہ ہو تو جب تک پیر مطیع نہ ہونگے یہ عمل ناممکن ہوگا اور عقل کو چلنے کا خیال بھی نہ آئے گا۔

یہاں یہ بات ظاہر ہوئی کہ جس طرح عقل جسم انسانی میں امیر اور قائد کی طرح ہے! اسی طرح دنیا کی دوسری مخلوقات میں بھی عقل و دانش اور علم و نظر رکھنے والے ہیں۔ اور اپنی نسبت ان خوبیوں اور صفات کے ساتھ رکھتے ہیں لیکن تمثیلی دنیا میں یہ تمام صفات رکھنے والے ایک جسم کی طرح شمار ہونگے اور ان میں مجموعی طور پر کارآمد اور فیصلہ کن عقل ہی ہوگی۔ اور اس کو اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جو لوگ امیر کی قیادت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کا اتباع نہیں کرتے وہ ہمیشہ پریشانی اور خسارے کا شکار رہتے ہیں۔ لیکن جب امیر کی اطاعت اور اس کا اتباع کرتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں! اور اپنی عقل پر تکیہ نہیں کرتے، کیونکہ اس بات کا امکان رہتا ہے کہ جو کچھ امیر و قائد نے کہا ہے ان کی عقل کی رسائی وہاں تک نہ ہو! اس لئے ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ امیر و قائد کا اتباع کریں۔ جس طرح ایک بچہ کو درزی کی شاگردی میں دیا جاتا ہے تو اب اس شاگرد کا یہ فرض ہے کہ وہ استاد کے احکام کی تعمیل کرے۔

اگر وہ کرتہ پہننے کو دے تو وہ اس کو پہنے اگر وہ پائجامہ پہننے کو کہے تو وہ اس کو پہنے۔ اگر وہ کپڑے سینے کا فن سیکھنا چاہتا ہے تو اسے ہر حالت میں اپنے استاد کا حکم ماننا ہوگا اور اپنی رائے اور اختیار کو چھوڑنا ہوگا۔

ان تمام مثیلوں کے بعد حضرت مولاناؒ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذات کے ساتھ اطاعت و فرمانبرداری میں ایسی ہی حالت پیدا کردے اور ایسی کیفیت صرف اس کی عنایت سے پیدا ہو سکتی ہے جو ہزاروں کوششوں سے برتر و بالا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے" لیلۃ القدر خیر من الف شھر" (سورۂ قدر پارہ عم) شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔

اور اس سلسلہ میں یہ بات اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے کہ "جذبۃ من جذبات الحق خیر من عبادۃ الثقلین"۔ ذاتِ باری کی جانب ایک کشش دونوں جہانوں کی عبادتوں سے بہتر ہے۔ جب اس کی عنایت ہوتی ہے تو اس کے مقابلہ میں ہزار جدوجہد کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی (حالانکہ کوشش اور جدوجہد کا جذبہ بہتر ہے لیکن عنایت الٰہی کے آگے ہیچ ہے)

کوشش عنایت کا نتیجہ ہوتی ہے

یہ سن کر امیر پروانہ نے کہا کہ کیا عنایتِ الٰہی سے جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؟ مولاناؒ نے فرمایا کہ بیشک ایسا ہی ہے کیونکہ جب عنایت (بندہ کے) شاملِ حال ہوتی ہے تو جدوجہد کا جذبہ خود بخود (اس کے اندر) پیدا ہو جاتا ہے[1]۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہ کلمات گہوارہ میں ادا فرمائے تھے۔ تو کیا اس میں ان کی کوشش شامل تھی۔؟ "انی عبد اللہ اٰتٰنی الکتاب" (مریم ع ۲) میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا فرمائی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام ابھی شکم مادری ہی میں تھے۔ لیکن اس کی (اللہ تعالیٰ کی) تعریف و توصیف کرتے تھے (پس یہ سب کچھ عنایتِ الٰہی تھی۔ جدوجہد کا یہاں نام بھی نہیں تھا)۔

---

[1] مثنوی دفتر سوم "تمنا کردن ہاروت و ماروت مقام بشریت" کے تحت عنوان اشعار اس مضمون سے مطابقت رکھتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ

ان دو مقدس انبیاء کرام علیہما السلام کے تذکرہ کے بعد مولاناؒ نے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ مرتبہ کوشش اور جد وجہد کے بغیر عطا ہوا تھا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا، "فمن شرح اللہ صدرہ للاسلام" (زمر ع ۳) سو جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کھول دے۔

مولاناؒ نے فرمایا: اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ فضل خداوندی کو اولیت حاصل ہے۔ جب بندہ ضلالت اور گمراہی سے دور اور خواب غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے تو یہی فضل حق اور عطائے محض بندہ پر ہوتی ہے، ورنہ حضور علیہ السلام کے بعض قریب رہنے والوں کے ساتھ یہی کیفیت کیوں نہ پیدا ہوگی۔[۱] حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اس فضل الٰہی کے بعد جزا کی منزل آتی ہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسی کہ آگ کی پہلی چنگاری تو یہ فضل عطا ہے لیکن جب تم نے اس چنگاری کے سامنے روئی رکھ دی جو اس چنگاری کو پروان چڑھا دے تو یہ فضل اور جزا ہے (کہ اب اس روئی کے سبب وہ چنگاری شعلہ زن ہو جائے گی)۔ ورنہ انسان تو اپنی خلقت اور سرشت کے پہلے مرحلے میں نہایت کمزور اور ضعیف ہے "خلق الانسان ضعیفا" (نساء ع ۵) انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

جس طرح کہ پتھر اور لوہے کی رگڑ سے چنگاری نکل کر کپڑے کو جلا دیتی ہے، اس چنگاری کی ابتداء بہت کمزور تھی، لیکن جب تم نے اس چنگاری کو نہیں بجھایا اور اس کو تقویت ملی تو اب یہ ایک عالم کو جلا سکتی ہے۔ یہ حقیر سی چنگاری بہت عظیم آگ بن جائے گی۔ (فضل خداوندی نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کرم سے نوازا اور عطا کے بعد فضل فرمایا۔ تو آپ کی شان ایسی ہوگئی) کہ فرمایا "انک لعلیٰ خلق عظیم" (قلم ع ۱) بیشک آپ خلق عظیم کی منزل پر فائز ہیں۔ میں (مولف ملفوظات) نے امیر پروانہ سے کہا کہ حضرت مولاناؒ آپ کو بہت زیادہ دوست رکھتے ہیں۔ امیر پروانہ نے فرمایا کہ (افسوس) میری حاضری بقدر اس دوستی کے نہیں ہے۔ اور نہ میری گزارشات اس التفات کے بقدر ہیں لیکن جو کچھ خیال میں آتا ہے کہہ دیتا ہوں۔ خدا کو اگر منظور ہوا تو یہ تھوڑی باتیں بھی نافع بن جائیں گی۔ اور ان باتوں کو لوگوں (حاضرین مجلس

---

[۱] اس سلسلہ میں بہتوں کی مثال دی جا سکتی ہے جو دل سے سرکارؐ کی رسالت کے تو قائل تھے۔ مگر بوجہ اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکے۔

کے دلوں میں راسخ فرمادے گا۔ اور بہت زیادہ نفع بخشے گا۔ اور اگر اس کی منشا و مرضی نہ ہو تو لاکھوں باتیں کہو۔ کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ اور ایک دل میں بھی وہ مرتسم نہیں ہو سکتیں جس طرح آگ کی چنگاری کپڑے پر پڑے اگر حق تعالیٰ چاہے تو یہی چنگاری تقویت حاصل کر کے آگ بن جاتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہو تو سو چنگاریاں بھی کپڑے تک پہونچ کر بجھ جائیں! اور ان کا کچھ بھی اثر نہ ہو۔ "وَلِلّٰہِ جنود السمٰوٰت والارض" (فتح ع ۱) آسمانوں اور زمینوں کے لشکر اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں یہ باتیں بھی اللہ تعالیٰ کا لشکر ہیں جن کے ذریعہ اللہ کے حکم سے قلعہ فتح کیئے جاتے ہیں۔ (دل مسخر کیئے جاتے ہیں) اور ان پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس کا حکم ہو کہ اتنے ہزار کا لشکر لے جاؤ اور اس کا محاصرہ تو کرو لیکن قبضہ نہ کرو۔ تو وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور اگر ایک سوار کے لئے حکم ہو تو وہی ایک سوار قلعہ فتح کر لیتا ہے۔ اس کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ نمرود جیسے سرکش اور متمرد بادشاہ پر مچھر کو مسلط فرما کر نمرود کی ہلاکت کا سبب بنا دیا جاتا ہے اس لیئے کہا جاتا ہے "استوٰی عند العارف الدانق والدینار والاسد والھرۃ"۔ عارف کے لئے کوڑی اور دینار، شیر اور بلی برابر ہیں۔ اگر مشیت الٰہی ہو اور کوڑیوں میں برکت عطا فرمادے تو ایک کوڑی ایک لاکھ دینار کا کام کر دے۔ اور ایک لاکھ دینار سے وہ برکت اٹھالے تو وہ لاکھوں دینار کوڑی کا کام بھی نہ کریں گے۔ اسی طرح بلی کو اگر وہ کسی پر حملہ آور کر دے تو وہ اس کو اسی طرح ہلاک کر دیتی ہے جس طرح مچھر نے نمرود کو ہلاک کیا تھا لیکن وہ چاہے تو شیر کو فقیروں کی سواری بنا دیے اور شیر ان سے لرزاں و ترساں رہے۔ چنانچہ شیر بہت سے فقیروں کی سواری میں رہا ہے۔ اور ایک مثال یہ کہ نار نمرود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیئے ٹھنڈی اور سلامتی والی بنا دیا تھا۔ اور اس کو ان کے لیئے گل و گلزار میں بدل دیا تھا۔ کیونکہ مشیت الٰہی اس کی متقاضی نہیں تھی کہ وہ آگ جناب ابراہیم ؑ کو نقصان پہونچائے۔

بزرگوں کی باتیں جمعیت خاطر سے سنی جائیں:

حاصل کلام یہ کہ جب یہ بات متحقق ہو گئی کہ تمام امور مشیت الٰہی پر موقوف ہیں۔ اور سب اس کے سامنے یکساں ہیں۔ لہذا ہم اللہ رب العلمین سے یہ امید کرتے ہیں کہ آپ یہ باتیں توجہ اور دل لگا کر سنیں گے۔ کیونکہ توجہ اور دل لگا کر سننا مفید اور کار آمد ہے۔ اگر باہر کے چور اگر اس دروازے کو کھولنا چاہیں (کہ دروازہ کو کھول کر اس مال کو چرالیں)

تو وہ اس دروازہ کو نہیں کھول سکیں گے۔ جب تک ان کا کوئی رفیق باطن میں موجود نہ ہو جو ان کے داخلہ کے لئے دل کا دروازہ کھولدے۔ یوں باہر سے کوئی لاکھوں باتیں کرتا رہے جب تک کہ کوئی تصدیق کرنیوالا اُن کے سینہ میں موجود نہ ہو اُن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جب تک بیج میں نمو کا مادّہ نہ ہوگا۔ اس پر سے ہزار سیلاب گزر جائیں تو بھی اس میں نمو پیدا نہ ہوگا۔ اول بیج میں تری اور نمو کی صلاحیت چاہیئے۔ تاکہ وہ بیرونی عوامل سے استفادہ کر سکے۔

نور اگر صد ہزار ہا بینند ۔ جز کہ بر اصل نور ننشیند

نور اگر لاکھوں کو دیکھے تب بھی وہ اسی جگہ متمکن ہوگا جس کی اصل نوری ہے۔
اگر ساری دنیا منور ہو جائے لیکن اگر آنکھ میں نور نہیں ہے تو وہ اس نور کو نہیں دیکھ سکے گی۔

نفس کی صلاحیت ہی اصل ہے

اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اصل قابلیت دی ہے جو نفس میں ہے۔ لیکن نفس و رُوح بھی دو چیزیں ہیں۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ نفس عالمِ خواب میں کہاں کہاں پہونچتا ہے۔ لیکن رُوح جسم میں موجود رہتی ہے۔ صرف نفس سیر کرتا ہے۔ اور اس حالت میں کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا " من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ "۔ جس نے نفس کی معرفت حاصل کرلی اس کو رب کی معرفت حاصل ہوگئی۔ اس جملہ میں نفس کی معرفت کے بارے میں کہا گیا ہے رُوح کی معرفت کے بارے میں نہیں فرمایا ہے لیکن اگر ہم کہیں کہ یہ نفس کی بابت ہے جب بھی یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ اگر ہم اس محل پر نفس کی شرح کریں تو اس سے بھی نفس عام سمجھا جائے گا۔ چونکہ سامع اس نفس کے بارے میں (من عرف نفسهٗ فقد عرف ربهٗ) کہا گیا ہے نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ ؟

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر ہم ہاتھ میں ایک چھوٹا آئینہ لیں۔ اس آئینہ میں ہر چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اچھی ہو یا خراب نظر تو آئے گی! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی کیفیت کا بیان کرنا محال اور ناممکن ہے۔ (کیونکہ آئینہ کا تو خاصّہ ہی ہے کہ وہ چیز کو منعکس کر دیتا ہے) اور یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ وہ ایسا

کیوں کرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے کانٹا رکھ دیا جائے تو کانٹا ہی نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ ایک اور ہی دنیا ہے اور وہ الگ اس لیئے ہے کہ ہم اس کو طلب کریں اور جو اسرار تیں اس میں پوشیدہ ہیں ان کو حاصل کریں۔ کیونکہ انسان کے حصہ میں وہی خوشیاں آتی ہیں جو حیوانیت سے متعلق ہیں۔ اور حیوانی قوت ہی انسان کو انسان بناتی ہے، اور آدمی ہی اصل ہے یعنی انسان جو اس مسرّتوں کی دنیا میں رو بزوال اور کاہش میں ہے کہ گھٹتے گھٹتے اس منزل پر پہونچ جاتا ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔

آدمی ۲ دو چیزوں کا مرکّب ہے

اس طرح آدمی دو چیزوں کا مجموعہ ہے اس دنیا میں اس کی ذات میں جو قوت حیوانی ہے وہ اس کی شہوات اور آرزوئیں و تمنائیں ہیں لیکن جو اس کا خلاصہ اور اصل ہے یعنی انسانیت، اس کی غذا علم حکمت اور دیدار الٰہی کی خواہش ہے۔ آدمی کی قوت حیوانی حق سے گریزاں ہے اور اس کی انسانیت دنیا سے گریزاں ہے! اسی بناء پر کہا گیا ہے۔ " فمنکم کافرٌ و منکم مؤمنٌ (تغابن ع ۱)
تم میں کافر بھی ہیں اور مومن بھی۔ اور اس وجود میں دو شخصیتیں بر سر پیکار ہیں۔ یعنی حیوانیت اور انسانیت۔ تا بخت کرا بود و کرا دارد دوست

دیکھئے خوش بختی کس کے لئے ہے اور وہ دوست کس کو پسند کرتا ہے؟ !

سوز و گداز کے مناظر اور مثالیں

یہاں شک و شبہ کے لئے کوئی مقام نہیں ہے کہ یہ دنیا ایک دنیائے سرد ہے (موسم سرما کی دنیا ہے) اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ جمادات کو جمادات کیوں کہا جاتا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ کوہ و دمن، پتھر وغیرہ سب کے سب منجمد ہیں۔ اگر زمانہ موسم دے نہیں ہے تو پھر تمام عالم منجمد کیوں ہے؟ عالم کے ایک معنی بسیط (غیر مرکب) ہے وہ ہماری نظر میں (اصل حقیقت کے ساتھ) نہیں آسکتا، صرف اس کے اثرات ہی سے اس کو سمجھ لیا جاتا ہے، جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو ہم اس کے اثرات سے کہنے لگتے ہیں کہ یہ موسم سرما کی ہوا ہے۔ پس ان اثرات کے پیش نظر

ہم کہتے ہیں کہ یہ تمام دنیا ماہ دے کا موسم ہے کہ تمام چیزیں منجمد ہیں (کہ موسم دے میں شدتِ سرما سے تمام چیزیں منجمد ہو جاتی ہیں) لیکن یہ دے عقلی ہے۔ دے حسی نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے فنا کی ہوا آئے گی تو یہ تمام پہاڑ پگھل جائیں گے۔ اور تمام دنیا فنا ہو کر پانی پانی ہو جائے گی جس طرح جب ماہ تموز آتا ہے تو تمام منجمد اشیاء پگھل جاتی ہیں۔ پس قیامت کے دن جب بادِ فنا چلے گی تو تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کلمات کے لشکر کا حصار تمہارے گرد کر دے گا تاکہ دشمنوں کے مقابلے میں وہ تمہارے لئے حصار اور مخالفین کے لئے سدِّ راہ بن جائے جس کی وجہ سے تمہاری حفاظت ہو اور دشمنوں کے نقصان کا سبب بنے۔ یعنی اعدائے اندرونی کے لئے یہ تمہارے بیرونی دشمن کوئی حیثیت نہیں رکھتے، ان کی بھلا کیا حقیقت ہے؟

کیا تم نے غور نہیں کیا کہ کتنے ہزار کافر ایک کافر بادشاہ کے اسیر ہیں اور وہ کافر بادشاہ اپنے خیالات کا اسیر ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں آئی کہ اصل عامل اندیشہ و خیال ہے جب ایک ضعیف و مکدر اندیشہ کے اسیروں کی تعداد کئی ہزار مخلوق ہو تو جہاں بے پایاں اندیشے ہوں تو تصور کرو کہ وہاں کیا عالم ہوگا۔ کیسی عظمت اور کیسا شکوہ ہوگا؟ اور کس طرح دشمنوں پر قہر مسلط ہوگا اور کس طرح دنیا کو تسخیر کیا جائے گا؟

جب ہم واضح طور پر یہ دیکھتے ہیں کہ لاکھوں صورتیں اور بے حد و حساب لشکر جو صحرا صحرا جنگل جنگل پھیلے ہوئے ہیں وہ سب ایک شخصیت کے اسیر ہیں اور وہ شخصیت اندیشۂ حقیر کی اسیر ہے اس طرح یہ تمام عالم ایک اندیشۂ حقیر یا خیال کا اسیر ہوا اور اندیشے بے حد و حساب عظیم و خطیر علوی و قدسی ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل عامل اندیشہ یا خیال ہی ہوتے ہیں اور صورتیں اس کی تابع اور آلۂ کار ہیں اور بغیر اندیشہ یا خیال کے وہ معطل اور منجمد ہیں (اس طرح جو شخص صورت کو دیکھے گا وہ بھی جمادی کی طرح ہوگا اور عالمِ معنوی میں اس کے لئے کوئی راہ نہیں ہوگی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگرچہ وہ سو سالہ معمر شخص کی طرح ہے لیکن ذہنی طور پر وہ نابالغ اور بچہ ہے (کہ عالمِ معنوی میں اس کو راستہ نہیں ملا ہے)۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں

مولانا نے فرمایا[1] "رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر" ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی جانب لوٹے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ نفس کے ساتھ مقابلہ کرنا جہادِ اکبر ہے لیکن اب ہم اندیشوں اور تخیلات کے لشکر سے برسرِ پیکار ہیں تاکہ نیک اندیشے اور خیالات بُرے اندیشوں پر غالب آ کر ان کو نیست و نابود کر دیں اور فتح حاصل کر کے ان کو بدی کی مملکتِ تن سے نکال باہر کر دیں! اس طرح یہ بھی جہادِ اکبر کہلائیگا.

فکر کی حیثیت

اب جنگ فکر کے ساتھ ہے. کیونکہ وہ بغیر بدن کے واسطہ کے مصروفِ پیکار ہے جس طرح مصروف کار عقل یا عقل فعال کسی آلہ اور واسطہ کے بغیر آسمان کو گھماتی ہے اور بیساختہ کہہ دیتی ہے کہ مجھے آلہ کی ضرورت و احتیاج نہیں ہے.

توجہری و ہر دو جہاں بر ترا عرض ... گوہر کہ از عرض طلبی ہست ناپسند[2]

عرض کی کیفیت

جب عرض کی یہ کیفیت ہے تو عرض پر بھروسہ اور تکیہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ جوہر تو مشک کے نافہ کی طرح ہوتا ہے. یہ دنیا اور اس کی مسرتیں مشک کی خوشبو کی طرح ہیں لیکن مشک کی خوشبو دوامی اور مستقل نہیں کیونکہ یہ عرض ہے اور جو شخص خوشبو کے لئے مشک کو طلب کرتا ہے اور صرف خوشبو[3] پر قانع نہیں ہے. اس کا یہ فعل درست ہے لیکن جس نے صرف مشک کی خوشبو پر قناعت کر لی تو یہ مناسب نہیں ہے

---

[1] مثنوی دفتر اول بعنوان "تفسیر رجعنا من الجهاد الاصغر" مولانا قدس سرہٗ العزیز نے اس کو بیان فرمایا ہے.

[2] تو ایک جوہر ہے (قائم بالذات) اور یہ دونوں جہان تیرے لئے عرض (قائم بالغیر) ہیں تو جوہر کو عرض سے طلب کر رہا ہے یہ کیسی نادانی ہے وہ تو خود قائم بالغیر ہے.

کمّ اور کیف وغیرہ عرض ہی کی قسمیں ہیں.

[3] بُو عام ہے لیکن اردو میں اچھی بُو کے لئے خوشبو کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور خراب بُو کے لئے بدبُو کا لفظ اس لئے ترجمہ میں خوشبو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے.

کیونکہ اس نے ایسی چیز سے وابستگی کی ہے اور ایسی چیز کو قبول کیا ہے جو اس کے ہاتھ میں رہنے والی چیز
نہیں ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ خوشبو مشک کے ساتھ متعلق ہے اور جب تک کہ دنیا
میں مشک کا وجود ہے خوشبو موجود ہے لیکن جب وہ مشک پس پردہ چلا جائیگا تو جو بھی لوگ خوشبو پر
زندہ تھے، وہ مرجائیں گے کیونکہ خوشبو مشک کا خاصہ ہے جہاں مشک ہوگا خوشبو بھی وہیں ہوگی۔ جو
خوشبو پر سبقت حاصل کر کے مشک تک پہونچ گیا یعنی بو سے بودتک رسائی حاصل کرلی اس طرح
وہ عین مشک ہو گیا جس کے بعد اس کی خوشبو کے لئے فنا نہیں اب تو وہ مشک کی عین ذات میں باقی
رہے گا اور خود وہ بمنزلہ مشک کے ہوگا۔ اس کے بعد وہ مشک کی طرح خود دوسروں کو خوشبو پہونچائے
گا۔ اور دنیا اس سے حیات نو حاصل کریگی۔ اس کی اپنی حیثیت ختم ہوجاتی ہے اور سوائے نام کے اس کا اور
کچھ باقی نہیں رہتا جس طرح کہ کوئی حیوان اگر نمک کی کان میں چلا جائے تو وہ بھی نمک بن جاتا ہے۔ نام کے
اعتبار اور تاثیر کے لحاظ سے وہ نمک ہی ہوتا ہے اب اس کا نام اس کے لئے کسی زیان یا نقصان کا موجب نہیں
ہوتا اور یہ نام اس کو نمکینی (نمک پن)۔ ملاحت نہ کسی طرح نکال سکتا ہے خواہ تم اس کانِ نمک کا کوئی دوسرا
نام رکھ لو وہ نمکینی سے نہیں نکل سکتا۔

خوشبو اور مزے عکس ذاتِ باری ہیں

پس انسان کو ان خوشبوؤں اور ذائقوں سے جو ذاتِ باری کا پرتو ہیں گزر جانا چاہیئے اور اسی پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے۔ اگرچہ خوشی اور لطف
بھی جو اس کو میسر ہے یہ بھی لطفِ الٰہی ہے اور اسی کے جمال کا پرتو ہے لیکن اس کی نسبت ہماری
ذات سے باقی نہیں ہے۔ صرف حق کے ساتھ اس کی نسبت ہے خلق کے ساتھ اگر نسبت ہوگی تو وہ فانی
ہوگی اس کی مثال یہ ہے کہ آفتاب کی کرنیں تمام عالم کو منور کرتی ہیں باوجود یکہ وہ آفتاب کی کرنیں
ہیں اور نورانیت کی حامل ہیں لیکن وہ آفتاب کی تابع ہیں جب تک آفتاب روشن ہے یہ کرنیں
باقی ہیں اور روشنی مل رہی ہے۔ لہٰذا چاہیئے کہ انسان آفتاب بنے تاکہ جدائی کا خطرہ باقی نہ رہے۔

[1] مثنوی دفتر دوم زیر عنوان "گمان بردن کار دانیاں" اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اصل چیز خود سپردگی ہے اور شناخت ہے بعض کے لئے وہ داد و عطا ہے لیکن انہیں شناخت نہیں اور بعض کو شناخت ہے لیکن خود سپاری نہیں ہے لیکن جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں خود سپردگی اور شناخت تو یہ توفیق کا مظہر عظیم ہو گا۔ ان خصوصیات کا مظہر کیسا عظیم ہوگا اور ایسا شخص کیسا عظیم اور بے نظیر ہوگا۔ تمثیل کے طور پر یوں سمجھو کہ ایک شخص چل رہا ہے لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ وہ راستہ پر چل رہا ہے یا اندھے شخص کی طرح راستہ کے سوا ادھر اُدھر چلا جا رہا ہے جب اس کے کان میں مرغ کی یا آبادی میں سے کسی قرنا (بگل) کی آواز آتی ہے تو اس کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آبادی کے قریب ہے۔ اب یہاں یہ فرق ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص تو اس راستے کے نشانات سے واقف ہے اور بلا تکلف رواں دواں ہے اور اس کو کسی نشانِ راہ کی ضرورت نہیں وہ اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شناخت ہی اصل ہے۔ اور سب سے بالا ہے

عبادت اور راز و نیاز شب کے وقت بہتر ہے

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔۔

" اللیل طویل فلا تقصرہ بمنامک والنھار مضی فلا تکدرہ باٰثامک "

(رات لانبی ہے اس کو نیند میں گزار کر چھوٹی نہ کرو۔ دن روشن ہے اس کو اپنے گناہوں سے تاریک نہ کرو)

راز کی باتیں کرنے اور مرادیں مانگنے کے لئے رات طویل ہے کہ اس طویل رات میں مخلوق کی تشویش اور دوستوں اور دشمنوں کی زحمت و تشویش کے بغیر خلوت اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے علاوہ ازیں اللہ رب العٰلمین نے (تاریکی کا) ایک پردہ بھی تان دیا ہے تاکہ بندے کے اعمال ریا اور نمود و نمایش سے محفوظ ہو جائیں۔ اور اس وقت صرف رب العٰلمین ہی سے رجوع کیا جائے کیونکہ رات میں خلوص کی کیفیت طاری ہوتی ہے ساری چیزیں تاریکی میں ڈھک جاتی ہیں جبکہ دن میں تمام اشیاء آشکارا ہو جاتی ہیں لیکن ریاکار شخص کی حیثیت تو رات ہی میں ظاہر اور اس کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے اور وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ جب کوئی میرے اعمال کو دیکھ ہی نہیں

رہا ہے تو میں یہ کام (عبادت) کس کے لئے کروں۔ اس سے کہا جاتا ہے (ہاتف غیبی کہتا ہے) کہ
ہاں ایک دیکھنے والا دیکھ رہا ہے لیکن چونکہ تو خود کچھ نہیں ہے لہٰذا اس ہستی کو نہیں دیکھ سکتا جو
تجھے دیکھ رہا ہے یہ سب مخلوق اس کے قبضۂ قدرت میں ہے! اسی کو سب مصیبت کے وقت
یاد کرتے ہیں اور اس کی دہائی دیتے ہیں۔ دانت میں درد ہو یا کان اور آنکھ میں تکلیف ہو یا کوئی اور
مرض لاحق ہو تو اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں! اسی طرح کسی کی طرف سے تہمت کا خدشہ ہو یا کسی
اور قسم کا خوف ہو تو ان تمام حالتوں میں صرف اسی کی جانب رجوع ہوتے ہیں اور اسی کے سامنے
عرض تمنا کرتے ہیں اسی کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعتماد ہے کہ وہ سمیع و بصیر ہے وہ
ان کی حاجت روائی فرمائے گا۔ دفع بلیات کے لئے پوشیدہ طور پر صدقہ دیتے ہیں اس
شافی مطلق کی ذات سے بیمار کی شفایابی کی امید اور توقع کرتے ہیں اور یہ امید رکھتے
ہیں کہ وہ ہمارے صدقات کو قبول فرمائے گا۔ لیکن جب صحت حاصل ہو جاتی ہے اور جب حاجت
روائی ہو جاتی ہے اور فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر بندے سے وہ سابقہ یقینی کیفیت ختم ہو جاتی ہے
وہی پرانی حیثیت لوٹ آتی ہے اور اسی خیال میں مستغرق ہو کر کہتے ہیں خداوندا! وہ کیا حالت تھی کہ تجھے صدق
سے ہم نے پکارا تھا اور کنج زنداں میں (تیری رضامندی کے لئے) سورۂ اخلاص کی ہزاروں
مرتبہ تلاوت کی تھی! اور عجز و انکسار کا اظہار کیا تھا اور تو نے حاجت روائی فرمائی تھی! اب
اس زندانِ مصیبت سے باہر بھی ہماری احتیاج کی وہی صورت ہے جو زندانِ مصیبت میں تھی۔
اب ہماری التجا ہے کہ ہم کو اس عالم ظلماتی کے زندان خانہ سے آزادی عطا فرما اور اس عالم میں
ہمیں واپس لے آ جو انبیاء علیہم السلام کی نورانیت سے معمور ہے۔ اے خالق و مالک اب ہمیں
وہی اخلاص کیوں عطا نہیں ہوتا اور ہمیں اس زنداں سے آزادی کیوں نہیں ملتی اور اضطراب
کی کیفیت کیوں دور نہیں ہوتی اس وقت ذہن میں طرح طرح کے ہزاروں خیالات آتے ہیں
کہ دیکھئے ہماری تمنا پوری ہوتی ہے یا نہیں؟ اس خیال کی تاثیر سے بے حساب کاہلی اور رنج و
ملال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ہائے وہ پہلا سا سوز یقین کہاں گیا؟۔

نفس حیوانی انسان کا دشمن ہے

اس تمنا اور حرص و ضلالت کے جواب میں خالق کائنات ارشاد فرماتا ہے۔ میں نے تم کو بتا دیا ہے کہ نفس حیوانی تمہارا دشمن ہے اور ہمارے حضور میں بھی وہ دشمنی کرتا ہے پس "لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء" (سورۃ ممتحنہ ع ۱) میرے اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ ہمیشہ اس دشمن کو مجاہدہ کے قید خانہ میں مقید رکھو اور یاد رکھو کہ جب تک وہ قید خانہ میں ہے اور رنج و محن میں مبتلا ہے تم سے اخلاص ظاہر ہو گا اور اس میں قوت پیدا ہو گی اور تم ہزار بار اس کا تجربہ کر چکے ہو۔ جب تمہارے دانت میں تکلیف ہوئی یا درد سر کی شکایت ہوئی یا کوئی اور جسمانی شکایت ہوئی یا خوف لاحق ہوا تو اس کی کیفیت نے تمہارے اندر اخلاص پیدا کر دیا اور اب تم جسم کو آرام و آسائش پہونچانے میں کیوں مشغول ہو گئے۔ اور تم نے اصل مقصد کو بھلا دیا اب تم کو چاہیئے کہ منتہائے مقصود کو فراموش نہ کرو اور اپنے نفس کے ساتھ کسی توقع کو وابستہ نہ کرو اور اس کو نامراد ہی رکھو تاکہ تم مراد کو پہونچ جاؤ اور اس زندان تاریک سے نجات حاصل کر سکو۔ "ونھی النفس عن الھوی فان الجنۃ ھی الماوی ہ" (پارہ عم سورۂ نازعات) جس نے اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھا اس کا ٹھکانہ جنت میں ہو گا۔

فصل

امیر سیف الدین کا معمول

شیخ ابراہیم نے مجلس میں فرمایا کہ امیر سیف الدین فرخ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ کسی کو کوڑوں کی سزا دیا کرتے تھے تو فوراً باتوں میں مشغول ہو جاتے تاکہ کسی کو ان سے سفارش کا موقع نہ ملے اور مجرم کو سزا دیدی جائے۔

یہ سن کر مولانا نے فرمایا کہ جو کچھ اس عالم میں دیکھتے ہو ایسا ہی اس عالم میں بھی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ سب کچھ اسی عالم کے احوال کا نمونہ ہے اور اسی عالم سے لایا ہوا ہے اور یہ آیت قرآنی شاہد ہے "وان من شیءٍ الا عندنا خزائنہ وما ننزلہ الا بقدرٍ معلوم ہ" کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اس کو صرف بقدر معلوم ہم اتارتے رہتے ہیں۔ (سورہ الحجر) دیکھو

تھوک دوائیں فروخت کرنے والے اپنے یہاں فروخت ہونے والی دواؤں کے انبار سے مٹھی مٹھی بھر دوائیں لے کر اپنے ڈبوں کے اوپر رکھدیتے ہیں مثلاً کالی مرچ مصطگی وغیرہ، ان کے پاس دواؤ کے ڈھیر ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے ڈبوں میں نہیں آسکتے۔ اس لئے مشتے از نمونہ بنا کر رکھدیتے ہیں! اسی طرح انسان بھی اس تھوک فروش کی طرح یا عطار کی دوکان کی طرح ہے کہ اس میں بھی صفاتِ حق تعالیٰ کے خزانوں سے مٹھی مٹھی یا تھوڑی تھوڑی ڈبیوں ڈبوں بھر بطور نمونہ رکھدیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی صلاحیت کے لائق اس عالم میں کاروبار کر سکیں اور بس! اس لئے ان کو کچھ سماعت، کچھ بصارت، کچھ نطق، کچھ عقل اور کچھ علم کے سرمایہ سے نوازا گیا ہے اس طرح یہ حضرات حق کے طوّاق ہیں اور یہ طوّاقی کرتے ہیں۔ یہ لوگ شب و روز اپنے بڑے ڈبوں مرتبانوں کو ان سے بھرتے ہیں اور تم ان کو خالی کرتے رہتے ہو۔ ان کو صرف بھی کرتے ہو۔ ان کے ذریعہ روزی کماتے ہو۔ رات میں ان خالی ڈبوں کو پھر بھر دیا جاتا ہے! ان کے ذریعہ لوگ، اپنی قوت و غذا حاصل کرتے ہیں۔

آنکھ کی اور روشنی کو دیکھو اس کے ذریعہ تم چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہو اس عالم میں بھی بے شمار چیزیں ہیں اور آنکھیں بھی ہیں لیکن تمہاری آنکھوں سے مختلف ہیں۔ یہاں (دنیا) کی آنکھیں ان آنکھوں کا صرف ایک نمونہ ہیں۔ جو تم کو عطا کی گئی ہیں تاکہ تم ان کے واسطے سے دنیا کا نظارہ کر سکو لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اُس عالم میں قوتِ بصارت کا سرمایہ صرف اسی قدر ہے! ایسا نہیں ہے بلکہ تم کو جو قوت بصارت دی گئی ہے وہ صرف اسی قدر ہے جس کا تم تحمل کر سکو (تمہاری برداشت کے مطابق) ورنہ "وان من شیئ الا عندنا خزائنہ" (کوئی چیز ایسی نہیں جس کا ہمارے پاس خزانہ نہ ہو) یعنی یہ قوائے سمع و بصر نطق، علم، عقل بے نہایت ہیں۔ صرف بقدر معلوم تم کو دیئے گئے ہیں۔

غور کرو کہ کروڑوں مخلوق خداوندی صدی بعد صدی دنیا میں آتی رہی ہے! وہ اس دریائے ناپید اکنار سے استفادہ کرتے اور خالی ہوتے رہے اب غور کرو کہ وہ انبار کیا ہیں اب جو کوئی اس دریا کی معرفت زیادہ رکھتا ہے اتنا ہی اس کا دل ان دنیاوی ڈبوں (قوائے جسمانی) سے بیزار ہوگا۔ ذرا غور کرو! کہ تمام دنیا خداوندی ٹکسال (دارالضرب یا ضرب خانہ) سے ڈھل کر نکلتی ہے اور پھر کچھ مدت کے بعد اسی ٹکسال کی طرف لوٹ جائے گی (جس طرح سکے کچھ مدت کے بعد پھر دارالضرب میں واپس کر دیئے جاتے ہیں کہ وہی ان کی اصل جگہ ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کا مفہوم

اس پر دال ہے کہ ہمارے تمام اجزا اسی دارالضرب سے ڈھل کر آئے ہیں۔ اسی عالم کا نمونہ ہیں پھر کچھ مدت کے بعد اسی عالم میں لوٹ جائیں گے۔ خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ حیوان ہو یا انسان۔ !!!
یہ تمام کے تمام ان ڈبوں (صفاتِ جسمانی) کے ساتھ جلد ظاہر ہو جاتے ہیں اور بغیر ان ڈبوں (صفات جسمانی) کے ظاہر نہیں ہوتے۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ عالم ایک لطیف شئے ہے نظر نہیں آتا۔ تم اس پر تعجب کرو۔ تم نسیم بہار کو نہیں دیکھ سکتے لیکن جب وہی نسیم درختوں، سبزہ و گل و گلزار میں ظاہر ہوتی ہے تو تم ان کے واسطہ سے (سبزہ و گل کے ذریعہ) جمالِ بہار کا نظارہ کرتے ہو اور اس سے تفریح حاصل کرتے ہو لیکن نفس نسیم بہار سے تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے! اس وجہ سے نہیں کہ اس میں تفریح کا سامان اور گل و گلزار کی کوئی کیفیت نہیں ہے یہ سب اس کا پرتو ہیں بلکہ اس میں گلزار و ریاحین کی لطیف امواج بھی موجود ہیں لیکن وہ اپنی لطافت کی وجہ سے بلا واسطہ تم کو نظر نہیں آتی ہیں۔ یہی حال انسان کا ہے کہ انسان میں بھی اوصاف پوشیدہ ہیں اور وہ کسی اندرونی یا بیرونی واسطہ ہی سے نظر آتے ہیں۔ وہ کسی کی گفتگو سے کسی خطرہ سے، کسی کے ساتھ جنگ یا صلح کے واسطے سے پیدا اور ظاہر ہوتے ہیں۔ تم صفات کو نہیں دیکھتے۔ ذرا اپنی ذات میں تو غور کرو۔ ان صفات سے تم کو کچھ بھی نظر نہیں آئے گا اور بظاہر تم ان صفات سے خود کو خالی پاؤ گے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) اور نہ ایسا ہے کہ تم جو کچھ تھے اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ بلکہ یہ تمام صفات تو تم میں پوشیدہ ہیں اور یہ آبِ دریا کی طرح ہیں جو دریا سے باہر نہیں آتا سوائے ابر و باراں کے، اور دریا کی موجوں کے کچھ ظاہر نہیں ہوتا اور موج کیا ہے؟ موج ایک جوش ہے جو بیرونی واسطہ کے بغیر تمہارے اندر موجزن ہے۔ اور دریا جب تک ساکن رہتا ہے اس سے کچھ بھی باہر نہیں آتا۔ اسی طرح تمہارا جسم دریا کا کنارہ ہے اور تمہاری روح دریا کی طرح ہے۔ کیا تم نے یہ منظر نہیں دیکھا کہ ہزاروں دریائی جانور، مچھلیاں، دریائی سانپ، پرندے اور بہت سے جانور دریائے حیات سے باہر آتے ہیں خود کو ظاہر کرتے ہیں پھر بعد میں دریا ہی میں لوٹ جاتے ہیں! اور تمہاری صفات جیسے غصہ، حسد، شہوت وغیرہ اس دریائے بے پایاں سے سر نکالتے ہیں پس تمہاری صفات عاشقانِ حق کی طرح ہیں جو اپنی لطافت کی وجہ سے بغیر واسطۂ نطق کے نظر نہیں آتیں۔ نطق کے واسطہ سے نظر آتی ہیں اور جب ان میں سے بعض

جب جامد نطق سے عاری ہو جاتی ہیں تو واسطہ درمیان میں نہیں رہتا تو اپنی انتہائی لطافت کے باعث نظر سے محجوب ہوتی ہیں۔

فصل

عشق کیا ہے؟

انسان میں عشق، درد، طلب، تکلیف اور تقاضہ کی کیفیات ہیں۔ اگر انسان کی ملک میں ایک لاکھ عالم بھی آجائیں تو اس کو کافی نہ ہوں اور اس کو سکون و آرام نہ آئے۔ یہ صفت عشق اپنے اجمال کے ساتھ ہر حرفہ اور ہر پیشہ ہر صنعت و ہر منصب میں اور حصولِ علوم و فنون میں کوشاں ہوتی ہے۔ اسی صفت عشق کی تحریک سے انسان فنون و علوم کی تحصیل میں کوشاں ہوتا ہے۔ لیکن سکون میسّر نہیں آتا۔ کیونکہ جو مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ معشوق کو ہم دلآرام کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ دل کو اس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ تو اس کے غیر سے کس طرح آرام و قرار حاصل کر سکتا ہے؟ اس کو مثال سے اس طرح سمجھیں کہ یہ تمام آرزوئیں اور مسرتیں سیڑھی کی طرح یا زینہ کی مانند ہیں اور زینہ یا سیڑھی پائیدان اقامت یا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہوتے یہ تو صرف عبور کرنے یا گزرنے کے لئے ہوتے ہیں! اور خوش قسمت وہ شخص ہے جو جلد تر بیدار ہو جائے تاکہ طویل راستہ اس کے لئے مختصر اور آسان ہو جائے اور زینہ کی سیڑھیوں پر قیام کر کے اپنا وقت ضائع نہ کرے۔

کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ یہ تاتاری ہمارا مال و متاع چھین لیتے ہیں اور کبھی کبھی ہمیں کچھ مال دے بھی دیتے ہیں۔ اس مال کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا کہ یہ تاتاری جو کچھ بھی لیں وہ ایسا ہے کہ وہ مال حق تعالیٰ کے اقتدار اور قبضہ میں آگیا ہے اور اس سلسلہ میں مثال کے طور پر یوں سمجھیں کہ دریا سے ایک کوزہ یا ایک مٹکا پانی لیں تو وہ تمہاری ملکیت ہو جائے گا جب تک کہ وہ تمہارے کوزہ اور مشکہ میں ہے اور کسی کو اس پر تصرف کا اختیار نہیں ہے اور اس کوزہ یا مشکہ سے جو کوئی بھی کچھ بے اجازت لے گا اس کا یہ عمل غصب کے مترادف ہو گا۔ لیکن اگر اس کوزہ یا مشکہ کے پانی کو دریا میں

ڈال دیا جائے تو وہ [illegible] حلال ہو جائے گا اور تمہاری ملک میں نہیں رہے گا۔ سو امثال اس [illegible]ال کی ہے کہ ہمارا مال ان [illegible]ام ہے لیکن ان کا مال ہم پر حلال ہے۔

اسلام اور رہبانیت

سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لا رھبانیۃ فی الاسلام" اسلام میں رہبانیت کی کوئی ج[illegible] نہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا "الجماعۃ رحمۃ جماعت میں رحمت ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعیت اور اتحادِ ملّی کے لئے کوشش اور جدوجہد فرمائی۔ کیونکہ مجمع ارواح کا بہت اثر و نفوذ ہے جو اکیلے پن اور انفرادیت میں حاصل نہیں ہوتا اور اس راز اور ستر کا انکشاف مسجد کی دنیا سے ہوتا ہے تاکہ لوگ نماز باجماعت ادا کرنے کے لئے مسجد میں حاضر ہوں اور ان کو رحمت و فوائد دینی و دنیاوی حاصل ہوں یہ کیفیات فزوں تر ہوں الگ الگ گھروں اور قیام گاہوں کی تعمیر میں یہ مصلحت پنہاں ہے کہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں اور ان کے عیوب پوشیدہ رہیں۔

مسجد میں نماز پنجگانہ کی حاضری کے بعد جامع مسجد کی حاضری کا حکم اس لئے ہے کہ شہر کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور حج بیت اللہ اور خانہ کعبہ کی حاضری کے حکم میں مصلحت یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک جگہ ہو کر اخوت و محبت کا عملی مظاہرہ کریں۔

امیر پروانہ نے کہا کہ منگول ابتداءً اس علاقہ میں آئے تو ان کی عجیب کیفیت تھی۔ نہ تو تن پر مناسب لباس تھا نہ سواری کے لئے جانور۔ ننگے رہتے، گائے اور بیلوں پر سوار ہوتے۔ بہتر ہتھیاروں کے بجائے لکڑی کے ہتھیار استعمال کرتے۔ ان کی کیفیت اب بدل گئی ہے، اب ان کے پاس سواری کے عمدہ جانور ہیں اور بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ جب یہ لوگ دل شکستہ اور ضعیف تھے طاقت و قوت کے مالک نہ تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔ ان کی نیازمندی کو قبول فرمایا لیکن جب وہ طاقتور اور مضبوط ہو گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں کمزور مخلوق کے مقابلہ میں مغلوب فرمائیگا تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ وہ دنیا پر غالب ہوئے اس میں ان کی طاقت و قوت کو دخل نہ تھا۔

ابتداء میں وہ مخلوق سے دور جنگلوں میں یکہ و تنہا تھے۔ بینوا مسکین اور محتاج نگران ہیں

سے لبعض تجارت کے لئے خوارزم شاہ کے علاقہ میں آئے۔ خرید و فروخت کرتے اور اپنے لباس کے لئے تھان خریدتے۔ خوارزم شاہ نے انہیں روکا۔ ان میں جو تاجر تھے انہیں قتل کرنے کا حکم دیدیا اور ان سے خراج بھی وصول کیا اور کسی تاجر کو بھی جانے نہ دیا۔ یہاں تک کہ تاتاری لوٹتے پیٹتے اپنے بادشاہ کے پاس گئے کہنے لگے ہم تو ہلاک ہو گئے۔ بادشاہ نے ان سے مہلت طلب کی اور ایک غار میں جاکر روزہ رکھ کر مصروف گریہ وزاری ہو گیا۔ خود پر سکینی کی کیفیت طاری کر لی۔ ندائے حق سنی کہ تمہاری گریہ وزاری مقبول ہو گئی۔ جاؤ مقابلہ کرو۔ فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مقابلہ کیلئے نکلا تو حکم الٰہی کے بموجب فتح یاب ہوا اور عالم کو مسخر کر لیا۔

تاتاریوں کا عقیدہ

امیر نے جناب مولاناؒ سے دریافت کیا کہ تاتاری بھی حشر کا اقرار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یقیناً ایک ایسا دن آئے گا کہ جس دن اعمال کا حساب ہوگا۔ امیر کے سوال پر مولاناؒ نے فرمایا کہ وہ اس عقیدہ کا اظہار کر کے بظاہر خود کو مسلمانوں کا ہمنوا ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کا یہ کہنا غلط، دھوکہ اور فریب ہے۔ وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیں کہ ایک شخص سے دریافت کیا گیا۔ کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے جواب دیا حمّام سے۔ سوال کرنے والوں نے کہا کہ یہ بات تو تمہارے بدن سے ظاہر ہے۔ اب اگر یہ حشر کا اقرار کرتے ہیں تو اس کے لئے علامت اور نشان کیا ہے؟ ان کے معاصی اور مظالم تم نے دیکھے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسی کہ برف اور اس کے تودے جو کہ تہ بہ تہ جمتے چلے جارہے ہیں۔ جب توبہ وانابت کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوگا تو اس عالم آخرت کی بشارتوں اور خشیت الٰہی سے معاصی اس طرح ختم ہو جائیں گے جس طرح آفتاب کی گرمی سے برف پگھل جاتی ہے۔ اگر برف کا تودہ یہ کہے کہ میں نے آفتاب کی تمازت اور حرارت کا سنا کیا ہے اور میری حیثیت باقی ہے تو اس کی اس بات کو کوئی قبول نہیں کرے گا۔ اور ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ماہ تموز کا آفتاب چمکے اور اس کی گرمی سے برف نہ پگھلے۔

روزِ قیامت یوم الحساب ہے

حق تعالیٰ نے اگرچہ وعدہ فرمایا ہے کہ نیک و بد کی جزا روزِ قیامت ہوگی لیکن روزِ قیامت کی تکلیفوں کا نمونہ دنیا میں ہی مصیبتوں اور اذیتوں کی شکل میں دم بدم لحظہ بہ لحظہ ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کسی کو مسرت و شادمانی حاصل ہوتی ہے تو وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے کسی کو شادکام کیا ہے۔ اگر کوئی شخص غمگین ہے تو اس نے کسی کو غمگین کیا ہے یہ اس کا بدلہ ہے۔ یہ سب اُس عالم کا تحفہ و نمونہ ہے تاکہ اس تھوڑی تکلیف سے روزِ جزا کی تکالیف کا اندازہ ہو سکے! وہ اس کی مثال ایسی ہے جیساکہ گیہوں کے ڈھیر سے نمونہ کے طور پر مٹھی بھر اناج اٹھا لیا جائے۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس میں درد!

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و شان کے باوجود ایک مرتبہ آپؐ کے دستِ اقدس میں درد ہوا۔ تو اشارۂ غیب ہوا کہ یہ درد تو جناب عباسؓ کے ہاتھوں کے درد کی وجہ سے ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب جناب عباس بن عبدالمطلب کو اسیر کیا گیا اور دوسرے قیدیوں کی طرح ان کے بھی ہاتھ باندھے گئے تو اگرچہ یہ عمل دست بندی حکمِ الٰہی کے مطابق تھا تاکہ اسیروں کو یہ احساس ہو جائے کہ یہ اسیری اور بدبختی جن کا یہ شکار ہیں ان گناہوں اور نافرمانیوں کی پاداش ہے جن کے یہ مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ بگران اعمال کی تفصیل ان کو یاد نہیں کہ یہ اعمال جہالت غفلت اور بے دینوں کی ہم نشینی کی وجہ سے سرزد ہوئے اور ان بدمذہبوں کی ہم نشینی کی وجہ سے ان برائیوں کا ارتکاب ان کے لئے آسان ہو گیا یا یہ تصور رہو کہ یہ گناہ اور نافرمانی نہیں لیکن ایسے اعمال کی جزا پر غور کرو کہ اس میں کس قدر فراخی اور کس قدر تنگی و گرفت ہے قبض و انقباض معصیت کی سزا ہے بسط و کشاد طاعت کی جزا ہے۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد

ایک مرتبہ سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگشت مبارک میں اپنی انگوٹھی کو گھمار ہے تھے۔ وحیِ الٰہی ہوئی کہ ہم نے آپ کو اس بے مصرف عمل اور اس بیکاری کے لئے پیدا نہیں کیا " افحسبتم انما خلقنکم عبثاً " (سورۂ مومنون) کیا آپ نے گمان کر لیا ہے کہ ہم نے آپ کو بیکار پیدا کیا ہے: اس آیت کریمہ سے یہ سبق لینا چاہئے کہ ہم دیکھیں کہ ہم دن کس طرح گزارتے ہیں. خیر میں گزرتا ہے یا شر میں. یا شر اور معصیت دونوں میں بسر ہوتا ہے یا طاعتِ الٰہی میں اس کو صرف کیا جاتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو مصلحت کی بنا پر مخلوق کی طرف متوجہ فرمایا اور جناب خضر علیہ السلام کو کامل طور پر صرف اپنی طرف مشغول و مصروف بنا دیا (دنیا سے ان کا تعلق نہ رکھا)۔ ابتدا میں سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم صرف طاعت و عبادت میں مشغول رہتے تھے: اس کے بعد حکم ربی ہوا، اب آپ دعوت رشد و ہدایت کو عام کریں اور اصلاحِ امت کی جانب توجہ کریں. سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بصد آہ و زاری فرمایا. خداوندا! مجھے اپنی عبادت سے کیوں روکا جارہا ہے تو مجھے اپنی ذات اور اپنے قرب سے کیوں دور فرمارہا ہے اور مجھ سے ایسا کونسا عمل صادر ہوا ہے جس کی وجہ سے عبادات سے ہٹا کر عوام کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے. میں تو مخلوق سے الگ تھلگ رہ کر تنہائی میں سکون کے ساتھ تیری عبادت کرنا چاہتا تھا. ارشاد خداوندی ہوا. اے حبیب! غمگین نہ ہو! ہم نے تمہیں چھوڑا نہیں! اور نہ تمہیں اپنی عبادات سے ہٹایا ہے اور مخلوق کی طرف اس لئے متوجہ نہیں کیا ہے کہ تمہیں اپنی عبادت سے روکا جائے. حقیقت حال یہ ہے کہ آپ مخلوق کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ رہیں گے اور آپ کی مشغولیت میرے ہی ساتھ ہوگی اور جو اوقات آپ مخلوق کے ساتھ بسر کریں گے. وہ میری ہی عبادت میں گزاریں گے. آپ جس حالت میں بھی جو کام کریں گے وہ بھی، اور مخلوق کے ساتھ آپ کی مصروفیت آپ کی طاعت اور مجھ سے قربت میں ذرا کمی کا بھی باعث نہ ہوگی. آپ جو کام بھی کریں گے اور جس کام میں بھی مصروف رہیں گے وہ آپ کے لئے عینِ وصل ہوگا.

(آپ کو ہر حال میں مجھ سے وہی قربت حاصل رہے گی جو اب تک حاصل تھی)

سوال دربارۂ تقدیر

بعض لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ احکام ازل اور تقدیر الٰہی میں کسی طرح تبدیلی ہو سکتی ہے؟ حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا

کہ حق تعالیٰ نے تو روز ازل ہی میں مقدر فرما دیا تھا کہ بُرے کام کا بدلہ بُرا اور نیک کام کا اجر اچھا اور نیک ہوگا۔ یہ ازلی فیصلہ کسی صورت اور کسی طرح بھی تبدیل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں۔ اس نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ بدی کرو بدلہ میں نیکی پاؤ گے۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ گیہوں بونے کے بعد جَو کاٹے جائیں یا جَو بو کر کوئی گیہوں کاٹے۔ تمام انبیاء و مرسلین علیہم یہی سبق دیتے آئے ہیں کہ نیکی کا بدلہ اچھائی سے اور بُرائی کا ثمرہ برائی سے ملے گا۔ ارشادِ ربانی ہے "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" (پارہ نمبر ۳۰ سورۃ الزلزال) اگر تم حکم ازلی سے وہ چاہتے ہو جو کہ ہم نے بتایا اور اس کی تشریح کی ہے تو ایسا نہ ہوگا (معاذ اللہ) اور یہ چاہتے ہو کہ نیکی اور بدی کی سزا و جزا میں زیادتی اور کمی ہو جائے تو ایسا ہونا تو ممکن ہے۔ جتنی نیکیاں زیادہ کرو گے تو اجر و ثواب کے زیادہ مستحق ہو گے۔ ظلم و ستم اور برائیوں میں جتنی زیادتی کرو گے اتنی ہی پاداش اس کی زیادہ ہوگی۔ اس میں بعض زادتی تبدیلی تو ممکن ہے لیکن یہ اصل حکم تبدیل نہیں ہو سکتا۔

سعادت و شقاوت

امیر نے اس موقع پر سوال کیا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نیک بخت شقی ہو جاتے ہیں اور بعض شقی سعید اور نیک بخت بن جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس شقی سے کوئی عمل خیر صادر ہوا یا اس نے نیکی کی یا نیکی کی نیت کی تو وہ نیک بخت ہو گیا اور وہ نیک بخت جو کہ شقی ہو گیا اس نے بدی کی نیت کی (جو اس کی شقاوت کا سبب بنا) جیسا کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں اعتراض کیا۔ "خلقتنی من نار و خلقتہ من طین" (سورۃ اعراف) (اے ربِّ کریم) تو نے میری تخلیق آگ سے فرمائی (اور جناب آدم علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا فرمایا۔ پس ملائیکہ کا استاد ہونے کے باوجود ابد تک کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا اور ملعونِ ابدی قرار دیدیا گیا پس ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اعمالِ خیر کی جزا بھی اچھی ملتی ہے اور بُرے کاموں کے بدلہ میں سزا اور برائی نصیب ہوتی ہے! اس طرح وہ شخص جو ازل سے نیک بخت نہیں ہے وہ شقی بن جاتا ہے جیسا کہ ابلیس ہوا اور نعوذ باللہ جو مومن کافر ہو جاتا ہے وہ بھی نیک بختوں میں سے ہرگز نہیں تھا۔ لیکن جو شخص کہ ازل سے نیک بختوں میں سے تھا اگرچہ کافر ہی ہو وہ مومن

ہو جاتا ہے۔

نذر کا کفارہ

امیر نے ایک اور سوال نذر کے بارے میں کیا کہ کسی شخص نے نذر مانی کہ ایک دن کا روزہ رکھوں گا۔ اگر وہ روزہ رکھ کر توڑ دے تو اس پر کفارہ دینا لازم ہوگا یا نہیں؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول کے مطابق اس کو کفارہ دینا لازم ہوگا کیونکہ نذر بھی قسم کی طرح ہو جاتی ہے اور جو قسم کو توڑتا ہے اس پر کفارہ لازم ہو جاتا ہے، پس نذر کا روزہ توڑنے پر بھی کفارہ لازم ہوگا لیکن اس سلسلہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان یہ ہے کہ نذر بمنزلہ قسم کے نہیں ہے لہٰذا اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

نذر کی اقسام

نذر کی دو قسمیں ہیں۔ نذر مطلق۔ نذر مقید۔
نذر مطلق کی تعریف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "عَلَیَّ اَن اصوم یومًا"۔ میرے اوپر لازم یہ ہے کہ میں ایک دن روزہ رکھوں۔ (اس میں ایک دن کا تعین نہیں ہے)
نذر مقید: علیَّ کذا ان جاء فلانٌ۔ اگر فلاں شخص آجائے تو مجھ پر (افعال کا تعین) لازم ہے۔
کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کا گدھا کھو گیا تھا! اس نے گدھے کی بازیابی کی نیت سے تین روزے رکھے تین دن کے بعد گدھا تو مل گیا لیکن وہ مُردہ تھا! اس کو بہت رنج ہوا اور وہ فرطِ غم میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہنے لگا۔ خداوندا! ان تین روزوں کے عوض (جو میں نے گدھے کی بازیابی کے لئے رکھے تھے) اگر میں نے بھی رمضان کے چھ روزے ترک نہ کئے تو میں جوانمرد نہیں تو نے مجھ سے خالی خولی روزہ رکھوایا؟

دنیا عالم اسباب ہے اور سبب مثل پردہ ہیں

حضرت مولاناؒ سے کسی نے سوال کیا "التحیات" کے کیا معنی ہیں اور الصلوات، والطیبات سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تمام عبادتیں، بندگی اور پرستش یہ تمام کی تمام عطائے الٰہی ہیں اور اس کی ملک ہیں کیونکہ اگر وہ ہمیں صحت و عافیت سے ہمکنار نہ فرماتا تو یہ عبادتیں اور فراغت (بے فکری) حاصل نہ ہوتی اور ہمیں اس کی توفیق ہی نہ ہوتی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ تحیات و طیبات سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ اور اس کی توفیق سے ہیں۔ ہمارا اس میں کوئی ذاتی دخل نہیں ہے سب کچھ اسی کی ملک اور اسی سے ہیں۔ موسم بہار پر

لوگ کھیتی باڑی میں مشغول ہوتے ہیں۔ عمارتیں تعمیر کرتے ہیں اور اسی موسم میں سفر کرتے ہیں۔ اور آبادیوں سے صحرا اور جنگلوں کا رُخ کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ سب کچھ موسم بہار کی بخشش اور عطا کا ثمرہ ہے۔ ورنہ لوگ تو گھروں میں اس طرح بند پڑے تھے جیسے زندان اور غاروں میں بند ہوں۔ لہٰذا اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زراعت یہ تفریح اور تمام نعمتیں سب کچھ بہار ہی کا عطیہ ہے۔ انسانوں کی نظریں اسباب پر ہوتی ہیں اور ان تمام باتوں کو اسباب کا نتیجہ جانتے اور سمجھتے ہیں (بہار کی مثال موجود ہے) لیکن اولیاء کو کشف کے ذریعہ معلوم ہو چکا ہے کہ اسباب کی حیثیت پردہ کی ہے! اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ وہ اسباب کے توسط سے مُسبّب کو جانیں اور یہ جان لیں کہ اس پردہ کی حقیقت ایک طلسم سے زیادہ نہیں ہے جیسا کہ پس پردہ کسی کو بات کرتا پائیں اور یہ سمجھ لیں کہ پردہ ہی مصروف گفتگو ہے اور ان کو یہ احساس نہ ہو کہ پردہ مصروف کار نہیں ہے! اس کی حیثیت تو صرف حجاب کی سی ہے اور جب وہ (گفتگو کرنیوالا) پردہ سے باہر آئے تو حقیقت کا اظہار ہو جائے کہ پردہ تو صرف ایک بہانہ تھا (اصل میں گفتگو کرنے والا یہ تھا جو پردہ سے باہر آیا ہے)۔

کشود کار بغیر اسباب بھی ممکن ہے

مقربین بارگاہ الٰہی اور اولیائے حق نے بغیر اسباب بھی کاموں کو سرانجام پاتے دیکھا ہے اور وہ اس طرح کہ معاملہ مسبب الاسباب پر چھوڑ دیا اور کام ہو گیا جیسے کہ پہاڑ سے اونٹ کا نکلنا۔ عصائے موسیٰ کا اژدھا بن جانا۔ پتھر سے بارہ چشموں کا جاری ہو جانا اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے چاند کا شق ہو جانا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق بغیر ماں باپ کے ہو جانا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا گلزار بن جانا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا اور اس کے علاوہ بہت سے امور کا ظاہر ہونا اسی قبیل سے ہے۔ جب ان تمام (محیرالعقول) باتوں کو دیکھا تو یہ حقیقت ظاہر ہو گئی کہ اسباب تو صرف سبب اور بہانہ یا ذریعہ ہیں درحقیقت کارساز کوئی دوسرا ہی ہے اور اسباب کی حیثیت تو سوائے بہانہ کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ سبب (اسباب کا

لہ اس مضمون کو مولانا رومیؒ نے مثنوی معنوی میں تحت عنوان " موورے کہ بر کاغذ می رفت " بیان فرمایا ہے۔

(مثنوی معنوی دفتر چہارم)

واسطہ صرف اس لئے ہے کہ عوام اسباب سے قطع تعلق نہ کرلیں۔

حضرت زکریاؑ کو فرزند کی بشارت

حضرت زکریا علیہ السلام کو ربّ کریم نے بشارت فرمائی کہ تمہیں فرزند عطا کیا جائیگا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں اور میری بیوی ضعیف العمر ہو گئے ہیں اور میری طاقت بھی کچھ ختم ہو گئی ہے اور میری بیوی زندگی کے ان مراحل میں ہے کہ اس کے حاملہ ہونے کا امکان بھی نہیں رہا۔ اے رب کریم اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے یہاں فرزند کی ولادت ہو سکے (قرآن پاک میں اس کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے) "قال رب انی یکون لی غلام وقد بلغنی الکبر وامرأتی عاقر" (آل عمران ع ۴) (حضرت زکریاؑ نے کہا) اے رب اب میرے اولاد کیوں کر ہوگی میری بیوی سن ایاس کو پہونچ چکی ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ حق تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا (اے زکریا) تم نے پھر ضابطہ قدرت الٰہی کو بھلا دیا حالانکہ لاکھ مرتبہ تم نے دیکھا ہے کہ ہم بغیر سبب کے کام بنا دیتے ہیں۔ یہ بات تمہارے ذہن سے نکل گئی ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسباب تو محض بہانہ ہیں۔ ہماری ذات کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ہم ایک آن میں تمہارے ہزار فرزند پیدا کر دیں جو نہ حمل کے محتاج ہوں گے اور نہ بطن مادر کے اور یہی نہیں بلکہ اگر ایک اشارہ کر دیں تو اس خطۂ زمین پر ایسی مخلوق پیدا ہو جائے جو پیدائشی طور پر ہی عاقل، بالغ اور دانا ہو۔

کیا میں عالم ارواح میں بغیر ماں باپ کے تمہیں وجود میں نہیں لایا اور تمہارے اس وجود میں آنے سے پہلے تم پر میری عنایتیں اور شفقتیں نہ تھیں۔ تم نے انہیں کیسے فراموش کر دیا۔؟

انبیاؑ اور اولیاؑ کے مراتب

انبیا اور اولیا اور نیک و بد بندوں کے مراتب اور ان کی صلاحیتوں کا اگر ادراک حاصل کرنا ہو تو اس کی مثال یہ ہے کہ کفرستان سے غلاموں کو مسلم ممالک میں لایا جاتا اور فروخت کر دیا جاتا۔ ان میں سے بعض کی عمر پانچ سال ہوتی بعض کی دس سال اور بعض کی پندرہ سال۔

وہ غلام جس کی عمر پانچ سال کی ہوتی ہے اور عمر کا بیشتر حصہ وہ اسلامی ماحول میں گزارتا ہے تو اس کو اپنے وطن کے بارے میں کچھ یاد نہیں رہتا اور وہاں کے واقعات سے اس کا ذہن یکسر خالی ہوتا ہے جبکہ دس سال والے کے ذہن میں وطن کی کچھ جھلک باقی ہوتی ہے اور پندرہ سال والے چونکہ عمر کے اعتبار سے زیادہ ہو۔ تے ہیں اس لئے ان کے ذہن میں وطن کی

یادیں اور باتیں زیادہ باقی ہوتی ہیں۔

یہی کیفیت ارواح کی عالمِ بالا میں خالق کائنات کے ساتھ ہے کہ جب خالق کائنات نے عالم ارواح میں رُوحوں سے دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا ہاں" الست بربکم قالوا بلیٰ" (اعراف ع ۲۲) اس عالم میں ان ارواح کی غذا اور خوراک صرف اللہ کا کلام تھا جو بغیر الفاظ و آواز کے تھا پس غور کرو کہ جب ان ارواح میں سے بعض کو بچپن ہی کی حالت میں اس دنیا میں لایا گیا اور جب وہ اس کلام کو سنتی ہیں تو ان کو کچھ بھی یاد نہیں آتا اور وہ خود کو اس کلام سے بیگانہ پاتی ہیں۔ یہ فریق مجوسیوں کا ہے اور یہ مکمل طور پر کفر و ضلالت کا شکار ہیں۔ بعض ارواح کو وہاں کے کچھ احوال یاد آتے ہیں اور عالم ارواح کا ماحول اور وہاں کی رغبت ان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ مومنین کا گروہ ہے اور بعض وہ ہیں کہ جب کلام سنتے ہیں تو ان کی قدیم حالت ان کے سامنے آجاتی ہے اور تمام حجابات کلی طور پر ان کے سامنے سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور اس عالم سے وصل ان کو حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کا ہے

بصیرت کی بات صاحبانِ بصیرت سے کی جائے

میں اپنے دوستوں اور احباب کو اس طرف خاص طور پر متوجہ کرتا ہوں کہ جب عروسِ معانی باطن میں رونمائی کرے اور اسرار ان پر ظاہر ہونے لگیں تو خبردار! اس کیفیت کا اظہار غیروں کے سامنے نہ کرنا اور اس کی شرح بیگانوں سے نہ کی جائے۔ اسی طرح میری یہ جو باتیں سنتے ہو اُن کو بھی غیروں کے سامنے بیان نہ کرنا۔ فرمایا گیا ہے کہ "لا تعطوا الحکمۃ لغیرا اھلھا تظلموھا ولا تمنعوھا عن اھلھا تظلموھم" حکمت نا اہلوں کو نہ دو ورنہ خود حکمت پر ظلم کرو گے اور نہ اس کے اہل کو دینے سے باز رہو ورنہ ان پر ظلم کرو گے۔ یوں سمجھو کہ تمہیں ایک دوست یا محبوبہ میسّر آجائے اور تمہارے گھر میں پوشیدہ ہو کر یہ کہے کہ مجھے کسی کو نہ دکھانا۔ میں تو صرف تمہارے لئے ہوں تو کیا یہ بات مناسب اور روا ہوگی کہ تم اس کو سر بازار لے جا کر یہ کہو کہ لوگو آؤ اور میری محبوبہ کو دیکھو۔ یہ بات اس کو ہرگز پسند نہ آئے گی وہ تم سے الگ ہو کر اپنا منہ چھپائے گی۔ تمہارا یہ عمل اس کے لئے ناراضگی کا سبب ہوگا۔ اس تمثیل سے یہ بات سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے

ایسی باتیں ان لوگوں کے لئے حرام کر دی ہیں (یعنی غیر اہل پر اسرار کو ظاہر کرنے کی سخت ممانعت فرمادی ہے)۔

اس کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ قیامت کے بعد جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے تو دوزخی اہل جنت سے کہیں گے کہ ہم پر مہربانی کرو اور اللہ رب العلمین نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور جو نوازشات تم پر کی ہیں از روئے صدقہ اور بندہ نوازی ہمیں ان سے محروم نہ کرو۔ ہمیں بھی اس سے ریزہ چینی کا موقع دیدو تمہارا تو کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔ اگر بچی کھچی اور گری پڑی چیز کسی کو دیدیں تو کیا حرج ہے "وللارض من کاس الکرام نصیب"۔ اہل کرم کے پیالے سے زمین کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

اے جنتیو! دیکھ رہے ہو کہ ہم اس آگ میں جل رہے ہیں اور پگھل رہے ہیں۔ اگر بہشت کے میووں یا آب زلال میں سے ہمیں بھی کچھ عنایت ہو جائے تو تمہارا کوئی نقصان نہیں۔

"ونادیٰ اصحٰب النار اصحٰب الجنۃ ان افیضوا علینا من الماء او مما رزقکم اللہ۔ قالوا ان اللہ حرمھما علی الکفرین"۔

دوزخی جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ ہمیں ذرا سا پانی پلادو یا تمہیں اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں ان میں سے کچھ ہمیں بھی دیدو تو جنتی جواب دیں گے کہ اللہ رب العلمین نے یہ نعمتیں کافروں پر حرام اور ممنوع کر دی ہیں"۔ افسوس۔ ان نعمتوں کا بیج جو تم کو اس دنیا میں ملا تھا اس کو تم نے نہیں بویا اور اس تخم کی آبیاری کا موقع کھو دیا وہ بیج ایمان وصدق اور عمل صالح تھا۔ اب یہاں اس سے تم کیا پھل حاصل کرو گے۔ از روئے کرم اب اگر ہم کچھ تمہارے لئے ایثار بھی کریں تو چونکہ رب العلمین نے یہ نعمتیں تم پر حرام کر دی ہیں تو یہ تمہارے حلقوم جلا ڈالیں گی اور تم انہیں اپنے حلق سے نیچے نہ اتار سکو گے اور اگر تم انہیں تھیلی یا جیب میں ڈالو گے تو وہ پھٹ جائیں گی اور یہ گر جائیں گی۔

صاحبان بصیرت کی مثال

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں منافقوں کی ایک جماعت حاضر ہوئی اس وقت صحابہ کرامؓ شرح اسرار اور مدح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں مصروف تھے۔ اس جماعت کے کہنے کے

بعد سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور صحابہؓ سے خطاب فرمایا:

"اپنے کوزوں، پیالوں، دیگوں، سبو اور مشکوں کو ڈھانک کر رکھو خمّروا آنیتکم (بخاری کتاب بدء الخلق باب خمس من الدواب فواسق) کیونکہ بہت سے جانور زہریلے اور نجس ہوتے ہیں ممکن ہے وہ تمہارے برتنوں میں گر جائیں، اور لاعلمی میں تم اس برتن سے پانی پی لو اور اس سے تم کو نقصان پہونچے۔"

اس طرح سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو اس لطیف طریقہ سے نصیحت فرمائی کہ غیر محرم (نااہلوں) سے حکمت کی باتوں کو پوشیدہ رکھو۔ اپنی زبان کو غیروں کے سامنے بند رکھو کیونکہ ان کی حیثیت چوہوں کی سی ہے اور وہ حکمت و نعمت کے لائق نہیں ہیں۔ (حکمت کی ان باتوں کو ان منافقین کے سامنے مت بیان کرو) اس کے بعد حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ وہ امیر جو ابھی ہمارے پاس سے اٹھ کر گیا ہے۔ اگرچہ اس نے ہماری بات کو تفصیل سے نہیں سمجھا ہے لیکن اجمالاً اس کو جان لیا ہے کہ ہم اس کو حق کی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ اس کی نیاز مندی اس کے سر ہلانے اور اس کی محبت و عقیدت سے ہم یہ سمجھتے ہیں۔

دیکھو! دیہاتی جب شہر میں آتا ہے اور اذان کی آواز کو سنتا ہے تو اگرچہ وہ اذان کے الفاظ کے معانی کو تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھتا لیکن اذان کے مقاصد سے تو واقف ہوجاتا ہے (کہ نماز کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس طرح امیر بھی اجمالاً کچھ نہ کچھ تو سمجھ ہی گیا ہے)

فصل
محبوب کی کیفیات

مولاناؒ نے فرمایا ہر محبوب اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا عکس منطقی درست نہیں ہے کہ جو چیز اچھی معلوم ہوتی ہے وہ محبوب ہوتی ہے۔ حسن محبوبیت کا جزو ہے لیکن محبوبیت اصل ہے۔ جہاں محبوبیت ہوگی وہاں حسن بھی ہوگا۔ کیونکہ جزو اپنے کل یا اصل سے جدا نہیں ہوتا اور وہ لازمہ کل ہوتا ہے (ایسا نہیں ہے کہ جہاں حسن ہوگا وہاں محبوبیت بھی ہوگی) مجنوں کے زمانہ میں لیلیٰ سے زیادہ حسین و جمیل خواتین موجود تھیں لیکن وہ مجنوں کی محبوب نہ تھیں۔ جب مجنوں سے کہا گیا کہ لیلیٰ سے بہتر اور خوشنما خواتین موجود ہیں! اگر تم کہو تو ہم ان کو تمہارے لئے منتخب کریں۔ مجنوں نے جواب دیا کہ میں

لیلیٰ کو اس کی شکل کی وجہ سے پسند نہیں کرتا۔ لیلیٰ صورت کا نام نہیں بلکہ لیلیٰ تو میرے ہاتھ میں جام کی طرح سے ہے اور میں اس جام سے شراب نوشی کرتا ہوں۔ درحقیقت میں تو اسی شراب کا عاشق ہوں جو میں پیتا ہوں لیکن تمہاری نظر قدح شراب پر ہے۔ تم شراب کے مزے کو کیا جانو؟ اگر میرے لیے عمدہ زریں مرصع جام لاؤ لیکن اس میں شراب کے بجائے سرکہ یا کوئی اور مشروب ہو تو وہ میرے لئے کس کام کا؟۔

کدوئے کہنہ یا شکستہ جام تمہی دیکھے کدو کا پیالہ جس میں شراب ہو وہ میرے لئے اس مرصع اور زریں جام سے بہتر ہے اور اسی سے نہیں بلکہ اس جیسے سینکڑوں مرصع پیالوں سے بہتر ہے۔ اور اس بات کو سمجھنے کے لئے عشق اور شوق کی ضرورت ہے تاکہ شراب اور جام شراب میں فرق کیا جا سکے جیسے ایک جگہ دو شخص موجود ہیں ان میں ایک ایسا ہے جس نے دس دن سے کچھ نہیں کھایا ہے اور ایک شخص ایسا ہے جس نے دن میں پانچ مرتبہ کھایا ہے۔ ان دونوں کے سامنے ایک روٹی لائی جائے تو شکم سیر کو وہ صرف روٹی ہی نظر آئے گی جب کہ بھوکا اس کو اپنی جان سمجھے گا۔ پس یہ روٹی جام کی طرح سے ہے اور اس کی لذت شیر (دودھ) کی طرح ہے جس کو صرف بھوک کی نظر سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تم اپنے اندر حقیقی اشتہا اور شوق پیدا کرو تاکہ صورت پرست نہ رہو بلکہ کون و مکان میں معشوق ہی معشوق کو دیکھو (سوائے معشوق کے اور کچھ تم کو نظر نہ آئے)۔ مخلوق کی صورت تو جام کی طرح ہے اور ان کے علوم و ہنر و دانش جام کے نقش و نگار کے مانند ہیں جب جام ٹوٹ جاتا ہے تو نقش و نگار بھی ختم ہو جاتے ہیں اور حقیقت میں کام تو شراب سے ہے جو اس جام میں ہے اور جو شخص اس شراب کو دیکھتا ہے اور اسے پیتا ہے وہی یہ جانتا ہے کہ "الباقیات الصالحات خیر الآیہ۔ باقی رہنے والے اعمال خیر اچھے ہوتے ہیں۔ (جو کچھ بچ گیا وہی بہتر ہے)۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا سوال کرنے والے کے پیش نظر دو باتیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ سائل بن سکے۔ ایک یہ کہ پختگی کے ساتھ یہ جان لے کہ میں نے جو کچھ کہا وہ غلط ہے اصل چیز کچھ اور ہی ہے۔ دوسرے یہ خیال کرے کہ جو کچھ مجھے معلوم ہے اس سے بہت بلند تر اور بالاتر گفتگو اور حکمت موجود ہے جس کے بارے میں مجھے علم اور ادراک نہیں ہے یہاں یہ بات ہم کو معلوم ہوئی کہ "السؤال نصف العلم" (سوال بھی نصف علم ہے) ہر شخص جو کسی دوسرے شخص کی طرف رجوع ہوتا ہے وہ حق بات کے لئے

رجوع ہوتا ہے کہ سب کا مطلوب حق ہے۔ طالب حق اس امید میں اپنی تمام عمر صرف کر دیتا ہے لیکن یہ تمیز کا ایک معیار یا کوئی ممیز (تمیز کرنیوالا) ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ وہ جان سکے کہ اس جماعت میں وہ کونسا شخص ہے جو درست بات کہہ رہا ہے اور اس پر بادشاہ کے چوگان کے زخم کا نشان ہے (کوئی ایسا نشان رکھتا ہو جس سے معلوم ہو سکے کہ تمام گھوڑوں میں یہ گھوڑا منفرد ہے) تاکہ وہ دوئی سے ہٹ کر ایک ہی ذات کو جان سکے۔ موحد بن سکے۔

مستغرق آب سی کو کہا جائیگا جس پر پانی کو تصرف حاصل ہو اور وہ پانی پر تصرف نہ رکھتا ہو۔ پانی میں وہ غرق نہیں ہوتا ہے جس کو پانی پر فوقیت حاصل ہو پانی کو اس پر نہیں۔ کیونکہ غرق ہونے والا اور تیراک دونوں ہی پانی میں جاتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو تیرنا نہیں جانتا پانی اس پر تصرف حاصل کر لیتا ہے لیکن تیرنا نہ جاننے والے کی ہر جنبش اس کا ہر عمل اس کی ہر بات جو اس حالت میں اس سے صادر ہوتی ہے وہ اسی پانی کی وجہ سے ہوگی۔ غرق ہونے والے کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کی حیثیت تو درمیانی واسطہ اور ایک بہانہ کی ہے۔ یوں سمجھیں کہ دیوار سے کوئی آواز آئے تو یہ دیوار کی آواز نہیں یہ کسی کا عمل ہے جس نے دیوار کو بولنے پر مجبور کر دیا ہے (دیوار سے آواز آرہی ہے)۔

انا الحق کی تفسیر

اولیاء کی مثال دیوار کی سی ہے جو موت آنے سے پہلے ہی مُردہ ہیں اور دستِ قدرتِ حق میں سپر (ڈھال) کی طرح ہیں اور یہ بات محقق ہے کہ سپر میں بذاتہ حرکت نہیں ہوتی اس کے لئے کوئی محرک ضرور ہوتا ہے اور یہی انا الحق کی تفسیر ہے اور یہ وہ منزل ہے جہاں سپر یہ کہتی ہے کہ میں درمیان میں نہیں ہوں اور میری حرکت ذاتی نہیں ہے۔ یہ تو دستِ قدرتِ حق کا اشارہ ہے۔

اس پر سپر کا خیال کرو اور حق تعالیٰ سے پنجہ آزمائی نہ کرو کیونکہ جنہوں نے ایسی حرکت کا ارتکاب کیا ہے انہوں نے حق تعالیٰ سے نبرد آزمائی کی ہے اور خود اللہ تعالیٰ کے بالمقابل کھڑے ہو گئے ہیں۔ زمانہ آدم علیہ السلام سے آج تک یہ سنتے چلے آئے ہو کہ حق تعالیٰ کے مقابلہ پر آنیوالوں پر کیا گذری ہے فرعون۔ شداد۔ نمرود۔ عاد و ثمود وغیرہ اور یہ سپر آج تک قائم ہے اور تا قیامت تک باقی رہے گی۔ کبھی تو یہ سپر انبیاء علیہم السلام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اولیاء

کی شکل میں نمودار ہوتی ہے جو ماضی میں گزرے یا حال میں موجود ہیں یا مستقبل میں آئیں گے تاکہ اچھے لوگ بُروں سے اور نیکوکار گناہ گاروں سے ممتاز ہو جائیں۔ اس طرح ہر وَلی خلق پر حجت حق ہے۔ اور مخلوق کا ولی سے جس قدر تعلق ہوگا اسی تعلق کی بنا پر خلقت کا مرتبہ اور مقام متعین ہوگا لیکن اگر مخلوق وَلی سے مخالفت کرے گی تو یہ مخالفت وَلی کی نہ ہوگی بلکہ وہ ذاتِ باری کی مخالفت اور دشمنی ہوگی۔ اور وَلی سے دوستی اللہ رب العٰلمین سے دوستی ہوگی۔

"من رّاہ فقد رأنی ومن قصدہٗ فقد قصدنی"۔ جس نے اس کو (ولی کو) دیکھا اس نے مجھے دیکھا اور جس نے وَلی کا قصد کیا اس نے میرا قصد کیا۔

اولیا محرمِ رازِ الٰہی ہوتے ہیں

اولیاء اللہ محرم حریم الٰہی ہوتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ خادموں کی طرح ان کی تمام خواہشات آرزوئیں اور خیانت کے تمام محرکات تمام ریشوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے (سلب کر لئے ہیں) اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مخدوم عالم بن گئے ہیں۔ اور محرم رازِ الٰہی ہیں۔ "لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ"۔ پاکوں کے علاوہ اور کوئی اس کو نہ چھوئے۔ یعنی بجز پاکوں کے اور کوئی نہیں جو اُن کو پا سکے۔ پاک لوگوں کے سوا دوسروں کی اس پر دسترس نہیں ہے۔

فصل

ظاہری بے تعلقی

حضرت مولاناؒ نے فرمایا ہے کہ اگر میں نے بزرگوں کی قبروں کی جانب سے پشت کرنی یہ گریز اختیار کر رکھا ہے تو اس کا سبب بے توجہی یا غفلت نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میری توجہ ان کی ارواح اور ان کے باطن کی جانب ہے۔ کیونکہ جو الفاظ میری زبان سے ادا ہوتے ہیں یہ انہیں کی طرف سے ہیں ظاہر ہے کہ بے تعلق ہو کر صرف اس کے باطن کی جانب توجہ منعطف رکھی جائے تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہوتا (فائدہ ہی فائدہ ہے)

تالیفِ قلب کی انتہا

آپ نے فرمایا میری خواہش اور آرزو ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ کوئی مجھ سے ناراض نہ ہو اور کسی کا دل نہ دُکھے۔ یہ جو محفل سماع میں بعض لوگ (حال و وجد میں)۔ مجھ سے ٹکراتے ہیں اور میرے اوپر گر پڑتے ہیں تو میرے

جس احباب نے ایسے لوگوں کو اس بات سے روکا ہے اور کہا ہے کہ یہ خلاف ادب ہے تو یہ بات مجھے پسند نہیں میں نے ہزار بار کہا ہے کہ میری وجہ سے کسی سے مزاحمت نہ کی جائے۔ میرے سامنے اگر کوئی شخص کوئی کام کرتا ہے تو میں اس سے راضی ہوں۔

"کہاں میں کہاں شاعری" میں تو اس حد تک اپنے احباب کی دلداری کرتا ہوں کہ محض اس خیال سے کہ یہ لوگ ملول نہ ہوں۔ میں ان کی خوشنودی کی خاطر شاعری بھی کرتا ہوں تاکہ وہ اس میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں شاعری۔ خدا کی قسم میں تو شعر سے بیزار ہوں اور شاعری سے بدتر میرے نزدیک کوئی اور چیز نہیں۔

یہ ایسا ہی ہے کہ کسی شخص کا پیٹ بھرا ہے لیکن محض مہمان کی خاطر جس کو بہت بھوک لگی ہے ہاتھ دھو کر کھانے میں شریک ہو جائے بس اسی طرح میں احباب کی خاطر داری کے لئے ایسا کرتا ہوں ورنہ شاعری سے میرا دل سیر ہے۔

یہی حالت اس تاجر کی ہے جو یہ دیکھتا ہے کہ کس شہر میں کس چیز کی ضرورت ہے اس لئے وہ ادنیٰ سی ادنیٰ چیز خرید کر اس شہر میں جا کر فروخت کرتا ہے (اس مملکت میں شاعری کا بہت چرچا ہے مجبوراً مجھے بھی اس متاعِ حقیر کو پسند کرنا پڑا)۔ میں نے حصولِ علم میں بہت تکلیفیں برداشت کی ہیں تاکہ میرے پاس اہل علم و دانش آئیں اور میں ان کے سامنے علمی دقائق و حقائق اور علمی نکات بیان کروں اور مشیت الٰہی بھی یہی ہے کہ اس نے تمام علوم کو اس دل میں یکجا کر دیا ہے اور میری ان کوششوں کو اس منزل پر پہونچایا ہے تاکہ میں اس کام میں بھی مشغول ہو جاؤں (شعر و شاعری میں مصروف رہوں) میں کیا کر سکتا ہوں مجبور رہوں ورنہ ہمارے ملک (بلخ) میں شاعری سے بدتر اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ ہم اگر اس ملک میں ہوتے تو وہاں کے ماحول کے مطابق کام کرتے اور وہاں کے رہنے والوں کے انداز کے مطابق زندگی گذارتے! اس لئے کہ ان کو درس و تدریس اور وعظ و تذکیر و تصانیف کتب اور زہد و عمل کے مشاغل پسند ہیں (مملکت بلخ کے لوگ شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ علما و ارباب فضل و کمال

لہ تفصیل سوانحِ عمری مولانا روم مرتبہ شبلی نعمانی میں دیکھئے۔

موعظت وتذکیر، تصنیف وتالیف اور زہد واتقا میں اپنے شب وروز بسر کریں) یہاں تو یہ میں آکر ہم کو مجبوراً دوستوں کی خاطر شاعری کو اختیار کرنا پڑا۔

کیا اصل چیز عمل ہے

امیر پروانہ نے حضرت مولانا سے پوچھا کیا اصل چیز صرف عمل ہی ہے ؟ حضرت مولاناؒ نے فرمایا عمل کے طالب اور عمل کرنے والے اب کہاں ہیں تاکہ انھیں عمل کرکے دکھایا جائے۔ تم تو ابھی صرف قول کے طالب ہو۔ یہ چاہتے ہو کہ کچھ سنو۔ اور انہیں باتوں پر کان لگائے ہوئے ہو۔ اگر ہم تم کو کچھ سنائیں تو تم ملول اور رنجیدہ ہوتے ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ عمل کے طالب بنو تاکہ ہم تم کو عمل کرکے دکھائیں ہم تو دنیا میں ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جس کو کچھ کرکے دکھائیں۔ لیکن ہمیں عمل کا خریدار ملتا ہی نہیں۔ گفتار کا خریدار تو مل جاتا ہے اس لئے ہم گفتگو (تقریر) ہی میں مشغول ہیں اور توجہ کے قابل بات تو یہ ہے کہ تم خود عامل نہیں اس لئے تم عمل کو کیا جانو کیونکہ عمل ہی سے علم کو پہچانا اور جانا جاتا ہے۔ صورت کو صورت سے اور معانی کو معانی سے جان سکتے ہیں۔ مگر کوئی اس راہ پر چلنے والا نہیں ہے اور راستہ خالی ہے۔ اگر ہم اس راہ کے رہرو اور اس پر گامزن ہیں (یعنی عمل کرتے ہیں) تو ہمیں دیکھنے والا کون ہے ؟ راستہ تو خالی پڑا ہے۔

اعمال کی ظاہری و باطنی تقسیم

یہ نماز، روزہ اصل عمل تو نہیں ہیں۔ یہ تو اعمال کی ظاہری صورت ہیں۔ درحقیقت عمل کے معنی تو باطنی ہیں۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک نماز وروزہ اس ہیئت میں نہ تھے صرف عمل تھا اصل عمل تو انسان کی داخلی اور روحانی کیفیت کا اظہار ہے پس یہ عمل کی ظاہری ہیئت ہوئی۔ جیسے کہا جائے کہ فلاں دوا نے فائدہ کیا ہے۔ یہاں عمل سے اس کی ظاہری کیفیت مراد نہیں ہے اس سے باطنی کیفیت مراد ہے یا یوں کہا جائے کہ فلاں شہر میں فلاں شخص عامل ہے۔ یہاں چیزوں کو ان کی ظاہری صورت میں نہیں دیکھا جاتا بلکہ وہ کام جو اس شخص (عامل) سے متعلق ہیں ان کی وجہ سے عامل کو عامل کہا گیا پس یہ عمل اس خیال کے مطابق نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔

لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عمل ظاہری چیز کا نام ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ منافق اگر کوئی ظاہری

عمل کرتا ہے (اپنے اسلام کا اظہار وغیرہ) تو اس عمل سے اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس میں اقرار بالّلسان تو موجود ہے لیکن اس کے باطن میں صدق اور ایمان مفقود ہے۔

یہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہیں (جس کو تم عمل سے تعبیر کرتے ہو) یہ تمام کی تمام قولی اور زبانی ہیں لیکن تمہیں ابھی گفتار یعنی زبانی باتوں کا علم ہی نہیں ہے اس لیئے اس کو حقارت سے دیکھتے ہو۔ زبانی باتیں تو علم کے درخت کا ثمرہ ہیں جو عمل سے پیدا اور نمایاں ہوتی ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس ساری کائنات کو صرف قول ہی سے پیدا کیا ہے۔ حکم ربی ہوا "کن فیکون" (ہو جا تو ہو جاتی ہے۔

ایمان قلبی اور باطنی تصدیق کا نام ہے۔ اگر کہیں زبانی اقرار نہ ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اسی طرح نماز کہ وہ عمل تجھ ہے اگر اس میں قرآن کریم کی تلاوت نہ کی جائے تو نماز نہ ہوگی۔ یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ قول معتبر نہیں ہے یہ بھی تو ایک قول ہی ہے عمل نہیں ہے۔

ایمان خوف و رجا کا دوسرا نام ہے

ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب ہم عمل خیر اور نیکی کا کام کریں اور اللہ رب العٰلمین سے امید لگائیں اور بھلائی کی توقع کریں تو کیا ہمارا یہ عمل ہمارے لئے زیاں کا سبب ہوگا؟ حضرت مولانا نے فرمایا کہ ہاں واللہ، مگر اس سے امید رکھنی چاہیئے۔ اور اسی خوف و رجا کی کیفیت کا نام ایمان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ رجا بذات خود اچھی بات ہے لیکن یہ خوف کیا چیز ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ تم بغیر رجاء کے خوف یا بغیر خوف کے رجاء بتاؤ اور دکھاؤ تب میں جانوں! سنو! جب یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں تو پھر اس سوال سے فائدہ؟ یہ دونوں تو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کون ایسا شخص ہوگا جو گیہوں بونے کے بعد یہ توقع کرے کہ گیہوں نہ پائے گا۔ یقیناً اس کاشت سے گیہوں ہی پیدا ہوگا۔ ہاں اس کو اس بات کا خوف ضرور لاحق ہوگا کہ کوئی ایسی ناشدنی بات نہ پیدا ہو جائے جس سے گیہوں نہ پیدا ہو سکے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ایسا تصوّر بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ امید بغیر خوف کے ممکن ہے۔ یا خوف بغیر امید کے پایا جا سکتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اعمال خیر کے بعد جزا اور احسان کی توقع رکھتا ہے (اور یقیناً توقع رکھنی چاہیئے) تو اپنے اعمال میں وہ اور زیادہ سرگرم ہوگا اور یہ

توقع اور امید اس کے لیئے پَر اور بازو کی طرح سے ہیں۔ یہ بازو جتنے قوی اور مضبوط ہونگے پرواز اتنی ہی اچھی اور بلند ہو گی لیکن اگر اس پر نا امیدی طاری ہو تو اس سے اعمال میں سُستی اور کاہلی سرزد ہو گی اور اعمال میں کار ہائے بندگی سرزد نہ ہونگے جیسے ایک شخص صحت کے حصول کے لئے کڑوی دوا پیتا ہے اور بہت ہی میٹھی اور ذائقہ دار چیزوں کو ترک کر دیتا ہے۔ اگر وہ صحت کا امیدوار نہ ہو تو وہ ایسا نہیں کرے گا اور کڑوی دواؤں کا استعمال کیوں کریگا؟

اِنسان کی کیفیت

اِنسان حیوان ناطق ہے یعنی وہ حیوانیت اور نطق (گویائی) سے مرکب ہے۔ جس طرح کہ اس میں صفت حیوانی دائمی ہے اور اس کا جزو لاینفک ہے! اسی طرح نطق اور گویائی کی کیفیت بھی ایسی ہے، جو اس سے جُدا نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ وہ بات نہیں کرتا لیکن بباطن وہ گویا ہے! اس کی صفت نطق دائمی اور لاینفک ہے۔ دیکھو جب سیلاب کا ریلا آتا ہے تو اس کے ساتھ مٹی اور کیچڑ بھی آتے ہیں سیلاب کا پانی نطق اور گویائی کی کیفیت کا غمّاز ہے جب کہ مٹی اور کیچڑ اس کی صفت حیوانی کی طرح ہیں۔ لیکن کیچڑ اور سیلاب کے پانی کا ساتھ عارضی ہے۔ کیا تم اس بات کو نہیں دیکھتے کہ کیچڑ اور اجسام تو گل سڑ جاتے ہیں لیکن صفت نطق و گویائی حکایات و علوم نیک و بد کی دسترس سے محفوظ رہ کر لوگوں سے باقی رہ جاتے ہیں۔ صاحب دل کی مثال ایک مکمل چیز کی سی ہے جس نے اس کو دیکھ لیا اس نے سب کچھ دیکھ لیا۔ اَلصید کلہ فی جوف الفرا؛ (جس کو اردو کی مثال میں اس طرح کہیں) ہاتھی کے پیر میں سب کا پیر۔ دنیا کی تمام مخلوق اس کے اجزا ہیں اور وہ صاحب دل کل ہے۔

جزو درویشند جملہ نیک و بد ۔۔۔۔ ور نباشد این چنیں درویش نیست

(اچھائیاں اور برائیاں تو درویش کا جزو ہیں۔ اگر کسی میں یہ صفات نہیں ہیں تو وہ درویش نہیں ہے)

جسزو کل کا دیکھنا

اب جبکہ تم نے اس کو دیکھ لیا ہے جو کل ہے تو قطعًا اور یقینًا سارے عالم کو دیکھ لیا ہے۔ اور اس کو دیکھنے کے بعد جو کچھ تم دیکھو گے وہ ایسا ہے کہ تم نے اس کل کا دوبارہ مشاہدہ کیا۔ اسی طرح اقوال میں اس کا فرمان حرف آخر اور قول کل ہے:

فمن یرہٗ فی منزل فکانما　　　رأی کل انسان وکل مکان

جس نے اس کو کسی منزل میں دیکھ لیا گویا کہ اس نے ہر انسان اور ہر مکان کو دیکھا ہے۔

اے نسخۂ نامۂ الٰہی کہ توئی　　　وے آئینۂ جمال شاہی کہ توئی

بیروں ز تو نیست ہر چہ در عالم ہست　　　در خود بطلب ہر آنچہ خواہی کہ توئی

نامۂ الٰہی کا نسخہ (دفتر) اصل میں اے انسان تو ہی ہے اور جمال شاہی کا آئینہ تیری ہی ذات ہے (کہ اس میں حسن حقیقی کا پرتو منعکس ہو رہا ہے) دنیا میں اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ تیری ذات سے باہر نہیں ہے (تیری ذات کے اندر موجود ہے۔ وہیں سے طلب کر)

فصل

مسلمان کی صفت

نائب السلطنت یعنی امیر پروانہ نے مولانا سے عرض کیا کہ جس طرح کافر بت پرستی کرتے تھے اور بتوں کے سامنے سر جھکاتے تھے اسی طرح موجودہ دور میں ہم بھی ایسی ہی حرکتوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ہم جاتے ہیں اور مغلوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور خود کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں! اس کے ساتھ ہی بہت سے باطنی بت بھی رکھتے ہیں مثلاً حرص، حسد، کبر، نخوت وغیرہ اور ہم ان کے مطیع ہیں۔ بظاہر اور بباطن ہم وہی (غلط) کام کرتے ہیں لیکن پھر بھی خود کو مسلمان سمجھتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ نے فرمایا۔ یہاں ایک بات اور بھی ہے۔ جب تمہیں یہ خیال آتا ہے کہ یہ کام برا اور ناپسندیدہ ہے تو یقیناً تمہارے دل کی آنکھ (باطن) نے بے مثال اور عظیم چیز کو دیکھ لیا ہے جو اس کو ناپسند اور بری معلوم ہوتی ہے کیونکہ کھاری پانی کی حیثیت اور حقیقت اسی پر آشکارا ہو سکتی ہے جس نے شیریں پانی کا ذائقہ چکھا ہے " و بضدھا تتبین الاشیاء"۔ اپنی ضد سے ہی اشیاء پہچانی جاتی ہیں۔

حق تعالیٰ نے تمہارے جسم و جاں میں نور ایمان ودیعت فرما دیا ہے جو ایسے کاموں کی برائی کو دکھاتا ہے اور اچھے اور برے کے فرق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور اگر ایسی کیفیت نہیں ہے! اگر دوسرے لوگوں میں یہ درد موجود نہیں ہے (اچھے برے کی تمیز کا احساس ان کے اندر نہیں ہے) تو وہ جس حال میں ہیں فرحاں اور شاداں ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کام تو خود ذات باری کا ہے کہ وہ تمہاری خواہش کے مطابق نعمتیں عطا فرمائے اور جہاں سے بھی ہو وہیں سے حصہ دلوا دے۔ تم اس بات کو خوب جانتے ہو۔

الطیر یطیر بجناحیہ والمومن یطیر بھمتہ پرندہ اپنے پروں سے اڑتا ہے جبکہ مومن اپنی قوتِ ایمانی سے پرواز کرتا ہے۔

مخلوق کی اقسام

خلقت تین طرح کی ہیں۔ ایک ملائکہ۔ یہ عقل محض ہیں۔ عبادت بندگی، ذکرِالٰہی ان کی فطرت ہے، یہی ان کی غذا ہے اور یہی عبادت و ریاضت ان کی وجہِ حیات ہے! ان کی مثال پانی میں رہنے والی مچھلی کی سی ہے جس کی زندگی اور اوڑھنا بچھونا یہی پانی ہے۔ پانی اس کے لئے سبب حیات ہے اس کو اس سے تکلیف نہیں بلکہ راحتِ حیات ملتی ہے۔ فرشتے شہواتِ انسانی سے مبرا ہیں پاک ہیں! اگر انہیں کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی تو اس پر تحیّر کیوں اور تعجب کی کیا بات ہے چونکہ وہ خواہشات سے پاک ہیں اس لئے خواہش کو کچلنے کے لئے انہیں جد وجہد نہیں کرنی پڑتی! اسی طرح ان کے لیے طاعت و عبادت میں اجر و ثواب بھی نہیں ہے کیونکہ ان کی فطرت وطبیعت ہی یہی عبادت ہے اور بغیر اس کے وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

دوسرے حیوانات: یہ شہوت محض ہیں۔ انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں اور وہ اپنے اعمال کے جواب دہ بھی نہیں (یہ حیوان مطلق ہیں)۔

تیسری قسم میں مسکین انسان ہے جو عقل و خواہشات کا مجموعہ ہے جس کا ایک نصف فرشتوں کی سی صفات سے متصف ہے تو دوسرا نصف حیوانی صفات کا حامل ہے گویا نصف حصہ سانپ کی مثل ہے اور نصف مچھلی کی طرح ہے۔ سانپ اس کو مٹی یا خاک کی جانب کھینچتا ہے تو مچھلی پانی کی جانب۔ ان دونوں کی کشاکش کے درمیان ہے گویا وہ ایک جنگ کی حالت میں ہے۔

من غلب عقلہٗ علٰے شھوتہ فھو اعلٰی من الملئکہ ومن غلب شھوتہ علٰے عقلہ فھو ادنٰی من البھائم

جس کی عقل شہوت پر غالب آگئی وہ ملائکہ سے برتر ہے لیکن جس کی عقل خواہشات سے مغلوب ہو گئی وہ بہائم سے بھی بدتر ہے۔

فرشتہ است بعلم و بہیمہ است بجہل میانِ ایں دو منازع بماند آدم زاد

فرشتہ نے اپنے علم اور جانور نے اپنے جہل کی وجہ سے رستگاری حاصل کر لی لیکن انسان ان دونوں کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔

اتباع کی کیفیت اور اس کے نتائج

بعض انسانوں نے عقل کی کامل اتباع کر کے صفات ملکی کو حاصل کر لیا اور یہ طبقہ انبیاء اور اولیاء کا ہے۔ یہ حضرات خوف و رجا کی منزل سے آزاد ہیں اور وہ کامل طور پر ملائکہ صفت بن گئے ہیں۔

ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ٥ ان پر نہ کسی قسم کا خوف مسلط ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے

انسانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جن کی خواہشات عقل و شعور پر غالب آگئیں۔ ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صفات حیوانی کے حامل ہو کر پوری طرح حیوان بن گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو درمیانی کیفیت کا حامل ہے۔ اور وہ عقل اور خواہشات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ رنج و درد۔ آہ و فغاں اور حسرت کا شکار ہیں اور وہ اپنی زندگی سے شاداں اور راضی نہیں ہیں۔ یہ مومنین ہیں اور اولیاء اللہ جو اس دریا (حیات) میں بصفت ماہیان ہیں وہ ان مومنوں کے منتظر ہیں کہ انہیں ان کی منزل پر پہونچا دیں وہ منزل اعلیٰ علیین ہے اور ان کو اپنے جیسا کر دیں۔

اب دوسری قسم رہی تو وہ شیاطین (بدکاروں) کی جماعت ہے جو اس دنیا کے مار و اژدر ہیں۔ وہ بھی لوگوں کے منتظر ہیں کہ ان کو اپنے مقام کی طرف کھینچ لیں اور اسفل السافلین میں جو ان کا مقام ہے پہونچا دیں۔

ما می خواہیم و دیگراں می خواہند   تا بخت کرا بود کرا خواہد دوست

ہم بھی چاہتے ہیں اور دوسروں کی بھی خواہش ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مقدر کس کا ساتھ دیتا ہے دوست کس کو پسند کرتا ہے۔ اکون منزل مومنین تک پہونچتا ہے اور کون منزل شیاطین تک۔

فصل

نصرتِ الٰہی

"اذا جاء نصر اللّٰہ" (پارہ ۳۰) جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے فتح و نصرت آئی۔

ظاہر بیں مفسرین اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ تمام انسانوں کو اسلام سے مشرف فرما دیں اور راہِ خدا دکھائیں لیکن جب آپؐ نے اپنی حیاتِ ظاہری کے اختتام کو ملاحظہ فرمایا تو آپؐ نے فرمایا کہ میری حیاتِ ظاہری اتنی نہیں کہ تمام

دنیا کو دعوتِ اسلام دوں اور راہِ حق دکھاؤں۔

ربّ العٰلمین کو اپنے محبوب کی دلفگاری گوارہ نہ ہوئی۔ پیغامِ الٰہی ملا۔ اے حبیبؐ آپ رنجیدہ نہ ہوں جب آپ کی حیاتِ ظاہری ختم ہو جائے گی تو جن شہروں اور آبادیوں کو شمشیر و لشکر سے آپ نے فتح کیا ہے وہاں کے بسنے والوں کو میں بغیر فوج کشی کے آپ کا مطیع اور مومن بنا دونگا۔ اور اس کی نشانی یہ ہے کہ آپ شعورِ الٰہی پورا ہونے سے پہلے یہ ملاحظہ فرمالیں گے کہ لوگ دور دور سے جوق در جوق گروہ در گروہ آئیں گے اور مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ جب یہ علامات ظاہر ہو جائیں گی تو آپ سمجھ لیجئے گا کہ آپ کے سفرِ آخرت کا وقت آپہونچا ہے پس آپ تسبیح و تحمید میں مشغول ہوں کیونکہ آپ ہمارے پاس آنے والے ہیں۔

اربابِ تحقیق (صوفیائے کرام) فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ اپنے عمل اور اپنی جدوجہد سے اخلاقِ ذمیمہ کا قلع قمع کر دے گا۔ اور جب وہ اس سلسلہ میں جدوجہد کرتا ہے اور اپنی تمام قوتوں کو اس راہ میں صرف کر دیتا ہے اور اس میں کامیاب نہیں ہوتا تو ناامید ہو جاتا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے (میرے بندہ بغور سُن) یہ تو وہ طریق کار ہے جو عالمِ اسباب میں ہم نے متعین و مقرر فرما دیا ہے۔ یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کو ہماری راہ میں خرچ کرو (برے کاموں سے بچنے کی جدوجہد کرو) اس کے بعد ہم کرم فرمائیں گے۔ اس راہِ بے پایاں میں ہمارا لطف و کرم تیری دستگیری فرمائے گا۔ لیکن ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ ان ہی کمزور ہاتھوں اور پاؤں سے اس راہ کو طے کر۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ ان کمزور دست و پا سے تم اس راستہ کو طے نہیں کر سکتے اور یہی نہیں ایک لاکھ سال کی مدت میں بھی اس کی ایک منزل تک تمہاری رسائی نہ ہوگی۔ اس راستہ کو طے کرنے میں تیری کیفیت ایسی ہو جائے گی کہ تو تھک کر کسی جگہ گر پڑے گا اور تیرے اندر اٹھنے اور دوبارہ سفر کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہے گی! اس وقت رحمتِ خداوندی تیری مدد و معاون بن جائے گی۔ اور اس کو مثال سے اس طرح سمجھو جس طرح بچہ جب تک شیرخوار رہتا ہے ماں اس کو گود میں اٹھائے پھرتی ہے لیکن جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو گود میں نہیں لیا جاتا اور اس کو خود بخود چلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اب جب کہ تیری قوت ختم ہو گئی (تو بے بس ہو گیا) لیکن جب تک تیرے جسم میں قوت رہی تو مصروف جدوجہد رہا۔ اس عرصہ میں کبھی خواب اور کبھی بیداری

کے عالم میں تجھ پر ہم لطف و کرم فرماتے رہے تاکہ اس کے بہانے تو ہماری طلب میں جد و جہد کرتا رہے اور ہماری رحمتوں کا امید وار رہے۔ اب جب کہ تیرے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور تیرے لئے جد و جہد ممکن نہیں رہی تو ہماری بے پایاں بخششوں اور عنایتوں کو اپنے شامل حال پائے گا۔ جب تم اپنی ذات کو درمیان سے علیحدہ کر دو گے اور اپنے ہاتھ اور پیروں میں بغیر ہماری قدرت کے قوت نہ پاؤ گے تو ایسے وقت میں ہماری عنائیتیں اور رحمتیں تمہاری دستگیری کریں گی۔ اور اس وقت تم دیکھو گے کہ ہماری بے پایاں عنائیتیں فوج در فوج آکر تمہاری مدد و معاون ہوتی ہیں جبکہ طاقت و قوت کے دور میں ہزار کوشش کے باوجود اس کا ذرّہ بھی تم نہ پا سکتے تھے۔ اب تم ہماری تسبیح و تقدیس کرو اور ہم سے مغفرت طلب کرو۔" فسبح بحمد ربك واستغفره۔" اور اس خیال کو دل سے نکال دو کہ یہ سارے کام تمہارے ہاتھ پیر ملانے کا نتیجہ تھے اور اس میں ہماری قدرت کا دخل نہ تھا۔ اب جب کہ تمہیں اس کا احساس ہو گیا کہ یہ ہماری توفیق کا نتیجہ تھے تو ہم سے مغفرت طلب کرو کہ ہماری شان" انه کان توّابا" ہے (بیشک خداوند تعالےٰ توبہ قبول کرنیوالا ہے)

دوستی کا معیار

سلاؔ انؔ نے فرمایا کہ ہم امیر کو اس کے جاہ و منصب اس کے علم و عمل کی وجہ سے دوست نہیں رکھتے۔ دوسرے لوگ امیر کو اس لئے دوست رکھتے ہیں کہ وہ اس کی شکل کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کی پشت کو دیکھتے ہیں (امیر کو اس کی امارت اور جاہ و منصب کی وجہ سے دوست رکھتے ہیں) امیر کی حیثیت آئینہ کی ہے اور امیر کی صفات قیمتی موتیوں کی طرح سے ہیں جن سے اس آئینہ کی پشت مزیّن کی گئی ہے جو زر و جواہر کے شوقین ہیں وہ آئینہ کی پشت کو دیکھتے ہیں لیکن جو آئینہ کے طلب گار ہیں اُن کی نظر زر و جواہر پر نہیں جاتی وہ آئینہ کو اس کی صفائی اور شفافی کی وجہ سے چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس آئینہ میں جمال خوبی کا نظارہ کرتے ہیں اور اُن کو آئینہ کے دیدار سے ملال نہیں ہوتا (کہ اپنا جمال اُن کو اس آئینہ میں نظر آرہا ہے) لیکن جو چہرے کو زشت رکھتا ہے اس کو آئینہ میں بجائے جمال خوبی کے وہ زشتی نظر آتی ہے لہذا وہ فوراً آئینہ کا رُخ بدل دیتا ہے اور پشت آئینہ میں جو زر و جواہر لگے ہیں ان کے نظارے اور ان کی طلب میں محو ہو جاتا ہے۔ آپ آئینہ کی پشت پر ہزاروں نقش و نگار بنائیں یا اس میں مرصع کاری کریں روئے آئینہ میں (آئینہ کی صفائی) اس سے کچھ خلل نہیں پڑتا اور نہ اس میں کچھ نقصان ہے۔ اس طرح حق تعالیٰ نے حیوانیت اور انسانیت

دونوں کو مجتمع کر دیا ہے تاکہ دونوں کا اظہار ہو سکے (جو طالب صفا ہیں وہ صفا کو دیکھیں اور جو طالب جواہر ہیں وہ جواہر کو دیکھیں)" یضد ھا تتبین الاشیاء" اشیاء کی اصل حیثیت ان کی مخالف چیزوں سے ظاہر ہوتی ہے اس کلیہ کے مطابق جب کہ ہر چیز اس کی ضد سے پہچانی جاتی ہے اور حق کا کوئی ضد نہیں اس لئے اس نے فرمایا" کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعرف" میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا جب میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے کائنات کی تخلیق کی تاکہ عالم کی ظلمت میں انوار ظاہر ہوں اسی لئے اس نے انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کی تخلیق فرمائی" اخرج بصفاتی الی خلقی" میری صفات سے مزین ہو کر میری مخلوق میں آئیے یہ (انبیاء و اولیاء) مظہر نور ربانی ہیں۔ ان کی وجہ سے دوست دشمن سے اور اپنا غیر سے ممتاز ہو جائے معنوی اعتبار سے اس کا کیفیت کی کوئی ضد نہیں ہے لیکن صوری اعتبار سے فرق معلوم ہوتا ہے جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس جناب موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل کے مقابلہ میں معلوم ہوتا ہے اور ان کی مثل اور بہت سے واقعات جو رونما ہوئے پس اسی طرح (فرعون اور ابوجہل کی طرح) اولیاء اللہ کے مخالف پیدا ہوئے اور جس قدر وہ اس ضد اور دشمنی کا اظہار کرنے لگے شہرت پاتے گئے

اگرچہ معنوی طور پر اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے لیکن بظاہر مخالفین دشمنی اور ضد کا اظہار کرتے ہیں ان کے مناصب اور بلند ہوتے ہیں اور شہرت ان کے قدم چومتی ہے۔

" یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون ○ (سورۃ الصف)	ان کافروں کی خواہش یہ ہے کہ وہ اللہ کے نور کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نور کو اتمام تک پہنچانے والا ہے اگرچہ کافروں کو بہت شاق ہے۔
مہ نور می فشاند و سگ بانگ میکند	مہ را چہ جرم خاصیت سگ چنیں بود

ماہتاب نور افشانی کرتا ہے اور کتا بھونکتا ہے۔ اس میں بھلا چاند کا کیا قصور ہے کیونکہ کتے کی تو فطرت ہی بھونکنا ہے۔

از ماہ نور گیرند ارکانِ آسمان	خود کیست آں سگے کہ بجا از زمین بود

آسمان کے ستارے مہتاب سے نور حاصل کرتے ہیں اس کتے کی کیا حیثیت کہ زمین کا بخار بھی بن سکے۔

آزمائش کے انداز

دنیا میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کو جاہ و نعم سے آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے اور ان کی جان اس سے گریزاں رہتی ہے ملک عرب میں ایک فقیر نے ایک امیر کو سواری پر دیکھا جس کے بشرہ اور پیشانی سے انبیاء اور اولیاء کا نور موجزن تھا یہ دیکھ کر اس فقیر نے کہا " سبحان اللہ من یعذب لعباد بالنعم

فصل

روح قرآن اسکے معانی ہیں

بعض احباب نے مولاناؒ سے عرض کیا کیا فلاں قاری قرآن کی صحیح تلاوت کرتا ہے ؟ مولاناؒ نے فرمایا کہ وہ قرآن کے الفاظ تو درست پڑھتا ہے لیکن اس کے معنی اسے بے خبر ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ جس طرح دوسروں کو پڑھتے دیکھتا ہے اسی طرح وہ بھی پڑھتا ہے گویا وہ اندھے پن کے ساتھ پڑھتا ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کے ہاتھ میں مٹھائی ہے لیکن اس کے پاس اس سے بہتر مٹھائی لائی گئی تو اس نے اس کو واپس کر دیا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مٹھائی کی شناخت نہیں کھتا. کسی نے اس کو یہ بتایا تھا کہ یہ مٹھائی ہے پس اس نے اس مٹھائی کو مٹھی میں دبا رکھا ہے مزید اس کو اس مثال سے سمجھیں کہ بچے اخروٹ سے کھیلتے ہیں اگر انہیں اخروٹ کی گری نکال کر دی جائے (کہ لو اس سے کھیلو) تو وہ اس کو قبول نہیں کریں گے۔ اور کہیں گے اخروٹ تو وہ ہے جس کے اندر سے کھٹ کھٹ کی آواز آئے اور اس میں سے کھٹ کھٹ کی آواز نہیں آتی (یہ اخروٹ نہیں ہے۔) خدا کے خزانے بعید اور وسیع ہیں ۔ اسی طرح علم الٰہی کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔

اگر آدمی خود قرآن کو سمجھ کر پڑھے تو دوسرے کے پڑھنے کو کیوں رد کرے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک قاری سے دریافت کیا کہ تم نے قرآن کریم کی اس آیت کی جانب توجہ کی ہے ۔ کہ

قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی (سورۃ کہف ع ۱۲)

اے پیارے نبیؐ آپ ان لوگوں سے فرما دیں کہ اگر سارا سمندر روشنائی بن جائے اور اس سے رب کریم کی تعریف توصیف لکھی جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا لیکن کلمات ربانی باقی رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پچاس درہم وزن کی روشنائی سے قرآن کریم کو لکھ لیا جاتا ہے تو

اس نکتے کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ قرآن مجید جو تمہارے ہاتھ میں ہے علم الٰہی کا رمز و اشارہ ہے تمام تر علوم الٰہیہ کا مجموعہ اور تفصیل نہیں ہے، اللہ کے کلمات بے شمار ہیں۔) مثال سے اس طرح سمجھ لو کہ عطار اگر کسی کو تھوڑی سی دوا پڑیا میں باندھ کر دے دیتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ساری دکان دے دی ہے ایسا خیال کرنا محض حماقت ہے اور اس بات کو اس انداز میں سمجھو کہ انبیائے سابقین کے پاس کتب الٰہی آئیں جناب موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر کلام الٰہی نازل ہوا لیکن وہ زبان عربی میں نہ تھا۔ یہ بات میں ان قاری صاحب کو سمجھاتا رہا لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا تو میں نے افہام و تفہیم کو ترک کر دیا۔

صحابہ اور حفظ قرآن

منقول ہے کہ صحابۂ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اگر بعض صحابی پوری سورت یا نصف سورت یاد کر لیتے تھے تو ان کی شان ارفع و اعلیٰ ہو جاتی تھی اور یہ کہا جاتا تاکہ یہ وہ صاحب ہیں جو ایک سورۃ کے حافظ ہیں۔ بات یہ تھی کہ یہ حضرات قرآن کی حقیقت اور آیت کی روح کو سمجھتے تھے۔ دیکھو! ایک من یا دو من روٹی کا کھانا کمال کی بات ہے اور منہ میں رکھ لینا اور چبانا اور چبا کر اگل دینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے اس طرح تو ہزار من روٹیاں ختم کی جا سکتی ہیں۔ اسی لیئے کہا جاتا ہے :-

رُبَّ تالی القرآن والقرآن یلعنہ۔ افسوس ہے قرآن کریم کی اس انداز میں تلاوت کرنے والے پر جس پر قرآن لعنت کرتا ہے۔ اور یہ بات اس شخص کے بارے میں ہے جو تلاوت تو کرتا ہے لیکن اس کے معانی نہیں سمجھتا۔ بایں ہمہ عدم فہم قرآن کی تلاوت ایک عمل خیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ اس دنیا کی تعمیر میں مشغول ہو جائیں کیوں کہ اگر ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے نہ پڑے ہوں تو اس عالم اسباب میں کوئی آبادی نہ ہو۔ غفلت ہی تو دنیا کی آبادکاری اور آسائش کا سامان فراہم کرتی ہے، یوں سمجھو کہ یہ غفلت و نادانی ہی تو بچّے کی نشو و نما کا سبب بنتی ہے اور جب وہ صاحب عقل و شعور ہو جاتا ہے تو جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے۔ لہٰذا تعمیر و ترقی کا سبب غفلت ہے اور اس کی ویرانی لذات اور دنیاوی خواہشات کے ترک کا سبب ہوشیاری اور دانائی ہے۔ سنو! میری یہ بات دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو میں ایسا حسد کی بنا پر کہتا ہوں یا شفقت کے

سبب سے کہتا ہوں۔ حاشا وکلّا، میری گفتگو حسد کی بنا پر نہیں ہے۔ حسد تو بڑی ارذال ہے۔ پس میں اس ارذال شے کو کیوں اختیار کروں۔ میرا یہ سب کچھ کہنا بربنائے مہر و شفقت ہے اس لئے میری خواہش یہ ہے کہ میں اسی محبت اور شفقت سے اپنے عزیز کو حقیقت کی جانب راغب کروں تاکہ وہ آئندہ قرآن کریم کو غفلت سے نہ پڑھے۔

دُوسروں کی بات پر کان نہ دھرو

منقول ہے کہ ایک شخص حج کے ارادے سے گھر سے نکلا اور ایک جنگل میں جا پہونچا۔ پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ اسے دُور سے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ اُفتاں وخیزاں وہاں پہونچا تو وہاں ایک عورت کو موجود پایا۔ اس شخص نے آواز دے کر اسے بلایا اور اپنی بپتا سُنائی اور پیاس بجھانے کے لئے پانی مانگا۔ وہ عورت جو پانی لائی وہ بہت زیادہ گرم اور کھاری تھا جب اس مسافر نے اس کا ایک گھونٹ لیا تو وہ اس کے لبوں سے سینے تک چیرتا چلا گیا لیکن اس مسافر نے اپنی میزبان عورت پر غصہ کرنے کے بجائے مشفقانہ لہجے میں نصیحت کی اور کہا کہ تمہارا مجھ پر حق ہے کہ تم نے مجھے آرام پہونچایا۔ تمہارے اس حق کے باعث میری شفقتوں میں جوش آگیا ہے اور جو کچھ میں کہوں اس پر توجہ کرو! اس جگہ سے جہاں تم مقیم ہو کوفہ، بغداد اور واسط کے شہر قریب ہیں۔ یہاں تم جس طرح زندگی گزار رہی ہو وہ بہت سخت ہے۔ لہٰذا تم کسی نہ کسی طرح ان جگہوں پر پہونچ جاؤ جہاں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی افراط ہے قسم قسم کے لذیذ کھانے اور بہت سے حمام اور بیشمار نعمتیں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ اس مسافر نے اس عورت کو شہروں کی آسائش سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔

کچھ دیر کے بعد اس عورت کا شوہر بھی آگیا جو جنگلی چوہے شکار کرکے لایا تھا۔ اس نے شکار اپنی بیوی کو دیکر کہا کہ ان کو بھون لو اور اس میں سے اس مہمان کو بھی کچھ کھلاؤ۔ مصیبت زدہ اور بھوکے مہمان نے کسمپرسی کے عالم میں اس شکار کو زہر مار کرکے پیٹ کی آگ بجھائی، اس کے بعد آدھی رات کو خیمہ کے باہر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تو اس نے سُنا کہ عورت اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی کہ تم نے کچھ سنا کہ اس مہمان نے شہروں کی کیسی تعریف کی ہے، پھر اس نے شوہر کو وہ تمام باتیں جو مہمان نے کی تھیں سب کی سب سنائیں تو شوہر نے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر کہا۔ "خبردار، اس قسم کی باتوں پر توجہ نہ دینا، اسلئے دنیا میں حاسد بہت ہیں۔"

لوگ جب کسی کو امن و آسائش سے زندگی بسر کرتے دیکھتے ہیں تو اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور اس کے آرام و سکون میں خلل ڈالنے لگتے ہیں۔

اس واقعہ کو سنا کر مولاناؒ نے فرمایا کہ اس مخلوق میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو نصیحت کی بات کو حسد پر محمول کرتے ہیں مگر ایسی باتوں کو وہی سمجھتا ہے اور اس سے استفادہ کرتا ہے جس میں اصل حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو یا اس پر اصل آشکارا ہوتی ہو اور ایسا شخص وہ ہوتا ہے جس پر روزِ الست حقیقت کا ایک قطرہ ٹپکا تھا اور یہی قطرہ اس کو دریائے حقیقت تک پہنچا دیتا ہے اور مشکلات و مصائب سے نجات دلا دیتا ہے۔ ایکی مستقل صدا یہ ہے کہ آؤ! ہم کب تک بیگانہ اور دور رہو گے اور وہم و تشویش کا شکار رہو گے؟ لیکن ایسے لوگوں کی کیا بات سنائی جائے جنھوں نے نہ تو اپنے شیخ سے اور نہ کسی صاحبِ دل سے کوئی ایسی بات سنی ہو جس کو ان باتوں کی ہوا نہ لگی ہو وہ تو قطعاً ان باتوں کو قبول نہیں کرے گا۔

چوں اندر نہادش بزرگی نبود | نیارد حدیثِ بزرگاں شنود

"جب اس کی فطرت میں یہ بزرگی تھی ہی نہیں تو وہ بزرگوں کی باتوں پر کان نہیں لگا سکا"۔

ظاہر سے باطنی معنی کی جانب توجہ!

معنی کی طرف توجہ اگرچہ ابتداء میں شاق اور گراں معلوم ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے مدارج طے ہوتے ہیں معانی کی حلاوت سے حصہ ملنے لگتا ہے لیکن صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ جتنی زیادہ سامنے رہے گی، جذبات میں کمی اور جمود کی کیفیت پیدا ہوتی رہے گی۔ اس سے یہ تصور کرو کہ کہاں الفاظِ قرآنی اور کہاں معنی و مفاہیم قرآنی۔ انسان کو دیکھو کہاں اس کی ظاہری حیثیت اور کہاں اس کی حقیقت ——— اگر آدمی کی صورت سے اس کی معنویت و حقیقت نکل جائے تو ایک لمحہ کیلئے بھی اس کو گھر میں نہ رہنے دیا جائے۔

ایک حکایت

مولانا شمس الدینؒ نے فرمایا کہ ایک عظیم قافلہ مصروفِ سفر تھا لیکن راستہ میں نہ تو کوئی آبادی نظر آئی نہ کہیں پانی دستیاب ہوا۔ راستہ میں اچانک

ایک کنواں ملا، ڈول رسّی باندھ کر اسے کنویں میں ڈال دیا اور جب اس کو کھینچا تو ڈول ندارد۔!
دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ رسی میں کسی انسان کو باندھ کر کنویں میں اتارا جائے جو اصل بات کو جاکر معلوم کرے لیکن جب اس آدمی کو اتارا تو وہ بھی لوٹ کر نہ آیا۔ اس طرح کئی انسان کنویں میں پہونچ کر واپس نہ آئے تو اس قافلہ کے ایک دانا فرد نے کہا کہ اس مرتبہ مجھے اس کنویں میں اتارو۔ چنانچہ اس کے اصرار پر اس کو کنویں میں اتار دیا گیا۔ جب وہ سطح آب پر آیا تو اس کے سامنے ایک سیاہ مہیب شکل (جس کو اصطلاح میں چڑیل کہتے ہیں) ظاہر ہوئی۔ اس کو دیکھ کر اس دانا کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کے چنگل سے رہائی مشکل ہے اب عقلمندی ہی اس کے پنجہ سے نجات دلا سکتی ہے۔ لہٰذا عقل و شعور ہی پر بھروسہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے خود پر قابو پاکر چڑیل سے گفتگو شروع کردی تو اس چڑیل نے کہا کہ گفتگو کو طویل نہ کرو۔ تم اس وقت تک رہائی حاصل نہیں کرسکتے جب تک میرے سوال کا درست جواب نہ دیدو۔ عاقل نے کہا کہ تمہارا کیا سوال ہے بتاؤ؟ چڑیل نے کہا دنیا میں سب سے بہتر جگہ کونسی ہے؟۔ عاقل نے سوچا اگر مصر و بغداد کا تذکرہ کرتا ہوں تو ممکن ہے اس کو میرا جواب پسند نہ آئے اور مجھے اس پر مطعون کرکے اس کو غلط کہدے لہٰذا بہتر یہ کہ ایسا جواب دیا جائے جو مسکت ہو، کہنے لگا میرے نزدیک وہ جگہ سب سے بہتر ہے جہاں کوئی مونس و ہمدرد موجود ہو، خواہ وہ خطۂ زمین پر ہو یا کنویں کی تہہ میں وہی جگہ بہتر ہے۔ اور اگر کوئی مونس چوہے کے بل میں بھی ہو تو وہی جگہ بہتر ہے۔ چڑیل نے اس جواب کو سن کر کہا۔ آفریں، صد آفریں! تونے اپنے جواب سے اپنے لئے رہائی کا جواز پیدا کرلیا۔ دنیا میں تو ہی صاحب عقل و شعور ہے۔ تیرے لئے بھی رہائی ہے اور تیری وجہ سے میں تیرے دوسرے ساتھیوں کو بھی آزاد کرتی ہوں اور اب میرا وعدہ یہ ہے کہ آئندہ کسی کا خون نہیں کروں گی اور میرے ہاتھوں کسی کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہوگا۔ سب کو میں نے تیرے محبت بھرے الفاظ کی وجہ سے بخشدیا اس کے بعد اس نے تمام قافلہ والوں کے لئے پانی مہیا کردیا۔

اس واقعہ کو سنانے کی غرض معنویت ہے واضح ہی مفہوم کو مختلف انداز میں ادا کیا جاسکتا ہے

لیکن ظاہر پرست اور دوسروں کی تقلید کرنے والے تو بس ایک ہی بات کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان سے بات کرنی مشکل ہے۔ اب اگر اسی بات کو کسی دوسرے پیرایہ میں سمجھاؤ تو نہیں سمجھیں گے۔

فصل

حقیقت کا اظہار ظاہری لباس سے نہیں ہوتا

مولاناؒ نے فرمایا کہ تاج الدین قباعیؒ کا کہنا ہے کہ عقلمند اور دانشور ہمارے معتقدات کو خراب کرتے ہیں۔ مولاناؒ نے اکے جواب میں فرمایا حاشا وکلّا ایسا نہیں ہے کہ وہ ہم میں سے ہوں۔ اگر زریں پٹہ کسی کتّے کے گلے میں ڈال دیا جائے تو وہ شکاری کتا نہیں بن جاتا۔ شکاری ہونا تو اس کی باطنی صفت ہے خواہ اس کے گلہ میں زریں پٹہ ہو یا رسّی کا پھندا ہو۔ پس صرف جبّہ و دستار سے عالم نہیں بن سکتا۔ علم تو اس کی باطنی و ذاتی صفت ہے۔ وہ علم جبّہ اور دستار میں ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

خود سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ظاہری میں منافقین دین میں رہزنی کیا کرتے تھے۔ نماز کا چولہ پہنتے تاکہ مسلمان نمازیوں کو راہِ حق سے بھٹکائیں اور انہیں سستی کی تلقین کریں۔ ایسا کرنا ان کے لئے اس وقت تک ممکن نہ تھا۔ جب تک وہ خود کو مسلمانوں جیسا ظاہر نہ کریں۔ ورنہ اگر انہیں یہودی یا نصرانی طعنے دیتے تو ہرگز ہرگز اس کی پرواہ نہ کرتے۔

فویل للمصلّین الّذین ھُم عن صلاتھم ساھون ۝ الّذین ھم یراءُون ۝ و یمنعون الماعُون ۝

بُرا ٹھکانہ ہے ان نمازیوں کا جو اپنے نماز میں سستی کرتے ہیں اور وہ جو ریاکاری کرتے ہیں اور وہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں بخل کرتے ہیں۔

ساری بات یہ ہے کہ تم نور رکھتے ہو لیکن تمہارے پاس آدمیت (انسانیت) نہیں ہے۔ آدمیت مانگو کیونکہ یہی اصل مقصود ہے۔ باقی تو بات کو محض طول دینا ہے۔ گفتگو میں جب لفاظی اور حاشیہ آرائی شامل ہو جاتی ہے تو مقصد ختم ہو جاتا ہے۔

مقصود اور اندازِ گفتگو

ایک دوکاندار ایک عورت سے محبت کرتا تھا۔ اور اُس خاتون کی ملازمہ کو اس نے اپنا پیامی بنا رکھا تھا۔ اس کی زبانی اپنی عاشقی کی داستان کہلواتا تھا کہ میں تیرا ایسا دالہ و شیدا ہوں۔ تیرے عشق کی آگ میں سلگتا رہتا ہوں، مجھے نہ دن کو چین ہے اور نہ رات کو آرام ہے۔ تیری محبت میں کل کا دن اس طرح گزرا اور کل رات میری یہ حالت رہی۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں اس کنیز کے ذریعہ کہلواتا رہتا تھا۔ ایک دن کنیز نے اپنی مالک

سے اگر اس عاشق کی داستانِ عشق کی بجائے صرف اتنا کہا کہ فلاں ڈوکاندار نے تمہیں سلام کہا ہے اور یہ درخواست کی ہے کہ تم میرے پاس آجاؤ تاکہ میں تمہارے ساتھ یہ کروں اور وہ کروں۔ عاشق کا پیغام سُن کر محبوبہ نے یہ کہا کہ ایسا عظیم پیغام کیا اس نے اتنی سرد مہری اور اختصار کے ساتھ دیا ہے؟ کنیز نے کہا کہ باتیں تو اس نے بڑی لمبی چوڑی کی تھیں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے لیکن اس پوری گفتگو میں مطلب کی بات بس یہی تھی پس سمجھ لو کہ اصل مقصود اتنا ہے اور باقی دردِ سر کے سوا کچھ نہیں (بیکار ہے)۔

فصل

بیوی کے ساتھ معاشرت کا طریقہ

حضرت مولانا نے (ایک مقرب شخص سے) فرمایا کہ تم خود تو دن رات جھگڑتے رہتے ہو اور اپنی بیوی کو مہذب اور اخلاق سے آراستہ دیکھنا چاہتے ہو گویا عورت کو نجاست سمجھ کر خود سے دور رکھنا بھی چاہتے ہو (عورت سے بے تعلق رہنا چاہتے ہو) اور اپنے آپ کو اسی سے پاک کرنا چاہتے ہو حالانکہ بہتر یہ ہے کہ تم اپنی ذات اور اپنی شخصیت سے اس کو پاک کرو (تاکہ وہ تمہارے ذریعہ اور تم اس کے ذریعہ مہذب بن جاؤ) پس اپنی بیوی کے پاس جاؤ اور جو کچھ وہ کہے اس کو مان لو، خواہ اس کی بات کا قبول کرنا تم پر کتنا ہی گراں گزرے۔ تم غیرت و حمیت کو اس کے معاملہ میں بھول جاؤ۔ اگرچہ غیرت و حمیت مردوں کا شیوہ اور ان کا وصف ہے لیکن اس ایک اعلیٰ وصف کے باعث بہت سی بُری عادتیں تمہارے اندر پیدا ہو جائیں گی (یہاں تک کہ تم ترکِ دنیا تک کا تہیہ کر بیٹھو گے) اور اسی وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لَا رھبانیۃ فی الاسلام" یعنی اسلام میں ترکِ دنیا روا نہیں ہے (اسلام نے رہبانیت سے منع فرمایا ہے) رہبانوں کا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ خلوت نشین ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ اس سے الگ تھلگ رہتے ہیں شادی نہیں کرتے اس طرح وہ دنیا کو بالکل ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

ربُ العٰلمین نے معلمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نازک اور مخفی راستہ بتایا (اور وہ کیا ہے؟) وہ شادی کرنا ہے۔ تاکہ شادی کر کے بیوی کی زیادتیاں برداشت کریں ان کی

محال اور ناممکن العمل فرمائشوں کو سنیں اور ان کے پورا کرنے کے لیے تگ و دو کریں! اس طرح اپنے آپ کو مہذب بنائیں۔ "انک لعلیٰ خلق عظیم" اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ دوسروں کی زیادتیاں برداشت کرنا اور ناممکن باتوں کو گوارا کر لینا اپنی ذات سے گندگی اور ناپاکی کو دور کرنا ہے۔ اس طرح تمہارے اخلاق اس تحمل سے اچھے ہو جائیں گے ورنہ بیوی یا عورت اس زیادتی و تعدّی اور بے تعلقی کے باعث بدخلق بن جائے گی۔ جب تم نے اس حکمت اور اس نکتہ کو سمجھ لیا تو جاؤ خود کو پاک کرو اور بیویوں یا ان عورتوں کو تم اپنے اس کپڑے کی طرح سمجھو جس سے تم ناپاکیوں کو صاف کرتے ہو (ھنّ لباس لکم وانتم لباس لھن، وہ تمہارا لباس ہیں تم اُن کا لباس ہو)

اور اگر تم اپنے نفس کی گرفت سے باہر نہ آسکو تو اپنی عقل ہی سے مدد لو کہ ہمیں تو ایسا لگتا ہے، جیسے اس سے کوئی عہد نہ بندھا ہو وہ کوئی خراباتی معشوقہ ہے کہ جب مجھ پر شہوت غلبہ کرتی ہے تو اس کی جانب لپکتا ہوں تو جاؤ اسی طرح سہی اپنی حمیت و غیرت اور حسد کو اپنے آپ سے دفع کرو تاکہ تم کو مجاہدات تحمل و برداشت کی لذت محسوس ہونے لگے اور عورتوں کی محال باتوں سے تمہارے اندر مختلف احوال رونما ہونے لگیں، پھر اس کے بعد تم بغیر کسی خیال کے مزید تحمل و برداشت کے ساتھ اپنے اوپر افسوس کرنے لگو گے اور ضبط و جبر اختیار کر لو گے اور اپنا ہی مستقبل اور معیّن فائدہ اس میں دیکھو گے۔ (قرآن مجید میں جو آیت ہے کہ ھنّ لباس لکم وانتم لباس لھن، اس میں یہی نکتہ مخفی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کی محبّت و مودّت پاکی و پاکیزگی مہیا کرنے کیلئے پیدا کیا گیا ہے)

عیب پوشی کی تعلیم

منقول ہے کہ ایک مرتبہ سیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ سے واپس تشریف لا رہے تھے جب شہر پناہ کے قریب پہونچے تو حکم فرمایا کہ طبل بجاؤ کہ آج قیام شہر سے باہر ہوگا۔ اور ہم سب آبادی میں صبح داخل ہونگے۔ بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس میں کیا مصلحت ہے۔ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھروں میں ناگہاں داخلے پر امکان یہ ہے کہ تمہاری خواتین دوسرے مردوں کے پاس بیٹھی ہوں، انھیں غیروں کے پاس بیٹھا دیکھ کر تمہیں رنج ہو اور ممکن ہے کہ فتنہ بھی اٹھ کھڑا ہو۔ ان میں ایک صاحب ایسے تھے جنھوں نے تعمیل ارشاد نہ کی اور شہر میں داخل ہو گئے، جب گھر پہونچے تو بیوی

کو ایک غیر مرد کے پاس بیٹھا دیکھا معلم انسانیت ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار تو یہ تھا کہ غیرت وحمیت پر چوٹ پڑنے سے بچنے کے لئے تکلیف اٹھائی جائے۔ عورت کے لئے کفاف روٹی کپڑا لباس اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے محنت و مشقت برداشت کرنی چاہیئے تاکہ ان مشقتوں کو برداشت کر کے عالم محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برکات سے بہرہ اندوز ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طرز عمل شہوت کو مارنا اور خلوت نشینی ہے۔ اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار مردوں اور عورتوں کے غصہ اور ان کی زیادتیوں کو برداشت کرنا ہے اگر طریق محمدی پر گامزن نہیں ہو سکتے تو حضرت عیسیٰ ؑ کے راستہ کو اختیار کر لو تاکہ محرومی کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اگر تمہارے اندر صبر و ضبط و تحمل کی یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ تم سو طمانچے برداشت کر سکو اور اس تحمل و برداشت کے اثرات کو گوارا کر سکو یا تم غیب کے معتقد ہو جیسا کہ انبیاء علیہم السلام نے فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ایسے پیش آنے والے معاملات پر صبر سے کام لو تاکہ صبر و ضبط و تحمل کے اجر کے بارے میں جو کچھ ان نفوس قدسیہ نے فرمایا ہے اس سے تم بہرہ ور ہو سکو اس کے بعد دیکھو گے کہ ان اچھائیوں میں اور انکے نتیجے میں تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کرنے سے اگر اس وقت کچھ حاصل نہیں ہو رہا تو آخر کار ان خزانوں تک تمہاری رسائی ہوگی اور اپنی توقعات سے زیادہ اجر و جزا حاصل کرو گے۔

اگرچہ یہ بات اس وقت دل پر اثر نہیں کرتی اور قلب اثر پذیر نہیں ہوتا لیکن جب پختہ کار ہو جاؤ گے تو اس کا بہت اثر تم پر ظاہر ہو گا۔

عورت کیا ہے؟ اور دنیا کیسی ہے؟ تم اگر ان کے بارے میں کچھ کہو یا نہ کہو وہ تو ویسی ہیں جیسی کہ ہیں! وہ اپنا کام خود بخود کرتی ہیں بلکہ کہنے سے تو کچھ اور بھی بدتر ہو جاتی ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک روٹی کو بغل میں دبا کر تم کہو کہ اس کو میں کسی کو نہیں دوں گا اور دینا کیا معنی کسی کو دکھاؤں گا بھی نہیں۔ اگرچہ دروازوں پر بہت سی روٹیاں پڑی ہوں جن پر کتے بھی منہ نہ ڈالیں ان پر کوئی توجہ نہیں دیگا لیکن جس کے بارے میں منع کیا ہے لوگ اس کی فکر میں لگ جائیں گے اور ہر امکانی کوشش کریں گے کہ اس کو حاصل کر لیں۔ اگرچہ اس روٹی کو تم سال بھر تک بغل میں چھپائے پھرو لوگ اس کے حصول کے لئے سال بھر کوشاں رہیں گے۔ اور ان کی رغبت حصول اور فزوں تر ہو جائے گی۔

مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ "الناس حریص علے ما منع" انسان اس چیز کا

حریص ہے جس سے اس کو رُوکا جائے۔

عورت کی فطرت

تم عورت کو پردہ پوشی کا جتنا حکم دو گے اتنا ہی وہ خود نمائی کی کوشش کرے گی۔ عورت کی پردہ پوشی لوگوں کی مزید توجہ کا سبب بنتی ہے اس طرح تم بیٹھے رہ کر دُو طرفہ رغبت کے مواقع فراہم کررہے ہو اور یہ سمجھتے ہو کہ میں اصلاح کر رہا ہوں اور یہی عین فساد ہے اگر اس عورت میں اچھائی کا جوہر ہے تو اس کو تم منع کرو یا نہ کرو وہ اپنی نیک سرشت کے مطابق عمل کرے گی۔ لہٰذا تم مطمئن ہو کر دیکھتے رہو لیکن اگر اس عورت میں اچھائی کی خو نہیں ہے تو وہ اپنے چلن کو ترک نہیں کرے گی۔

بصارت و بصیرت کا فرق

بہت سے لوگ یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ ہم نے خواجہ شمس الدین تبریزی رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے جناب والا! ہم نے انہیں دیکھا ہے۔ اے عزیز! تم نے انہیں کیسے دیکھ لیا ایک شخص بالاخانہ پر اونٹ کو تو دیکھ نہیں سکتا مگر یہ کہتا ہے کہ میں نے سُوئی کے ناکہ کو دیکھ کر اس میں تاگہ پرو دیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ مجھے دُو چیزوں پر ہنسی آتی ہے (۱) حبشی اپنی انگلیوں کے پوروں کو سیاہ کرے یا نابینا کھڑکی سے سر نکال کر کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش کرے۔ یہ ایسے ہیں جن کے باطن اندھے ہیں اور یہ اندھے قالب کے دریچہ سے باہر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کیا دیکھ سکتے ہیں اور ایسے دیکھنے والوں کی تعریف و تنقیص سے کیا حاصل ہے؟۔ عقلمند کے نزدیک دُونوں برابر ہیں۔ پہلے بصیرت و بصارت حاصل کرنی چاہیئے اس کے بعد دیکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب بصارت حاصل ہو جائے تو بھی کیا دیکھ سکتے ہو، جب تک اُن کو بانہ لو اس وقت تک کچھ نہیں دیکھ سکتے (اور یہ ان کی مرضی پر موقوف ہے کہ وہ خود کو دکھانا پسند کرتے ہیں یا نہیں)۔

عالمِ دُنیا اور اولیاء

اس دنیا میں کتنے ہی اولیاء صاحبان بصیرت اور واصل بحق ہیں۔ اُن کے علاوہ کچھ اور بھی بزرگ ہیں جنھیں مستورانِ حق کہا جاتا ہے اور یہ اولیاء تمنا اور آرزو کرتے ہیں کہ خداوندا ہمیں مستورانِ حق میں سے کسی کی زیارت کرادے کیونکہ ان کی خواہش اور رضامندی کے بغیر کوئی انہیں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر دیدۂ بینا رکھتا ہو تب بھی ان کو بغیر ان کی خواہش کے انہیں دیکھ سکتا۔ زنانِ بازاری کو بھی جب تک کوئی اُن کے پاس نہیں پہونچے گا۔

نہیں دیکھا جاسکتا۔ جب ان کا یہ عالم ہے تو مستورانِ حق کا کیا کہنا۔ ان کو بغیر ان کی مرضی کے دیکھنے کی تاب کس کو ہے۔ کون ان کو پہچان سکتا ہے اور یہ کام آسان نہیں۔ فرشتے بھی اس منزل پر اپنی عاجزی کا اعتراف کر چکے ہیں کہ

"نحن نسبح بحمدك ونقدس لك" (بقرع۴) ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔

ہم تو عشق کے متوالے اور رُوحانیت کے پرستار ہیں۔ ہم نورِ محض ہیں اور یہ جو حضرتِ انسان ہے یہ تو بکم پرور ذلیل اور سفّاک ہے۔

"یسفك الدماء" (بقرع۴) "یہ انسان خون بہائے گا"

حاصل کلام یہ کہ سب کچھ اس لیئے ہے کہ انسان ہر دم لرزاں ترساں رہے اور غور کرے کہ یہ رُوحانی فرشتے کہ جن کو نہ مال کی رغبت اور نہ جاہ سے تعلق نہ ان کے لئے کوئی پردہ وہ صرف نورِ محض اور ان کی غذا صرف جمالِ خداوندی، تصورِ ذاتِ الٰہی اور عشق اُن کا مشغلہ لہٰذا ایسے دور بیں اور تیز نظر رکھنے والے بھی اقرار و انکار کے بین بین رہے (اور خلافتِ انسانی کے سلسلہ میں کہہ اٹھے کہ یہ انسان تو دنیا میں خونریزی کریگا۔ بارِ الٰہا تو ان کو اپنا خلیفہ بنائے گا) تو جب ملائکہ کا یہ عالم تھا تو بیچارے انسان کی کیا ہستی؟۔ اس کو تو لرزاں و ترساں رہنا چاہیئے اور غور کرے کہ میں کیا ہوں اور میں مستورانِ حق کو کیا پہچان سکتا ہوں لیکن اگر کسی انسان کو نورِ شناسائی سے نوازا جائے تو وہ بارگاہِ الٰہی میں ہزار بار کلماتِ تشکر پیش کریگا کہ خداوندا یہ تیرا کرم ہے ورنہ میں کس لائق تھا کہ تو نے مستورانِ حق کی دید کے قابل بنا دیا)۔

مولانا نے فرمایا۔ اس مرتبہ تم شمس الدین تبریزیؒ کی باتوں سے بہت فیض حاصل کر گئے کیونکہ اعتقاد انسان کے وجود کی کشتی کا بادبان ہے جس کشتی میں بادبان لگے ہوتے ہیں اس کو ہوا دور دور تک لیجاتی ہے لیکن کشتی میں اگر اعتقاد کے بادبان نہ ہوں تو بات بیکار جاتی ہے۔ اگر عاشق و معشوق کے درمیان بے تکلفی ہو تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ یہ سارے تکلفات تو اغیار کے لیئے ہیں اور جو کچھ عشق کے علاوہ ہے وہ اس (عاشق) پر حرام ہے۔

اس بات کو میں نے نہایت اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کے بارے میں انتہائی کوشش کرنی چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیں کہ اس سے ندیاں اور نہریں نکال کر

دل کے حوض میں اس پانی کو ڈال دیں۔ لیکن اس سے قوم کو تکلیف ہوگی یا اس بات کے کہنے والے کو اذیت ہوگی اور وہ بہانہ بازی کرے گا اور اگر کوئی کہنے والا (مقرر) اپنی قوم یا سامعین کے قلوب سے ملال اور رنج کو دور نہ کر سکے تو وہ دو کوڑی کا بھی نہیں اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی عاشق اگر عاشق ہے تو وہ معشوق کے حسن پر کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتا نہ کوئی دوسرا شخص ہی کسی عاشق کے دل میں معشوق کے نقائص کی کوئی دلیل بٹھا سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں دلائل و براہین کا کام نہیں ہے۔ یہاں صرف عاشق و طالب ہونا ضروری ہے۔ اگر میں اشعار میں معشوق و محبوب کی بابت مبالغہ آرائی کروں تو اس کو مبالغہ نہیں کہیں گے۔ یہاں میں یوں کہوں گا کہ طالب و مرید نے معشوق کی صورت کے بیان میں اپنے معنی و مراد کو بیان کیا ہے ع اے نقش تو از ہزار معنی خوشتر "اے محبوب و مراد کہ تیری صورت ہزار معانی سے زیادہ حسین ہے۔" کیونکہ جو مرید بھی شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے وہ ان معانی کو ترک کر کے جن سے اس کو آگاہی تھی۔ اپنے شیخ کا محتاج بن جاتا ہے۔ (سوائے شیخ کی ذات کے معانی سے اس کو سروکار نہیں رہتا) اس موقع پر بہاؤالدین نے یہ سوال کیا کہ کیا وہ شیخ کی صورت کی وجہ سے معانی و اسرار کو چھوڑ دیتا ہے یا شیخ کے تعارف کی وجہ سے وہ اپنے حقائق و معانی سے دستبردار ہو جاتا ہے؟ فرمایا خود اپنے مفہوم و معنے سے، ورنہ دونوں شیخ بن جائیں گے بلکہ ہونا تو یہ چاہیئے کہ اپنے باطن میں نور پیدا کرے۔ تاکہ وسوسوں اور تشویش کی آتش سوزاں سے نجات حاصل کرے اور مامون و محفوظ ہو جائے جس شخص کے باطن میں ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے تو پھر دنیا کے احوال مثلاً مناصب امارت اور وزارت کی آرزو اور خواہش اس کے دل میں اگر تابندہ بھی ہوتی ہے، یہ خیالات آتے بھی ہیں تو برق تاباں کی طرح آن کی آن میں اس کے باطن سے گزر جاتے ہیں جس طرح دنیا والوں کے دل کی حالت ہے کہ عالم غیب کے احوال مثلاً خوف خدا، اولیاء اللہ کے دیدار کا شوق، جب اُن کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو آن کی آن میں بجلی کی طرح ان کے دل سے گزر جاتا ہے۔ لیکن جو اہل حق ہیں اور حق میں مستغرق ہیں وہ تو کلیتہً حق کے لئے ہیں۔ ان کے دل میں بھی ہوس پیدا ہوتی ہے لیکن وہ بالکل نامرد کی شہوت

کی طرح ہے کہ آن کی آن میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ان کے دل میں قرار نہیں پکڑتی اور اہل دنیا اہل عقبیٰ کے معاملہ میں اس کے بالکل برعکس ہیں (ان کے دل میں ہوس جگہ کر لیتی ہے اور قائم رہتی ہے)۔

فصل

مستغنی کسے کہتے ہیں؟

شرلعیف پاسدختہ نے یہ کہا ہے کہ:

آں منعم قدس کز جہاں مستغنی است | جان ہمہ اوست او زجان مستغنی است

وہ ذات باری عالم بالا کی نعمتیں عطا فرمانے والا جو جہان سے مستغنی ہے وہ سب کی جان تو ہے لیکن وہ خود جان سے بے نیاز ہے۔

ہر چیز کہ وہم تو بدو گشت محیط | او قبلۂ ما آنست و از آں مستغنی است

ہر وہ چیز جس کو تیرا وہم محیط ہو سکتا ہے (یعنی جو بات تیرے وہم میں آسکتی ہے) اس کا بھی قبلہ وہی ہے لیکن حق بے نیاز ہے کہ بے پروا اور مستغنی ہے۔ اس سے بھی؛

مذکورہ بالا اشعار نہایت لغو ہیں ان اشعار سے نہ تو بادشاہ کی مدح ہوتی ہے نہ اپنی تعریف۔ اے نادان تجھے اس سے کیا فیض حاصل ہوگا۔ جو تجھ سے بے پروا ہو جائے۔ دوستوں سے اس طرح خطاب نہیں کیا جاتا۔ بلکہ یہ طریقہ تو دشمنوں کا ہے کیونکہ وہ مخالفوں سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تم سے بری الذمہ اور بے پروا ہیں۔ اہل دل مسلمانوں کو دیکھو کہ حالت ذوق میں اس کا محبوب اس سے کہہ دے کہ وہ اس سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔

یہ بات ویسی ہی ہے جیسے ایک بھڑ بھونجا بھاڑ کے قریب بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا کہ مجھ بھڑ بھونجے سے بادشاہ بے نیاز ہے اور مجھ سے ہی نہیں بلکہ میرے تمام ہم پیشہ افراد سے مستغنی ہے۔ اس بھاڑ جھونکنے والے میں ذوق کا پہلو کہاں کہ بادشاہ اس سے بے نیازی کا اظہار کرے۔ بات تو جب ہو کہ تونی (بھاڑ والا یا حمامی) یہ کہہ رہا ہو کہ میں بھاڑ کے قریب بیٹھا تھا وہاں سے بادشاہ کا گزر ہوا میں نے اس کی ثنا و ستائش کی۔ وہ مجھے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ بلکہ اس کی

نظر النتفانۃ، اب بھی مجھ پر ہے۔ یوں کہا جائے تو اس بات سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح کہنے سے کہ بادشاہ بھاڑ والوں سے بے نیاز اور مستغنی ہے"۔ یہ قول نہ بادشاہ کی مدح و ثنا ہے اور نہ بھاڑ والے میں ہی اس سے ذوق و شوق پیدا ہو سکتا ہے۔

اے مردک (شریف شاعر) یہ جو تو نے کہا ہے کہ ہر چیز کہ دہم تو، بدرہ گشت محیط"۔ تو غور کر کہ تیرے وہم سے کیا ہو سکتا ہے اور وہ کس چیز کو محیط ہو سکتا ہے جب کہ حال یہ ہے کہ دوسرے لوگ تیرے حال سے اور تیرے وہم سے مستغنی و بے پرواہیں۔ اگر تو دوسرے لوگوں ہی سے یہ بات کہے کہ تم لوگ مجھ سے مستغنی و بے پرواہو تو یہ دنیا والے ہی تجھ سے رنجیدہ اور ملول ہو جائیں گے اور تجھ سے قطع تعلق کر لیں گے۔ تو پھر خداوند تعالیٰ اس وہم سے مستغنی کیوں نہ ہوگا۔ خود نص قرآنی میں یہ اَستغنا کافروں کے لئے آیا ہے" اللہ تعالےٰ کافروں سے مستغنی ہے"۔ خدا نہ کرے کہ یہ خطاب مسلمانوں کے لئے ہو۔ اے نادان! اللہ تعالیٰ کا یہ استغنا تو ثابت ہے ہاں تجھے اگر ایسا حال میسر آجائے کہ تو کسی قابل ہو جائے (معرفت و طریقت میں تو کسی مرتبہ پر پہونچ جائے) تو ہو سکتا ہے کہ تیرے مرتبہ اور عزت کے بقدر وہ تجھ سے مستغنی نہ ہو (یہ اور بات ہے کہ باری تعالیٰ کا تجھے عزیز رکھنا تیرے حال کے مطابق اور تیرے مرتبۂ طریقت کے بقدر ہوگا۔ بس اسی کے بقدر وہ تجھ سے مستغنی نہ ہوگا ورنہ وہ سارے عالم سے بے نیاز ہے (ان اللہ غنی عن العالمین)

اوّل دید بعدہٗ گفت و شنید

کسی نے کہا "میر محلہ" کہتا ہے کہ اول دید ہے۔ اس کے بعد گفت و شنید کا مرتبہ اور منزل ہے کہ بادشاہ کا دیدار تمام لوگ کرتے ہیں لیکن ان میں خاص وہ ہے جسے بادشاہ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو سکے۔ یعنی دیدار عام ہے اور کلام خاص یہ سُن کر مولاناؒ نے فرمایا کہ اس نے بالکل الٹی بات کہی۔ غور کرو موسیٰ علیہ السلام گفت و شنید کے باوصف دیدار کے طالب تھے۔ پس کلام تو موسیٰ علیہ السلام کیلئے تھا اور مقام دیدار سرور کونین صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص تھا پس "میر محلہ" کا مذکورہ قول کس طرح درست ہو سکتا ہے؟۔

وجود باری محتاج دلیل نہیں

مولانا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے سلطان المحبوبین مولانا شمس الدین تبریزی کے سامنے کہا کہ میں نے دلیل قاطع سے وجود باری کو ثابت کر دیا ہے۔ دوسرے دن مولانا شمس الدین نے فرمایا کل رات فرشتے آئے تھے۔ اور اس شخص کے لئے دعائے خیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ فلاں شخص نے ہمارے خداوند کریم کے وجود کو ثابت کر دیا۔ اللہ اس کی عمر دراز فرمائے اس نے اہل دنیا کا حق پورا کر دیا۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ اے نادان شخص! وجودِ باری تو ثابت ہے! اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اگر تم کوئی کارنامہ انجام دیتے ہو تو خود اپنی صلاحیتوں اور ہنر کو بطور دلیل اسکے سامنے ثابت کرو ورنہ وہ (ذاتِ باری) تو بغیر دلیل کے ثابت ہے (تم اپنی صلاحیتوں کو دلیل سے ثابت کرنے کے محتاج ہو۔ خداوند تعالیٰ کو اس کی احتیاج نہیں ہے)۔

وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ "(کوئی چیز ایسی نہیں جو پروردگار کی تسبیح وتحمید میں مشغول نہ ہو)"

حضرت مولانا رومیؒ نے فرمایا کہ اس بات میں کچھ شک نہیں ہے کہ فقیہ بہت ہوشیار، زیرک اور فطین ہوتا ہے اور اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ اپنے فن کی باریکیوں پر اس کی نظر ہوتی ہے لیکن جواز اور عدم جواز کے نظام کے سلسلے میں اس کے اور عالم کے درمیان ایک حدِ فاصل کھینچ دی گئی ہے اگر یہ حجاب دیوار درمیان میں نہ ہو تو انہیں کوئی نہ پوچھے اور وہ نکمے بیٹھے رہیں۔

اس سلسلہ میں مولانائے محترم نے ایک مثال دی اور فرمایا کہ عالم قدس دریا کی طرح ہے اور یہ عالم اس دریا کے جھاگ کی مانند ہے۔ مشیت ایزدی یہ ہے کہ اس جھاگ کو برقرار محفوظ رکھے اور جھاگوں کی بقا اور اعتبار کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ گرد دریا کے پٹے کھینچے ہیں تاکہ اس جھاگ کی تعمیر میں لگا ہے اگر نظام نہ ہوتا تو ایک دوسرے کو ختم کر دیتے اور اس سے نظام عالم میں خلل واقع ہوتا۔

اس بات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ کیلئے ایک خیمہ لگایا گیا اور مخلوق کی ایک جماعت کو اس خیمہ کے بنانے میں مشغول ومصروف کر دیا۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ اگر میں میخیں

نہ بنا تا تو خیمہ کو کہاں باندھتے دوسرا کہتا ہے کہ میں طناب نہ بناتا تو خیمہ کھڑا کس طرح کیا جاتا؟

حالانکہ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ہم سب بادشاہ کے ملازم ہیں اور ہمارے ذمہ خیمہ بنانے اور اس کو نصب کرنے کے فرائض ہیں جس میں بادشاہ بیٹھے گا۔ عیش و تفریح کریگا۔ غور کرو کہ اگر جولاہے وزارت کے شوق میں کپڑا بننا ترک کر دیں تو ساری دنیا عریاں اور ننگی رہ جائے۔ اسی لئے اس کو اس پیشہ کا شوق عطا کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشے میں مگن ہے

لہذا اس گروہ کے دل میں خلاق عالم نے ایک ذوق پیدا کیا جو اسکی خوشی کا سبب بنا پھر اُس گروہ کو اس دنیا کے نظام کے لئے مقرر فرمایا اور عالم دنیا کو اُس گروہ کے لئے۔

لیکن خوش قسمت وہ جس کے لئے اس عالم کو بنایا گیا نہ کہ اُس (گروہ) کو عالم کے لئے

اسی طرح خالق کائنات نے ہر شخص کے اندر اُس کے کام سے لگاؤ اور دلچسپی پیدا کر دی ہے اس کے باعث وہ اپنے کام سے مطمئن ہے۔ اگر اس کاریگر کی عمر ایک لاکھ برس کی ہوتی تو وہ اپنے کام میں ویسی ہی لگن اور دلچسپی محسوس کرتا بلکہ یہ لگن اور شوق اس میں کچھ اور ہی فزوں ہو جاتا۔ اور وہ اپنے کام میں دقتِ نظر سے انواع و اقسام کی نت نئی باتیں پیدا کر کے اپنے شوق کی تکمیل کرتا رہتا اور اس سے شاداں و فرحاں ہوتا۔

" وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ " کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھو کہ خداوند تعالیٰ کی یہ تسبیح و تحمید ایک طرز اور ایک انداز کی نہیں ہے۔ رسن تاب کی تسبیح اور ہے اور میخ ساز کی کچھ اور ہے۔ چوب تراش کی کچھ اور جامہ باف کی تسبیحات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان اولیاء اللہ کی تسبیح کچھ اور ہے جو اس خیمہ میں فروکش ہوں گے (جن کے لئے یہ خیمہ بنایا جا رہا ہے)

ہماری ذات دوسروں کیلئے آئینہ ہے

حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ کچھ لوگ (دلسوز جماعت) ہمارے پاس آتے ہیں اور ان کے سامنے میں اگر خاموش رہتا ہوں تو یہ لوگ رنجیدہ خاطر ہوتے ہیں۔ اگر میں اُن سے ایسی گفتگو کرتا ہوں جو ان کی اصلاح حال کے لئے موزوں اور مناسب ہو تب بھی وہ ملول و رنجیدہ ہوتے ہیں اور اٹھکر چلے جاتے ہیں اور مجھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مولانا ہم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ذرا غور کرو کہ جلانے والی لکڑی دیگ سے کب گریزاں ہوتی ہے (جلانے

والی لکڑی تو ہوتی ہی اس لئے ہے کہ اس کو دیگ کے نیچے جلادیا جائے) البتہ دیگ خود اس خشک
لکڑی سے بچتی ہے کہ اس میں اس کی آنچ کی برداشت کی قوت نہیں ہوتی پس اس طرح آگ اور
ایندھن کا اس دیگ سے پہلوتہی کرنا گریز نہیں ہے بلکہ جب ایندھن نے یہ دیکھا کہ دیگ کمزور ہے تو
وہ اس سے دور ہو جاتی ہے پس ہر حال میں دیگ ہی ایندھن اور اسکی آگ سے گریزاں ہوتی
ہے پس ہمارا گریز ان لوگوں سے نہیں ہے بلکہ حقیقت میں خود ان کا گریز ہے۔ ہماری حیثیت تو
آئینہ کی ہے ان کا جو گریز ہے وہ ہم میں ظاہر ہو جاتا ہے پس ہم جو گریز کرتے ہیں وہ ان ہی
کی وجہ سے ہوتا ہے (چونکہ ان میں مناسب حال بات سننے کی صلاحیت نہیں ہے)"

آئینہ کیا ہے؟

آئینہ وہ ہے جس میں خود کو دیکھا جائے اگر ہمارے چہرے سے ملال (اضمحلال ظاہر ہوتا ہے تو خود دیکھنے والوں کا ملال ہے کیونکہ
ملال کمزوری کی علامت ہے، حس کی ہمار ے بہار، گنجائش نہیں ہے۔ بھلا ملال کا یہاں کیا کام؟

انسان کو ہر عمل میں تدریج و اعتدال چاہیئے

حمام میں ایک مرتبہ مجھے شیخ صلاح الدین کی خاطرداری و خدمت کا
بہت زیادہ موقع ملا۔ اس کے جواب میں شیخ موصوف نے بھی میری
خدمت و تواضع کے جواب میں بہت زیادہ خدمت فرمائی تو میں نے اس تواضع
پر ان کی خدمت میں شکایت کی لیکن میرے دل میں یہ خیال آیا کہ تواضع اور خدمت اعتدال سے ہونی
چاہیئے اگر کسی کی خدمت کرنی ہے تو پہلے اس کے ہاتھ دبانے اور ملنے چاہئیں اس کے بعد اور خدمت
کرے تاکہ اس کو احساس نہ ہو اور وہ اس خدمت کا خوگر ہو جائے اور اسکو یعنی تمہارے مخدوم کو تمہاری
خدمت کے بدلہ میں زحمت نہ اٹھانی پڑے بلکہ تم اپنے تدریجی عمل سے اس کو اس کا عادی بنا دو۔ یہی
کیفیت دوستی اور دشمنی میں بھی ہونی چاہیئے۔ اگر کسی سے دشمنی ہے تو پہلے اس کو نصیحت کرو اور
اس نصیحت کو تدریجاً بڑھاتے جاؤ۔ اگر وہ مان جائے تو خیر ورنہ اس سے دوری اختیار کرو اگر
پھر بھی اصلاح پذیر نہ ہو تو اس پر تشدد کرو۔ قرآن مجید میں ہے: "فعظوھن واھجروھن
فی المضاجع واضربوھن (نساء ۶٤) ابتداء میں انہیں سمجھاؤ اگر وہ اصلاح پذیر نہ ہوں تو
ان سے ترکِ تعلق کرو اور ان کے ساتھ ہمخوابی ترک کر دو اور اگر اس پر بھی اپنی اصلاح نہ کریں تو انہیں
(ہلکی) ضربیں لگاؤ۔

دنیا کے کام اسی طرح چلتے ہیں۔ تم موسم بہار کی جانب نہیں دیکھتے کہ موسم کس طرح بتدریج تبدیل ہوتا ہے۔ ابتداء میں موسم کی صلح ودوستی بہار کو ہلکی ہلکی گرمی پہونچاتی ہے اس کے بعد بتدریج بڑھتی ہے اسی طرح درختوں کو دیکھو بتدریج بڑھتے ہیں۔ پہلے کونپلیں نکلتی ہیں اس کے بعد پتے، پتوں کے بعد پھل ان میں آتے ہیں۔ لیکن صعیف زمانے نے یہ طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے یکبارگی تمام کا تمام سامنے لاکر رکھ لیتے ہیں اور سب کچھ یکبارگی ہی داؤں پر لگا دیتے ہیں (تدریجی ریاضت کا لحاظ نہیں رکھتے) پس اس دنیا کے کاموں میں یا آخرت میں جو لوگ تمام کے حصول کے لئے شتاب کاری کرتے ہیں اور ابتداء ہی میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں تو مقصد ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ (ریاضت نفس بتدریج ہونا چاہیئے) چنانچہ ریاضت نفس کا یہ طریقہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص روزانہ ایک من (من عجمی ۲/۱ سیر) روٹی کھاتا ہے۔ تو اس کو چاہیئے کہ وہ اپنی خوراک کو روزانہ ایک درم کم کرے اور پھر اسی طرح بتدریج کم کرتا چلا جائے! اس طرح دو سال تک عمل کرے پس کی خوراک اس طرح ایک من سے گھٹ کر نیم من رہ جائے گی اور جسم کو وہ کمی محسوس نہیں ہوگی! اسی طرح تدریجی عمل کو طاعت وخلوت میں بھی اختیار کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص تارک صلوٰۃ تھا تو اس کو چاہیئے کہ اولاً نماز پنجگانہ کا خود کو عادی بنائے پھر جب وہ اس کا عادی ہو جائے تو نوافل کی طرف توجہ کرے اس طرح وہ اپنی نماز میں مداومت پیدا کرلے گا۔ "فی صلوٰۃ دائمون"[1]۔

فصل

ابن چاؤش کو نصیحت حقیقت یہ ہے کہ ابن چاؤش کا فرض یہ ہے کہ وہ شیخ صلاح الدین کی عدم موجودگی میں ان کے حق کی پوری پوری حفاظت کرے۔

کیونکہ یہ اس کے حق میں نفع بخش ہوگا! اس طرح اس کی نفسانی تاریکیاں اور غفلتیں دفع ہونگی۔ آخر یہ ابن چاؤش کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ نہیں سوچتا کہ بیشمار لوگوں نے اپنے آبا واجداد اور اہل وعیال اعزاء واقربا کو چھوڑ کر ہند سے سندھ کا سفر اختیار کیا ہے۔ اور اس طویل سفر میں انہوں نے جوتیوں کی ایڑیوں میں نعل لگائے تاکہ وہ گھسنے سے محفوظ

[1] یہ نص قرآنی نہیں ہے بلکہ مولانا کا ارشاد ہے کہ اس طرح بتدریج جب تارک صلوٰۃ عادی ہو جائے تو پھر مزاولت کے باعث نماز پر مداومت کریگا۔ نص قرآنی اس طرح ہے: علیٰ صلوٰتھم دائمون۔

رہیں لیکن سفر کی طوالت نے ان کو بھی گھس ڈالا! ان کے اس سفر کی غرض و غایت صرف یہ تھی
کہ ایک ایسی شخصیت سے شرف ملاقات حاصل ہو جائے جس نے عالم حقیقت کی خوشبو
سونگھی ہو لیکن ان میں سے بہت سے اس حسرت کو دل ہی میں لئے ہوئے دوران سفر را ہی
ملک بقا ہو گئے اور ان کی یہ حسرت ملاقات و دیدار پوری نہ ہوئی۔
اے ابن جاؤش! یہ تیری خوش بختی ہے کہ تجھے گھر بیٹھے ایسی شخصیت کی شناسائی نصیب
ہو گئی لیکن تو نے اس کی قدر نہ کی۔ ہائے تیری یہ غفلت؟ اسے تیرے حق میں بلائے عظیم
ہی کہا جا سکتا ہے۔
والد محترم حضرت مولانا بہاء الدین مجھے ہمیشہ شیخ المشائخ صلاح الحق والدین (اللہ تعالےٰ
ان کے ملک کو قائم و دائم رکھے) کے سلسلہ میں یہی نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایک عظیم شخصیت ہیں۔
اور مولانا کے بارے میں میرا مشاہدہ ہے کہ جب بھی میری حاضری مولانا کی خدمت میں ہوتی تھی میں نے والد صاحب کو
ہمیشہ دیکھا ہے کہ وہ مولانا کی تعریف میں "سیدنا" "مولانا" "عارف پروردگار" اور "عارف خالقنا" جیسے
القاب استعمال فرماتے تھے۔ اور اب کیفیت یہ ہے کہ اس (ابن جاؤش) پر غفلت کے پردے پڑ
گئے ہیں اور وہ اغراض فاسدہ کے سایہ میں ہے۔ ہائے ہائے! اب تو وہ یہ کہنے لگا ہے کہ شیخ
صلاح الدین میں کیا چیز ہے؟ آخر شیخ نے اس کے حق میں کیا برائی کی ہے سوائے اس کے کہ تاریک
کنویں میں گرتے دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ اس تاریک کنویں سے بچو۔ ایسی شفقت تو ان کی سب پر
ہے کسی کی کیا تخصیص ہے۔ (ابن جاؤش اس شفقت کو اپنے حق میں پسند نہیں کرتا۔ اے ابن جاؤش
تم کو سمجھنا چاہیئے کہ اگر تم اس عمل کے مرتکب ہو گے تو یہ بات شیخ صلاح الدین کو پسند نہیں آئے گی۔
اور تم مقہور ہو جاؤ گے بلکہ ان کی ناپسندیدگی کی وجہ سے آخر تم انوار حق سے محجوب ہو گے
اور جہنم کی تاریکیوں میں گھر جاؤ گے پس وہ تمہیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہ میرے
قہر و غضب کا شکار نہ بنو بلکہ میرے سایہ عاطفت میں آجاؤ کیونکہ جب تمہارے اعمال میری
مرضی کے مطابق ہونگے تو تم میرے لطف و کرم کے حقدار بن جاؤ گے اور تمہارا دل روشن ہو گا
اور تم پیکر نورانی بن جاؤ گے۔
وہ تو تم کو تمہاری بھلائی کے لئے نصیحت کرتے ہیں لیکن تم اس شفقت و نصیحت

کو غرض اور مطلب پر محمول کرتے ہو۔ بھلا کیا ایسا شخص کسی کے ساتھ غرض و مطلب کی وجہ سے بات کرتا ہے۔ ایسا شخص پند و نصائح کسی غرض یا عداوت کے لئے نہیں کرتا۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ حرام کھانے پینے یا چرس کے استعمال یا ناچ اور راگ رنگ کی وجہ سے تم کو سرور آجائے اور تم مست ہو جاؤ یا کسی علاوہ کسی اور وجہ سے ایسی کیفیت سے دوچار ہو جاؤ تو ایسے وقت اپنے دشمن سے بھی راضی ہو کر اسے معاف کر دیتے ہو اور اس کی قدم بوسی اور دست بوسی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو۔ ایسے وقت بیس کافر اور مومن بلا امتیاز تمہارے لئے برابر ہو جاتے ہیں اور ان میں (ایمان اور کفر کے فرق کے باوجود) تمہاری نظروں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

شیخ صلاح الدین کا تعارف

شیخ صلاح الدین ذوق کے حامل ہیں اور بالفاظ دیگر یوں کہوں کہ وہ کیفیات کے بحر ذخار ہیں۔ لہٰذا یہ تصوّر کر لینا کہ معاذ اللہ وہ کسی کے ساتھ بغض و حسد کریں یا ان کی کسی کے ساتھ کوئی غرض وابستہ ہو (بالکل لغو و غلط ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز عمل کو تو بندوں پر شفقت اور رحمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور اگر ایسا نہ سمجھا جائے تو انہیں ان کیڑے مکوڑے جیسے لوگوں سے کیا غرض۔ اور جس شخص کو یہ اہمیت حاصل ہو اور وہ صاحب عظمت و اقتدار ہو وہ ان سالکین کے برابر کس طرح ہو سکتا ہے۔ کیا آب حیات کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ ظلمات میں ہے حقیقت حال یہ ہے کہ وہ بحر ظلمات اولیاء کے اجسام ہیں اور آب حیات ان میں پوشیدہ درواں دواں) ہے اور متقی ہی آب حیات کو ان ظلمات میں پا سکتے ہیں۔

اگر تو اس چشمۂ ظلمات (گروہ اولیاء) کو برا جانتا ہے اور اس ظلمات سے متنفر ہے تو تجھے آب حیات کس طرح ملے گا۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے کہ اگر تو مخنثوں سے برائی اور بدمعاشوں سے بدمعاشی سیکھنا چاہتا ہے تو اس میں تجھے اس وقت تک کامیابی نہ ہو گی جب تک کہ تو اپنے ضمیر کے خلاف ہزار کام نہ کرے اور اپنے ارادوں سے بغاوت نہ کرے (ارادوں کے خلاف نہ کرے) تب کہیں تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا اور برائیوں کے طریقے سیکھ سکے گا۔ پس

جب برائیوں کے حصول میں اتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تو پھر حیات باقیہ اور ابدی زندگی (جو اولیاء اللہ اور انبیاء علیہم السلام کا مقام ہے) کا حصول بغیر اس کے کہ کسی ناپسندیدہ امر سے کچھے دو چار نہ ہونا پڑے اور بعض ان چیزوں کو ترک کرنا پڑے جو کچھے حاصل ہیں کس طرح ممکن ہے (اس کا حصول تو جب ہی ممکن ہے کہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے کنارہ کش ہو جا اور مکروہات کو گوارہ کرنے کے لئے تیار ہو جا) آج کل کے شیخ تو ہمارے مشائخ کی طرح حکم بھی نہیں دیتے جو شیوخ متقدمین حکم کرتے تھے کہ اپنی بیوی کو، اولاد کو اور مال کو ترک کردو اور منصب سے دستبردار ہو جاؤ۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ حکم بھی دیدیتے تھے کہ اپنی بیوی کو طلاق دیدو ہم اس کو اپنی زوجیت میں لے لیں [illegible] اور یہ مخلص مریدین ان سب باتوں کو برداشت کرلیتے تھے اور ایک تم لوگ ہو کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم کو جو معمولی نصیحت کی جاتی ہے وہ بھی تمہارے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ حالانکہ ارشاد ربانی ہے "عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم"۔

ممکن ہے تم کسی بات سے ناگواری محسوس کرتے ہو، اپنے حق میں اس کو برا جانتے ہو لیکن وہی تمہارے حق میں بہتر ہو اسی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگو[illegible] مریدوں) پر جہل کا غلبہ ہے اور یہ اندھے ہو گئے ہیں۔ یہ نادان اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ایک شخص جب کسی بچے یا عورت پر عاشق ہو جاتا ہے تو وہ اس کی کیسی نازبرداریاں کرتا ہے اور اس کے کس طرح اظہار عجز کرتا ہے اور دن رات اس کی دلجوئی میں لگا رہتا ہے اور اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑنا غیر کے ساتھ تو اس کی رغبت کا یہ عالم ہے لیکن اللہ کے شیخ سے اس کی محبت اس سے کہیں کم ہوتی ہے وہ شیخ کے ادنیٰ سے حکم یا نصیحت کو بے تکلف اور بے جھجک چھوڑ دیتا ہے اور کسی غرض پر اس کو محمول کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نہ طالب ہے اور نہ عاشق ہے اگر وہ عاشق و طالب ہوتا تو اس سے کہیں بڑی باتوں کو تسلیم کرلیتا جن کو ہم نے کہا ہے اور وہ امتثال امر میں شہد و شکر سے زیادہ لذت اندوز ہوتا ہے۔

فصل

اصل چیز عزم صادق ہے

حضرت مولانا نے فرمایا کہ توقات جانا چاہیئے کیونکہ وہاں موسم اچھا ہے۔ یہ مقام گرم سیر ہے (شدید موسم گرما میں لوگ جہاں گرمی سے بچنے کے لئے جاتے ہوں) انطاکیہ کا موسم بھی اگرچہ اچھا ہے وہاں زیادہ سردی نہیں ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ وہاں رومیوں کی کثرت ہے اور عموماً ان کی سمجھ میں ہماری باتیں نہیں آتیں اگرچہ ان رومیوں میں سے بھی بعض ایسے لوگ ہیں جو ہماری بات کو سمجھ لیتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔ ان میں کچھ کفار بھی موجود تھے میری باتوں کا ان پر اثر ہوا اور انہوں نے اس گفتگو سے کیف حاصل کیا اور ان پر گریہ اور وجد طاری ہوگیا۔ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ جو گفتگو ہو رہی تھی اس کو تو ہزار میں سے ایک مسلمان سمجھ سکتا ہے! انہوں نے کیا سمجھا جو وہ رونے لگے؟۔

حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ یہ ضروری نہیں کہ بات کی تہہ کو وہ پہونچ سکیں (تب گریہ و حال طاری ہو) بلکہ اس بات کا جو بنیادی نقطہ تھا (اصل سخن) اس کو سمجھ گئے کیونکہ وہ ذاتِ باری کی وحدانیت کے تو قائل ہیں جو سب کا خالق و رزاق ہے ہر چیز پر اس کا تصرف و قبضہ ہے اور اس کی جانب ہی سب کو لوٹ کر جانا ہے عذاب و ثواب بھی عطا فرماتا ہے۔ جب انہوں نے گفتگو سنی تو یہ نتیجہ نکالا کہ یہ تمام باتیں اسی ذاتِ باری کی تعریف و توصیف میں ہیں اور یہ گفتگو اسی کے بارے میں ہو رہی ہے اسی کا ذکر ہے۔ لہٰذا ان میں بھی وجد اور ذوق و شوق کی کیفیت پیدا ہوگئی کیونکہ ان باتوں سے ان کو اپنے محبوب و مطلوب کی خوشبو آرہی تھی۔

اگرچہ راستے مختلف ہیں لیکن مقصود تو ایک ہی ہے۔ دیکھو! کعبہ کو بہت سے راستے جاتے ہیں بعض روم سے، کچھ شام سے، بعض خشکی کے راستے ہیں اور بعض سمندری ہیں۔ اگر تم راستوں کے اختلاف پر نظر کرو تو مختلف راہیں نظر آئیں گی اور ان راستوں میں عظیم اختلاف اور بہت زیادہ فرق بھی لیکن منہائے مقصد پر نظر کرو تو سب کا مقصود ایک ہی ہے۔

اور ان کے باطن کو کعبۂ مقدسہ سے ایک عظیم ارتباط ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہیں بلکہ ایسا ارتباط ہے جس کا تعلق نہ کفر سے ہے اور نہ ایمان سے کہ وہ تعلق ان مختلف راستوں سے نہیں ہے جن کا تذکرہ ہم نے ماسبق میں کیا ہے۔ اور جب مختلف راستوں کے راہی مقصود کو پہونچ گئے تو مباحثے، جنگ و اختلاف جس کی وجہ سے باہم ایک دوسرے کو گمراہ اور بے دین کہتے رہے ہیں وہ تمام اسباب علل یہاں ختم ہو جاتے ہیں جب ان مختلف راستوں سے کعبۂ مقصود کو پہنچ جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنگ و جدل اور اختلاف صرف راستے کا تھا۔ اب معلوم ہو گیا کہ مقصد ایک ہی تھا۔

یوں سمجھو کہ اگر کاسہ (پیالہ) میں جان ہوتی تو وہ پیالہ بنانے والے کا غلام ہوتا اور اس پر والہ و شیدا ہوتا۔ اب اس پیالہ کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کو اسی طرح دسترخوان پر رکھ دیا جائے بعض کا خیال ہے کہ اس کو اندر سے دھو دینا چاہیئے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کو باہر سے دھو دیا جائے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کو اندر باہر دونوں طرف سے دھو دیا جائے اور بعض نئی بات کہتے ہیں کہ اس کو دھویا ہی نہ جائے! اب اختلاف اس کاسہ کی ظاہری حالت سے متعلق ہے لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پیالہ کا کوئی بنانے والا ہے اور یہ خود بخود نہیں بن گیا ہے! اس سلسلہ میں کوئی مختلف الرائے نہیں ہے (سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی اس کا بنانے والا ہے)۔

تمام انسان باطنی طور پر اپنے دل میں اللہ رب العٰلمین سے محبت رکھتے ہیں اور حق کے طالب ہیں اسی کی جانب رجوع ہوتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اسی کی ذات سے توقعات وابستہ کرتے ہیں۔ دنیا میں کسی کو اس کی ذات کے علاوہ متصرف اور قادر نہیں سمجھتے۔ اور یہ کیفیت نہ تو مفضی الی الکفر ہے اور نہ موصل الی الایمان ہے۔ باطن میں اس کا کوئی نام نہیں ہے لیکن جب باطن کا یہی پانی زبان کے پرنالہ سے گرتا ہے اور سمٹتا ہے تو وہ نقوش و حروف سے تعبیر ہونے لگتا ہے اور اس کو الفاظ کی دنیا میں حا، خا، اور دال سے تعبیر کرتے ہیں اسی طرح (عالم ظاہر میں) اس کا نام کفر و ایمان اور نیک و بد ہو جاتا ہے۔

مثال سے اس طرح سمجھیں کہ پودا زمین سے اُگتا ہے تو اس میں حسن و جمال نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کی کوئی خاص صورت و شکل ہوتی ہے۔ روئیدگی کے وقت اس میں نزاکت ہوتی ہے (ابتداءً لطیف و نازک نظر آتے ہیں) لیکن جوں جوں وہ بڑھتے ہیں اور اس دنیا میں قدم آگے رکھتے ہیں کثیف و غلیظ (موٹے اور بڑے) ہوتے جاتے ہیں اور ان کا رنگ کچھ اور ہی ہو جاتا ہے۔ جب مومن اور کافر ایک جگہ بیٹھتے ہیں اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں کرتے تو اس وقت وہ سب یگانہ ہوتے ہیں کیونکہ خیال پر مواخذہ نہیں ہے (ان کے خیالات میں بیگانگی ہی سہی لیکن بظاہر ان پر گرفت نہیں ہوتی)۔ باطن ایک دنیائے آزادی ہے اس لئے کہ خیالات تو ایک لطیف شیئی ہیں! ان پر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ "نحن نحکم بالظاہر واللہ یتولی السرائر" ہم تو ظاہر پر حکم لگاتے ہیں راز ہائے دروں کا والی و حاکم اللہ تعالیٰ ہے وہ اندیشے اور خیالات جو اللہ رب العٰلمین تمہارے اندر پیدا فرماتا ہے! ان کو تم ہزار کوشش اور لاحول پڑھ کر بھی دور نہیں کر سکتے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ رب العٰلمین کو کسی آلہ کی ضرورت نہیں درست اور حق ہے۔ دیکھو! اس نے تمہارے قلوب میں خطرات اور خیالات کو کسی آلہ، قلم و رنگ کی معاونت کے بغیر پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ اندیشے تو پرندوں اور جنگلی جانوروں کی طرح ہیں اور قبل اس کے کہ تم ان کو پکڑ کر باندھ لو اور اپنا اسیر بناؤ تم ان کو فروخت کرنے کے مجاز نہیں کیونکہ فروخت میں مبیع کا قبضہ شرط ہے جبکہ ان پرندوں اور جنگلی جانوروں پر تمہارا تصرف و اختیار ہی نہیں تو تم ان کو فروخت کس طرح کرو گے کہ بیع میں مبیع کا بائع کے سپرد کرنا شرط ہے پس جب ان کی سپردگی تمہارے اختیار سے باہر ہے تو تم بائع کے سپرد کیا چیز کرو گے؟ بنابریں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکر و خیال جب تک ذہن میں ہیں بے نام و نشان ہیں۔ ان پر نہ تو اسلام کا حکم لگایا جاسکتا ہے نہ کفر کا۔

کیا کسی قاضی، منصف، حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ یہ کہہ سکے کہ تم نے اپنے دل میں ایسی بیع کا اقرار کیا ہے۔ یا تم قسم کھاؤ کہ تم نے اپنے دل میں ایسا خیال کیا تھا۔ وہ ایسا نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ کوئی بھی باطن پر حکم لگانے کا مجاز نہیں ہے۔

خیالات کی اصل حقیقت

اندر لیٹے اور خیالات تو مرغ ہوائی کی طرح ہیں لیکن جب یہ ضبط تحریر میں آجائیں تو قابل مواخذہ ہو جاتے ہیں اور ان پر کفر و اسلام ، اچھے اور بُرے کے احکام مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح اجسام کا ایک عالم ہے اسی طرح تصوّرات ، تخیّلات اور توہمات کا بھی ایک عالم ہے اور حق تعالیٰ تمام عالموں سے ماوراء ہے۔ اس کو نہ عالم داخل میں شامل کیا جاسکتا ہے نہ عالم ظاہر میں۔ اب ان تصوّرات کی تخلیق میں حق تعالیٰ کے تصرفات کا مطالعہ کرو کہ وہ بے چون و چگوں بغیر کسی قلم اور کسی آلہ کے ان تصورات کی قلوب میں منظر کشی فرمادیتا ہے اگر تم ان تصوّرات کا مشاہدہ کرنا چاہو یا انہیں طلب کرنے کے لئے سینہ کو چیر کر ذرہ ذرہ کر دو تو بھی اس میں کچھ نہ ملے گا۔ یہی نہیں بلکہ وہ نہ تو خون میں ملیں گے اور نہ رگوں میں ، اوپر نہ نیچے۔ کہیں ان کا کوئی پتہ اور سراغ نہ ملے گا۔ وہ اس قدر بے جہت اور بے چون و چگونہ ہوتے ہیں کہ اندرون کی طرح تم بیرون میں بھی نہیں پاسکتے۔

جب اس کے تصرفات ان تصورات میں اتنے لطیف ہیں کہ جن کا نشان نہیں ملتا تو وہ ذاتِ باری جو ان تصوّرات کی خالق ہے اس کی ذات کیسی بے نشان اور لطیف ہوگی۔ اس کی لطافت کے اظہار کے لئے الفاظ کا سہارا ممکن نہیں کیونکہ یہ کالبد یا قالب باعتبار شخصیت انسانی نہایت کثیف ہیں بلکہ یہ معانی لطیفہ بھی بے چون و چگوں باری تعالیٰ کی نسبت سے کثیف ہیں اور کثیف ہی نہیں گویا اجسام و صورہ ہیں۔ ؎

زیر پردہ ہا اگر آں رُوحِ قدس بنمود ے　　عقول و روح بشر را بدن شمر دندے

اگر وہ پاک روح پردوں سے دکھائی جاتی تو انسانوں کی ارواح اور عقول کو بھی بدن ہی شمار کیا جاتا۔

ذاتِ باری تصوّرات سے وراء ہے

حق تعالیٰ نہ تو عالم تصورات میں سما سکتا ہے اور نہ کسی اور عالم میں۔ کیونکہ اگر وہ عالم تصورات میں سما جائے تو یہ بات ضروری ہو جائے گی کہ تصوّر کرنے والے نے اس کا احاطہ کرلیا ایسی صورت میں ذاتِ باری کے بارے میں خالق تصوّرات نہ ہونے کا دعویٰ درست نہ ہوگا۔

لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ وہ تمام عالموں اور تصورات سے وراء ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُولَہُ الرُّؤیَا بِالحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ المَسْجِدَ الحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ" (فتح ع ۴)

اللہ رب العلمین نے اپنے محبوب کے خواب کو سچا کر دکھایا کہ اگر مشیت الٰہی ہوئی تو آپ ضرور مسجد حرام میں (فاتحانہ انداز میں) داخل ہونگے۔

عاشقوں کا انداز

سب کہتے تھے کہ ہم کعبہ مکرمہ میں داخل ہونگے لیکن بعض دل کا انداز مختلف تھا وہ اس طرح کہتے تھے کہ اگر مشیت الٰہی ہوئی تو ہم کعبہ میں داخل ہونگے۔ وہ اپنے داخلہ کو مشیت سے متعلق کرتے تھے۔ ایسا کہنے والا گروہ عاشقوں کا ہے کہ عاشق کسی کام پر بھی خود کو صاحب عمل اور مختار نہیں سمجھتے ہیں وہ تو معشوق ہی کو فاعل و مختار سمجھتے ہیں اسی لئے یہ کہتے تھے کہ اگر وہ (رب العلمین) چاہے گا تو ہم کعبہ میں داخل ہونگے۔

ظاہر بین حضرات کے لئے مسجد حرام کعبہ ہے۔ عاشقوں اور خاصان بارگاہ کے لئے کعبہ وصال حق ہے اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہے گا تو اس تک جا پہونچیں گے اس کے دیدار سے مشرف ہوں گے لیکن معشوق کی طرف سے ان شاء اللہ کہا جانا بہت ہی شاذ و نادر ہے اور یہ حکایت بہت عجیب و غریب ہے پس ایسی حکایت کو سننے کے لئے بھی عجیب و غریب فرد کی ضرورت ہے تاکہ سنے اور سن سکے۔

رب کریم کے محبوب بندے

خالق کائنات کے ایسے بندے بھی ہیں جن کا طالب خود خالق ہے اور وہ اس کے مطلوب ہیں۔ پس وہ عاشقوں کے سارے طور طریقے اختیار فرماتا ہے اور دکھاتا ہے کہ جس طرح عاشق کہتا ہے کہ اگر حق نے چاہا تو ہم حق تعالیٰ کو دیکھیں گے اسی طرح رب العلمین بھی اپنے محبوب کے لئے انشاء اللہ فرماتا ہے۔ اگر میں اس رمز کی تشریح و توضیح کر دوں تو اس منزل پر واصل بحق دل بھی اپنا سر رشتہ ہوش کھو بیٹھیگا۔ لہذا ایسے اسرار و رموز سے کس طرح پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

قلم اینجا رسید و سر بشکست۔ قلم یہاں تک پہونچا تھا کہ اس کا قط ٹوٹ گیا۔

پس جو شخص منارہ سے اونٹ کو نہیں دیکھ سکتا وہ اونٹ کے منہ میں بال کو کس طرح دیکھ سکتا ہے۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم اپنے موضوع کی جانب پھر رجوع کرتے ہیں کہ جو عاشق انشاء اللہ کہتے ہیں وہ معشوق ہی کو ہر کام کا انجام دینے والا سمجھتے ہیں یعنی اگر معشوق چاہے گا تو ہم کعبہ جائیں گے ۔ وہ فنا فی اللہ کی منزل میں ہیں جہاں غیر کا گزر نہیں۔ جہاں غیر کی یاد حرام ہے غیر کی گنجائش کا ذکر ہی کیا جب تک کہ اس منزل پر خود کو محو نہ کر دے اس منزل پر نہیں پہونچ سکتا (جب اپنی ہی ذات کی گنجائش نہیں تو غیر کے وجود کا کیا ذکر) یہی مفہوم ہے لیس فی الدّارین غیر اللہ (دارین میں اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ۔

الرؤیا کی تفسیر

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق پر غور کرو یہ خواب عاشقانِ صادق اور طالبانِ راسخ کے خواب ہیں۔ ہر ایک ایسے رؤیا بے ضرر نہیں ہوتا جس کی تعبیرات اس عالم میں ظاہر ہوں گی اور یہی نہیں بلکہ عالم کے تمام احوال خواب ہی ہیں جن کی تعبیر اس عالم سے متعلق نہیں بلکہ اُس عالم (آخرت) میں ملے گی ۔ یوں سمجھو کہ خواب میں خود کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر تعبیر یہ لیتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی ۔ ذرا سوچو کہ گھوڑ سواری اور مراد پر پہونچنے میں کیا نسبت ہے ؟ ۔

اسی طرح اگر کوئی شخص خواب میں تمہیں درم دیتا ہے تو اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ تم کسی عالم و فاضل سے نصیحت آمیز گفتگو سنو گے ۔ سوچو کہ درم اور نصیحت سننے کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ اسی بنا پر تو میں نے کہا ہے کہ اس دنیا کے تمام احوال خواب کی طرح ہیں الدنیا حلم النائم (یہ دنیا تو سوتے ہوئے شخص کا خواب ہے) جس کی تعبیر اس عالم (آخرت) میں کچھ اور ہی ہوگی ۔ جس کا اس عالم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس کی تعبیر تو خدائی معبّر کرتا ہے (اللہ تعالیٰ ہی اس کی تعبیر فرماتا ہے) کیونکہ اُس پر سب کچھ مکشوف اور ظاہر ہے ۔ جس طرح ایک باغبان جب باغ میں آتا ہے تو تمام درختوں کے پھلوں کو دیکھے بغیر ہی وہ یہ بتا سکتا ہے کہ یہ درخت انگور کا ہے اور یہ کھجور کا ۔ یہ انار کا ہے اور یہ انجیر کا ، چونکہ اس کو ان تمام درختوں اور پھلوں کا علم ہے اس لئے ان درختوں

کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس ذات کو جو معبّر ہے قیامت کی حاجت نہیں کہ قیامت برپا ہو تب وہ ان خوابوں کی تعبیرات کو دیکھے وہ تو باغبان کی طرح پہلے ہی سے ان خوابوں کی تعبیرات سے آگاہ اور ان کو جانتا ہے یعنی جس طرح باغبان کو معلوم ہو کہ فلاں درخت فلاں پھل دے گا! اسی طرح اس ذاتِ عالمِ کُل کو معلوم ہے کہ فلاں خواب کا نتیجہ اور اس کی تعبیر کیا ہو گی۔

مطلوب لذاتہ و لغیرہ

دنیا کی تمام اشیاء، مال و اسباب، زر و جواہر، بیوی بچے مطلوب لغیرہ ہیں مطلوب لذاتہ نہیں (اصل مطلوب نہیں ہیں) اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس ہزار درم ہوں اور کھانے کے لئے غذا میسر نہ ہو تو درم غذا نہیں بن سکتے۔ بیوی از دیادِ نسل (بچے پیدا کرنے) اور شہوت فرو کرنے کے لئے ہے۔ لباس ستر پوشی اور موسم کے تغیرات سے محفوظ رہنے کیلئے ہے۔ اسی طرح تمام چیزوں کا سلسلہ حق تعالیٰ تک پہونچ جاتا ہے اور وہی حق تعالیٰ مطلوب لذاتہ ہے۔ لہٰذا تم اس کی خاطر اس کے طالب بنو۔ کسی دوسری چیز کی وجہ سے نہیں یعنی تمہارا مطلوب لذاتہ ہو اس کو لغیرہ نہ چاہو! کہ وہ سب موجودات سے وَرا ہے اور تمام موجودات سے بہتر، بلند تر، اور کامل تر ہے، پس ایسی اعلیٰ اور برتر چیز کو اس سے فروتر اور کمتر چیز کے لئے چاہنا کس طرح دُرست ہو گا۔ پس سب کی انتہا اسی کی طرف ہے جب ذاتِ حق تک پہونچ گئے تو مطلوب کلّی تک پہونچ گئے وہاں سے اور کسی طرف کو جانا نہیں ہے۔

یہ نفس انسانی شبہتوں اور اشکال کا محل ہے ان شبہتوں اور اشکال کو کسی طرح سے بھی اس سے دُور نہیں کیا جا سکتا! اس کا علاج صرف یہ ہے کہ عشق کے راستہ پر گامزن ہو! اس کے بعد کوئی اُلجھن باقی نہیں رہے گی۔ "حبك الشئ یعمی ویصم" کسی چیز کی محبت محب کو اندھا اور گونگا بنا دیتی ہے۔

جب ابلیس کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ نہ کر کے خالق کائنات

کی حکم عدولی کی اور کہاکہ خلقتنی من نار و خلقتہ من طین تونے میری تخلیق آگ سے کی اور اس کی (آدم علیہ السلام کی) مٹی سے۔ اور کہاکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اعلیٰ ادنیٰ کے آگے جھک جائے اور اس کو سجدہ کرے۔ لہٰذا ابلیس کو اس جرم (عدم تعمیل حکم) یعنی ذاتِ باری سے سرتابی کرنے اور اس سے جھگڑنے کے جرم میں سزا ہوئی۔ اس پر مستقل لعنت مسلط کر دی گئی اور راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔

ابلیس نے (اپنے جرم پر ندامت کے بجائے) اللہ رب العٰلمین سے کہا خداوندا یہ سب تیرا ہی کیا ہوا ہے۔ سارا فتنہ تیرا ہی پھیلایا ہوا ہے اب تو مجھ پر لعنت فرما رہا ہے اور مجھے راندۂ درگاہ کر رہا ہے۔

قصہ آدم علیہ السلام

جب حضرت آدم علیہ السلام سے فروگذاشت ہوئی تو ربّ کریم نے انہیں جنت سے باہر بھیج دیا اُن سے فرمایا۔ اے آدم (علیہ السلام) جب میں نے تمہاری فروگزاشت پر مواخذہ کیا تو تم نے مجھ سے بحث کیوں نہ کی حالانکہ تمہیں یہ استحقاق تھا تم مجھ سے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ سب تیری (ذات باری کی) وجہ سے ہے اور تونے ہی کرایا ہے جو تیری مشیت ہوتی ہے وہ ہو جاتا ہے۔ اور جس کام کو تیری مشیت گوارہ نہیں فرماتی وہ کام نہیں ہو سکتا ہے (پس میری یہ لغزش تیرے ہی حکم سے ہے) یہ باتیں تم کہہ سکتے تھے تم نے یہ کیوں نہ کہا؟

جناب آدم علیہ السلام نے عرض کیا خداوندا! میں یہ جانتا تھا لیکن میں نے تیرے حضور میں پاس ادب کو ملحوظ رکھا اور یہ گوارہ نہ کیا کہ تیری بارگاہ میں زبان کھولوں۔ میرے عشق (الٰہی) نے یہ گوارہ نہ کیا کہ میں تیری ذات سے کسی قسم کا مباحثہ کروں اور کوئی حجت کروں۔

شریعت کیا ہے

حضرت مولانا قدس سرہٗ نے فرمایا شریعت پانی کا ایک گھاٹ ہے جس سے لوگ سیراب ہوتے ہیں۔

اور اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک بادشاہ کی کچہری اور عدالت ہے جہاں سے بادشاہ کے احکام جو امر و نہی، عدل، سیاست سے متعلق ہوتے ہیں عوام و خواص کے لئے جاری ہوتے

ہیں. بادشاہ کی عدالتیں بے شمار ہیں جن کا احصار و شمار ممکن نہیں ہے جو عوام کے فائدہ کے لئے ہیں! انہیں سے دنیا کا نظام (عدل) قائم ہے لیکن درویشوں کا کام اس سے الگ تھلگ ہے وہ تو صرف بادشاہ کے مصاحب ہیں! احکام شاہی کو جاننے اور علم حاکم کو جاننے میں بڑا فرق ہے اسی طرح علم حاکم کو جاننے اور بادشاہ کی مصاحبت میں ایک عظیم فرق ہے۔ یہ اصحاب یعنی فقرا اور ان کے احوال تو ایک مدرسہ کی طرح ہیں جس میں بہت سے فقیہ ہیں جو فقہ کا درس دیتے ہیں لیکن مدرس اور استاد شاگرد کی استعداد کے مطابق اس کو درس کا جام دیتا ہے کسی کو ایک کسی کو دس اور کسی کو بیس تیس جام عطا کرتا ہے اسی طرح ہماری یہ بزم بھی ایک مدرسہ ہے کہ "لوگوں سے اُن کے فہم و عقل کے مطابق بات کرتے ہیں"

"کلموا الناس علی قدر عقولهم"

فصل

تجلّی الٰہی قیدِ مکاں سے منزّہ ہے

ہر شخص اپنی نیت کے مطابق عبادت کرتا ہے ان میں بعض کا مقصد بزرگی کا اظہار ہوتا ہے بعض نام و نمود کیلئے اور بعض حصول اجر و ثواب کے لئے کرتے ہیں۔ رب کریم چاہتا ہے کہ اولیاء کے مرتبہ کو بلند فرمائے ان کے مقابر اور مزارات کی عظمت کو ظاہر فرمائے۔ حالانکہ یہ (اولیا) خود معزز و مفتخر ہیں (انہیں دنیاوی طور پر کسی قسم کی عزت و عظمت کی احتیاج نہیں ہے) مثلاً چراغ اگر یہ چاہتا ہے کہ اس کو بلند جگہ پر رکھا جائے تو اس کی یہ خواہش علوِ ذاتی (کے حصول) کے لئے نہیں ہوتی بلکہ یہ خواہش دوسروں کے فائدہ کے لئے ہوتی ہے اس کو بلندی و پستی سے کوئی سروکار نہیں جہاں کہیں رکھ دو وہ روشن ہے لیکن اس صورت میں چراغ کا مقصد یہ ہے کہ اس کی روشنی سے دوسرے فائدہ اٹھائیں۔

یہ آفتاب جو آسمان پر (روشن و تاباں) ہے اگر وہ نیچے ہوتا جب بھی آفتاب ہی ہوتا لیکن کائنات اس کی ضیاؤں سے مستنیر اور روشن نہیں ہو سکتی تھی پس اس کا یہ ارتفاع اس کی اپنی ذات کیلئے نہیں بلکہ دوسروں کو فائدہ پہونچانے کیلئے ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ

اولیائے کرام، دردو لیش، بلندی و پستی، تعظیم و توقیر سے بے نیاز ہیں. اب رہی تیری ذات تو تجھے اس عالم کے ذوق کا ایک ذرہ اور اس کے لطف کا ایک لمحہ ایک لحظہ کیلئے اگر تیرے سامنے رُونما ہو جائے تو اسی لحظہ و لمحہ تو اعلیٰ و اسفل آقائی اور غلامی سے بیزار ہو جائے یہاں تک کہ اپنی ذات سے بھی کہ جو سب سے زیادہ تجھ سے قریب ہے تجھے کوئی تعلق باقی نہ رہے تو اس کو فراموش کر دے۔

وہ حضرات جو اس نور اور ذوق کے خزانے اور اس کی کانیں ہیں وہ بھلا کس طرح اس بلندی و پستی کے محتاج ہو سکتے ہیں ان کا تفاخر تو ذاتِ باری پر ہے اور حق تعالیٰ بلندی و پستی (زمان و مکان) سے مستغنی ہے۔ بلندی و پستی کا یہ تصوّر تو ہمارے لئے ہے کیونکہ ہم مقید بہ ہستی ہیں۔ اور سرو پا رکھتے ہیں۔

واقعہ معراج کی جانب اشارہ

سرورِ عالم نورِ مجسّم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تفضلونی علیٰ یونس بن متی فان معراجی کان عروجہ فی بطن الحوت وعروجی کان فی السماء علی العرش مجھے (اس بنا پر) یونس بن متی پر برتری نہ دو کہ مجھے معراج آسمانوں میں عرشِ اعظم پر ہوئی اور جناب یونس کو مچھلی کے پیٹ میں۔

رب کریم تو بلندی و پستی سے مستغنی ہے (اس کے لئے مکانیت کا تصوّر بے معنی ہے) اس کی تجلّی جہاں بھی ہو زیرِ زمین ہو یا آسمانوں کی بلندیوں پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس تجلی کا مظہر بطنِ حوت ہو یا آسمانوں کے اوپر، تجلی دونوں جگہ یکساں ہے۔ ذاتِ باری تو زیر و بالا سے منزہ ہے اور اس کے لئے سب مقام یکساں ہیں۔

دینِ اسلام کی عظمت

بہت سے عظیم لوگ ایسے ہیں جو کارنامے انجام دیتے ہیں اس سے ان کی غرض دوسری ہوتی ہے اور مشیت الٰہی کچھ اور چاہتی ہے۔ خالقِ کائنات نے جب یہ چاہا کہ دینِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ہو اور وہ تا قیامت تک باقی رہے تو ذرا غور کرو کہ قرآن مجید کی کیسی کیسی گرانمایہ اور ضخیم تفسیریں لکھی گئیں کہ کوئی ان میں دس جلدوں پر مشتمل ہے کوئی آٹھ جلدوں میں ہے بعض چار جلدوں پر محتوی ہے گو اس سے ان کا مقصود اپنے فضل و کمال کا اظہار تھا لیکن خدمتِ دین کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں علم نحو اور لغت کو نہایت فصیح و بلیغ عبارت میں پیش کیا ہے۔ زمخشری نے اپنی تفسیر میں اپنے علم کا اس لئے بھرپور مظاہرہ کیا ہے تاکہ (رباطن) مقصود حق حاصل ہو جائے اور یہی دین محمد علیہ التحیۃ والثنا کی عظمت کا اظہار ہے۔ اسی طرح دوسرے بھی دین حق کی عظمت کیلئے اپنی کارگزاریاں دکھاتے رہے ہیں لیکن حق تعالیٰ کی غرض سے غافل ہیں اور ان کا مقصود ان عظیم کارناموں سے کچھ اور ہی ہے۔

اسی طرح دنیا میں کچھ لوگ اور بھی ہیں جو خواہشات و شہوات کے متبع ہو گئے ہیں مشیت الٰہی یہ ہے کہ دنیا باقی رہے لیکن یہ لوگ اپنی شہوت رانی میں اس طرح مستغرق ہیں کہ لذت اندوزی کی خاطر عورتوں سے اختلاط کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں بیٹا پیدا ہوتا ہے اور اس طرح توالد و تناسل کا سلسلہ قوام عالم کا سبب بن جاتا ہے اس طرح وہ بندگی حق تو بجالاتے ہیں لیکن اس میں اطاعت و فرمانبرداری کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

لوگ مرصّع و مزّین مسجدیں تعمیر کرتے ہیں اس کی تعمیر در و دیوار اور چھت پر کافی رقم خرچ کرتے ہیں۔ لیکن سمت قبلہ پر اس تعمیر کے مقصد سے اس کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے حالانکہ اصل مقصود یہ نہیں ہوتا۔ (وہ تو ادائے نماز کی خاطر اور اپنے نام کی بقا کے لئے اس کی تعمیر کرتے ہیں۔)

اولیاء کی بزرگی اور بڑائی کسی شکل و صورت کی بنا پر نہیں، بخدا یہ لوگ صاحبانِ عظمت و سربلندی ہیں اور یہ عظمت کسی سبب کی محتاج نہیں۔ غور کرو درہم پیسے سے زیادہ قدر و قیمت والا ہے اس کی یہ برتری اس کی ظاہری صورت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ قدر و قیمت اور اندازہ کے لحاظ سے ہے اگر چاندی کو چھت پر رکھ دیا گیا ہو اور سونے کو چھت کے نیچے رکھیں تو بہرصورت سونے ہی کو برتری حاصل رہے گی (چاندی بلند مقام پر ہونے کے باعث اس سے برتر نہیں ہو سکتی) اسی طرح لعل اور موتی ہیں زر کے مقابل میں خواہ وہ زیر ہوں یا بالا رہیں۔ وہ برتر ہی رہیں گے۔ (سونا کسی طرح اُن سے برتر نہیں ہو سکتا) غور کرو آٹے کی بھوسی چھلنی میں آٹے کے اوپر ہوتی ہے اور آٹا نیچے ہوتا ہے لیکن بھوسی باوجود بالا ہونے کے آٹے سے برتر نہیں ہو سکتی۔ آٹا ہی ہر صورت میں برتر رہے گا اگرچہ وہ بھوسی

کے نیچے ہے پس یہ برتری اور بلندی ظاہری اعتبار سے نہیں ہے بلکہ برتری کا یہ جوہر اس کی اصل ذات میں موجود ہے اس لئے وہ برتر ہے پس وہ ہر حال میں برتر و بالا رہے گا۔

(فصل)

تواضع اور اس کے محرکات

ایک صاحب حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ شخص محبوب اور متواضع ہے اور اس کی یہ کیفیت اس کے جوہر ذاتی کی بنا پر ہے جس طرح درخت کی وہ شاخ زمین کی جانب جھکی ہوتی ہے جس میں پھل زیادہ ہوتے ہیں جب کہ شاخ بے ثمر بلندی پر رہتی ہے۔ مثال سے اس طرح سمجھیں کہ سپیدہ کا درخت جب اس میں بکثرت پھل آتے ہیں تو اس کی شاخیں جھکنے لگتی ہیں اس وقت ان کے نیچے ٹیکیاں لگائی جاتی ہیں کہ شاخیں زمین پر نہ آجائیں۔

سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم غایت درجہ تواضع فرماتے تھے کیونکہ اولین و آخرین کی تمام خوبیاں آپ کی ذات اقدس میں جمع کردی گئی تھیں اسلئے آپ سب سے زیادہ متواضع تھے۔ "ماسبق رسول اللہ احدٌ بالسلام" سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام میں کسی نے سبقت حاصل نہیں کی۔ آپ غایت تواضع کے سبب ہمیشہ سلام میں سبقت فرمایا کرتے تھے! اگر اتفاقاً کبھی آپ سلام میں سبقت نہ فرماتے تب بھی سراپا تواضع آپ ہی رہتے! اور سلام میں سبقت بھی آپ ہی کی طرف سمجھی جاتی کیونکہ سلام کرنیوالوں نے سلام کرنا آپ ہی سے سیکھا ہے۔ اولین و آخرین کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ آپ ہی کی ذات مجتمع الصفات کا عکس ہے اور آپ ہی کا سایہ ہے۔ مثال سے یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص کا سایہ مکان میں اس سے پہلے داخل ہوجاتا ہے تو حقیقت میں پہلے داخل ہونے والی ذات وہی ہوتی ہے۔ اگرچہ سایہ آگے ہے اور دوسری صورت میں سایہ جو اس سے آگے چلا گیا ہے وہ اسی کی شخصیت کی فرع ہے (اور اصل صاحب سایہ ہے)۔

رہی اخلاق و تواضع کی بات تو یہ اب سے نہیں ہے کیونکہ اس کے ذرّے آدم علیہ السلام

میں پہلے سے موجود تھے۔ ان ذرّوں میں بعض بہت روشن ہیں بعض کم اور بعض تاریک تھے۔ جو (ذرات) اس وقت ظاہر ہو رہے ہیں ان میں یہ تابانی اور روشنی وہی سابقہ تابانی ہے۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں نمودار ہونے والے ذرات وہی ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام میں چمکتے اور روشن تر اور متواضع تھے۔

اندازِ فکر

بعض لوگ اوّل پر نظر رکھتے ہیں اور بعض آخر پر۔ لیکن جن کی نظر آخر پر ہے وہ بزرگ تر اور عزیز تر ہیں کیونکہ ان کی نظر آخرت پر ہے لیکن جن کی نظر ابتدا پر ہے وہ خواص میں سے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں کیا غرض کہ ہم آخر پر نظر ڈالیں۔ کیونکہ ہم نے گندم کاشت کی ہے لہٰذا جو نہیں کاٹ سکتے۔ اور جن لوگوں نے جو بوئے ہیں اُن کی کھیتی سے گندم حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے یہ حضرات اول ہی پر نظر رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک گروہ اخص الخواص اصحاب کا ہے جن کی نظر نہ تو ابتدا پر ہوتی ہے اور نہ انتہا پر۔ نہ اول کی یاد آتی ہے اور نہ آخر کی۔ وہ بس یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے ہیں۔

ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دنیا میں غرق ہے یا غفلت کیوجہ سے آخرت پر نظر نہیں کرتا۔ وہ دوزخ کا ایندھن ہے اس سے ثابت ہوا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کائنات کی اصل ہیں۔ خالق کائنات نے فرمایا ہے۔ "لولاک لما خلقت الافلاک" (حدیث قدسی) "اے حبیب اگر آپ کی ذاتِ گرامی کا اظہار مقصود نہ ہوتا تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا" اب دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم کے شرفِ تواضع، حلم، رفعت کے سبب سے ہے۔ یہ سب کچھ آپؐ ہی کی بخشش کا نتیجہ ہے۔ اور یہ سب کچھ رحمتِ عالم کا سایۂ عاطفت ہے اور حضورؐ ہی کی ذات کا پرتو ہے جس طرح ان ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے وہ عقل کا پرتو ہوتا ہے کیونکہ اس پر بھی تو عقل کا سایہ ہے (اسی طرح عالم کائنات آپؐ کے وجود باجود کا پرتو ہے)۔

سایۂ بے سایہ

ہر چند کہ عقل کا بظاہر کوئی سایہ نہیں ہے لیکن درحقیقت اس کا سایۂ بے سایہ ہے جس طرح معنیٰ کی ہستی ہے لیکن اس کا وجود ظاہری نہیں ہے اگر انسان پر عقل کا سایہ نہ ہو تو اس کے تمام اعضاء معطل

ہوجائیں۔ ہاتھ کی گرفت صحیح نہ ہو، پاؤں چلنے میں ناکام رہیں، نہ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوں اور نہ کانوں میں سننے کی صلاحیت پیدا ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ سارے کام عقل کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ اعضا تو اس کے آلات، ذریعہ، واسطہ اور وسیلہ ہیں جس طرح انسانوں میں حاکم وقت کی حیثیت ہوتی ہے کہ وہ عقل کل کی حیثیت رکھتا ہے بقیہ دوسرے لوگوں کی عقلیں اس کے لئے اعضا کی طرح ہیں اور ان تمام کے افعال اسی کے رہین منت ہیں اگر ان سے کوئی لغزش ہوتی ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ عقل کا سایہ اس کے اوپر سے اٹھ گیا ہے جیسے ایک دیوانہ جب کوئی بے عقلی کا کام کرتا ہے تو سب سمجھ لیتے ہیں کہ اس کی عقل میں فتور آگیا ہے یعنی عقل کا سایہ اس کے اوپر سے اٹھ گیا ہے اور وہ عقل کی پناہ اور سایہ سے دور ہوگیا ہے۔

عقل فرشتہ کی جنس سے ہے

اگرچہ فرشتہ کے بال و پر ہوتے ہیں اور اس کی ہیئت و شکل ہوتی ہے جو عقل کو میسر نہیں لیکن حقیقت میں دونوں ایک طرح ہیں۔ ایک ہی چیز ہیں یکساں فعال ہیں اور یکساں طبیعت بھی ہیں صورت کو نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اگر صورت سے صرف نظر کر لیا جائے تو بس عقل ہی عقل رہ جائے گی اور پر و بال کا وجود نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب عقل ہی ہے لیکن جسم کے ساتھ۔ اسی لئے اس کو عقل مجسم کہتے ہیں۔ اگر موم کا پرندہ بنائیں کہ بال و پر بھی ہوں تو وہ سب موم کے ہوں گے۔ لیکن اگر اس کو پگھلا یا جائے تو نہ اس پرندہ کا وجود باقی رہے گا نہ بال و پر رہیں گے اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز وہ موم تھی جس نے وہ شکل اختیار کر لی تھی جس کو پرندہ کہا گیا تھا۔ اسی طرح برف کی کیفیت ہے کہ جب وہ پگھل جاتی ہے تو پانی بن جاتا ہے لیکن پانی نے جب تک برف کی شکل اختیار نہیں کی تھی اس کو گرفت میں لینا دشوار تھا صرف فرق یہ ہے کہ برف بن کر غیر مصور پانی مصور ہوگیا ہے (اس نے برف کی صورت اختیار کر لی ہے)۔ پگھل جائے تو پانی ہے اسی طرح انسان کی حالت ہے کہ جیسے فرشتہ کے پر ایک گدھے کی دم سے لگا دیئے گئے

ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ فرشتہ کی صحبت سے صفات ملکی حاصل کرے اور فرشتہ بن جائے کیونکہ یہ بات بھی ممکنات میں سے ہے کہ گدھا بھی اس رنگ میں رنگ جائے اور اس میں بھی صفات ملکی پیدا ہو جائیں۔

از خرد بر داشت عیسیٰ بر فلک بر پر یدا و ۔۔۔ گر خرش را نیم پر بودے نماندے در خری

جناب عیسیٰ علیہ السلام نے عقل سے پروں کا کام لیا تو آسمانوں پر تشریف لے گئے اگر ان کے گدھے کے پاس عقل کے استعمال کی ذرا بھی چھٹ ہوتی تو اس میں گدھا پن باقی نہ رہتا۔ اور کیا تعجب کہ اس میں انسانیت آجاتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

قدرتِ خداوندی

دیکھو جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ابتداً گدھے سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ نجاست میں ہاتھ ڈال کر اس کو منہ تک لے جاتا ہے! اس کے برخلاف گدھے میں تھوڑا بہت شعور ہوتا ہے جب وہ پیشاب کرتا ہے تو ٹانگوں کو کھول لیتا ہے تاکہ پیشاب ٹانگوں پر نہ آئے۔ آدمی کا یہ بچہ عقل و شعور میں گدھے سے بھی پست تر ہے اس کو بڑا ہونے پر اللہ تعالیٰ فہم و ادراک عطا فرما دیتا ہے (پھر گدھے اور اس میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے) اگر وہ گدھے کو انسان بنادے اور اسے انسانیت سے نوازدے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت سے یہ باتیں کچھ عجیب نہیں ہیں۔

روزِ قیامت اعضاءِ انسانی کی شہادت

قیامت کے دن انسان کے تمام اعضاء جدا جدا باتیں کریں گے اور اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے۔ فلسفی حضرات نے اس سلسلہ میں تاویلیں کی ہیں کہ ہاتھ کس طرح باتیں کرے گا۔ تاویل یہ ہے کہ ہاتھ پر کوئی ایسی کیفیت ظاہر ہو جو مشابہ سخن ہو۔ مثلاً ہاتھ پر زخم یا پھوڑا نمودار ہو جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ ہاتھ پر حدت یا گرمی کا اثر ہوا ہے یا ہاتھ مجروح ہو جائے یا کالا پڑ جائے تو ہاتھ کا کہنا یہی ہوگا کہ مجھے چھری کا زخم لگا ہے پس ہاتھ کا باتیں کرنا اسی قبیل سے ہوگا۔ (متکلمین اور فلاسفہ یہ کہتے ہیں۔

فلسفیوں کے عقیدہ کا ابطال

ہم اہل سنت وجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حاشا وکلا حقیقت میں بات ایسی نہیں بلکہ ہاتھ اور پاؤں اسی محسوس اور معروف طریقہ پر گفتگو کریں گے جس طرح کہ زبان کرتی ہے کیونکہ قیامت میں انسان اپنے اعمال سے منکر ہو جائے گا اور کہے گا کہ میں نے تو یہ کام کئے ہی نہیں۔ میں نے چوری نہیں کی تب زبان فصیح بیں ہاتھ کہے گا کہ تونے چوری کی تھی اور میں نے چوری کی چیز پکڑ کر یا اٹھا کر دی تھی۔ اس وقت وہ شخص اپنے پاؤں کی جانب متوجہ ہو کر کہے گا کہ تمہارے پاس تو زبان نہیں تھی اب تم باتیں کس طرح کر رہے ہو تو وہ کہیں گے" انطقنا اللہ الذی انطق کل شیئ " ہمیں اس ذات نے بولنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے جس نے سب کو بولنا سکھایا۔ وہ خالق در و دیوار، پتھر اور مٹی کے ڈھیلے کو طاقت گویائی دیتا ہے مجھے بھی اس نے اسی طرح طاقت عطا فرمادی جس طرح تمہاری زبان کو طاقت دی تھی۔ زبان بھی مضغۂ گوشت ہے اور ہاتھ بھی گوشت کا پارہ ہے۔ جب زبان کا گفتگو کرنا جو گوشت کی ایک بوٹی کی طرح ہے خلاف عقل نہیں ہے بلکہ معقول ہے کیونکہ اس گوشت پارے کا باتیں کرنا تم نے بکثرت مشاہدہ کیا ہے اس لئے تم کو محال نہیں معلوم ہوتا ورنہ حق تعالیٰ کی قدرت کے سامنے تو زبان ایک ذریعہ ہے۔ جب اس کو حکم ہوا کہ بول تو وہ بولنے لگی۔ بس اسی طرح وہ جس چیز کو بھی بولنے کا حکم فرمائے گا وہ کلام کرے گی

لیکن اس سے بات تو جس قدر ہوتی ہے وہ اس بات کرنے والے کے اعتبار ہی سے ہوتی ہے (دانا ہوشمندی کی باتیں کرتا ہے اور نادان بیوقوفی سے کلام کرتا ہے۔)

گفتگو بقدر ظرف

گفتگو بھی پانی کی طرح ہے پانی کو کیا معلوم کہ سیراب کنندہ اس کو کس طرف لے جا رہا ہے۔ باغ میں، کھیت میں، سبزہ زار میں یا کسی اور جگہ۔ البتہ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جب پانی زیادہ آتا ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین بہت (زیادہ پیاسی تھی) اور کم مقدار میں آتا ہے تو اس سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ زمین کم اور کم پیاسی تھی اور بڑا باغ نہیں بلکہ باغیچہ ہے یا چھوٹی چہار دیواری (جہاں زیادہ پانی پہنچانے کی ضرورت نہیں) "یلقن اللہ الحکمۃ علی لسان الواعظین

جقدرِ فہم المستمعین" دربِ کریم واعظوں اور خطیبوں کو علم وحکمت کی تعلیم سامعین کی صلاحیت کے مطابق دیتا ہے۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں تو اس کفش ساز کی طرح ہوں جس کے پاس چمڑا تو بہت ہے لیکن وہ جوتا بنوانے والے کے پیر کے ناپ کا چمڑا کاٹتا ہے (سامعین کی صلاحیت کے اعتبار سے کلام کرتا ہوں ورنہ کلامِ حکمت کی میرے پاس کمی نہیں ہے)۔

سایۂ شخصم واندازۂ او   قامتش چند بود چندانم

میں ایک شخصیت کا سایۂ انداز ہوں۔ میں بس اتنا ہی ہوں جتنی اس کی قامت ہے "

عطا بقدرِ ظرف

ایک جاندار ایسا بھی ہے جو زمین پر زندگی بسر کرتا ہے لیکن تاریکی میں رہتا ہے۔ اس کے نہ کان ہیں نہ اس کی آنکھیں کیونکہ جس جگہ وہ رہتا ہے وہاں نہ آنکھ کی احتیاج ہے اور نہ کان کی ضرورت۔ اس حیوان کو ان نعمتوں سے سرفراز نہ کیئے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کارخانۂ قدرت میں ان کی کمی ہے یا (نعوذ باللہ) بخل کی وجہ سے اس کو یہ چیزیں عطا نہیں کی گئی ہیں بلکہ اس میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ وہ جس کو جو چیز عطا فرماتا ہے وہ اس کی ضرورت کے مطابق ہوتی ہے! اس طرح اگر کسی کو کوئی چیز غیر ضروری طور پر مل جائے تو یہ غیر مناسب ہوگی! اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کے الطاف اس پر بار بن جاتے ہیں (جونکہ غیر ضروری ہوتے ہیں) مصلحت ایزدی یہ گوارہ نہیں کرتی کہ اس کی نعمتیں کسی کے لئے بار اور غیر ضروری ہوں۔ مثلاً درزی کو بڑھئی کے اوزار یعنی آری اور بسولہ دیکر یہ کہا جائے کہ تم ان سے کام کرو تو کام اس کے لئے ناممکن ہوگا۔ کیونکہ وہ ان کے ذریعے کام کر ہی نہیں سکتا لہٰذا اس کو ان اوزاروں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور وہ اس کے لئے غیر ضروری اور بیکار ہیں! اسی لئے خالقِ کائنات ہر شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق چیزیں عطا فرماتا ہے۔

حشرات الارض جو ظلمت اور تاریکی میں زمین کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں وہ بھی تو مخلوق ہیں۔ دنیا کی اس ظلمت اور تاریکی پر قانع ہیں اور اس پر راضی۔ وہ بیرونی دنیا کی زندگی کے مشتاق نہیں ہیں! اس لئے تمہاری آنکھ اور تمہارے کان ان کے کس کام کے۔ وہ

اپنے تمام کام اپنی چشم احساس سے نکالتے ہیں اور بصارت کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے ۔ اور اگر بصارت انہیں مل بھی جائے تو وہ ان کے لئے بیکار ہوگی (اسی لئے انہیں بصارت نہیں دی گئی)۔

تا ظن نبری کہ رہ رواں نیز نیند   کامل صفتان بے نشاں نیز نیند
زیں گونہ کہ تو محرم اسرار نۂ   می پنداری کہ دیگراں نیز نیند

تمہارے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ راستہ چلنے والے نہیں ہیں۔ تمام صفات کے حامل کچھ بے نشان لوگ اب بھی ہیں ۔ چونکہ تم حامل اسرار نہیں ہو اسی لئے تمہارا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی حاملِ اسرار نہیں ہے (حالانکہ ایسا نہیں ہے)

غفلت اور بیداری | یہ کار خانہ عالم اسی غفلت کے بل پر قائم ہے کہ اگر غفلت نہ رہے تو یہ عالم (ناسوت) باقی نہ رہے ۔ اور اس عالم (ملکوت ولاہوت) کے معمار محبت الہٰی ، آخرت کی یاد ، سُکر (بیخودی) اور وجد ہیں! اگر یہ سب ہم کو حاصل ہو جائیں تو ہم کلیتہً اُس عالم ہی کے ہو جائیں ۔ اور پھر یہاں کی اس دنیا میں نہ رہیں (اور دنیا سے قطع تعلق کر لیں) اور حق تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں رہیں تاکہ دونوں عالم باقی رہیں (اس دنیا کا سلسلہ بھی قائم رہے) پس اس نے ان دونوں گروہوں کے لئے دو صاحب خانہ مقرر فرمائے (اس عالم کے لئے) غفلت اور (اُس عالم کے لئے) بیداری ۔ تاکہ ان دونوں سے دونوں عالم معمور اور آباد رہیں۔

فصل

شخصی تعریف و تعظیم کی مذمت

حضرت مولاناؒ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اگر میں آپ کی مہربانیوں اور نوازشوں اور آپ کی ان مساعی کا جو حاضر و غائب میں بسلسلہ تربیت آپ سے ظہور میں آتی ہیں شکریہ ادا کرنے اور آپ کی تعظیم و تکریم بجالانے میں مجھ سے جو کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں ان کی عذر خواہی میں مجھ سے جو بظاہر تقصیر ہوتی ہے تو وہ بر بنائے کبر و غرور نہیں ہے اور نہ یہ سبب ہے کہ مجھ کو آپ کے لئے فرصت نہیں ہے ۔ اس میں میری مصروفیت کار فرما ہے یا مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ

منعم اور ولی نعمت کی نوازشوں کو قول و عمل سے کس طرح سراہا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے پاکیزہ عقائد و خیالات سے مجھ کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کا عقیدہ اور طریقہ کار یہ ہے کہ آپکے یہ سارے کام محض اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے حصول کے لئے ہوتے ہیں تو میں نے بھی معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ تاکہ اس کی معذرت بھی وہی قبول کرے پس اگر میں اپنی زبان سے کچھ کہوں، تعریف و توصیف کے کلمات ادا کروں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ جس بات کا اجر آپ کو اللہ رب العٰلمین سے ملنا چاہیئے اس میں سے کچھ آپ کو مل گیا ہے (کہ میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے) کچھ مساعی کا بدلہ آپ کو مل گیا۔ یہ تواضع اور عذر خواہی تعریف و توصیف دنیاوی لذتیں ہیں۔ آپ دنیا میں مال خرچ کرتے ہیں اور اپنے منصب سے فائدہ پہونچاتے ہیں اور دوسرے کاموں میں محنت و مشقت برداشت کرتے ہیں تو سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ آپ اس کا کلیتہً اجر اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل کریں۔ اور میں اسی وجہ کر عذر خواہی نہیں کرتا کیونکہ عذر خواہی دنیاوی معاملات سے متعلق ہے کیونکہ مال کو کھایا نہیں جاتا۔ اور وہ خود مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ دولت اور مال سے (چیزوں کو) غلام اور کنیزوں کو خریدا جاتا ہے۔ اور جاہ و منصب کو طلب کیا جاتا ہے تاکہ مالداروں کی تعریف کی جائے دنیا اسی کا نام ہے کہ مالدار کو بڑا اور محترم سمجھا جائے۔ اور اس کی مدح و ثنا ہو۔

شیخ نسّاج بخاری کی بصیرت

شیخ نسّاج بخاری ایک بزرگ شخص تھے۔ بڑے بڑے صاحب دل، دانشور اور بزرگ ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے! وہ ان کی خدمت میں مؤدب اور دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔ باوجود ان خصوصیات کے شیخ (نسّاج) علوم ظاہری سے بے بہرہ تھے۔ حاضرین چاہتے تھے کہ آپ سے تفسیر حدیث اور معرفت کے رموز سنیں۔ شیخ نساج فرماتے تھے کہ میں عربی نہیں جانتا تم کسی آیت یا حدیث کا ترجمہ پڑھو تو میں اس کے بارے میں کچھ بیان کروں۔ چنانچہ تفسیری نکات کے طالب آیت قرآنی کا ترجمہ ان کو سنا دیا کرتے تھے اور شیخ نسّاج اس آیت سے متعلق اس طرح تفاصیل بیان فرماتے تھے کہ سیدعالم صلے اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے وقت فلاں مقام پر تھے اور اس مقام کی تمام کیفیات و حالات پر سیر حاصل روشنی ڈالتے اور یہی نہیں بلکہ اس مقام کے

جغرافیائی حالات، اس مقام کا مرتبہ، اس کے راستے اور اس کی بلندی کو نہایت تفصیل سے بیان فرماتے تھے۔

ایک روز ایک علوی شخص نے جو مُعّرف چوبدار تھا (یہ وہ ٹوکول افسر کی خدمات انجام دیا کرتا تھا) شیخ نساج کی مجلس میں ایک قاضی کی تعریف کی کہ ایسا قاضی خطۂ زمین پر نہ ہوگا۔ رشوت نہیں لیتا ہے نہایت دیانت کے ساتھ خلوص سے لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کرتا ہے۔

اس کی باتیں سُن کر شیخ نساج نے فرمایا کہ تم یہ کہتے ہو کہ وہ رشوت نہیں لیتا یہ خود ایک جھوٹ ہے۔ تم علوی نسبت رکھتے ہو اور خانوادۂ نبوت سے ہونے کا شرف رکھتے ہو پھر بھی اس کی تعریف و توصیف کر رہے ہو اور اس کے گن گا رہے ہو کیا یہ رشوت نہیں ہے اس سے بڑی اور کیا رشوت ہوگی کہ تم اس کے سامنے اس کی تعریف کر رہے ہو۔

فصل

"علم اور اس کا اظہار"

حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ شیخ الاسلام ترمذیؒ نے ایک موقع پر ارشاد کیا کہ سید برہان الدین بہت ہی پُر معرفت گفتگو کرتے ہیں۔ تو اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ مشائخ کی تصانیف، ان کے مقالات اور ان کے اسرار و عوارف کا مطالعہ بہت زیادہ کرتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے شیخ ترمذیؒ سے کہا کہ آپ بھی تو ایسی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ ان کی طرح اسرار و غوامض کو کیوں نہیں بیان کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں جد و جہد کی ہے ان کے دل میں طلب اور تڑپ ہے اور وہ اس کی مشق و محنت میں مشغول رہتے ہیں۔ اس شخص نے کہا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ اور مطالعہ سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس کو بیان نہیں کرتے؟

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اصل تو عالَم باقی ہے ہم اسی کی گفتگو کرتے ہیں تم بھی اسی کی گفتگو کرو ان حضرت کے دل میں اُس عالم (باقی) کی طلب اور تڑپ نہیں تھی اُن کا دل کلیتہً اس دنیا سے لگا ہوا تھا۔

یوں سمجھ لو کہ بہت سے لوگ اس دنیا میں محض کھانے پینے کے لئے آتے ہیں (ان کی ہمت صرف اسی میں مشغول ہے) بہت سے لوگوں کا مطمح نظر محض دنیا کی دید اور تماشائے جہاں ہے

ایسے لوگ بس یہ چاہتے ہیں کہ ایسے عوارف و معارف کو سیکھ لیں اور اس کے ذریعہ اپنی دوکان چمکائیں
یہ عوارف تو ایک عروس اور حسین معشوق کی طرح ہیں۔ دیکھو بہت سے لوگ حسین
لونڈیاں خریدتے ہیں محض بیچنے کے لئے تو ایسی خوبرو کنیز کو اس شخص سے کیا محبت پیدا
ہو سکتی ہے! اور اس کو اس سے کیا وابستگی ہوگی جبکہ اس تاجر کی تمام تر لذت کا انحصار اس کنیز
کے فروخت کرنے پر ہے وہ تو ایک بے حس ہے جس نے لونڈی کو محض فروخت کرنے کے لئے خریدا ہے
اس کے اندر وہ مردمی ہے ہی نہیں کہ اس کنیز کو اپنے لئے خریدتا (اس سے قربت کرتا اور اس
کی محبت اس کے دل میں گھر کر جاتی)۔ ایک ہیجڑے کے ہاتھ اگر شمشیر ہندی لگ جائے تو وہ
اس کو بیچنے کے سوا اس کا اور کیا کریگا؟ یا کسی پہلوان کی کمان اس کو مل جائے تو وہ بھی اس کے
لئے بیکار ہے۔ بیچ ہی ڈالے گا۔ چونکہ وہ اس کمان کو کھینچنے اور اس کا چلّہ چڑھانے کی طاقت ہی
نہیں رکھتا اس کی چٹکی اس کمان کی زہ (چلّہ) کے لائق نہیں اس نے اگر چلّہ پسند ہی کیا تو کیا حاصل
وہ تو اس کو بیچ ہی ڈالے گا۔ اور بیچ کر اس کی قیمت سے وہ مخنث اپنے لئے غازہ و (گلگونہ)
اور وسمہ خریدے گا۔ اور اس کے سوا وہ کریگا بھی کیا۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اس سے بہتر اور خرید
بھی کیا سکتا ہے۔

یہ جو کچھ میں نے کہا اس کو یوں خیال کرو کہ وہ سریانی زبان کی گفتگو ہے تم اس کے بارے میں
یہ خیال نہ کرنا کہ ہم نے اس کو سمجھ لیا ہے۔ تم نے اس کو جتنا بھی سمجھا ہوگا اتنے ہی اصل مفہوم سے دور ہو گئے
اس کا فہم فضول اور بے قیمت سی چیز ہے بلکہ اس کی سمجھنا تمہارے لئے ایک بلا اور مصیبت ہے بلکہ تمہارے لئے
ایک بند ہے اس سے رہائی حاصل کرو تاکہ تم کچھ بن جاؤ۔ تم کہتے ہو کہ ہم مشک کو دریا سے بھرتے ہیں
اور دریا مشک میں سما جاتا ہے، یہ بات ناممکن اور محال ہے بلکہ یہ بات حقیقت سے قریب
اور قرین قیاس ہوگی کہ: (مشک دریا میں ڈوب گئی (اس طرح تم اس بات میں ڈوب جاؤ بجائے
اس کے کہ تم کہو کہ وہ بات ہم سمجھ گئے ہیں) اصل اور حقیقت یہی ہے۔

عقل اور اس کا استعمال

عقل بس اسی قدر خوب ہے اور اتنی ہی وہ مطلوب ہونا چاہیئے کہ وہ تم کو بارگاہ شاہی تک پہونچا دے جب
تم درِ شاہی تک پہونچ جاؤ تو پھر اس کو چھوڑ دو کہ اب عقل کا کام نہیں بلکہ اس سے کام لینا زیاں

کا باعث ہے۔ اب وہ (تمہاری راہ نما نہیں بلکہ) تمہاری راہزن ہے۔ جب تم اس سلطان (مالک حقیقی) تک پہونچ گئے تو اب خود کو اسی بادشاہ کے سپرد کردو۔ اب چون وچرا کا یہاں کام نہیں ہے۔ مثلاً بغیر قطع کئے ہوئے کپڑے سے تم قبا یا جبّہ تیار کرنا چاہتے ہو تو عقل کا بس اتنا کام ہے کہ وہ تم کو درزی کے پاس لے جائے، بس عقل کا کام یہیں تک مناسب اور دُرست تھا کہ وہ تم کو درزی تک لے آئی اب یہاں پہونچ کر عقل کو چھوڑ دو۔ درزی کے پاس پہونچ کر اپنے تصرف اور اپنی عقل کو ترک کر دینا چاہیئے۔ (اب درزی جس طرح چاہے گا اس کپڑے کو قطع کرے گا اور سیئے گا)۔

اسی طرح بیمار کے لئے عقل بس اسی قدر مناسب ہے کہ وہ اس کو طبیب تک پہونچا دے۔ عقل کا کام بس یہاں ختم ہو گیا۔ یہاں پہونچ کر خود کو طبیب کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

دل کی آواز سننے والے

رفیقان نعرہ ہی تمہارے نعرہ ہائے باطنی کو سنتے ہیں جس شخص کے باطن میں کوئی خوبی ہوتی ہے یا اس کے اندر طلب یا تڑپ ہوتی ہے وہ ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ دیکھو اونٹوں کی قطار میں اگر کوئی شوخ و سرمست اونٹ ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں سے اس کی رفتار اور اس کے منہ کے جھاگوں سے اس کی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی کی جانب اشارہ ہے

" سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (فتح ع ۴) ان کے چہروں سے سجدہ کے نشان ظاہر ہیں۔

درخت کی جڑ کو جو غذا ملتی ہے وہ درخت کی شاخوں پھلوں اور پتوں کی شکل میں ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر کوئی جڑ غذا حاصل نہیں کرتی تو وہ درخت پژمردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ہا و ہو کے نعرے جو اہل دل بلند کرتے ہیں اس کا راز یہ ہے کہ یہ لوگ ایک ہی بات سے بہت سی باتوں کا علم حاصل کر لیتے ہیں اور ایک حرف اور اشارہ سے بہت سے مضامین اور مفاہیم تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور یہ بات ایسی ہے کہ جس نے وسیط اور مطول اور تنبیہ پڑھی ہیں تو ایسا شخص جب کوئی کلمہ سنتا ہے تو چونکہ وہ اس کی شرح پڑھ چکا ہے تو وہ اسی ایک کلمہ سے اس کی اصل کو اور اس سے متفرع ہونیوالے بہت سے مسائل کو سمجھ لیتا ہے! اسی طرح صاحب

دل ایک کلمہ تنبیہہ یہ ہائے وہو کرنے لگتا ہے! اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کا اظہار کر رہا ہے کہ میں اس کلمہ میں جو راز و حقائق پنہاں ہیں ان کو دیکھ رہا ہوں (ان کو سمجھ رہا ہوں) اور یہ وہی مقام ہے کہ وہاں تک پہونچنے کے لئے میں نے بہت ہی تکلیفیں اٹھائی ہیں اور دکھ برداشت کئے ہیں تب پھر حقائق کے خزانے حاصل ہوئے ہیں۔ ارشادِ ربّانی ہے۔

الم نشرح لک صدرک (پارہ عم سورۃ الانشراح)۔ "کیا ہم نے آپ کے سینے کو نہیں کھولدیا"۔

اس شرح صدر کی کوئی انتہا نہیں ہے جس نے اس شرح کو پڑھا ہے تو اس رمز سے ہی بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن مبتدی اس لفظ سے وہی معنی سمجھ سکتا ہے جو اس کو معلوم ہیں! اس کے تحت جو حقائق و مفاہیم کے ذخیرے پنہاں ہیں اُن کو وہ کیا سمجھے۔ جو بات کہی جاتی ہے اس کا فہم سننے والے کی صلاحیت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ وہ اس کو اپنے اندر جس قدر جذب کرتا ہے اور اس سے غذا حاصل کرتا ہے اتنی ہی اس کی حکمت و دانش میں ترقی یا اور افزونی ہوتی ہے اور جب اس کلمہ کو اپنے اندر جذب نہیں کرے گا تو نہ اس کے اندر حکمت پیدا ہوگی اور نہ اس کا اظہار اس سے ہوگا اس وقت اس کا یہ کہنا کہ معرفت و حکمت میری زبان سے ادا کیوں نہیں ہوتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ تو کلماتِ حکمت (حقائق معرفت) کو اپنے اندر جذب کیوں نہیں کرتا۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جس نے تجھے قوتِ استماع عطا نہیں کی ہے اسی نے عارفانہ گفتگو کرنے والے کو سخن گوئی کا داعیہ بھی عطا نہیں فرمایا ہے۔

ایک عجیب نکتہ

دورِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک با صلاحیت صحابی ایک کافر کے غلام تھے۔ ایک صبح آقا نے ان غلام صحابی سے کہا کہ طشت اٹھاؤ تاکہ حمام چلیں جب دونوں مسجد کے سامنے سے گزرے تو دیکھا کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں صحابہؓ کے ساتھ نمازِ فجر ادا فرما رہے تھے۔ صحابی نے اپنے آقا سے کہا اللہ کے لئے تھوڑی دیر کو یہ طشت سنبھالو میں دو رکعت نماز ادا کرلوں اس کے بعد اپنے کام پر چلیں گے۔ آقا نے طشت لے لیا۔ غلام صحابی مسجد میں چلے گئے۔ نماز پڑھی لیکن مسجد سے باہر نہ آئے۔ اور حضور علیہ السلام صحابہؓ کے ساتھ نماز ادا کرکے مسجد سے تشریف لے گئے۔ آقا نے غلام کا بہت دیر تک انتظار کیا یہاں تک کہ چاشت کا وقت ہوگیا (ایک پہر گزر گیا)۔

تو اُس نے آواز لگانی شروع کی کہ اے غلام ! باہر آ۔ اندر سے غلام کی آواز آئی کہ مجھے چھوڑتے ہی نہیں (میں کیسے آؤں) تو کافر آقا نے دروازہ سے سر اندر کیا (جھانکا) تاکہ یہ معلوم کرے کہ وہ کون ہے جو غلام کو نہیں چھوڑ رہا ہے۔ جب اس نے اندر دیکھا تو وہاں اسکو کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اس نے غلام سے کہا کہ بتا وہ کون ہے جو تجھے نہیں چھوڑتا (یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے) غلام نے کہا کہ مجھے وہی نہیں چھوڑتا جو تجھے مسجد میں نہیں آنے دیتا (یعنی خداوند عالم) وہ وہی ذات ہے جس کو تو نہیں دیکھ رہا ہے۔

انسان تو ہمیشہ اسی چیز کا عاشق و فریفتہ ہوتا ہے جس کو اس نے نہیں دیکھا۔ (ان دیکھی چیز ہی کا شوق دید ہوتا ہے) اور نہ سنا ہے اور نہ اس کو سمجھا ہے۔ باینہمہ وہ شب و روز اس کی طلب میں لگا رہتا اور یہی کہتا ہے سہ بندۂ آنم کہ نمی بینمش

میں تو اسی کا غلام اور اسی کا بندہ ہوں جس کو نہیں دیکھتا ہوں۔

ثمرۂ رویت

لیکن جس نے سمجھ لیا یا دیکھ لیا وہ ملول اور گریزاں ہے (اس میں پھر وہ شوق باقی نہیں رہتا) اور یہی سبب ہے کہ فلاسفہ رویت باری سے انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر مجھے رویت ہوجائے تو ممکن ہے دید سے سیر ہوجائے اور پھر کیف حاصل نہ ہو لیکن ان کا یہ کہنا ناروا ہے (کہ رویت کے بعد ملال حاصل ہوگا) جب کہ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے جب کہ وہ ہر لحظہ میں سو طرح سے جلوہ نما ہے۔ کل یوم ھو فی شان (رحمٰن ع ۲) "ہر دن اُس کی نئی شان ہے"۔

اگر وہ ہزار سال تجلیاں فرماتا ہے تو ہر تجلی ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ تم تو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ آثار میں افعال میں لیکن ہر لحظہ گوناگوں انداز میں دیکھتے ہو۔ مسرت کے موقع پر کسی اور قسم کی تجلی ہوتی ہے اور رنج والم کے موقع پر دوسرے رنگ کی تجلی ہے۔ خوف کی کیفیت میں اور انداز ہے اور رجا کی کیفیت میں انداز تجلی اور ہے۔

جب تجلیٔ صفات حق کے اِن افعال و آثار میں مختلف انداز ہیں جو ایک دوسرے سے

مماثل نہیں تو تجلّی ذات بھی تجلی صفات کی طرح مختلف انداز کی ہوگی۔ خود تمہاری ذات بھی قدرتِ خداوندی کا نمونہ ہے۔ ایک لمحہ میں ہزار رنگ بدلتے ہیں۔ یک رنگی نہیں ہے۔

قرآن کے ذریعہ خدا تک رسائی

اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو قرآن کریم کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کرتے ہیں لیکن بعض ایسے خواص بھی ہیں جو خدا کے پاس سے آتے ہیں اور قرآن مجید کو یہاں پاتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس کو خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون" (حجر ع ۱) (قرآنِ کریم کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں)۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت قرآنِ کریم کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔ یہ بھی درست ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تیری ذات میں جو گوہر طلب و شوق ودیعت کیا گیا ہے اس کی حفاظت کی جاتی ہے اور اس کو منزلِ مقصود تک پہونچایا جائے گا۔ اور اس کو ضائع نہیں کیا جائیگا۔ تو ایک بار اللہ کہدے اور اس پر استقامت کر تمام بلاؤں سے مامون ہو جائے گا۔

ثمرۂ محبّت

ایک صاحب نے خدمت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں آکر عرض کیا یا رسول اللہ انی احبّک ﷺ، اے اللہ کے رسول میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا خوب غور کرلو کیا کہہ رہے ہو۔ ان صاحب نے پھر اپنے قول کا اعادہ کیا تو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب (دعویٰ) پر استقامت دکھانا کہیں ایسا نہ ہو کہ خود مجھے تم کو تمہارے ہی ہاتھوں قتل کرانا پڑے (اگر اس دعویٰ سے پھر گیا تو مرتد ہو جائیگا اور مرتد کا قتل واجب ہے)۔ تجھ پر حیف (کہ ایسا دعویٰ بے سوچے سمجھے کر رہا ہے)۔

ایک اور صاحب خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں آپکے دین کو پسند نہیں کرتا عاجز ہو گیا ہوں اور خدا کی قسم میں تو اس دین کو نہیں چاہتا اب اسے آپ واپس لے لیں۔ جب سے آپ کا دین اختیار کیا ہے ایک دن بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ مال گیا۔ زن و فرزند چھٹے۔ نہ عزت و نشان باقی رہی۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایسا ناممکن ہے میرا دین

جہاں بھی گیا وہاں سے واپس نہیں آیا جب تک (برائیوں) کو بیخ و بن سے نہ اکھاڑ دے اور (کفر کے) گھر میں جھاڑو پھیر کر اسے صاف نہ کر دے "لا یمسہ الا المطہرون" (واقعہ ع ۳) پاک لوگوں کے سوا اس کو کوئی نہیں چھوتا (اس کو جس نے چھوا وہ پاک و صاف ہو گیا۔

معشوق کے انداز

وہ کیسا معشوق ہے؟ کہ جب تک تجھ میں اپنی ذات کی محبت سرِ مُو باقی رہتی ہے وہ اپنا دیدار نہیں کراتا اور تجھے اپنے وصل کے قابل نہیں سمجھتا اور تجھے اپنی راہ نہیں دکھاتا۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ خود اپنی ذات سے اور ساری دنیا سے بیزار ہو کر اپنی ذات کا دشمن ہو جا تاکہ دوست کی زیارت نصیب ہو جائے۔ ہمارا دین جس دل میں بھی راسخ ہو جائے تو وہ جب تک اس کو حق کی راہ نہ دکھا دے اور غیر ضروری چیزوں سے بالکل اس کو پاک و صاف نہ کر دے اس کو چھوڑتا نہیں۔

اسی لئے سیّد عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس شخص سے جو دین کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا فرمایا کہ تیرے آسودہ خاطر نہ ہونے اور گرفتارِ غم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ غم کھانا بھی خوشیوں اور مسرّتوں کی قے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک معدہ بھرا ہوا ہے تجھے کھانے کو کچھ نہیں دیا جائے گا اور استفراغ کے وقت (قئے) کوئی غذا کھانے کے لئے نہیں دی جاتی ہے البتہ قئے کے بعد کچھ کھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اب تو صبر کر اور غم کھا کیونکہ غم کھانا استفراغ (قئے) کی طرح سے ہے! اس قئے کے آنے کے بعد مسرّتوں کا حصول ہو گا! اور ایسی مسرتیں کہ ان کو غم لاحق نہ ہو گا جس پھول کے ساتھ کانٹا نہیں اور جس شراب میں خمار نہیں نہ تو اس کو پھول کہیں گے اور نہ اس کو شراب (پھول وہی ہے جس کے ساتھ خار ہو اور شراب وہی ہے جس کے ساتھ خمار ہو)۔

دنیا میں آرام و آسائش کہاں؟

تو دنیا کی زندگی میں آرام و آسائش چاہتا ہے جس کا حصول دنیا میں ممکن نہیں اور تو اس کی طلب سے ایک لحظہ و لمحہ بھی غافل نہیں! وہ راحت و آرام جو تجھے دنیا میں میسّر آتا ہے وہ بجلی کی طرح سے ہے جو ایک لحظہ کے لئے چمکتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے اور بجلی

بھی کیسی جس کے ساتھ ژالہ باری، موسلادھار بارش اور برف باری کی زحمتیں ہیں۔

منزلِ مقصود اور سیدھا راستہ

اگر کوئی شخص انطاکیہ جانے کا ارادہ کرے اور قیصریہ کا راستہ اختیار کرکے یہ سمجھے کہ وہ انطاکیہ پہونچ جائے گا تو یہ اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ ممکن نہیں کہ وہ اس راستہ سے انطاکیہ پہونچ جائے بجز اس کے کہ وہ انطاکیہ کا راستہ اختیار کرے۔ چاہے سفر کرنے والا لنگڑا لولا اور ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ کبھی نہ کبھی طرح انطاکیہ پہونچ جائیگا کہ یہ راستہ وہیں پر ختم ہوتا ہے۔ جب دنیا کا کاروبار محنت کے بغیر مکمل نہیں اسی طرح آخرت کی کامیابی محنت و مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی لہٰذا دنیا کے حصول میں محنت کرنے کی بجائے اپنی توانائیاں آخرت کے حصول میں صرف کرتا کہ دنیا کی خاطر تیری محنت ضائع نہ ہو۔ تو نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ کہہ تو دیا کہ اپنا دین مجھ سے واپس لیلیں کیونکہ میرا عیش و آرام اس کے سبب ختم ہو چکا ہے۔ (حضور علیہ الصوۃ والسلام نے فرمایا) کہ ہمارا دین کسی کو کسطرح چھوڑ سکتا ہے جبتک اس کا مقصود حاصل نہ ہو جائے۔

کمبل نہیں چھوڑتا

کہا جاتا ہے کہ ایک استاد نے سردی کے موسم میں غریبی کے باعث سوتی جبّہ بغیر استر کا پہن رکھا تھا اسی اثنا میں بارش کی زیادتی کی وجہ سے دریا میں سیلاب کی کیفیت تھی۔ سیلاب پہاڑ سے اپنے ریلے میں ایک ریچھ کو بھی بہا لایا تھا! اس کا سر پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاگردوں نے ریچھ کی پیٹھ دیکھ کر استاد سے کہا کہ آپ سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں دیکھئے وہ دریا میں ایک کمبل بہتا ہوا آرہا ہے اگر ممکن ہو تو اس کو حاصل کرلیں۔ استاد نے ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگادی۔ تاکہ اس کمبل کو پکڑ کر نکال لائے لیکن وہ تھا ریچھ۔ وہ استاد سے لپٹ گیا اور استاد پانی کے اندر اس کی گرفت میں آگئے۔ شاگردوں نے استاد کو آوازیں دیں کہ اگر کمبل قابو میں نہیں آتا تو آپ اس کو چھوڑ کر باہر آجایئے! استاد نے جواب دیا، بچو! میں نے کمبل کو تو چھوڑ دیا ہے لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ کیا کروں؟۔

اسی طرح خدائے تعالیٰ کی ذات کا ذوق و شوق ہمیں کہاں چھوڑتا ہے اور یہ بات موجب
شکر و ستائش ہے کہ ہم اپنے اختیار میں نہیں ہیں۔ بلکہ قدرت حق کے اختیار میں ہیں جس طرح
شیر خوارگی کے عالم میں بچہ ماں کے دودھ کے علاوہ کچھ اور نہیں جانتا (لا لہٗ الا صیحۃ
داس کے پاس رونے چیخنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے) مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس حال میں نہیں چھوڑا
پہلے وہ انگوٹھا چوستا اور کھیل کرتا رہتا تھا پھر اللہ نے رفتہ رفتہ اس کو نشو و نما دے کر مقام
عقل تک پہنچا دیا۔ اسی طرح اس مقام سے بھی نکال کر وہ ہمیں اس عالم میں پہنچائے
گا جس کے مقابلے میں ہمارا موجودہ عالم سراسر عالم طفلی ہے۔ عالم آخرت تو ایک اور ہی
باغ ہے جب وہاں پہنچو گے تب معلوم ہوگا کہ ہم کس طفلی کے عالم میں پڑے تھے (ایسے ہی موقع
پر کہا گیا ہے کہ) عجبت من قوم یجرّون الی الجنۃ الخ مجھے خوشی ہے کہ لوگ قیدیوں کی طرح
پابند سلاسل کر کے جنت کی طرف گھسیٹے جا رہے ہیں کہ ڈالو ان کے گلے میں طوق، دھکیلو ان کو
جنۃ النعیم میں، پھر لیجاؤ ان کو عالم وصال میں، پھر پہنچاؤ ان کو جمال و کمال کے حلقے میں
غور کرو! کہ جب مچھلی کے حلق میں شکاریوں کا کانٹا پھنس جاتا ہے تو اس کو
ایکدم نہیں کھینچتے بلکہ اس کو رفتہ رفتہ ٹھہر ٹھہر کر کھینچتے ہیں تاکہ وہ اپنا زور لگا کر سست
اور کمزور ہو جائے پھر اس کے بعد اس کو پکڑ لیتے ہیں۔ اسی طرح عشق کا کانٹا جب انسان
کے حلق میں پھنس جاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کو بتدریج کھینچتا ہے تاکہ اس کے اندر جو باطل کی
قوتیں اور خصلتیں ہیں ایک ایک کر کے اس سے زائل ہو جائیں (تم اس آیت پر غور کرو کہ)
واللہ یقبض و یبسط (البقرہ ۲۴۲) اللہ تعالیٰ ہی تنگی اور فراخی پیدا فرماتا ہے۔

ایمانِ عام اور ایمانِ خاص

لا الٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) ایمان عام ہے۔ اور لا الٰہ الا ھو (اس (اللہ تعالیٰ) کے
سوا کچھ موجود نہیں) یہ عقیدہ ایمان خاص ہے جس طرح ایک شخص خواب دیکھتا ہے کہ وہ بادشاہ

یہ قول گویا قرآن مجید کے اس لہجے میں ہے جو مشرکین و کافرین کے لئے سورہ حاقہ،
سورہ دہر، سورہ مومن اور سورہ زمر میں ادا ہوا ہے، مولانا قرآن مجید کے لہجے
اور تیور کو بھی عجیب عجیب انداز سے ادا فرما جاتے ہیں۔

بن گیا ہے اور تخت شاہی پر بیٹھا ہے۔ غلام، دربان اور امرا اس کے اطراف میں موجود ہیں اب وہ کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں اور میرے سوا اور کوئی بادشاہ نہیں ہے لیکن جب وہ خواب سے بیدار ہوتا ہے تو گھر میں اپنے سوا کسی کو نہ پاکر کہتا ہے کہ اب تو تنہا میں ہی ہوں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تو اس شخص کے لئے چشم بیدار کی ضرورت ہے خوابناک آنکھ سے اس کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا اس میں یہ صلاحیت کہاں ؟۔

حقانیت کے دعوے

ہر گروہ یہ کہتا ہے کہ میں راہ راست پر ہوں اور حقانیت ہمارے ساتھ ہے اور وہ ایک دوسرے کے دعاوی کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وحی الٰہی کے مطابق ہمارا یہی طریقہ ہے اور دوسرے عقیدۂ باطلہ کے متبع ہیں یوں بہتر (۷۲) فرقے ایک دوسرے کے خلاف غلط عقیدہ کا الزام لگاتے ہیں اس طرح تمام کے تمام اس بات پر تو متفق ہیں کہ ہمارے علاوہ دوسرے گروہ کا عقیدہ وحی کے مطابق نہیں ہے لیکن اس بات پر بھی سب متفق ہیں کہ ان گروہوں میں ایک ہی گروہ ایسا ہے جس کا عقیدہ وحی کے مطابق ہے اب ایک شخص ایسا چاہیے جو یہ فیصلہ کر دے کہ ان میں وہ ایک کونسا گروہ ہے جس کا عقیدہ وحی کے مطابق ہے۔

اَلمؤمن کیّسٌ فطنٌ ممیّز "(مومن ہی ممیز حقیقت اور صاحب ادراک ہے)۔

ایمان ہی سراپا تمیز و ادراک ہے۔ اور حق و باطل کے درمیان وہی امتیاز کر سکتا ہے۔

ذوق حقیقت کا عکاس ہے

عرض کیا گیا کہ حقیقت شناس تعداد میں کم ہیں اور نہ جاننے والے کثرت سے ہیں۔ پس ہم ان لوگوں میں جو نہیں جانتے اور جوہر تمیز نہیں رکھتے اور جو جانتے ہیں اور جوہر تمیز رکھتے ہیں (صاحب تمیز ہیں) اگر امتیاز کی کوشش کریں تو بہت وقت درکار ہوگا! حضرت مولاناؒ نے ارشاد فرمایا کہ نہ جاننے والے لوگ بکثرت ہیں اور تم نے ان معدودے چند (اصحاب بصیرت) کو جان لیا تو سمجھ لو کہ تم نے سب کو پہچان لیا۔ کیونکہ گندم کے ڈھیر کی صرف ایک مٹھی سے سارے ڈھیر کے بارے میں معلوم کر لیا جاتا ہے اسی طرح اگر تم شکر کے ذائقہ سے واقف ہو تو اگر شکر سے سینکڑوں طرح کے حلوے پکائے

جائیں اور تم کو پیش کئے جائیں تو تم اس کے ذائقہ کو معلوم کر لو گے کہ تم شکر دان سے شکر چکھ کر اس کا ذائقہ معلوم کر چکے ہو۔ تمہارے لئے اب بہ غرض شناخت مزید شکر کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جو ایک شکر پارے سے شکر کو نہ پہچان سکا تو اس کے لئے دوسری ڈلی کی ضرورت ہوگی۔ تم کو اگر میری یہ بات سخن گسترانہ اور مکرر معلوم ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پہلے سبق کو نہیں سمجھا۔ پس ہمارے لئے ضروری ہوگیا کہ ہم ہر روز اس کا اعادہ کریں تاکہ تمہیں سمجھنے کا موقع ملے۔ اس کے متعلق ایک حکایت سنو! ایک معلّم کے پاس ایک لڑکا پڑھنے کے لئے آیا۔ تین مہینہ گزرنے کے بعد بھی اس کا سبق "الف" سے آگے نہ بڑھا تو اس کے والد نے معلم سے آکر کہا کہ ہم نے آپ کی خدمت میں کونسی کوتاہی کی ہے کہ جس کی وجہ سے آپ کی توجہ بچہ کی طرف نہیں کیونکہ تین مہینہ سے اس کا سبق "الف" سے آگے نہیں بڑھا ہے معلم نے کہا کہ تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے لیکن لڑکا ہی اس کا اہل نہیں کہ اس کو آگے سبق دیا جائے۔ چنانچہ باپ کی موجودگی میں بچّہ کو پڑھانے لگا اور کہا پڑھو "الف" پر کوئی نقطہ نہیں۔ لڑکے نے کہا نقطہ نہیں اور الف کا تذکرہ ہی نہیں کیا اب معلّم نے شاگرد کے باپ سے کہا کہ اب تم ہی بتاؤ کہ اُس نے آج تک پہلا سبق ہی نہیں یاد کیا تو میں اس کو آگے کس طرح پڑھاؤں؟۔

شکرِ نعمت | حضرت مولاناؒ نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِین کہا اور پھر حاضرین سے فرمایا کہ ہم نے جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِین ابھی کہا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نان و نعمت میں کمی آگئی ہے (اور ہم الحمد للہ کہہ کر طالب نان و نعمت ہیں) بلکہ نان و نعمت بے حد اور بے حساب موجود ہے۔ یہاں تک کہ اب اشتہا باقی نہیں رہی اور سب مہمان سیر ہوگئے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِین تو اس لئے کہا گیا ہے کہ دنیا کی نان و نعمت کی اشتہا باقی نہیں رہی کہ اس دنیا وی نان و نعمت کو تو (بربنائے مرض) بغیر بھوک کے زبردستی بھی کھا لیتے ہیں (بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی) کہ دنیاوی نان و نعمت تو جماد کی طرح ہے جہاں اس کو لیجاؤ گے تمہارے ساتھ جائے گی! اس میں روح نہیں ہے کہ خود کو روک سکے (تمہارے ساتھ نہ جائے) کہ یہ مناسب مقام نہیں ہے یا اس کے استعمال کا محل صحیح نہیں۔

اس کے برعکس یہ نعمتِ الٰہی جس کا نام حکمت ہے ایسی نعمت ہے جو زندہ ہے (بے رُوح نہیں) جب تک تمہارے اندر اس کی بھوک ہے اور اس سے بھرپور رغبت تمہارے اندر موجود ہے وہ تمہاری طرف آئے گی اور تمہاری غذا بن جائے گی۔ جب بھوک اور رغبت ختم ہو جائے گی تو تم اس کو زبردستی نہ اپنی طرف کھینچ سکتے ہو اور نہ اپنی غذا بنا سکتے ہو وہ فوراً اپنا منہ چادر میں چھپا لیتی ہے پھر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

کرامت کیا چیز ہے؟

ایک دن کرامت کے سلسلہ میں تذکرہ ہو رہا تھا تو حضرتِ مولاناؒ نے فرمایا کہ کوئی شخص یہاں سے ایک دن میں یا ایک لمحہ میں مکہ مکرمہ پہونچ جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہیں اور نہ اس کو کرامت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ صلاحیت تو بادِ سموم تک میں موجود ہے کہ لحظہ میں جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے۔

کرامت یہ ہے کہ وہ تم کو پستی سے نکال کر بلندی تک لے جائے اور وہاں سے تم اور آگے سفر کرو اور وہ تم کو جہل سے نکال کر عقل کی منزل تک پہونچائے اور عالمِ جماد سے نکال کر عالمِ حیات میں لے آئے۔ جس طرح تم کو اللہ تعالیٰ عالمِ خاک سے عالمِ نبات میں لایا اور عالمِ نبات سے گزار کر تم کو حالتِ علقہ و مضغہ میں پہونچایا (خون کا ایک لوتھڑا بنایا) اور اس عالم سے نکال کر عالمِ حیوانی میں پہونچا دیا (جاندار بنایا) اور وہاں سے تم نے عالمِ انسانی کی طرف سفر شروع کیا (عالمِ انسانیت میں پہونچایا)۔

کرامت تو یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام مسافتوں کو تم سے قریب کر دیا اور ان منزلوں اور راستوں سے تم گزر کر آئے جبکہ تمہارے خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ میں ان منازل کو عبور کر لونگا اور کس طرح عبور کروں گا۔ پس تم کو لایا گیا اور تمہارا وجود اس پر شاہد ہے کہ تم لائے گئے ہو تو اسی طرح اس عالم سے تم کو سیکڑوں رنگا رنگ عالم میں لیجایا جائے گا۔ اس کا تم انکار نہ کرو۔ اور اس سلسلہ میں تم کو خبر دی جائے تو تم اس کو قبول کرو

زہر کہاں اثر کرتا ہے

امام اہلِ عدل خلیفۃ المسلمین جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تحفۃً ایک شیشی زہر کی

پیش کی گئی۔ آپ نے دریافت فرمایا اس کی کیا خاصیت ہے۔ لوگوں نے عرض کیا اس کا مصرف یہ ہے کہ کسی ناپسندیدہ شخصیت سے چھٹکارا حاصل کرنا اور اس کو علی الاعلان ختم کرنا مصلحت کے خلاف ہو تو اس میں سے تھوڑا سا زہر اسکو پلا دیا جائے یا کھلا دیا جائے تو پوشیدہ طور پر اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اور اگر کوئی ایسا دشمن ہو کہ تلوار سے اسے قتل کرنا مشکل ہو تو تھوڑا سا زہر اس کو کھلا دیا جائے اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم بہت اچھی چیز لائے ہو مجھے دو میں اس کو پی لوں کہ میرے اندر ایک عظیم دشمن پوشیدہ ہے جس تک تلوار کی رسائی نہیں، اور دنیا میں میرا اس سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے جنہوں نے زہر پیش کیا تھا کہا کہ اس ساری مقدار کی ضرورت نہیں ہے صرف ایک قطرہ کافی ہے اور یہ تمام زہر تو ایک لاکھ کے لیئے کافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ دشمن بھی تو ایک نہیں ہے وہ ہزاروں دشمنوں پر بھاری ہے اور لاکھوں کو اس نے شکست دی ہے یہ کہکر انہوں نے اس شیشی سے سب زہر پی لیا۔ یہ دیکھ کر وہ تمام لوگ مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ کا دین سچا ہے (کہ زہر قاتل نے آپ پر کچھ اثر نہیں کیا)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ تم لوگ تو مسلمان ہو گئے لیکن میرا نفس ایسا سخت جان دشمن ہے کہ ابھی تک اسی طرح کافر ہے (نفس راہِ راست پر نہیں آیا ہے)۔

ایمان کا مفہوم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس ایمان کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس سے مراد وہ ایمان نہیں ہے جو عوام کا ایمان ہے بلکہ ان کی مراد وہ ایمان ہے جو وہ خود رکھتے تھے بلکہ ان کا ایمان تو صدیقین کا ایمان تھا۔ ان کی مراد ایمان سے وہ ایمان تھا جو انبیاء اور خواص کا تھا اور جس کو عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہی ان کی مراد اور مقصد تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شیر کی شہرت ساری دنیا میں تھی لوگ اس کی شہرت سن کر دور دراز کا سفر طے کر کے ایک سال کی مدت میں اس جنگل میں پہونچے۔ جب انہوں نے دور سے شیر کو دیکھا تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے اور ایک قدم بڑھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ مقامی لوگوں نے کہا کہ تم اس شیر کو دیکھنے کے لئے اتنی مسافت طے

کرکے آئے اب رک کیوں گئے سُنو اس شیر ہیں ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ہمت و جرأت کا مظاہرہ کر کے قریب جاکر محبت کے ساتھ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرے تو یہ اس کو آزادہ نہیں پہونچاتا لیکن اگر کوئی اس سے ترساں و ہراساں ہوتا ہے تو اس کو غصہ آجاتا ہے بلکہ بعض اوقات حملہ بھی کر دیتا ہے (اور کہتا ہے کہ میرے بارے میں تم ایسی بدگمانی کرتے ہو (کہ ڈر کے مارے آگے نہیں آتے) ان لوگوں نے کہا کہ تم ایک سال کی مسافت طے کر کے اس شیر کو دیکھنے آئے اب یہاں ٹھہرنا کیسا؟ قدم بڑھاؤ اور قریب جاکر دیکھو لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اس شیر کے قریب جائے۔ یہاں تک آنا ہمارے لئے آسان تھا لیکن اب ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد اور مانی الضمیر ایمان سے وہ قدم تھا جو شیر کے سامنے قدم کا بڑھانا ہے اور ایسا قدم شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے اور ایسا قدم تو سوائے خاصانِ الہی و مقربانِ بارگاہ کے اور کسی کا کام نہیں ہے۔ اور اسی کو حقیقت میں قدم کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ ایمان ہے جو سوائے انبیاء کے اور کسی کو میسّر نہیں ہوتا ہے جو اپنی جان ہتھیلی پر رکھے رہے۔

عشقِ حقیقی و مجازی

دوست کتنی پیاری چیز ہے کیونکہ ایک دوست دوسرے دوست کے خیال سے قوت حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے قلب و روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور حیاتِ نو ملتی ہے۔ ہے نا تعجب کی بات؟ تم مجنوں کی حالت کو پیشِ نظر رکھو کہ وہ لیلیٰ کے خیال ہی سے قوت حاصل کرتا تھا اور یہی خیال اس کی غذا تھا۔ جب مجازی عشق کی یہ کیفیت ہے اور اس میں ایسا اثر ہے کہ دوست کی یاد اس کو قوت بخشتی ہے تو اندازہ کرلو کہ محبوب حقیقی کا خیال حضور ہو یا غیبت میں کس قدر قوت بخش ہو گا۔

خیال کی حقیقت

یہاں خیال کی کیا حقیقت ہے کہ وہ تو جانِ حقائق ہے اس کو خیال کس طرح کہہ سکتے ہیں! یہ دنیا خیال پر قائم ہے اور طرفہ یہ کہ اس دنیا کو عالمِ حقیقت کہتے ہیں (جو حقیقت میں عالمِ خیال ہے یا خیال پر قائم ہے)

اور دلیل یہ لاتے ہیں کہ وہ نظر کے سامنے ہے مگر محسوس ہے اور اس حقیقت کو جس کی فرع یہ عالم محسوس ہے تم خیال کہتے ہو کیسی اُلٹی بات ہے، خیال تو یہ عالم ہے کہ وہ حقیقت یا حقائق ایسے سو عالم پیدا کرسکتی ہے اور اس پر پھر بھی کہنگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ نوی و کہنگی (نئی اور پرانی) کی صفت شاخوں پر عائد کی جاتی ہے، جڑ پر نہیں اور وہ ذات جو اصل ہے، وہ خالق ہے تمام شاخوں کی۔ وہ خود پاک اور منزہ ہے نئی اور پرانی کی ہر صفت سے، اس کی ذات دونوں سے وراء الوریٰ ہے۔

غور کرو کہ ایک انجینئر اپنے خیال میں ایک عمارت کا خاکہ تیار کرتا ہے خیال ہی میں طے کرتا ہے کہ اس مکان کا طول اتنا ہوگا اور عرض اس قدر ہوگا، چبوترا اتنا ہوگا اور صحن اس قدر وسیع اور عریض ہوگا۔ ہم اس کو خیال نہیں کہیں گے کیونکہ حقیقی عمارت اسی خیال کا عملی پہلو ہے پس وہ عمارت اس خیالِ مہندس کی فرع ہوگی اور وہ خیال اس عمارت کی اصل! البتہ مہندس کے علاوہ اگر کسی اور کے دل میں یہ صورت پیدا ہو تو وہ خیال ہوگا (حقیقت نہیں ہوگی)۔

فصل

ظالموں اور حرام خوروں کے لقمہ سے پرہیز

بہتر یہ ہے کہ درویش سے سوال نہ کیا جائے اور کوئی بات دریافت نہ کی جائے کیونکہ اس طرح تم اس کو اختراع اور جھوٹ کی ترغیب دیتے ہو کیونکہ جب اس سے عالم اجسام (دنیا) سے متعلق کوئی سوال کیا جائے گا تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ سائل کی صلاحیت کے مطابق جواب دے اور جو درست اور حق ہے وہ بات اس سائل سے نہیں کہی جا سکتی (کہ اس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے) اس لقمہ کو حلق سے نہیں اتار سکے گا۔ لہٰذا اس کے حوصلہ کے مطابق جو جواب دیا جائے گا وہ درست نہ ہوگا۔ اس کیلئے جھوٹ اور اختراع کرنا پڑے گا تاکہ وہ جواب پاکر رخصت ہو جائے۔ جو کچھ فقیر کہتا ہے وہ حق اور درست ہوتا ہے اس میں غلط بیانی اور نہ جھوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی (بات

وہی ہوتی ہے اور سچ ہوتی ہے) اگر وہ بات غلط بھی ہو تو سائل کی نسبت سے درست ہی نہیں بلکہ درست اور صحیح سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔

ایک درویش کا ایک شخص مرید تھا جو اس کے لیے دریوزہ گری کرکے آذوقہ لایا کرتا تھا ایک روز وہ بھیک میں جو کھانا لایا حسب معمول درویش نے اسے کھالیا۔ اتفاق سے اس رات فقیر کو احتلام ہوگیا تو درویش نے مرید سے دریافت کیا کہ یہ کھانا کہاں سے لایا تھا۔ مرید نے بتایا کہ ایک زن بازاری نے دیا تھا۔ یہ سن کر فقیر نے کہا یہ اس لقمہ کا اثر تھا ورنہ مجھے تو بیس سال سے احتلام نہیں ہوا تھا کھانے کو ایک طوائف سے نسبت تھی اس کا یہ اثر ہوا)۔

درویشوں کیلئے احتیاط

درویش کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ کھانے پینے میں احتیاط برتے اور ہر ایک کی دی ہوئی چیز نہ کھائے کیونکہ وہ زیادہ حساس ہوجاتا ہے اور اس پر ہر چیز جلد اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا اظہار بھی ہوجاتا ہے جس طرح کہ سفید کپڑے پر سیاہی کا تھوڑا سا دھبہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے حالانکہ سیاہ کپڑے پر نہ دھبے کا اثر ہوتا ہے اور نہ وہ نظر آتا ہے۔ لہذا جب معاملہ ایسا ہو تو درویش کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ظالموں حرام خوروں اور کسبیوں کا مال نہ کھائے۔ کیونکہ ایسا لقمہ بہت جلد اثر انداز ہوتا ہے اور اس لقمہ بیگانہ کی وجہ سے برے اندیشے ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ اس کسبی کے کھانے کی وجہ سے اس فقیر کو احتلام ہوگیا تھا۔

فصل

اورادِ سالکان و طالبانِ معرفت

طالبانِ راہِ ہدایت اور سالکانِ راہِ طریقت کے لئے اوراد بس یہی ہیں کہ عبادت میں مشغول رہیں اور وقت کو جس طرح کاموں میں تقسیم کر رکھا ہے اس کی پابندی کریں اور یہ

تقسیم کار باعتبار عادت ان کے لئے ایک نگہبان بن جائے گی۔ مثلاً صبح کا اٹھنا کیونکہ اس وقت کی عبادت اولیٰ ترہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت نفس مزکیٰ مصفیٰ اور مطمئن ہوتا ہے اور اس وقت ہر شخص اس قسم کی عبادت کرتا ہے جو اس کے مناسب حال ہوتی ہے۔ اور اس کی صلاحیتوں کے مطابق بھی اور اس حقیقت کی عکاسی اس طرح ہوتی ہے۔

وانا لنحن الصافون ۝ وانا لنحن المسبحون (الصافات ع ۵)

ہم ہمہ وقت صف بستہ ہیں ہم ہمہ وقت مصروف تسبیح و تقدیس ہیں۔

ان کی ہزاروں صفیں ہیں۔ یہ جتنے مزکیٰ و مصفیٰ ہوتے ہیں اتنا ہی ان کو اس صف میں آگے لایا جاتا ہے اور جو لوگ ان صفات کے حصول میں کمتر ہوتے ہیں وہ اتنے ہی پیچھے لے جائے جاتے ہیں۔

اخروھن حیث اخرھن اللہ۔

"ان کو اسی طرح پیچھے رکھو جس طرح اللہ نے ان کو پیچھے رکھا ہے۔"

یہ نکتہ بڑی وضاحت کا حامل ہے لیکن اس کی طوالت سے مفر نہیں جس نے اس میں اختصار کیا۔ گویا اس نے اپنی عمر اور جان کو کوتاہ کیا الا من عصم اللہ مگر اللہ تعالیٰ نے جس کو محفوظ فرمالیا ہو (یہ تو عام سالکان طریقت اور طالبان ہدایت کے اوراد تھے)۔

کلموا الناس علیٰ قدر عقولھم

اب میں واصلان حق کے وظائف و اوراد تمہارے فہم کے مطابق تم سے بیان کرتا ہوں

سنو! صبح کے وقت مقدس روحیں اور ملائکہ مطہر اور وہ مخلوق لا یعلمھم الا اللہ جن کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں۔ ان واصلان حق کے سلام و زیارت کے لئے با وصف تمام بیگانگی حاضر ہوتے ہیں اور یہ عالم ہوتا ہے گویا

"ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا ۝ (سورہ نصر)

اور تم لوگوں کو دیکھو گے جوق جوق در جوق دین خدا میں داخل ہو رہے ہیں۔

"والملئکۃ یدخلون علیھم من کل باب ۝ (سورہ رعد)

اور ہر دروازہ سے فرشتے ان کے پاس آتے رہتے ہیں۔

لیکن عجیب حالت ہے کہ تم ان کے پہلو میں بیٹھے ہو اور ان کو نہیں دیکھتے۔ ان کی باتوں اور ان
کے سلام کو بالکل نہیں سنتے۔ اور یہ بات بالکل اس طرح ہے کہ ایک بیمار نزع کے وقت
جن کیفیات و خیالات سے دوچار ہوتا ہے اس کا تیمار داروں کو پتہ بھی نہیں چلتا اور نہ اس
کے ان خیالات سے وہ آگاہ ہوتے ہیں حالانکہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ایسے حقائق ہیں جو ان
خیالات سے ہزار گونہ لطیف تر ہیں اور ان حقائق کو کوئی ایسا جو بیمار نہ ہو نہیں سن سکتا۔ صرف
وہ شخص جو بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مقدس احوال اور ان کی عظمت
سے واقفیت حاصل کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ صبح سے ان کی خدمت میں مقدس ارواح
اور ملائکہ کی آمد و رفت ہے اور یہ مقدس افراد ان کی خدمت میں کافی دیر تک رہتے ہیں۔
لہذا یہ مناسب نہیں کہ ان کے وہ اوراد میں حائل ہوں اور ان کی وجہ سے شیخ کو زحمت ہو۔
اس کی مثال یہ ہے کہ بادشاہ کے بہت سے خدمت گزار ہوتے ہیں اور ان کا معمول ہوتا ہے کہ
وہ اس کی خدمت کو بجالائیں۔ جو ان کو معلوم ہے وہ اس کی بندگی بجالاتے ہیں۔ البتہ بعض وہ
ہوتے ہیں جو بادشاہ کی نظروں سے دور رہ کر اس کی خدمت کرتے ہیں۔ بادشاہ تو ان کی نظروں
سے دور ہوتا ہے لیکن بادشاہ کے مقرب ان کی خدمات سے واقف نہیں ہوتے اور نہ یہ دیکھتے ہیں
کہ فلاں شخص نے بادشاہ کی یہ خدمت انجام دی ہے۔ البتہ بادشاہ دیوان عام میں جلوہ
فرماتا ہے تو اس وقت ہر طرف سے سب لوگ اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اظہارِ وفاداری
کرتے ہیں اور اس کی بندگی بجالاتے ہیں۔ تو اس وقت "تخلقوا باخلاق اللہ" اپنے اخلاق کو
اخلاقِ خداوندی کا پرتو بناؤ"۔ کا سا عالم ہوتا ہے! اس وقت "کنت لہ سمعاً وبصراً"۔
میں اس بندہ کا کان اور آنکھ بن جاتا ہوں"۔ کا مقام آجاتا ہے۔ لیکن یہ مقام بہت دشوار اور
بہت ہی عظیم ہے اور مرتبہ کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔ رب کریم کی یہ عظمت ع۔ ظ۔ ی۔ م
(عظیم) سے سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اس عظمت کا ذرا سا بھی پرتو پڑ جائے تو نہ ع (عین) رہے
نہ اس کا مخرج، نہ ظ رہے نہ اس کا مخرج۔ بلکہ نہ ہست باقی رہے نہ نیست۔ کیونکہ انوارِ الٰہی کے
لشکر اور اس کے ہجوم سے وجود کا شہر تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے "ان الملوک اذا
دخلوا قریۃ افسدوھا" (نمل ع ۲) جب فاتح بادشاہ شہر میں داخل ہوتے ہیں

تو اس شہر کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ مثال سے اس طرح سمجھو کہ اگر اونٹ چوہے کے بل پر پیر رکھدے اس چھوٹے سے گھر میں داخل ہونا چاہے تو وہ گھر تہ وبالا ہو جائے گا۔ لیکن اسی خرابی میں ہزار خزینے پوشیدہ ہیں (یہ ویرانی و بربادی ہزاروں فائدے رکھتی ہے)۔

گنج باشد ، بموضع ویراں   سگ بود سگ بجائے آباداں

(ویران جگہوں میں ہزاروں خزانے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن کتے آبادیوں ہی میں پائے جاتے ہیں)

سالک و واصل کے مقامات

سالکوں کے مقامات کی تفصیل و تشریح ہم نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی۔ اب واصلانِ حق کے بارے میں اور کیا کہیں۔ صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ سالکوں کے مقام کی تو انتہا ہے لیکن واصلوں کے مقام کی کوئی انتہا نہیں۔

غور کرو کہ جب سالکوں کے مقام کی انتہا وصال ہے تو واصلوں کے مقام کی انتہا کیا ہوگی اس کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا وصال میسر ہوتا ہے جس میں فراق کا شائبہ نہیں ہوتا۔ یوں سمجھو کہ پختہ انگور پھر ناپختہ اور خام انگور (غورہ) نہیں بنتا یعنی میوہ پختہ (پختگی کے بعد) دوبارہ خام نہیں ہو سکتا۔ (فراق کا شائبہ تو ناپختگی کی دلیل ہے اور وصال پختگی کی دلیل ہے پس وصال کے بعد فراق ناممکن ہے)۔

حرام دانم از مردماں سخن گفتن   وچوں حدیث تو آید سخن دراز کنم

میں لوگوں کے بارے میں باتیں کرنا حرام سمجھتا ہوں لیکن اے دوست جب تمہاری باتیں چھڑ جاتی ہیں تو میں گفتگو کو طول دیتا ہوں۔

مولانا فرماتے ہیں کہ شاعر تو کہتا ہے کہ ہم گفتگو کو طول دیتے ہیں لیکن خدا کی قسم میں بات کو طول نہیں دیتا اختصار کرتا ہوں۔

خوں می خورم و تو بادہ می پنداری   جاں می بری و تو دادہ می پنداری

میں تو خون (جگر) پی رہا ہوں اور تو یہ سمجھتا ہے کہ میں مصروف مے نوشی ہوں۔ تو جان لے رہا ہے لیکن یہ سمجھتا ہے کہ میں حیات نو دے رہا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس نے اس راہ کو کوتاہ کیا تو گویا اس نے راہِ راست کو چھوڑ دیا۔

اور مہلک بیابان کا راستہ اختیار کر لیا ہے (جہاں سے جان بچانا مشکل ہے)۔

فصل

شرابی کی بات ناقابل اعتبار ہے

ایک عیسائی جراح نے کہا کہ مولانا شیخ صدر الدین کے احباب میں سے چند لوگ میرے پاس آئے اور صرف مئے نوشی ہو کر مجھ سے کہنے لگے (معاذ اللہ) عیسیٰ بن مریم خدا ہیں اور یہی ہمارا عقیدہ ہے اور تم بھی یہی عقیدہ رکھتے ہو اہم اسی کو حق سمجھتے ہیں لیکن ہم اس عقیدہ کو چھپاتے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کے خدا ہونے کا بظاہر انکار کرتے ہیں کیونکہ ہم ملتِ اسلامیہ میں انتشار نہیں پیدا کرنا چاہتے اس کی محافظت کے خواہاں ہیں تو اس بات کو سن کر کہنے والے نے کہا کہ اس اللہ تعالیٰ کے دشمن عیسائی نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حاشا و کلّا یہ تو اس شخص کا کلام ہے جس کو شیطانی شراب نے بدمست کر دیا ہے وہ خود تو گمراہ ہے ہی دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے دوسروں کو ذلیل کرنیوالا ہے اور وہ خود قعر ذلت میں پڑا ہوا ہے وہ حق تعالیٰ کا راندۂ درگاہ ہے اور ایسا کس طرح ممکن ہے کہ ایک کمزور شخص جو یہود کی مکاریوں سے بچنے کے لئے ایک بقعہ (علاقہ) سے دوسرے بقعہ کی طرف بھاگ رہا ہو جس کی قامت بھی دو گز سے کم ہو وہ سات آسمانوں کا محافظ ہو۔ سات آسمانوں کا تذکرہ آگیا تو ان کی مسافت بھی سنو۔

آسمانوں اور زمینوں کی مسافت

مسبب الاسباب نے اس عالم اسباب میں ساتوں آسمانوں کے مابین پانچ سو سال رکھی ہے اس طرح ساتوں آسمانوں کے مابین پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے اسی طرح زمین کی مسافت اور زمین کے ہر طبقہ کے مابین پانچ پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ عرش کے نیچے جو سمندر موجزن ہے اس کی گہرائی بھی پانچ سو سال رکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سمندر کی گہرائی کی اور زیادتی کا نظم اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا ہے۔ تعجب ہے کہ تیری عقل اس بات کو کس طرح تسلیم کریگی کہ اس میں تصرف کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ایسا ہی کمزور ہوگا جیسا کہ ماسبق میں بیان ہوا۔

مسیحیوں کے عقیدہ کا بطلان

پھر کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی آسمانوں اور زمینوں کے خالق ہیں

لیکن خالق کائنات سبحانہ' و تعالیٰ ان ظالموں کے اس باطل عقیدہ سے پاک و منزہ ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے تفوق اور مسلمانوں کے عقیدہ پر چوٹ کرتے ہوئے اس عیسائی نے کہا (خاکم بدہن) خاک خاک میں مل گئی۔ اور پاک پاک کے پاس چلے گئے۔ (ان الفاظ سے اس نے نعوذ باللہ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اہانت کرنی چاہی ہے)
حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اگر مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہیں اور روح اللہ ہیں ـــــ تو حضرت عیسیٰؑ کی روح کہاں گئی؟ کیونکہ روح تو اپنی اصل اور خالق ہی کی طرف لوٹتی ہے اب اگر وہی اصل تھے تو خالق ٹھہرے لیکن یہ کیسا خالق ہے جو کہیں اور چلا گیا

مسیحی کہنے لگا کہ ہم نے تو اس عقیدہ کو ایسا ہی پایا اور اس کو اپنا لیا اور اسی کو دین سمجھ لیا۔ آپؒ نے فرمایا کہ اگر تجھے باپ کے ورثہ میں یا کہیں اور سے کھوٹی اشرفی ملی تو کیا تو اس کو خالص اور معیاری سونے سے تبدیل نہ کرے گا۔ یا اس کو رکھ کر کہے گا کہ ہمیں تو ایسا ہی ملا تھا؟ باپ کے ترکہ سے کھوٹی اشرفی ہی کو پایا تھا؟

اسی طرح اگر تیرا ہاتھ مفلوج ہو جائے اور تجھے علاج کے لئے بہترین معالج کی خدمات میسر آجائیں تو علاج کرائے گا یا یہ کہے گا کہ ہمارا ہاتھ تو ایسا ہی ہے میں اس کی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہوں۔

یا اگر تو نے ایسے علاقہ میں پرورش پائی جہاں تیرا باپ مرا ہو اور وہاں کی آب و ہوا اچھی نہ ہو پانی کھاری ہو اور تجھے اس سے بہتر آب و ہوا کے علاقہ میں قیام کی سہولت میسر آجائے جہاں سبزیاں عمدہ ہوں اور جہاں کے رہنے والے بھی اچھے ہوں تو کیا تو اس کھاری پانی والے علاقہ سے اس علاقہ میں منتقل نہ ہو گا۔ اور اس عمدہ پانی سے اپنی بیماریوں کا ازالہ نہ چاہے گا۔ کیا اُس وقت بھی تو یہی کہے گا کہ ہم نے تو اس کھاری پانی والے علاقہ میں آنکھ کھولی ہے نشوونما پائی ہے لہٰذا ہم تو اسی کو پکڑے بیٹھے ہیں۔

(اس علاقہ کو نہیں چھوڑیں گے)۔ حاشا و کلاّ کوئی عقلمند ایسی حماقت نہیں کرے گا اور نہ ایسی حماقت کا اظہار کرے گا! ایسی غلط بات ہرگز نہ کہے گا۔ ایسی لغو بات تو وہی کہہ سکتا ہے جس کے پاس عقل و شعور نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے تیرے باپ کے وجود سے علیحدہ عقل و شعور عطا کیا ہے لہٰذا عقل و نظر کو بیکار نہ کر اور وہ عقل و شعور جو تجھے عطا کیا گیا ہے اس کو کام میں لا ورنہ ہدایت سے ہمکنار نہ ہو گا۔ جیسے ایک کفش دوز کے بیٹے کا قصہ ہے کہ ایک بادشاہ کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی اور اس نے بادشاہ کے یہاں آداب مجلس بھی سیکھے۔ اور فنون جنگ وغیرہ سے بھی آگاہی حاصل کر کے اعلیٰ منصب پر فائز ہو گیا۔ اب وہ موچی زادہ کیا بادشاہ سے یہ کہے گا کہ ہم نے تو اپنے آباء و اجداد کو جوتیاں گانٹھتے دیکھا ہے ہمیں اس اعلیٰ منصب، اس علم و فضل کی ضرورت نہیں ہمارے حال پر تو آپ یہ مہربانی کیجئے کہ ہمیں جوتوں کے بازار میں ایک دوکان عطا کر دیجئے اور بس۔

بادشاہ ایک کتّے کو اس کی دوسری خوبیوں کے علاوہ اگر تربیت دلوا کر شکاری بنوا دے تو وہ بھی اپنی پچھلی حیثیت کو بھول جائے گا اور اسے یہ یاد نہ رہے گا کہ وہ ماں باپ کے ساتھ ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا اور مرداروں پر لوٹ کر گزرتا تھا۔ اب وہ بادشاہ کا شکاری کتا ہے۔ اب اس کے فرائض میں بادشاہ کیلئے شکار کرنا ہے۔

یہی حیثیت شہباز کی ہے جب بادشاہ اس کو شکار کی تربیت دلا دے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم نے تو اپنی نسل کے جانوروں سے یہ سیکھا ہے کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہیں اور مردار کھائیں اس لئے ہم نہ تو بادشاہ کے طبل کی جانب توجہ کریں گے اور نہ اس کے شکار کی ہم کو کچھ پروا ہو گی۔

جب عقل حیوانی میں یہ بات آجاتی ہے کہ اگر باپ کے ورثہ سے بہتر چیز مل جائے تو اس کو اپنانا چاہئے اور اس کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔

انسان کو تمام مخلوقات ارضی پر فضیلت حاصل ہے

تو انسان جسے تمام مخلوقات ارضی پر عقل و فہم کی بنا پر فضیلت و فوقیت حاصل ہے! اس کے ذہن میں یہ بات کیوں نہ آئے

گی ؟ کیا وہ عقل و شعور میں حیوان سے بھی گیا گزرا ہے ۔ ہم اللہ رب العٰلمین سے ایسی باتوں (حماقتوں) پر پناہ مانگتے ہیں ۔ یہ بات البتہ درست اور صحیح ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے خالق نے حضرت عیسٰی (علیہ السلام) کو فضیلت عطا فرمائی اور تقرب سے نوازا ۔ پس اس عقیدہ کے بعد جس نے عیسٰی علیہ السلام کی خدمت کی اس نے خالقِ عیسٰی علیہ السلام کی خدمت کی اور جس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی اطاعت کی اس نے اللہ رب العٰلمین کی اطاعت کی ۔

جب خالقِ عالم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام سے برتر و افضل ایک نبی و رسول کو مبعوث فرمایا اور انہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام سے زیادہ معجزات عطا فرمائے جن کا ظہور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہوا تو اس نبی مکرم کی اطاعت ہم پر واجب و لازم ہوئی ۔ اور یہ اطاعت ان کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان خوارق عادات و معجزات کے ظہور کی وجہ سے ہے ۔ جن کا ظہور اُن کی ذات سے ہوا ہے کیونکہ وہ اللہ کے مبعوث کردہ نبی و رسول ہیں ۔ یہاں یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ ذاتی حیثیت میں عبادت صرف ذاتِ باری ہی کیلئے کی جاتی ہے اور محبت بھی صرف اللہ کی ذات سے ہوتی ہے ! اسی خالق کائنات کی طرف انتہا ہے یعنی تو اگر کسی سے محبت کرے یا کسی سے کچھ طلب کرے تو یہ محبت اور طلب رضاءِ الٰہی کے لئے ہو گی ۔ جب اس میں کوئی اور شریک نہ ہو اور یہ طلب و محبت اللہ تعالیٰ کی ذات پر منتہی ہو اور محبت اس کی ذات سے اس کے لئے ہو ۔

کعبہ را جامہ کردن از ہوس است ۔۔۔ پائے بینی جمالِ کعبہ بس است

کعبۂ مقدسہ پر غلاف چڑھانا ایک خواہش کی تکمیل ہے ۔ ورنہ خانہ کعبہ کے حسن و جمال کے لئے کیا یہ بات کم ہے کہ وہ خانۂ کعبہ ہے ۔ آنکھوں کو کالا کر لینا سرمہ لگانا نہیں ہے ۔ جس طرح پھٹے اور پیوند لگے کپڑے پہننا اُمارت و حشمت کے مرتبہ کو چھپا لیتا ہے اسی طرح عمدہ اور فاخرہ لباس فقراء کے نشاناتِ کمال پر پردہ ڈال دیتا ہے ۔ اور بزرگوں کے جمال کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور جب فقیر کے کپڑے پھٹے ہوئے ہوں تو اس کو انشراحِ قلب حاصل ہوتا ہے ۔ ایک سر تو وہ ہے جو سنہری ٹوپی سے آراستہ ہوتا ہے دوسرا وہ

ہے جس پر مرصع تاج رکھا جاتا ہے جو بالوں کے حسن و جمال کو چھپالیتا ہے۔ یہ بال حسن میں دلکشی اور دلآویزی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے وہ دلوں کی تخت گاہ بنتے ہیں تاج کی خوبصورتی جمادات سے ہے اور اس کا پہننے والا معشوق دلنواز ہے۔

سلیمانی انگوٹھی بعد تلاش ہم کو صرف فقر میں ملی، میں نے بھی اس معشوق سے محبت کی۔ وہ کسی چیز سے اتنا راضی نہ ہوا جتنا کہ فقر سے۔ عقل سے مجھ کو سب کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ جب میں نے یہ جان لیا کہ یہ فقر تمام موانع کو دور کر دیتا ہے اور درمیان کے حائل تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں تو میں نے سمجھ لیا کہ تمام عبادتوں کی اصل یہی ہے اور باقی عبادتیں اس اصل کی فرع ہیں۔ ایک بھیڑ کو ذبح کر لیا تو اس کے پارچے بنا ڈالو یا نہ بناؤ اس سے بھلا اس کو کیا فائدہ!

روزہ کی عبادت پر نظر ڈالو۔ یہ عدم کی طرف لیجانے والی ہے۔ اور اس کی مسرتیں اور اس کا انجام اسی عدم سے وابستہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ" اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

بازار میں جو کچھ سامان ہے یا ماکولات و مشروبات ہیں یا کسی شخص کا اثاثہ ہے یا کوئی پونجی ہے یا پیسہ ہے ان میں سے ہر چیز کا سر رشتہ اس حاجت اور ضرورت سے ہے جو نفس انسانی میں ہے اور اس کا یہ سر رشتہ پنہاں ہے جب تک وہ چیز چاہی نہ جائے طلب کا سر رشتہ حرکت میں نہیں آتا (اس چیز کو طلب نہیں کیا جاتا) اسی طرح ہر دین و ملّت، ہر کرامت، اور معجزہ اور تمام انبیاء علیہم السلام کے احوال کا معاملہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا سر رشتہ روح انسانی سے وابستہ ہے جب تک اس احتیاج کو حرکت نہیں ہوتی وہ سر رشتہ متحرک نہیں ہوتا۔ اور اس چیز کا اظہار نہیں ہوتا۔ ورنہ ہر شئے ہم نے اس کھلی کتاب "قرآن" میں محفوظ کر دی ہے وکل شئ احصیناہ بامام مبین۔ ارشاد ربانی ہے۔

نیکی و بدی کیا ایک ہیں؟

کسی نے حضرت مولاناؒ سے سوال کیا کہ نیکی اور بدی کا فاعل ایک ہی ہے یا دو ہیں؟ آپ نے فرمایا مناظراتی انداز میں اگر جواب دیا جائے تو کہا جائے گا کہ دو الگ الگ فاعل ہیں کیونکہ ایک چیز اپنی ذات

کے اعتبار سے اپنی ہی مخالف نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر اس اعتبار سے دیکھو کہ بدی نیکی سے جُدا
نہیں ہو سکتی تو فاعل ایک ہی ہے کہ بدی نیکی کا ایک جزو لاینفک ہے۔ دلیل یہ ہے کہ نیکی نام ہے
بدی کے ترک کرنے کا۔ اور بدی کو ترک کرنا بغیر بدی کے وجود کے محال ہے یہ کہنا کہ نیکی بدی کا
ترک کرنا ہے البتہ بدی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب نیکی کو ترک کیا جائے اگر بدی کی خواہش نہ ہو
تو ترک نیکی نہ ہو پس اصل میں ایک ہی چیز ہوتی دو نہیں ہوتیں۔ اور یہ جو مجوسیوں (آتش
پرستوں) کا عقیدہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یزداں خالق نیکی ہے اور اہرمن خالق بدی ہے کہ وہ
مکروہات کو پیدا کرتا ہے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ محبوبات (پسندیدہ امور) مکروہات
سے جُدا نہیں ہیں۔ اس لئے کہ محبوب چیز کا وجود بغیر مکروہ کے محال ہے۔ کیونکہ محبوب کا وجود
مکروہ کے زوال میں شامل ہے جس طرح غم کا زوال خوشی ہے اور غم کا زوال اسی وقت ہوگا
جب کہ غم پایا جائے پس حقیقت میں یہ ایک ہی چیز ہوتی۔ لاتجزی (ناقابل تقسیم) ہم کہتے
ہیں کہ جب تک کوئی چیز فانی نہیں ہوتی اس کا فائدہ ظاہر نہیں ہوتا۔ جس طرح کلام کہ جب تک
بروقت گفتگو حروف ہجا اور الفاظ منہ سے نکل کر فنا نہیں ہو جاتے سننے والے کو فائدہ نہیں پہنچاتے،

کچھ عارف کے بارے میں

جو شخص عارف کی بُرائی کرتا ہے وہ درحقیقت اس کی تعریف کرتا ہے کیونکہ عارف اپنی تعریف کو
پسند نہیں کرتا اور یہ گوارا نہیں کرتا کہ کوئی اس کی تعریف و توصیف کرے۔ علاوہ ازیں عارف
اپنی تعریف کا آپ دشمن ہے لہٰذا اس تعریف کو بُرا کہنے والا عارف کے مخالف کا دشمن اور عارف
کا تعریف کرنے والا ہوا۔ کیونکہ عارف ایسی برائی (اپنی تعریف) سے بھاگتا ہے اور بُرائی سے بھاگنے
والا محمود ہوتا ہے کیونکہ اشیا کی حقیقت اور حیثیت اس کی ضد اور صنف مخالف ہی سے ظاہر ہوتی
ہے اور عارف اس حقیقت سے واقف ہے کہ وہ میرا دشمن نہیں ہے۔ اور میرا بُرا چاہنے والا نہیں
ہے۔ کیونکہ میں خرما کے اس باغ کی طرح ہوں جس کے گرد چہار دیواری ہے جس پر رکاوٹیں ہیں اور
جھاڑ لگے ہیں۔ جو کوئی باغ کی طرف سے گزرتا ہے وہ اس دیوار کو اور کانٹوں والی جھاڑیوں کو
دیکھتا ہے اور وہ اس کو بُرا کہتا ہے باغ کو اس شخص پر کیسے غصہ آئے گا۔ بلکہ یہ بُرا کہنا تو خود اس
کے لئے زیاں کاری ہے کہ اگر وہ باغ کی دید کا خواہاں تھا تو اس کو اس دیوار سے تعلق پیدا

کرنا چاہیئے تھا جس کے ذریعہ وہ باغ تک پہونچ سکتا تھا پس اگر اس دیوار میں برائی ہے (اس پر خاردار جھاڑ ہیں) تو اس سے باغ کا کیا واسطہ؟ باغ اس نکوہش سے دور ہے پس اس برا کہنے والے نے برا کہکر خود کو معرض ہلاکت میں ڈالا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا " انا الضحوك القتول " میں ایک مسکراتا قاتل ہوں یعنی میرا کوئی دشمن نہیں ہے جس کے قہر پر مجھے غصہ آئے۔ (یعنی اس کی برائی پر مجھے غصہ آتا) وہ کافر کو ایک نوع کفر کی وجہ سے قتل کرتے ہیں تاکہ وہ کافر خود کو دوسرے سو انداز سے ہلاک نہ کر ڈالے پس اس قتل میں وہ تبسم فرماتے ہے۔

فصل

خواہش کی نفی

رشحنہ اور کوتوال کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ چوروں کو پکڑے جب کہ چور اس سے گریزاں رہتے ہیں لیکن یہ کیا طرفہ تماشہ ہے کہ ایک چور ایسا بھی ہے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ کوتوال مجھے پکڑلے اور سزا دے۔ حق تعالیٰ نے بایزید سے فرمایا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ بایزید نے جواب دیا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ بھی نہ چاہوں! " ارید ان لا ارید " میں یہ خواہش کرتا ہوں کہ خواہشوں کو ترک کر دوں "

غور کرو! انسان دو حالتوں سے خالی نہیں یا تو کسی چیز کی خواہش کرے یا خواہش نہ کرے۔ اب رہی یہ بات کہ کوئی ایسا انسان بھی ہے جو کچھ بھی نہ چاہے؟ تو یہ انسانی صفت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود سے رہا ہو کر کچھ بھی نہ رہا (یعنی کلیۃً خود سے خالی ہو گیا) اگر وہ باقی رہتا تو صفت آدمیت اس میں باقی رہتی۔ خواہ وہ چاہتا یا نہ چاہتا۔ اب مشیت ایزدی نے یہ چاہا کہ اُن کو کامل فرمائے اور اُن کو مکمل شیخ بنائے تاکہ اُن کو وہ منزل حاصل ہو جائے جہاں دوئی اور فراق کی گنجائش نہ ہو۔ وصل کلی اور اتحاد حاصل ہو جائے کیونکہ یہ تمام صعوبتیں اس چیز کی طلب اور خواہش کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں جو حاصل نہیں ہوتی اور جب طلب و خواہش ہی نہیں تو پھر نہ پانے کا رنج کیسا؟؟

حصولِ مقصد میں اِنسان کے مراتب

اس جدوجہد کے سلسلہ میں انسان کئی مراتب میں منقسم ہے بعض لوگ تو اپنی جدوجہد سے ایسی منزل پر پہونچ جاتے ہیں کہ ان کے دل میں جو آرزو پیدا ہوتی ہے اس کو وہ عمل سے حاصل کر لیتے ہیں اور انسان کو اس پر قدرت حاصل ہے لیکن وہ چیز جو باطن میں یا خواہش وخیال میں نہ آسکے اس کا حصول مقدورِ بشری نہیں ہے اس منزل تک حق تعالیٰ کی کشش ہی اس کو پہونچا سکتی ہے (وہ اپنے افعال سے اس کو حاصل نہیں کر سکتا)۔ " قل جاء الحق وزھق الباطل"۔ کہہ دیجئے کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا! جب یہ جذبۂ حق اس کی رہنمائی کرتا ہے تو وہ دغدغہ اور اندیشہ باطل کیطرح مٹ جاتا ہے۔

"اُدفع یا مومن فانّ نورک اطفأ ناری"۔ اے مومن مجھ سے ہٹ کر رہنا کہ تیرا نور میری آگ کو بجھا دے گا۔

نورِ مومن کیسا ہے؟

مومن کا جب ایمان کامل وحقیقی ہوتا ہے تو پھر اس سے وہی فعل سرزد ہوتا ہے جو حق تعالیٰ چاہتا ہے۔ خواہ وہ اس کا جذبہ ہو یا جذبۂ حق ہو (دونوں صورتوں میں اس کا عمل مشیتِ الٰہی کے بموجب ہوتا ہے) یہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی پر وحی نازل نہیں ہوئی! میں کہتا ہوں نزول وحی ہوتا ہے لیکن اس کو وحی سے موسوم نہیں کیا جاتا۔ اسی مقام پر کہا گیا ہے کہ " المومن ینظر بنور اللہ"۔ جب مومن نورِ خدا سے دیکھتا ہے تو وہ اول وآخر، حاضر وغائب۔ سب کچھ اس نورِ الٰہی سے دیکھ لیتا ہے۔ اور اگر کوئی چیز اس سے پوشیدہ رہے تو جان لو کہ وہ نورِ خدا نہیں تھا پس حقیقت میں یہی وحی ہے۔ اگرچہ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کو وحی نہیں کہا جاتا۔ وہی نورِ الٰہی تو ہے کہ مومن اس نور کو لئے جب دوزخ کے قریب پہونچے گا تو دوزخ پکار اٹھے گا کہ اے مومن مجھ سے پرے رہنا ورنہ تیرا نور میری اس آگ کو ٹھنڈا کر دیگا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا خطبۂ خلافت

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منصب خلافت سنبھالا اور منبر پر خطاب

کرنے تشریف لائے تو حاضرین محو انتظار تھے کہ حضرت کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے ان کے جذبات کو محسوس فرمایا اور انہیں خاموش رہنے کو کہا لیکن اس کے بعد زبان سے کچھ نہ فرمایا البتہ حاضرین پر ایک بھرپور نظر ڈالی جس نے ان کی کیفیت منقلب کر دی۔ ان پر وجد طاری ہو گیا اور ایسی حالت پیدا ہوئی کہ ایک دوسرے کی خبر نہ رہی اور یہ احساس ہی نہ رہا کہ ہم کہاں بیٹھے ہیں بہت سے مواعظ اور خطابات سے بھی یہ کیفیت نہ پیدا ہوتی جو آپ کی خاموشی اور ایک نظر سے پیدا ہوئی۔ اور وہ اسرار و معارف حاصل نہ ہوتے اور عقدے حل نہ ہوتے جو اس ایک نظرِ عثمانی رضؓ سے حاصل ہو گئے۔

ختم مجلس تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حاضرین پر اسی طرح نظر ڈالتے رہے اور زبان سے کچھ بھی نہ ارشاد فرمایا۔ جب منبر سے اترنے لگے تو صرف اتنا فرمایا۔

"ان لکم امام فعّال خیر لکم من امام قوّال"۔ بیشک تمہارے لئے عمل کرنے والا امام اور قائد باتیں کرنے والے امام اور قائد سے بہتر ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ (ان لکم امام فعال خیر لکم من امام قوّال) جو فرمایا بالکل درست فرمایا۔ کیونکہ جو آپ کی مراد اور مقصود تھا وہ گفتگو سے جو کچھ حاصل ہوتا وہ بغیر گفتگو ہی کے حاصل ہو گیا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ انہوں نے خود کو فعّال کہا اور بظاہر آپ نے کوئی ایسا عمل نہیں فرمایا جو بتایا جا سکے یعنی اس وقت نماز نہیں پڑھی، حج و صدقہ (زکوٰۃ) ادا نہیں فرمایا، خطبہ بھی نہیں دیا۔ ان افعال میں سے کچھ بھی آپ سے صادر نہیں ہوا۔ اس سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ فعل صرف ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ یہ کیفیات (جو ان حاضرین پر طاری ہوئیں) اس عمل ہی کی صورتیں ہیں اور حقیقت میں یہی فعل کی جان اور اصل ہے۔

حضور سیّد عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم"۔ میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو گے تم راہ یاب ہو جاؤ گے۔ اب غور کرو کہ ایک شخص ستارہ کی طرف دیکھتا ہے اور اس کو راستہ مل جاتا ہے (ستارے سے راستہ کی سمت معلوم ہو جاتی ہے۔) کیا ستارہ اس سے

گفتگو کرتا ہے؟ ہرگز نہیں پس ستارے پر نظر کرنے ہی سے اس کو گمراہی سے نجات مل جاتی ہے اور وہ راستہ پر لگ جاتا ہے۔ اور دیکھنے والا منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ تم اولیائے حق کو دیکھو (ان پر نظر کرو) اور وہ تمہارے اندر تصرف کریں اور بغیر گفتگو اور بحث کے تم کو مقصود حاصل ہو جائے اور وہ بغیر گفتگو ہی کے تم کو منزل مقصود پر پہونچا دیں۔

"فمن شاء فلینظر الیّ فمنظری نذیر الی من ظن ان الھوی سھل"

جو چاہے وہ میری طرف دیکھ لے۔ کیونکہ مجھ کو دیکھ لینا ہی اس شخص کے لئے انتباہ ہے۔ جو عشق کو آسان سمجھتا ہے۔

تحمّل اور مجاہدہ خالق کائنات کی بنائی ہوئی دنیا میں تحمّل سے زیادہ سخت اور کوئی امر نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تم نے ایک کتاب کو پڑھ کر اس پر اعراب لگائے ہیں اور اس کی تصحیح کی ہے اور اس کتاب کو ایک شخص تمہارے قریب بیٹھا ہوا غلط پڑھ رہا ہو تو تم کو ضبط کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن اگر تم نے اس کتاب کو پڑھا نہیں ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا! اس کو کوئی درست پڑھے یا غلط۔ کیونکہ تمہیں اس کتاب کے غلط اور صحیح کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تحمّل ایک زبردست مجاہدہ ہے "انبیاء علیہم السلام اور اولیاء بھی خود کو اس مجاہدہ سے نہیں بچا سکے۔ ان کو اس مجاہدہ سے گزرنا پڑا ہے۔

راہِ طلب میں پہلا مجاہدہ نفس کشی اور ترکِ شہوات ہے اور اسی کو جہادِ اکبر کہتے ہیں جب یہ اس مقام سے واصل ہو جاتے ہیں تو اور مقام امن پر پہونچ جاتے ہیں ان پر غلط اور درست کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے تب وہ حقیقت سے آگاہی حاصل کرتے ہیں! ابھی ایک اور مجاہدہ سے گزرنا ہے کیونکہ مخلوق کے افعال راست نہیں بلکہ کثر دیکھ رہے ہیں! اس کو یہ دیکھتے ہیں اور ضبط و تحمّل کا مظاہرہ کرتے ہیں! ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتے بلکہ خاموشی سے دیکھتے رہتے ہیں! اگر وہ کچھ بولیں

تو کوئی بھی ان کے پاس نہ ٹھہرے۔ اور ایسی بے اعتنائی برتیں کہ کوئی ان کو سلام تک کرنے کو تیار نہ ہو۔ مگر حق تعالیٰ نے انہیں زبردست حوصلہ زبردست قوت (برداشت) عطا کی ہے۔ وہ ایسے موقع پر سینکڑوں بج رویوں میں سے صرف ایک کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور بقیہ کی پردہ پوشی کرتے ہیں تاکہ دوسرے کو ناگوار نہ گزرے بلکہ (تالیف قلب کے لئے) ان افعال پر نکتہ چینی نہیں فرمائی بلکہ ان سے صرف نظر کیا۔ اسی طرح بتدریج ان برائیوں اور کجیوں کو دور کر دیتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ معلم طالب علم کو جب لکھنا سکھاتا ہے تو پہلے الفاظ کی ترتیب سکھاتا ہے اس طرح وہ ایک سطر لکھنی سکھاتا ہے۔ جب طالب علم سطر لکھ کر استاد کو دکھاتا ہے۔ تو باوجود اس کی کجی اور قاعدۂ تحریر کے خلاف ہونے کے معلم کہتا ہے، بہت خوب، بہت خوب، بہت اچھا لکھا ہے البتہ اس سطر میں صرف ایک لفظ اچھا نہیں ہے! اس کو اس طرح لکھنا چاہیئے۔ تاکہ اس کا حوصلہ بڑھے اور وہ دل تنگ نہ ہو، اس تعریف و توصیف سے طالب علم کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ بتدریج سیکھتا ہے اور اس کو اس طرح معلم سے فن تحریر کے حصول میں مدد ملتی ہے۔

ہم کو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ امیر (پروانہ) کو منزل مقصود تک پہونچا دے گا اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اور جو کچھ اس کی آرزو ہے وہ پوری ہوگی۔ علاوہ ازیں جو کچھ اس کے دل میں اس وقت نہیں ہے اور وہ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز ہے۔ حالانکہ وہی تمام امور کی اصل ہے۔ امید ہے کہ وہ چیز بھی اس کو میسر ہو جائیگی! اور جب وہ چیز اس کو مل جائیگی اور وہ اس پر غور و تامل کریگا اور اللہ تعالیٰ کی وہ نوازشیں اور عنایتیں اس کے شامل حال ہو جائیں گی! اس وقت وہ ان آرزوؤں اور تمناؤں سے شرمسار ہوگا اور کہے گا کہ ایسی عظیم نعمت میرے سامنے تھی اور میں نے اس نعمت عظمیٰ کے ہوتے ہوئے ہارے کیا کیا کہ ان کم مایہ نعمتوں کی آرزو کی۔ اس وقت وہ شرمندہ ہوگا۔

عطا اس چیز کا نام ہے کہ انسان کے فہم و خیال میں بھی نہ آئے! اس لئے کہ جو چیز فہم و خیال میں آجائے وہ اس کی ہمت کے اندازہ کے مطابق ہوگی اور اس کے بقدر اندازہ

ہو گی لیکن حق تعالیٰ کی عطاء قدرت الٰہی کے اندازہ کے مطابق ہوتی ہے پس عطائے حق، حق تعالیٰ کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ بندہ کے وہم و فہم کے بقدر نہیں ہوتی۔ وہ ایسی نعمت ہوتی ہے جس کو نہ آنکھ نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا۔ اور نہ انسان کے قلب میں اس کا گزر ہوا۔ ہر چند کہ جو کچھ انسان کی توقع ہوتی ہے آنکھیں اُس سے آشنا ہوتی ہیں کان اُس کے بارے میں سُن چکے ہوتے ہیں۔ اور دل میں اس کی ایک خیالی تصویر ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی عطائے خاص ان تمام امکانات سے وراء الوریٰ ہوتی ہے (نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا اور نہ دل میں اس کا گزر ہوا)۔ "مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر"

فصل

یقین کا مرتبہ طریقت میں

یقین کی صفت ایک شیخ کامل (کی طرح) ہے اور نیک گمان اُس کے سچّے مُرید ہیں لیکن ظن کے درجات کے تفاوت کے اعتبار سے یعنی محض ظن، اغلب ظن اور اغلب سے اغلب ظن اسی طرح اور درجات کا قیاس کرنا چاہیئے۔ جو ظن جس قدر زیادہ اور افزوں ہو گا وہ یقین سے اتنا ہی نزدیک اور انکار سے دُور تر ہو گا۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اگر ابوبکر رضؓ کا ایمان وزن کیا جائے تو وہ ثقلین کے بار کے ہم وزن ہو گا۔

جتنے بھی گمان نیک و راست ہیں وہ یقین ہی کا دودھ پیتے ہیں اور اسی دودھ سے نشو و نما پاتے ہیں۔ اور یہ شیر خوارگی اور اس سے نشو و نما یا افزونی "ظن کے حصول کی علامت ہے جو علم و عمل سے متعلق ہے یہاں تک کہ وہ یقین بن جائیں۔ بلکہ یقین میں فنا ہو جائیں کلیتہً۔ اس لیئے کہ جب یقین بن جائیں گے تو پھر "ظن" کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ یہ جو عالمِ ظاہر میں تم شیخ و مرید دیکھتے ہو یعنی ظاہری شیخ و مرید یہ اسی شیخ یقین اور اس کے مُریدوں ہی کا نقش ہے اور میرے اس قول پر دلیل یہ ہے کہ عالم اجسام کے یہ نقش ایک دَور

کے بعد دوسرے دور میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قرناً بعد قرن وہ بدلتے رہتے ہیں لیکن وہ شیخ یقین اور اس کے سچے مرید اپنی حالت پر قائم ہیں دوراً بعد دور اور قرناً بعد قرن تبدیل نہیں ہوتے۔ بلکہ اس حالت پر بہت سے دور اور قرنیں گزر چکی ہیں کہ وہ غیر مبدل ہیں۔ البتہ وہ گمان جو غلطی پر ڈالنے اور گمراہ کرنے والے ہیں وہ شیخ یقین کے راندۂ درگاہ ہیں وہ روزانہ اس سے دور سے دور تر اور باعتبار مرتبہ کمتر ہوتے جاتے ہیں اس لیے کہ وہ لوگ ان امور کی تحصیل میں مصروف ہیں جو ان بُرے گمانوں کو بڑھانے رہتے ہیں کہ فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً ان کے قلوب میں بیماری تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اور بڑھا دیا۔

اب تو خواجگان چھوہارے کھا رہے ہیں، مگر اسیر (مجبور) انھیں دیکھ کر خار کھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ افلا ینظرون الی الابل "کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے۔"

الا من تاب و امن و عمل صالحاً فاولٰئک یبدل اللہ سیاٰتھم حسنٰت (فرقان ع ۷)

بجز ان لوگوں کے جنھوں نے توبہ کی اور ایمان لائے (یعنی قوت ایمانی حاصل کی) اور اعمال صالح کئے تو اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو بھلائیوں میں تبدیل کر دے گا۔

اس ارشاد کے مطابق بدگمانی کو باطل کرنے میں جو جد و جہد کی گئی ہے وہ اب اصلاح ظن میں قوت بن کر رونما ہوتی ہے اور اب مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک دانا شخص پہلے چوری کرتا تھا بعد میں توبہ کر کے نیکوکار بن گیا اور اپنی بھلائیوں کے نتیجہ میں کوتوال نامزد پاگیا۔ وہ صلاحیتیں جن کا وہ چوری کے دور میں مظاہرہ کرتا تھا اب عدل و احسان اور فضل میں صرف کرتا ہے۔ (اس قوت کے باعث) وہ دوسرے شخصوں سے جو پہلے کبھی چور نہیں تھے سبقت لے گیا اس لیے کہ یہ شحنہ جو پہلے دزد پیشہ رہ چکا ہے چوروں کے گھاتوں سے خوب واقف ہے اور چوروں

کے داؤں گھات اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایسا شخص اگر شیخ (طریقت) بن جائے تو
بہت ہی کامل ہوگا اور وہ دنیا کا رہبر اور ہادئ زمانہ ثابت ہوگا۔

فصل

مہار اور مہار کش کا فرق

وقالوا تجنبا ولا تقرب تبنا فکیف و انتم حاجتی اجتنب۔
(انھوں نے کہا کہ ہم سے کنارہ کشی اختیار کرو اور ہمارے قریب نہ آؤ۔ ایسا کیوں کر
ممکن ہے کیونکہ تم تو ہمارے مقصود ہو۔ ہم تم سے کیونکر کنارہ کشی اختیار کر سکتے ہیں۔)
حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ جو شخص جہاں بھی ہے وہ اپنے
ساتھ حاجت کا لاینفک پہلو رکھتا ہے جو اس کی ذات سے جدا نہیں ہو سکتا! اس کے
ساتھ حاجت ضروری ہے اور وہ حاجت اس کے لیئے ایک پھندہ ہے جو اس کو مہار یا
لگام (پڑے ہوئے جانور) کی طرح ادھر اُدھر کھینچے لیئے پھرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ
کوئی شخص خود کو گرفتارِ سلاسل نہیں کر سکتا۔ (خود اپنے ہاتھ سے زنجیریں نہیں باندھتا)
پس یہ ضروری ہوا کہ کسی اور نے اس کو پھندہ میں پھانسا ہے۔ مثلاً جو شخص طالبِ صحت ہے
وہ خود کو بیمار کیوں ڈالے گا اس لیئے کہ یہ محال ہے کہ ایک شخص طالبِ صحت بھی ہو اور طالب
مرض بھی۔ چونکہ وہ اپنی حاجت کا خود پہلو ہے اس لیئے وہ اس حاجت دہندہ کا پہلو
ہوا لیکن چونکہ اس کی نظر اپنی مہار پر ہے اس وجہ سے وہ خوار و ذلیل ہے۔ اگر اس کی
نظر مہار کش پر ہوتی تو اس کو اس مہار سے چھٹکارا مل جاتا۔ یہ مہار اس کے ڈالی ہی
اس لئے گئی ہے کہ وہ بغیر اس مہار کے مہار کش کے ساتھ نہیں چلتا۔ اسی لیئے
اس کی ناک میں نکیل ہم ضرور ڈالیں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے۔
"سنسمہٗ علے الخرطوم" (قلم ع ۱) ہم اس کی ناک ــــ چھیدیں گے۔ اور اس
میں مہار ڈال کر اس کو اپنے حسب خواہش چلائیں گے کہ بغیر مہار کے وہ ہمارے پیچھے پیچھے

نہیں چلتا۔

یقولون ھل بعد الثمانین ملعب　　فقلت وھل قبل الثمانین ملعب

لوگوں نے کہا کہ کیا اسّی سال (بڑھاپے) کے بعد کوئی کھیل ہوتا ہے تو میں نے کہا کہ کیا اسّی سال سے پہلے بھی کوئی کھیلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بوڑھوں کو ایسا بچپن عطا کیا ہے کہ بچوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہے اس لیے کہ اِن بوڑھوں کا بچپن اُن کو تازگی بخشتا ہے۔ اور اُن کو کُدواتا ہے۔ اور ہنساتا ہے اور کھیل کود کی آرزو ان کے دلوں میں پیدا کرتا ہے اس لیے کہ وہ دنیا میں جینا چاہتے ہیں۔ اور دنیا سے ملول اور رنجیدہ نہیں ہوتے ہیں جب یہ بوڑھا تمام جہان کو ایک دنیائے نو کی شکل میں پاتا ہے تو وہ اس جہان نو کے ساتھ کھیلتا اور کودتا ہے اس کا خون بڑھتا اور جسم متوازن ہوتا ہے۔

لقد جل خطب الشیب ان کان کلما　　بدت شیبۃ یعد ومن اللھو مرکب

اگر یہی روایات رہتیں کہ بڑھاپے میں گھوڑے کا کھیل ہوا کرتا تو بڑھاپے کی شان یہی ہوتی کہ گھوڑے گھوڑے کا کھیل کھیلا جاتا۔

اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ بڑھاپے کی جلالت شان، جلالت حق کی بدولت بڑھتی ہے اور جلالت حق کی بہار عیاں ہوتی ہے اور بڑھاپے کی خزاں اس پر غلبہ کرتی ہے اور طبع انسانی اپنے خزانے خالی کرنا شروع کر دیتی ہے پس اس کی بہار کو کمزور اور ضعیف کرنے والی چیز اصل میں مصلحت خداوندی ہے کہ دانت گرنے لگتے ہیں اور اس کی بہار کی شگفتگی اور اور خندیدگی کم ہوتی جاتی ہے اس کے بال ایک ایک کر کے سفید اُٹھنے لگتے ہیں اور حق تعالیٰ کے فضل و کرم کی سرسبزی افزوں ہوتی جاتی ہے اس کی گریہ و زاری میں اضافہ ہوتا ہے تو اس کی گریہ و زاری کے ساتھ باغ حقائق کی بارش خزاں منغض اور مکدر ہوتی ہے، تعالی اللہ عما یقول الظالمون (اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور پاک ہے ان تمام باتوں سے جو یہ ظالم کہتے ہیں۔

فصل

مُرید کو کدُورت و آلائش سے پاک کرنا

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کو ایک وحشی حیوان کی صورت میں پایا۔ اس کی جلد ظاہری لومڑی جیسی تھی۔ وہ اس وقت ایک چھوٹی کھڑکی میں موجود تھا اور اس سے جھانک رہا تھا۔ میں نے اس کو پکڑنا چاہا پھر اس نے اپنے ہاتھ اٹھا لیئے اور گھگھیانے لگا پھر میں نے اسی (حیوان) کو پھر اپنے پاس ایک نہایت بھونڈی شکل میں پایا۔ اس وحشی نے بھاگنا چاہا لیکن میں نے اس کو پکڑ لیا۔ میرے پکڑ لینے پر اُس نے مجھے کاٹنا چاہا (لیکن میں نے اس کو اتنا موقع نہیں دیا۔) اور اس کا سر اپنے پاؤں کے نیچے اس طرح دبایا کہ اس کے اندر جو کچھ تھا وہ باہر نکل آیا۔ اب اس کی خوبصورت جلد پر میری نظر پڑی (نظرت الی حُسن جلدہٖ) تو میں نے کہا کہ یہ خوبصورت جلد تو اس لائق ہے کہ اس کو موتی، جواہرات اور سونے سے بھر دیا جائے۔ بلکہ اس سے بہتر چیزوں سے پُر کیا جائے۔ پھر میں نے خیال کیا کہ اُس سے جو کچھ مجھ کو لینا تھا وہ تو میں نے لے ہی لیا (اس کی اندرونی کدورتوں کو باہر نکال دیا اور کہا کہ بھاگنے والے جہاں چاہے بھاگ جا اور جدھر منہ اٹھے چلا جا۔ میرے یہ کہتے ہی وہ چھلانگیں لگاتا ہوا بھاگ گیا۔ (اس کو خوف تھا کہ کہیں دوبارہ نہ پکڑ لیا جائے حالانکہ اس کی مغلوبیت (گرفتاری) میں ہی اس کے لئے سعادت و فلاح تھی)۔ اور بے شبہ اور بالیقین (آلائش باطنی کے باہر آنے سے) اس کے چہرے پر ایک شہابی رنگت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں یہ بات سما گئی کہ وہ ان تمام چیزوں کو اس مسلک سے متعلق اپنے اندر سمیٹ لے جن کو وہ اپنی ذات کے اندر محفوظ رکھنا چاہتا تھا اور اس کے لئے کوشش کرتا رہا تھا لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔

بسا اوقات عارف کی کیفیت ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جال سے شکار کو نہیں پھانس سکتا۔ اور اس جال سے شکار کو پکڑنا اس کے لئے مناسب بھی نہیں ہوتا۔ باوجودیکہ جال صحیح و سالم بھی ہو۔ عارف کو اس کا اختیار ہے کہ جس کو پا لینے کی خواہش رکھتا ہے۔

اس کو پالے لیکن کسی دوسرے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ بغیر اس کی (عارف کی) خواہش کے اس کو پاسکے۔ شکار کی تلاش میں بیٹھے ہو اور شکار تمہاری نیت اور گھات کو محسوس کر رہا ہے اور پہچان رہا ہے، لیکن ابھی وہ آزاد ہے۔ اس کے گزرنے کے راستے محدود نہیں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ اسی راستے سے گزرے جس پر تم گھات میں بیٹھے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے وہ جس راستے پر چاہے گا گزر جائیگا اور اللہ رب العالمین کے علم کا اسی قدر احاطہ ممکن ہے جتنا کہ وہ چاہے (ولا یحیطون بشیئ من علمہ الا بما شاء)۔

جب یہ دقائق و معارف تیرے ذہن میں آ جائیں گے تو یہ دقائق و معارف نہیں رہیں گے۔ بلکہ کچھ متصل ہونے کیوجہ سے فاسد ہو جائیں گے اور یہ بات ویسی ہی ہے کہ کوئی اچھی یا بری بات عارف کی زبان پر آجائے یا اس کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو وہ ویسی نہیں رہتی بلکہ جو دقائق باقی رہ جاتے ہیں وہ بھی تمہاری زبان پر آنے والے دقائق سے اتصال کے باعث فساد کی زد میں آجاتے ہیں اور کچھ اور ہی بن جاتے ہیں کیا تم نے اس بات سے اس حقیقت کو معلوم نہیں کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں آجانے سے عصا کی ہیئت، صورت تبدیل ہوگئی تھی۔ اسی طرح استن حنانہ اور کھجور کی شاخ جو سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس میں تھی۔ دعائیہ الفاظ جو زبان عیسیٰ علیہ السلام پر جاری ہوئے اور لوہا حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں موم ہوا یا پہاڑ اپنی اصل حالت میں باقی نہ رہے۔ اسی طرح دقائق اور دعوات جب جسم کے غیر نورانی اور تاریک ہاتھ میں آجائیں تو وہ اپنی اصل حالت پر نہیں رہتے۔

تا ترا بود با تو در ذات است کعبہ با طاعت در خرابات است

جو کچھ تیری ذات کے ساتھ تھا وہ اب بھی اس میں موجود ہے لیکن تو نے اپنی کدورتوں اور نفس کی غلاظتوں سے خود کو خرابات بنا دیا ہے۔ کعبہ تیری بندگی سے خرابات بن کر رہ

گیاہے ا۔ (ویران ہوگیا ہے)

کافر و جاہل کا فرق

دیکھو کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے (اس قدر کھاتا ہے کہ آنتوں کے ساتوں گھیر پُر ہو جاتے ہیں)۔ مگر یہ بھوک ہے جس کو فراش نے اختیار کر رکھا ہے۔ وہ ستر آنتوں میں کھاتا ہے (بہت پیٹو ہے) اگر وہ ایک آنت کو پُر کرتا تب بھی وہ ستر ہی کے برابر ہوتا۔ کیونکہ مبغوض (دشمن) کی ہر چیز مبغوض (ناپسندیدہ) ہوتی ہے جس طرح محبوب کی ہر چیز محبوب ہوتی ہے ا۔ اگر فراش یہاں موجود ہوتا تو میں اس کو نصیحت کرتا (اور سمجھاتا) اور میں اس سے ان چیزوں کو نکال باہر کر دیتا جنھوں نے اُس کے دین، قلب، روح اور عقل کو برباد کر دیا ہے۔ کاش اس کو ان خرابیوں کی طرف مائل کرنے والی کوئی اور چیز اس کے سوا ہوتی۔ جیسے وہ شرابی ہوتا یا کسی مطربہ کی صحبت نے اس کو بگاڑا ہوتا۔ تو اس کے لئے اس سے بہتر ہوتا اور کسی صاحب کمال کی صحبت سے اس کی اصلاح ہوتی تو یہ بات اس کے شایانِ شان ہوتی لیکن اس نے تو اپنے گھر کو (اظہار تورع اور زہد کیلئے) مصلّوں اور سجادوں سے بھر دیا ہے۔ کاش کوئی اس کو ان ہی سجادوں میں لپیٹ کر جلا دیتا تاکہ فراش کو اس سے اور اس کے شر سے نجات حاصل ہو جاتی۔ کیونکہ یہ شخص فراش کے اس اعتقاد کو جو صاحب لطف و کرم سے ہونا چاہیئے فاسد کر رہا ہے (اپنی عنایتوں میں مشغول کر کے اللہ تعالےٰ کے لطف و کرم سے اُس کو غافل بنا دیا ہے) اس کے قدم اس راہ سے ڈگمگا گئے ہیں اور وہ خاموش تماشائی بنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے حالانکہ فراش کے ممدوح اپنے نفس کو تسبیحوں اور نمازوں سے آراستہ کر رکھا ہے ا شاید اللہ تعالیٰ کسی دن فراش پر اپنی عنایات کے دروازہ کو کھول دے (اور وہ اس غفلت سے نکل آئے) اور اس کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی مل جائے

اور وہ یہ سمجھ لے کہ وہ کس چیز میں گرفتار تھا (کس فریب میں مبتلا تھا) اور صاحب لطف وکرم (حقیقی) کی رحمت سے اس کو کس چیز نے دور کر دیا تھا پھر وہ اپنے ہاتھوں سے خود ان مصلوں اور سجادوں کے مالک کی گردن دبا دے، اور کہے کہ تو نے ہی مجھے ہلاکت میں ڈالا تھا۔ (اس کی یہی سزا ہے) اب مجھ پر بوجھ اور میرے افعال کی شکلیں ہر دو ظاہر ہو گئی ہیں (اب میں تیرے فریب میں نہیں آؤں گا) جس طرح میرے مصلح اور میرے ہادی نے اپنے مکاشفہ کے ذریعہ میرے قبیح اعمال اور عقائد فاسدہ کو ملاحظہ کر کے میرے گھر کے ایک گوشہ میں میرے پس پشت یکجا دیکھ لیا اگرچہ میں اس صاحب عنایت سے ان افعال قبیحہ اور اعمال فاسدہ کو چھپا تا رہا تھا اور ان کو پس پشت ڈال دیا تھا لیکن اس کو ان تمام کاموں اور باتوں کا علم تھا (میرے چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا) جو کچھ میں اس سے چھپاتا رہا تھا اور وہ کہتا تھا کہ مجھ سے کیا چھپاتا ہے (یہاں مولانا رومیؒ نے بطور مرشد و ہادی اور صاحب کشف کے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اب فرماتے ہیں کہ) اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں اُن اعمال خبیثہ کو بلاؤں تو وہ متشکل ہو کر ایک ایک کر کے میرے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔ اللہ رب العلمین مظلوموں کو ان جیسے ظالموں اور لٹیروں سے مامون و محفوظ فرمائے اور ان سے نجات عطا فرمائے جو فریبی طاعت و عبادت فریب کے ذریعہ اللہ کے راستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

شہر کے بسنے والے جو میدانِ جنگ میں شرکت نہیں کر سکتے اُن کو دکھانے کے لیے بادشاہ میدان میں چوگان کھیلتے ہیں تاکہ ان لوگوں کو دکھائیں کہ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت کس طرح دی جاتی ہے اور دشمنوں کے سر کس طرح کاٹ کر میدان میں گیند کی طرح لڑھکائے جاتے ہیں اور کس طرح میدان میں گیند سے کھیلتے ہیں۔

صلوٰۃ و سماع کی مثال

میدان کا یہ کھیل اصطرلاب کی طرح ہے۔ میدانِ جنگ کے شہسوار جس طرح میدان جنگ

میں دادِ شجاعت دیتے ہیں اسی طرح اہلِ اللہ نماز و سماع میں مشغول ہو کر بندگانِ خدا کے سامنے اپنے اعمال کو پیش کرتے ہیں (تاکہ انہیں ان کا ذوق و شوق ہو) تاکہ وہ اوامر و نواہی میں ان امور کا لحاظ رکھیں جو اُن کی ذات کے ساتھ مختص ہیں۔

سماع اور مغنّی

سماع میں مغنّی (قوال) کی حیثیت وہی ہے جو نماز میں امام کی ہوتی ہے کہ لوگ اس کا (امام کا) اتباع کرتے ہیں اور اس کے اشاروں (تکبیرات) پر ارکانِ نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر قوال کوئی اہم چیز گاتا ہے تو اُس کے ساتھ رقص بھی اہم انداز کا ہوتا ہے۔ اگر کلام خفیف ہوتا ہے تو رقص بھی خفیف ہوتا ہے۔ باطن میں امر و نہی کی جو دعوت اور پکار ہے اس اتباع کی یہ ایک مثال ہے۔

فصل

قرآن مجید کا اعجاز

مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ حفاظ قرآن، جن کو عارفین کے احوال کی ہوا تک نہیں لگی اس آیت کی شرح کیا فرماتے ہیں کہ ولا تطع کل حلاف مھین ھماز (بہت قسمیں کھانے والے ذلیلوں اور طعنہ زنوں کی باتیں نہ ماننا) ھمّاز طعنہ باز تو وہ خود ہی ہیں کہ فلاں کی بات مت سنو کہ وہ تمہاری چغلیاں کرتا ہے، ھمّاز ہے (بہت طعنہ دینے والا) مشاءِ بنمیم ہے چغلخوریوں کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا منّاع للخیر ہے (بہت روکنے والا لوگوں کو بھلائی کی باتوں سے) حالانکہ یہ خصائل خود انہیں لوگوں کے ہیں)۔

مگر قرآن مجید بھی عجیب جادو ہے (جو سر پر چڑھ کے بولتا ہے) اتنا غیرت مند ہے اور ایسی بندش باندھتا ہے کہ صریحاً دشمنوں کے کان میں پہنچکر اپنی بات کہتا ہے دشمن اس کے معنے سمجھتے تو ہیں مگر سرے سے ان کو

حقیقت کی بھنک نہیں ملتی ان کو اپنی خبر ہی نہیں ہوتی، وہ انفس پھر وہیں کھینچ لے جاتا ہے جہاں وہ تھے۔

ختم اللہ قرآن مجید میں ہے (کہ مہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر) یہ آیت عجیب لطافت اپنے اندر رکھتی ہے کہ مہر لگ جانے کے بعد بھی سننے والا سنتا تو ہے مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، بحث کئے جاتا ہے تہہ کو نہیں پہنچتا۔

اللہ لطیف ہے، اس کا قہر بھی لطیف ہے اور اس نے مہر لگائی ہے اور ان کی عقل و خرد پر جو قفل، ڈالا ہے وہ بھی لطیف ہے، لیکن ایسا قفل ہے جس کے کھلنے کی کوئی صورت نہیں، ایسی لطافت اس میں ہے کہ اس کی صفت بیان میں نہیں آسکتی۔ میں اگر اپنے اجزائے وجود کو بھی اس کی کشائش میں صرف کر دوں تو یہ قفل کشائی اس کے لطف بے پایان اور اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ تب بھی اس کے لطف بے نہایت اور قفل کشائی کی عنایت اور اس کی بیچونی و فتاحی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ بیماری ہو یا موت تم اس کو مہتم نہ کرنا کیونکہ اس پردہ زنگاری میں تو کوئی اور ہی ہے۔ جو مجھے تمام کرنے والا ہے۔ یہ ایک بے مثل لطف ہے، کوئی چھری تلوار اگر سامنے آئے تو اس کو بھی یہ سمجھنا کہ اغیار کے چشم بد سے مدافعت کے لئے ہے تاکہ اس کی منحوس نگاہ بیگانہ مقتل کا ادراک نہ کر سکے۔

فصل

صورت عشق کی اصل نہیں بلکہ ایک فرع ہے

صورت تو عشق کی ایک فرع اور شاخ ہے اور بغیر عشق کے اس صورت کی کوئی قدر نہیں۔ فرع کی تعریف یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی اصل ہو بغیر اصل کے اس کا وجود

ممکن نہیں اور اصل کے بغیر فرع ہو سکتی ہی نہیں۔ (اس کلیہ کے مطابق)۔ لہذا ہم اللہ تعالیٰ کو صورت یعنی فرع نہیں کہہ سکتے۔ یعنی ہم نے صورت کو فرع کہا ہے پس ہم اللہ تعالیٰ کے لئے فرع کا تصوّر نہیں کر سکتے کیونکہ وہ تو اصل ہے۔ عشق نہ تو بغیر صورت کے متصوّر ہے اور نہ عشق کا وقوع بغیر صورت کے ممکن ہے لہذا ہم فرع کو صورت سے تعبیر کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ بغیر صورت عشق کیوں ممکن نہیں عشق تو بغیر صورت کے بھی پیدا ہوتا ہے اور اسی عشق سے ہزاروں لاکھوں صورتیں وجود میں آتی ہیں۔ عشق ممثل بھی ہے اور محقق بھی۔

یہ بات تو مسلّم ہے کہ نقاش کے بغیر نقش کا وجود نہیں ہوتا۔ لیکن نقش کے بغیر نقاش بھی اپنا وجود ثابت نہیں کر سکتا۔ حالانکہ نقش فرع ہے اور نقاش اصل۔ کحرکة الاصبع مع حرکة الخاتم" جس طرح انگلی کی حرکت سے انگوٹھی متحرک ہوتی ہے۔ اگر گھر بنانے کا عشق (شوق) پیدا نہ ہو تو اس وقت تک کوئی مہندس (انجنیئر) گھر کی ہیئت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ یا یوں سمجھو کہ ایک سال گندم کا بھاؤ سونے کے بھاؤ کے برابر تیز ہوتا ہے اور ایک سال خاک کے برابر بہت ہی ارزاں اور کم نرخ۔ حالانکہ دونوں برسوں میں گندم کی صورت وہی ایک ہے۔ پس گندم کی قدر و قیمت یعنی اس کا اتار چڑھاؤ گندم کے عشق (شوق خریداری) کے باعث ہوتا ہے اس کی صورت سے نہیں۔ (کہ صورت سال بسال وہی رہتی ہے) اسی طرح اس ہنر کو لے لو جس کے تم والہ و دلدادہ ہو تو اس کی قدر و قیمت تمہاری نظر میں کچھ اور ہی ہوگی (اور جس کو اس ہنر کی چاہت نہیں اس کے نزدیک اس کی کچھ قدر نہیں ہوگی) اسی طرح جس دور میں کسی ہنر کا کوئی طالب نہیں ہوتا تو لوگ اس ہنر کو نہیں سیکھتے ہیں (کوئی اس کی طرف رخ بھی نہیں کرتا) لوگ اس کے دلدادہ نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ عشق

نام ہے محتاجی کا۔ پس جب احتیاج اصل قرار پائی تو محتاج الیہ (جس کی احتیاج ہے) وہ یقیناً اس کی فرع ہوئی! اس سے زیادہ وضاحت سے میں تم کو بتاؤں کہ "یہ بات جو تم کر رہے ہو آخر اس کی ضرورت جب تم کو لاحق ہوئی جب ہی تو یہ کلام تم سے سرزد ہوا چونکہ تم کو اس کی طرف رغبت تھی (یہ بات تم کہنا چاہتے تھے) پس یہ بات عالم گویائی میں یا صورت تحریر میں آئی! اس سے ظاہر ہوا کہ حاجت مقدم ہوئی اور تم نے جو بات کہی وہ اسی احتیاج سے پیدا ہوئی۔ پس اس سے قبل احتیاج کا وجود پایا گیا اور یہ فرع (سخن) موجود نہ تھی۔ اب اس کو تم احتیاج کہو یا عشق۔ اس موقع پر کسی نے کہا کہ اس احتیاج کا مقصود تو یہی سخن (بات کرنا) تھا۔ پس مقصود کو فرع کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ ہمیشہ مقصود فرع ہی ہوتا ہے کہ درخت کی جڑ جو اصل ہے اس سے مقصود اس کی فرع یعنی پھل ہے پس ثابت ہوا کہ مقصود اصل نہیں بلکہ اصل کی فرع ہے۔

فصل

دنیا کی حقیقت گھر کی طرح ہے

مولانا نے فرمایا کہ (اس دنیا) کے بارے میں جو بیان کیا جاتا ہے اگرچہ درست نہیں ہے اور اس دعویٰ کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا لیکن اس جماعت کے وہم میں یہ بات کچھ اسی طرح جاگزیں ہوگئی ہے۔ دیکھو انسان کا باطن اور وہم دہلیز کی طرح سے ہیں اور مکان میں داخل ہونے کیلئے پہلے دہلیز پر آتے ہیں۔ پھر مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ دنیا بھی گھر کی طرح ہے اور جو کوئی بھی مکان میں داخل ہونا چاہتا ہے اس کو دہلیز ضرور نظر آئے گی۔ جو مکان کا اہم اور نمایاں حصہ ہے مثلاً ہم اس گھر میں بیٹھے ہیں پہلے اس گھر کی تصویر یا ہئیت مہندس (انجنیئر) کے ذہن میں آئی اس کے بعد مکان کا وجود ہوا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ دنیا ایک گھر ہے اور جو کچھ تم نے دہلیز میں دیکھا اس کو یہ سمجھ لو کہ یہ سب مکان اور اسی کا نمونہ ہے اور یہ تمام چیزیں خیر و شر سے متعلق جو دنیا میں نظر آتی ہیں پہلے یہ تمام دہلیز میں ظاہر ہوئی ہیں اس کے بعد یہاں مکان میں نظر آتی ہیں۔

عجائبات عالم کی تخلیق

اللہ رب العلمین جب چاہتا ہے کہ قسم قسم کی چیزیں، عجائب و غرائب، باغات، سبزہ زار، علوم و فنون، مختلف الموضوع تصانیف اس دنیا میں پیدا فرمائے تو ان تمام اشیاء کی طلب ان میں پیدا کر دیتا ہے تاکہ اس احتیاج ظہور سے یہ چیزیں عالم وجود میں آجائیں اس دنیا میں۔ جو کچھ بھی نظر آتا ہے اور تم دیکھتے ہو اس کے متعلق یہ سمجھ لو کہ یہ اس عالم بالا سے متعلق ہے مثلاً جو کچھ تم شبنم پاتری میں دیکھتے ہو جان لو کہ وہ یقیناً سمندر ہی سے ہیں کیونکہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ سمندر ہی کی طفیل ہے (اگر سمندر نہ ہوتا تو یہ متعلقات بحر کس طرح وجود میں آتے) اسی طرح یہ زمین و آسمان، عرش و کرسی اور کائنات کے دوسرے عجائب ہیں۔ یہ تمام عجائب اور ان کے مظاہر اللہ تعالیٰ نے اسلاف کی ارواح طیبات میں پیدا فرما دیئے تھے۔ بہرنوع یہ چیزیں انھیں تقاضوں کی بناء پر ظہور میں آئیں۔

لوگ کہتے ہیں حکماء و فلاسفہ کہ عالم قدیم ہے۔ ان کی یہ بات کب قابل سماعت ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عالم حادث ہے اور یہ اولیاء اللہ کا مقولہ ہے انبیاء علیہم السلام تو عالم سے بھی قدیم ہیں اللہ تعالیٰ نے ان ہی انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبات میں آفرینش عالم کا تقاضہ رکھ دیا تھا۔ اور اسی تقاضہ کے باعث یہ عالم پیدا ہوا ہے۔ پس ان حضرات کا عالم کو حادث کہنا بجا اور درست ہے (یہی حقیقت میں جانتے ہیں کہ عالم حادث ہے) یہ کہہ کر یہ حضرات خود اپنے مقام کی خبر دیتے ہیں۔ مثلاً ہم اس گھر میں بیٹھے ہیں اور عمر ساٹھ ستر سال ہے، ہم کو علم

ہے پہلے یہ گھر نہیں تھا۔ چند سال ہوئے کہ یہ گھر بنایا گیا۔ اگر اس گھر میں (انسان کے بجائے) جانور اور حشرات الارض پیدا ہوتے۔ دیواروں کے اندر کے کیڑے مکوڑے چوہے سانپ اور دوسرے حقیر جانوروں سے یہ گھر بھرا ہوتا تو وہ اگر یہ کہیں کہ یہ گھر قدیم ہے تو اُن کی یہ بات کس طرح قابلِ قبول ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہمارے لئے اُن کا یہ قول حجت بن سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے مشاہدہ سے گزر چکا ہے کہ یہ گھر حادث ہے چونکہ وہ حشرات الارض اس گھر کے در و دیوار میں پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اس گھر کے سوا کوئی اور گھر نہیں دیکھا ہے' وہ اس گھر کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں اور نہ کچھ دیکھ سکے ہیں۔ اسی طرح وہ مخلوق ہے جس نے دنیا کے گھر میں جنم لیا ہے اور اس کے سوا ان کے اندر اور کوئی جوہر موجود نہیں ہے۔ ان کا تعلق تو بس اسی گھر سے رہا ہے اور اسی گھر میں مرکھپ جائیں گے۔ پس یہ اگر عالم کو قدیم کہیں تو اُن کا یہ قول انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے لئے حجت نہیں بن سکتا جو اس عالم سے لاکھوں سال پہلے (جبکہ اس گنتی کا کوئی شمار و حساب نہیں) موجود تھے کہ ان حضرات نے تو حدوثِ عالم کا خود مشاہدہ کیا ہے جس طرح تم نے اس گھر کی بنا (حدوث) کا خود مشاہدہ کیا۔ (پس یہ حضرات تکوینِ عالم کے قدم کو کس طرح تسلیم کرسکتے ہیں)۔

فصل

حدوث و قِدمِ عالم

ایک (چھٹ بھیا) فلسفی نے یہ سوال اٹھایا کہ تم نے حدوثِ عالم کو کس طرح معلوم کیا (تو اُس نے اس فلسفی سے یہ سوال کیا) اے احمق تو نے قِدم عالم کو کس طرح سمجھا؟ کیا قِدم عالم سے تیری مراد یہ ہے اور تو یہ کہتا ہے کہ یہ عالم قدیم ہے

اس کا مطلب یہ ہوا عالم حادث نہیں ہے اس طرح تو نے نفی حدوث عالم پر گواہی پیش کی اور قاعدہ یہ ہے کہ دلیل اور ثبوت پیش کرنا اثبات پر نفی کے ثبوت کے مقابلہ میں آسان اور قوی ہوتا ہے اور تمثیل سے اس کو یوں سمجھیں کہ اس کام کو فلاں شخص نے نہیں کیا ہے تو اس پر مطلع ہونا مشکل ہے چاہے وہ شخص ابتدائے عمر سے آخر تک ہمہ وقت سوتے جاگتے اُس شخص کے ساتھ رہا ہو اور اس تعلق کے باوصف وہ شخص کہے کہ اس نے یہ کام نہیں کیا تو یہ حقیقت نہ ہوگی۔ ممکن ہے دہ شخص سو گیا ہو یا کسی ضرورت سے کہیں چلا گیا ہو اور اس وقت اس کے لئے ساتھ رہنا ممکن نہ ہو سکا ہو۔ لہذا نفی پر یہ گواہی درست نہیں کیونکہ ہمہ وقت موجودگی کا ثبوت اس کے امکان میں نہیں لیکن اثبات میں گواہی اس کے مقدور میں بھی ہے اور آسان بھی کیونکہ وہ یہ بات ثابت کرتا ہے کہ میں اس کے ساتھ تھا تو اس نے یہ عمل کیا تھا یا اس طرح کیا تھا۔ تو یقیناً اس کی شہادت قابل قبول، اور قرین قیاس ہے کیونکہ یہ ثبوت اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔

اے کندۂ ناتراش! یہ جو حدوثِ عالم پر شہادتیں موجود ہیں تیری اس گواہی سے کہیں آسان ہیں جو تو نے قدمِ عالم پر پیش کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ عالم حادث نہیں ہے۔ اس طرح تو نے بجائے اثبات کے نفی پر دلیل اور گواہی پیش کی ہے۔

اور جب اِن دونوں حقیقتوں (حدوث اور قدم) کے لئے گواہی نہیں ہے کہ عالم حادث ہے یا قدیم اے فلسفی! تو کس دلیل کی بنا پر دوسرں سے حدوث عالم کی دلیل مانگتا ہے اور دوسرا تجھ سے قدم عالم کی دلیل طلب کرتا ہے۔

پس اس صورت میں تیرا دعویٰ زیادہ مشکل اور زیادہ محال ہے۔

فصل

حجت آرائی

ایک روز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شانۂ نبوت میں

رونق افروز تھے۔ چند کافر خدمت میں آئے اور حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس پر اعتراض کرنے لگے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ تم اس بات سے تو اتفاق کرتے ہو کہ اس دنیا میں ایک ایسی شخصیت ہے جس پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے یعنی وہ مہبطِ وحی الٰہی ہے اور یہ وحی الٰہی کسی اور پر نازل نہیں ہوتی اور جس کے پاس وحی الٰہی آتی ہے اس کے پاس علامتیں اور نشانیاں (معجزات) موجود ہوتے ہیں اس کے اقوال و افعال میں نیز سمجھو کہ اس کی پیشانی میں بھی خوارق موجود ہوتے ہیں۔ صرف پیشانی میں ہی نہیں بلکہ اس کے سراپا میں نشانیاں ہوتی ہیں جب تم ان نشانیوں کو دیکھتے ہو تو اس پر ایمان لاؤ اور اس کے دامن کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو تاکہ وہ تمہاری دستگیری فرمائے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر کافر شرمندہ ہو گئے اور ان کے پاس کوئی دلیل و حجت باقی نہ رہی۔ اس طرح گفتگو میں جب بند ہو گئے (اور کوئی جواب ان سے بن نہیں پڑا) تو وہ ظلم و تعدی پر اتر آئے۔

تلقینِ صبر یہ بدبخت ستم تیر بکف ہو کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو طرح طرح کی اذیتیں دیتے مارتے پیٹتے، تلواروں سے زخمی کرتے طرح طرح سے ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ احوال دیکھ کر رحمتِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے صبر کرو تاکہ ان کو یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ یہ (مسلمان) ہم پر طاقت کے ذریعے غالب آگئے ہیں تاکہ اپنے دین کو پھیلائیں۔ درآنحالیکہ حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس خود اپنے دین کو غلبہ عطا فرمائے گا۔

مقابلے کا حکم صحابۂ کرام مدت تک چھپ چھپ کر نمازیں ادا کرتے رہے حتیٰ کہ سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی بھی کھل کر نہیں لے سکتے تھے۔ (حضور علیہ السلام کا نام بھی علانیہ لینے کی جرأت نہ کرتے تھے) یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد وحی الٰہی آئی اور سرکار کو حکم ملا کہ تم بھی ان پر تلوار اٹھالو اور ان سے برسرِ پیکار ہو جاؤ۔

سرکارِ دوعالم کا امی لقب ہونا

معلمِ انسانیت سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو امی کہا جاتا ہے تو کیا انہیں امی اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ انشاء وعلوم پر قدرت نہ رکھتے تھے؟ آپ کو امی اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کو انشا اور علوم وحکمت وہبی طور پر حاصل تھے اور آپ پیدائشی طور پر ان علوم اور حکم کے حامل تھے۔ کسی کے سامنے زانوئے علم وادب تہہ نہیں کیا تھا اور کیوں نہ ہو جو شخص چاند پر تحریر کر سکتا ہو[1] کیا وہ دنیا میں کاغذ پر کچھ لکھنا نہ جانے گا؟ اور عالم دنیا میں کونسی ایسی چیز ہوگی جس کا علم معلمِ انسانیت کو نہ ہو اور وہ نہ جانیں جب کہ ساری دنیا انہیں سے سب کچھ سیکھتی ہے اور عقل جزوی (بشری) کے لئے وہ کونسی چیز ہو سکتی ہے جو اس صاحبِ "عقلِ کل" کو حاصل نہ ہو[2] البتہ اس عقل جزوی (انسانی) میں صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خود سے کوئی نئی چیز اختراع کرے جب کہ اس نئی چیز یا اس کی جنس کو دیکھا نہ ہو۔ یہ جو لوگوں نے تصانیف کی ہیں علوم ہندسہ کے بارے میں انکشافات کیے ہیں، نئی نئی تعمیرات اور ایجادیں کی ہیں یہ تمام چیزیں نئی نہیں ہیں یہ سب وہ باتیں ہیں جو پہلے سے علم میں ہیں۔ یہ لوگ تو صرف ان میں زیادتی اور اضافہ کرتے ہیں۔ اور وہ جو نئی ایجادات و اختراعات کرتے ہیں انہیں عقل کل کہا جاتا ہے۔

عقلِ کلی و جزوی کا فرق

عقل جزوی سیکھنے والی ہے اور محتاجِ علم ہے جبکہ عقل کلی معلم ہے اور محتاجِ علم نہیں اسی طرح اگر تم تمام پیشوں اور حرفتوں کو کرید کر ان کی اصل معلوم کرنا چاہو تو ان کا آغاز

---

[1] آپ نے چاند کو شق کرنے کے لئے انگشتِ مبارک سے اشارہ کیا وہ شق ہوگیا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ [2] مولانا کے ان جملوں سے علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس موضوع پر یہاں تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں صرف اشارہ کافی ہے۔

اور ان کی اصل وحی الٰہی ہے اور وہی تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ پس تمام علوم انبیاء سے سیکھے گئے ہیں اور حضرات انبیاء عقل کل ہیں۔

قابیل و ہابیل کی سرگزشت

قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مارنے کے بعد کیا کیا جائے، دیکھا کہ ایک کوّے نے دوسرے کوّے کو مار کر مٹی کھودی اور اس کو دفن کر کے اس پر مٹی ڈال دی۔ اس طرح قابیل نے کوّے سے مردہ دفن کرنے کی تعلیم حاصل کی اور قبر بنا کر مردہ دفن کرنا قابیل کو کوّے نے سکھایا (کوّے کی یہ کہانی مثنوی کے دفتر چہارم میں آموختن گور کنی دیکھنی چاہیئے۔)

پیشوں اور حرفتوں کی تعلیم

دنیا کے تمام پیشے اور صنعتیں جو عقل جزوی سے متعلق ہیں تعلیم کی محتاج ہیں اور کسی کے سکھانے سے سیکھی جاتی ہیں۔ لیکن عقل کلی ہر چیز کو وضع کرنے والی اور بنانے والی ہے اور یہ شخصیتیں انبیاء اور اولیاء کی ہیں کہ انہوں نے عقل جزوی کو عقل کلی سے اتصال بخشا ہے۔ مثال سے اس کو اس طرح سمجھیں کہ ہاتھ پیر آنکھ کان اور حواس انسانی یہ تمام کے تمام عقل و قلب انسانی سے تعلیم حاصل کرنے کے اہل اور لائق ہیں پیر عقل (انسانی) سے چلنے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ہاتھ پکڑنے کا علم سیکھتے ہیں۔ آنکھ دیکھنا سیکھتی ہے تو کان سننا۔ لیکن، اگر قلب و عقل نہ ہوں تو ان حواس و اعضاء میں سے کوئی بھی کام کے لائق نہ ہوگا نہ اعضاء انسانی کر سکیں گے۔

لطافت و کثافت

آنکھ قلب و عقل کے مقابلہ میں کثیف بھی ہے اور دبیز بھی۔ جبکہ قلب و عقل لطیف ہیں اور یہ کثیف اسی لطیف کے سہارے باقی و قائم ہیں اور ان میں جو کچھ لطف و تازگی ہے وہ انہیں کی وجہ سے ہے ورنہ

ان کے بغیر وہ عضوِ معطل کی طرح سے ہیں۔ دبیز بھی اور کثافت آلودہ بھی۔

اس طرح عقلِ جزوی عقلِ کلّی کے لئے ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی نسبت کی وجہ سے عقلِ جزوی عقلِ کلّی سے سیکھتی اور تعلیم حاصل کرتی ہے۔ عقلِ جزوی عقلِ کلّی کے مقابلہ میں کثیف و غلیظ ہے۔

ہمّت کی اہمیت اور صُورَت کی ضرُورت

ایک شخص نے کسی سے کہا کہ ہمیں اپنے باطنی تقرب کے ساتھ یاد رکھیئے کہ اصل چیز یہی ہمت ہے۔ کلام ہو یا نہ ہو اس کی حیثیت تفرعی ہے مولاناؒ نے فرمایا کہ یہ ہمت عالمِ اجسام سے پہلے عالمِ ارواح میں تھی اس طرح ہمیں عالمِ ارواح سے عالمِ اجسام میں کیا بلا وجہ لے آئے؟ یہ بات امر محال ہے ہم کو یہاں بے وجہ نہیں لایا گیا۔ لہٰذا یہاں سخن اور کلام کی ضرورت ہے اور یہ فائدہ سے خالی نہیں ہے اس کو اس طرح سمجھو کہ اگر زرد آلو کی گری (مغز) کو زمین میں بو یا جائے تو کیا اس سے درخت اُگے گا؟ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ (اصل کے ساتھ) صورت بھی درکار ہے۔

نماز اور حضورِ قلب

نماز کا تعلق بھی باطن سے ہے "لا صلوٰۃ الا بحضور القلب" بغیر حضورِ قلب کے نماز نہیں ہوتی لیکن اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ انسان رکوع اور سجود بھی بجالائے اور اسکو ظاہری صورت میں مکمل کرے۔ اُسی وقت تو فائدہ حاصل کرے گا اور مقصود کو پہونچے گا۔ اور یہ جو فرمایا گیا ہے "ھُمْ علیٰ صلوٰتھم دائمون" (وہ ہمیشہ نماز میں مقرر رہتے ہیں۔) اس کو رُوحانی نماز کہا جاتا ہے۔ نماز صوری تو وقت کی قید کے ساتھ ہے۔ وہ دائم اور ہر وقت ادا نہیں کی جاتی اور نہ ہر وقت جاری و ساری رہتی ہے۔ رُوح تو ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں ہے اور جسم ایک ساحل ہے جو خشک پڑا ہے اور محدود ہے اور اس کا ایک اندازہ ہے! اس لحاظ سے صلوٰۃ دائمی صرف رُوح کے لئے ہو سکتی ہے اس طرح رُوح بھی رکوع و سجود بجالاتی ہے لیکن اس

رکوع و سجود کو ظاہری صورت یعنی لا نا ضروری ہے تاکہ باطن کا ظاہر کے ساتھ اتصال ہو جائے۔ جب تک ان دونوں میں اتصال نہیں ہو گا کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ (جس طرح ہم نے اوپر مغز کی مثال پیش کی) کہ اس سے درخت نہیں اُگ سکتا)۔

صورت اور معنی کا فرق

یہ جو تم کہتے ہو کہ صورت معنیٰ کی فرع ہے صورت رعیت ہے اور قلب بادشاہ ہے۔ یہ سب اضافی نام ہیں (اور رسمی تعارف ہے) جب تم کہتے ہو کہ یہ اس کی شاخ ہے جب تک شاخ نہ ہو گی اس پر اصل کا نام کس طرح منطبق کیا جائے گا! اس طرح وہ اصل اسی فرع کی ہو گی۔ اگر فرع نہ ہوتی تو اس (اصل) کا نام بھی نہ ہوتا۔

جب تم نے کسی کو رَبّ کہا ہے تو اس کے لئے ایک مربوب بھی ضروری ہے! اسی طرح حاکم کہا تو محکوم کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے (پس یہ تمام اسمائے اضافی ہیں)۔

اولیا کی صحبت کا اثر

حسام الدین ارزنجانی اولیاء و صلحا کی خدمت میں حاضری سے قبل اپنے دور کے بہت بڑے مناظر تھے۔ جب کبھی وہ کہیں جاتے یا کسی نشست میں موقع ملتا تو مناظرانہ انداز میں بڑی پیاری گفتگو کرتے اور خوب دل کھول کر بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے۔ لیکن جب سے صلحاء اور اولیاء کی صحبت اختیار کی تو یہ مناظرانہ جذبات سرد پڑ گئے ع

نبرد عشق را جز عشق دیگر" عشق کو عشق کے سواء اور کوئی دوسری چیز نہیں کاٹتی۔" من اراد ان یجلس مع اللہ فلیجلس مع اھل التصوّف"۔ جو شخص خداوند تعالیٰ کی ہم نشینی چاہتا ہو اس کو چاہیئے کہ وہ صاحبانِ تصوّف کی صحبت اختیار کرے۔"

ان تمام علوم کو فقراء کے "احوال" کے مقابلے میں رکھ کر دیکھو تو یہ سراسر لہو و لعب معلوم ہونگے اور عمر کا ضائع کرنا ہو گا۔ دنیوی زندگی کے بارے میں ارشاد ہے:۔

"انما الحیوٰۃ الدنیا لھو و لعب" (حدید ع ۳)۔ دنیاوی زندگی تو صرف لہو و لعب اور کھیل ہے۔

جب انسان عاقل و بالغ ہو جاتا ہے اور اس کا شعور پختہ ہو جاتا ہے تو وہ کھیل کود لہو و لعب کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو شرم و ندامت کے خوف سے چھپ کر ایسے (ناشائستہ) کام کرتا ہے۔ یہ قیل و قال کی دنیا اور اس کی خواہش ہوا کی طرح ہیں اور انسان مشتِ خاک ہے۔ جب یہ خاک ہوا میں اڑتی ہے تو آنکھوں کو دھندلا کر دیتی ہے۔ اور اس کے وجود سے سوائے تکلیف و اذیت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن دیکھو اگرچہ وہ (انسان) خاک ہے۔ مگر جب قیمتی بات سنتا ہے تو بے اختیار رو پڑتا ہے اور آنکھ سے آنسو پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں تریٰ اعینھم تفیض من الدمع (مائدہ ع ۱۱) تم ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھو گے۔"

جب ہوا کے بدلہ پانی کا خاک پر گزر ہوتا ہے اور خاک پر آنسوؤں کا) پانی پڑتا ہے تو نتیجہ قول ماسبق کے برعکس نکلتا ہے (یعنی خاک پانی پڑنے سے جم جاتی ہے اور اس زمین پر سبزہ رنگا رنگ کے پھول اُگ آتے ہیں۔ یہ فقر ایک ایسا راستہ ہے جس پر قدم رکھ کر ہر مراد اور تمام آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں اور تمہاری ساری تمنائیں اس راہ پر چلنے سے بر آتی ہیں خواہ وہ مراد دشمن کے لشکروں پر فتحیابی سے متعلق ہو یا دشمن کے لشکروں میں افراتفری پھیلانے سے یا ممالک کی تسخیر، دوسروں پر تفوق حاصل کرنے اور طاقت و قوت کا مظاہرہ کرنے یا طلاقتِ لسانی اور فصاحت و بلاغت کا اظہار کر کے اپنے تفوق کے اظہار سے متعلق ہو۔ یہ تمام آرزوئیں اُس وقت حاصل ہوں گی جب تم فقر کا راستہ اختیار کر لو گے اور جو بھی اس راہ پر گامزن ہو گیا تو نارسائی و نامرادی کی شکایت کے کلمات اُس کی زبان پر نہیں آئے۔ اس کے برعکس جو لوگ دوسرے راستوں پر چلے ہیں تو ان راہروں میں سے لاکھ میں ایک کا مقصد حاصل ہوا ہے (باقی سب کے سب نامراد رہے ہیں) اور وہ مقصود بھی ایسا حاصل نہیں ہوا کہ دل کو ٹھنڈک پہنچی

اور اس کو قرار آجاتا ۔ وجہ یہ ہے کہ ہر راستہ کے لئے آداب و انداز اور اسباب مخصوص ہیں جن کو اپنائے بغیر مقصد تک رسائی حاصل نہیں ہوتی ۔ مگر اسباب کے اعتبار سے یہ راستہ بہت طویل اور پُر آفت ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رکاوٹیں مقصود تک پہونچنے بھی نہ دیں ۔ اور اسباب پیچھے رہ جائیں ۔

عالم فقر کے آداب

اَب جبکہ تم نے فقر کی دنیا میں قدم رکھ لیا ہے اور خالق کائنات نے تمہیں ایسے ملک اَور عالم عطا فرما دیئے ہیں جن کا تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے ! اور تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ تھے لیکن ابتداء میں تم نے جس چیز کی خواہش کی تھی اور جس چیز کو چاہا تھا اور اس کی وجہ سے ندامت سے ہمکنار بھی ہوئے تھے اور اس وقت یہ خیال کیا تھا کہ افسوس ایسی نعمت کی موجودگی میں جو مجھے مل گئی ہے ایک حقیر چیز کی تمنا کیوں کی تھی ۔ لیکن پروردگارِ عالم کا فرمان تو اس طرح ہوتا ہے کہ اگر تو نے اس خواہش اور آرزو سے کنارہ کشی اختیار کر لی یا اس کی خواہش ہی نہیں کی بلکہ اس سے بیزار بھی ہو گیا اور اس خواہش کو تو نے میری خاطر ترک کیا ۔ مگر میں اپنے بے پایاں کرم کے صدقہ تجھے تیری اس خواہش کے پورا ہونے میں ناکام نہ ہونے دونگا ۔

فصاحتِ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبل بعثت

سیّد عالم صلے اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل عربوں کی فصاحت و بلاغت کو ملاحظہ فرماتے تو خواہش ہوتی کہ مجھے بھی یہ صلاحیت حاصل ہوتی (اور مجھے بھی اس صلاحیت کے اظہار کا موقع ملتا) لیکن جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مکنونات غیوب پر آگاہی حاصل ہوئی (اور فنافی اللہ کی منزل آئی) اور محو حق

ہو گئے تو یہ خواہش قلب میں یکسر سرد پڑ گئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا (اے پیارے حبیبؐ) جس فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لئے آپ موقع کی تلاش میں تھے۔ اب وہ موقع میں نے میسّر کر دیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ خداوندا یہ میرے کس کام کی اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ آپؐ کی یہ کیفیت بھی باقی رہے گی اور آپؐ کو فصاحت و بلاغت پر دسترس بھی حاصل رہے گی اس سے آپؐ کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ پس حق تعالیٰ نے آپؐ کو وہ کلام عطا فرمایا کہ تمام دنیا آپؐ کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک آپکے کلام معجز نظام کی شرح میں مصروف ہے۔ اور بہت سی ضخیم کتابیں اسی کلام کی شرح میں مرتب ہو گئیں اور آج بھی ہو رہی ہیں لیکن بایں ہمہ اس کے ادراک سے قاصر ہیں اور حق تعالیٰ نے فرمایا اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کے اصحاب اپنی اجتماعی کمزوری اور دشمنوں کے خوف اور شر سے ابتداءً آپؐ کا نام علی الاعلان لیتے ڈرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے چپکے چپکے (سرگوشی میں) آپؐ کا ذکر کرتے لیکن ہم آپؐ کی عظمت اور برتری کو ایسے درجہ پر پہونچا دیں گے اور اس کو اس طرح پھیلائیں گے کہ ہفت اقلیم میں بلند میناروں پر اذان بلند آواز سے دیجائے گی اور اس میں آپؐ کا نام نامی شامل ہوگا۔ اور مشرق سے مغرب تک خوش الحانی کے ساتھ اور بلند آوازوں میں آپؐ کا نام لیا جائیگا۔

اب جب کہ خود کو کسی نے اس راہ میں سراپا محو کر دیا تو اس کے تمام دینی اور دنیاوی مقاصد پورے ہو گئے اور کسی نے اس راہ کی شکایت نہیں کی۔ ہماری گفتگو ساری کی ساری نقد ہے اور دوسروں کی باتیں نقل ہیں۔ اور یہ نقل نقد کی فرع ہے، نقد انسان کے پیر کی طرح ہے اور نقل لکڑی کے پیر کی طرح ہے جو انسانی قدم کی صورت تو رکھتا ہے اس چوبی قدم کا تخیل اصل

قدم سے چرایا گیا ہے۔ اور اسی انداز کا بنایا گیا ہے اگر اس دنیا میں اصلی پاؤں نہ ہوتا تو اس کا سانچہ کہاں سے بناتے۔ یہ نقلی پاؤں کیسے بنتا۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ بعض باتیں نقد ہیں اور بعض نقل۔ مگر دونوں ایک دوسرے کی مانند ہیں۔ پہچان میں کوئی ایسی امتیازی چیز ہونی چاہیے جو نقد کا نقل سے امتیاز کرائے۔

جاننا چاہیئے کہ تمیز ایمان ہے اور کفر عدم تمیز ہے۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ فرعون کے زمانہ میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بحکم الٰہی اژدھا بن گیا تو ساحروں کی تمام رسیاں بھی سانپ بن گئیں۔ یہ سب سانپ ایک ہی رنگ اور صورت کے تھے۔ فرعون ان میں تمیز نہ کر سکا۔ سحر اور معجزہ میں اس کو تمیز نہ ہو سکی۔ لیکن جو صاحب تمیز تھا اس نے سحر اور حق میں امتیاز کر لیا اور اسی تمیز کی بدولت وہ ایمان لے آیا۔ اس سے ہم کو معلوم ہوا کہ ایمان نام ہے تمیز کا۔ دیکھو! یہ قصہ کیا ہے؟ اس کی اصل وحی الٰہی ہے لیکن جب افکار حواس اور تصرف خلق سے اس میں آمیزش ہوئی تو اس میں لطافت باقی نہ رہی۔ کیا وحی کی لطافت آج اس میں موجود ہے۔

غور کرو کہ یہ پانی جو نالوں اور کاریزوں کے ذریعہ شہر میں آرہا ہے اگر اس کے سرچشمہ کو دیکھا جائے تو وہ کس قدر صاف شفاف نظر آتا ہے۔ لیکن جب وہ شہر میں باغوں اور کھیتوں اور آبادیوں میں سے گزرتا ہے تو لوگ اس میں ہاتھ پیر دھوتے ہیں۔ ان کے اعضاء کی کثافت، ہاتھ پیروں کا میل، کپڑوں اور جانوروں کی غلاظت اس پانی میں گر کر اس میں مل جاتی ہے اور وہ پانی جب دوسرے کنارہ پر پہونچتا ہے اس وقت وہی صاف شفاف پانی (اب مٹی اور کیچڑ میں تبدیل ہو گیا ہے) جو خشک زمین کو سیراب کر کے اس میں سبزہ اگاتا ہے اور پیاسوں کی تشنگی دور کر دیتا ہے لیکن پہچاننے والی نظر جانتی ہے کہ یہ وہی پانی ہے جو اب پہلے کی طرح صاف شفاف نہیں

باقی رہا اور اس میں ناپسندیدہ چیزوں کی آمیزش ہوگئی ہے۔
"اَلْمُؤْمِنُ كَيِّسٌ مُمَيِّزٌ فَطِنٌ عَاقِلٌ" مومن صاحبِ عقل و شعور و مالک فطانت و عقل اور صاحبِ تمیز ہوتا ہے۔

حیات کی صفت

کوئی صد سالہ پیر اگر کھیل کود میں مشغول ہو تو اس میں بچپن کی صفات باقی ہیں لہٰذا اس کو بوڑھا (صاحبِ عقل و شعور) نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ اپنے بچپن کے باوجود کھیل کود میں مشغول نہیں ہوتا تو اس کو بچہ نہیں کہیں گے۔ یہاں عمر کا اعتبار نہیں (بلکہ صفات کا اعتبار ہے) آپ اس کو مثال سے اس طرح سمجھیں کہ نہ خراب ہونیوالا پانی ماء آسن ہے اور ماء آسن کی تعریف یہ ہے کہ وہ ساری نجاستوں کو خود سے دور کردے۔ اور یہ نجاستیں اس پر اثر انداز نہ ہوں اور وہ پہلے کی طرح صاف اور لطیف ہے۔ معدے میں جاکر اسے مضمحل نہ کرے اور خلط نہ بن جائے اپنی صفائی کو علیٰ حالہ باقی رکھے۔ اس پانی کو ہم آبِ حیات کہتے ہیں۔

فساد و عدمِ فسادِ نماز

ایک شخص نے نماز میں چیخ ماری اور رونے لگا، اس کے اس عمل سے اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اس کا جواب تفصیل سے دیا جاسکتا ہے۔

اگر یہ رونا اس وجہ سے ہے کہ اس نمازی کو محسوسات کے علاوہ کوئی دوسرا عالم دکھایا گیا جس کی وجہ سے اس پر گریہ طاری ہوگیا اور اس کو اس حالت میں دیکھکر جن لوگوں نے یہ کہا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ اگر اس نے ایسی چیز یا ایسا منظر دیکھا جو نماز سے متعلق ہے اور نماز کی تکمیل کرنے والا ہے تو اس سے نماز ساقط نہ ہوگی بلکہ اس کو مکمل ترین نماز کہا جائیگا۔ کیونکہ یہی تو نماز کا مقصود ہے لیکن اس کے برخلاف اگر وہ دنیاوی امور کی وجہ سے رویا یا کسی دشمن کے

خوف کی وجہ سے اس کو رونا آگیا یا کسی پر حسد کی وجہ سے اس پر رقت طاری ہوئی کہ اس کے پاس ایسی چیزیں ہیں جن سے میں محروم ہوں تو ایسی حالت میں اس کی نماز ابتر، ناقص اور باطل ہو جائے گی۔

ایمان کیا ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان حق و باطل میں پہچان کرنیوالا ہے اور کھرے کھوٹے کے فرق کو ظاہر کرتا ہے اور جس کسی کو یہ تمیز حاصل نہیں ہے وہ محروم ہے۔ اور یہ باتیں جو میں کہتا ہوں اگر سننے والے میں عقل و شعور اور پہچان ہے تو وہ اس سے استفادہ کر لیتا ہے لیکن اگر اس میں ان صفات کا فقدان ہے تو میری باتیں اس پر بے اثر اور بیکار ہوتی ہیں۔ جس طرح شہر کے دو عقلمند شخص ایک دیہاتی آدمی کے مفاد اور اس کی تائید کی خاطر گواہی دینے جاتے ہیں لیکن وہ دیہاتی اپنی جہالت اور سادگی کی وجہ سے ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شہادت غیر موثر اور ان کی یہ کوشش ضائع ہو جاتی ہے۔ اسی بناء پر یہ ضرب المثل کہی جاتی ہے کہ دیہاتی اپنا گواہ خود ہی ہوتا ہے یا اپنا گواہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

اسی طرح جب کسی بزرگ پر سُکر کی حالت طاری ہو جاتی ہے تو جس پر یہ حالت طاری ہو جاتی ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہاں اس کیفیت کو جاننے والا کوئی موجود ہے یا نہیں؟ یا اس بات کا اہل اور قدردان کوئی ہے یا نہیں؟ لیکن وہ لاف گزاف کے اظہار سے باز نہیں رہتا اس کو مثال سے یوں سمجھیں کہ اگر کوئی عورت جس کی چھاتیاں دودھ سے بھر جائیں اور ان میں تکلیف بھی ہونے لگے تو وہ محلہ بھر کے سگ بچوں کو جمع کر کے اپنی بھری چھاتیوں کا دودھ ان پر ٹپکا دیتی ہے یعنی حالت سُکر میں کیا جانیوالا کلام اصحاب فہم نہ ہونے کی وجہ سے (ضائع ہو جاتا ہے) اب اگر یہ بات نااہل کے ہاتھ پڑ گئی تو اس کی مثال یہ ہے کہ

ایک قیمتی موتی کو ایک بچہ کے ہاتھ میں دیدیا جو اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے۔ جب وہ اس کو لے کر چلا تو موتی اس کے ہاتھ سے لیکر اس کی بجائے سیب ہاتھ پر رکھ دیا (تو وہ بچہ ناراضگی کے بجائے خوش ہو گا۔ کیونکہ وہ موتی کی قدر و قیمت سے واقف نہ تھا)۔ اس طرح عدم تمیز کی وجہ سے اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ دَر حقیقت تمیز اور پہچان ایک نعمت ہے اور بڑی نعمت ہے۔

بایزید اور تعلیم فقہ

بایزیدؒ کو اُن کے والد مدرسہ لے گئے تاکہ یہ فقہ کی تعلیم حاصل کریں۔ جب یہ استاد کے سامنے بیٹھے تو سوال کیا اُھ ذا فقہ اللہ کیا یہ اللہ کی فقہ ہے۔ اُستاد نے جواب دیا نہیں! ھذا فقہ ابی حنیفۃ یہ فقہ امام ابو حنیفہ کی ہے بایزیدؒ نے کہا کہ میں تو اللہ کی فقہ پڑھنا چاہتا ہوں۔ جب والد نے نحو پڑھانے والے کے سپرد کیا تو بایزیدؒ نے اس سے بھی یہی سوال کیا کہ کیا یہ نحو اللہ تعالیٰ کی ہے ؟ استاد نے جواب دیا کہ نہیں اسیبویہ کی ہے۔ بایزیدؒ نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کی نحو پڑھنا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد ان کے والد جس فن کے استاد کے پاس لے جاتے ان سے بایزیدؒ ایسے ہی سوال کرتے۔ پس اُن کے والد نے عاجز آکر انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔

بایزیدؒ علم کی تلاش میں گھومتے پھرتے بغداد آگئے۔ جب حضرت جنیدؒ بغدادی سے ملاقات ہوئی اور اُن کے چہرے پر نظر پڑی تو بیساختہ پکار اٹھے ھذا فقہ اللہ یہی تو اللہ کی فقہ ہے "آخر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا کہ بکری کا بچہ اپنی ماں کو نہ پہچانے جب کہ اس کے تھنوں کے دودھ سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ بایزید عقل و تمیز کی پیداوار تھے لہذا ظاہر پر نظر نہ رکھی۔ حقیقت کا ادراک کیا"۔)

ایک بزرگ کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنے سامنے مؤدب اور دست بستہ کھڑا رکھتے تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ مریدین کو دست بستہ کیوں کھڑا رکھتے ہیں۔

ہیں۔ انہیں بیٹھنے کو کیوں نہیں کہتے۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل فقراء اور بزرگوں کے طرزِ عمل کے مخالف ہے، یہ تو امیروں اور بادشاہوں کا طریقہ ہے۔ اُن بزرگ نے کہا نہیں! تم خاموش رہو۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ (مریدین) اس طریقہ کو باعظمت سمجھیں تاکہ اس سے فیض حاصل کریں۔ اگرچہ تعظیم کا تعلق دل سے ہے لیکن "الظاہر عنوان الباطن" ظاہر باطن کا عنوان ہے۔ عنوان کے معنی کیا ہیں؟؟ یعنی ہم عنوان یا سرخی سے خط کے مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں کہ کس کے نام ہے ہم عنوان سے کتاب کو جانتے ہیں کہ اس میں کتنے باب اور فصلیں ہیں۔ اسی طرح ظاہری تعظیم ہے اور سروقد کھڑے رہنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس عمل کو کرنے والے کے قلب میں ذاتِ باری کی کتنی تعظیم ہے؟ اور وہ کس طرح عظمتِ الٰہی کو اختیار کرتا ہے۔ اور اگر کوئی بظاہر تعظیم نہیں کرتا تو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ باطن بیباک ہے۔ اور اسی بیباکئ باطن کے باعث مردانِ حق کو معظم نہیں رکھتے (ان کی تعظیم و تکریم نہیں کرتے)۔

فصل

سوال بعد از مرگ

سلطان کے خادم جوہر نے مولانا سے سوال کیا کہ زندگی میں انسان کو دن میں پانچ مرتبہ تلقین کی جاتی ہے (یعنی اذان کے ذریعہ اس کو دین کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے) لیکن وہ بات کو سمجھتا ہی نہیں۔ اس سے مرنے کے بعد کون سے سوالات کئے جائیں گے؟ کیونکہ اس نے زندگی میں سیکھے ہوئے سوالات کو بھلا دیا ہے اب وہ سوالات کیا جانے دلگا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو جواب دیا کہ کوئی شخص آموختہ کو بھلا دیتا ہے تو اس سبق کو جو یاد نہیں ہوا بدرجۂ اولیٰ بھول جائے گا۔ اور ذہن اس سے یکسر صاف اور خالی ہو گا۔ مگر اس کو تو اپنی ذات پر منطبق کر کہ تو عرصہ دراز

ہے آج تک میری باتیں سنتا رہا ہے ان میں سے بعض کو تو نے یاد رکھا ہے کیونکہ ان جیسی باتیں تو نے پہلے بھی سنی ہیں اور بعض باتیں کچھ قبول کی ہیں اور بعض پر توقف کیا ہے اور بحث کی ہے اور اس بحث میں رد و قبول کی کیفیت جو تیرے ذہن میں پیدا ہوئی ہے اس کو نہ تو کسی نے سنا ہے اور نہ کوئی اس سے واقف ہوا ہے اور نہ اس کیفیت کو معلوم کرنے کے لئے کوئی آلہ ہے جس سے اس کیفیت کو معلوم کیا جائے باوجود یکہ تو کان رکھتا ہے لیکن تیرے باطن سے تیرے کان میں کوئی آواز نہیں آتی۔ اور اگر اپنے باطن میں کسی کو تلاش کرے تو کسی بات کرنے والے کو نہ پائے گا۔ (حالانکہ یہ سبھی کچھ ہوگیا جسکی تجھے پوری خبر ہے۔

آمد خود ایک سوال ہے

مولانا نے جوہر سے فرمایا کہ تیری آمد ہی بغیر کچھ کہے سوال ہے۔ یعنی تو چاہتا ہے کہ تجھے راہِ راست کی جانب متوجہ کیا جائے اور جس راہ پر ڈالا جائے اس راہ کو مزید روشن اور واضح کیا جائے۔ اور ہمارا اس نشست میں بات کرنا یا خاموش رہنا اس پوشیدہ سوال کا جواب ہے۔

اور جب تم لوگ ہماری صحبت سے اٹھکر بادشاہ کی خدمت میں حاضری دوگے تو وہ بادشاہ سے سوال و جواب کے مترادف ہوگی۔ اسی طرح بادشاہ کا اپنے ملازمین کے سامنے خاموش رہنا بھی ایک طرح کا سوال ہے کہ وہ کس طرح اٹھتے بیٹھتے اور کس طرح دیکھتے ہیں۔ اگر کسی کے باطنی نظر میں کجی ہے تو جواب بھی اس سے کج اور ٹیڑھا ہی ملے گا اور اس سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ راست جواب دے سکے۔ اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگر کسی کی زبان میں لکنت ہے تو کوشش بسیار کے باوجود وہ صحیح اور درست بات نہیں کر سکتا۔ سُنار اگر سونے کو کسوٹی پر کستا ہے تو یہ بھی ایک سوال ہے۔ سونا بیساختہ اپنی حیثیت کا اظہار کر دیتا ہے کہ میرے اندر آمیزش ہے یا نہیں۔

بوتہ خود گویدت چہ پالودی   کہ زری یا مس زر اندودی

سونے کی کٹھالی (مٹی کا وہ برتن جس میں سونا پگھلایا جاتا ہے) خود بتا دیگی کہ خالص سونا ہے یا اس میں میل اور کھوٹ ہے اسی طرح اگر تم غور کرو تو معلوم ہوگا کہ بھوک طبیعت کا ایک سوال ہے کہ جسم کے مکان میں کوئی کمی ہے جس کے لئے مٹی اور اینٹ کی ضرورت ہے اور بھوک کو مٹا دینا یعنی کچھ کھا لینا اس سوال کا جواب ہے۔ اور نہ کھانا اس امر کا غماز ہے کہ ابھی کھانے کی ضرورت نہیں ہے اور بھوک کا مہرہ (معدہ) ابھی خشک نہیں ہوا۔ لہٰذا اس پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہیں ہے۔

طبیب جب نبض پر انگلیاں رکھتا ہے تو یہ سوال ہے اور نبض کی حرکات اس سوال کا جواب ہیں قارورے پر نظر ڈالنا سوال ہے اس کی کیفیت جواب ہے۔ دانہ زمین میں ڈالنا سوال ہے (کہ ہم کو فلاں میوہ یا پھل کی ضرورت ہے) اور اس بیج سے درخت کا اُگ آنا جواب ہے۔ جو قول اور کلام سے خالی ہوتا ہے۔ جب سوال بے حرف وصوت ہے تو جواب بھی بے حرف وصوت ہونا چاہیئے۔ دانہ اگر سڑا ہوا ہے تو نہیں اُگے گا۔ یہ بھی سوال ہے اور نہ اُگنا ہی اس کا جواب ہے کہ میرے اندر روئیدگی کا سرمایہ نہیں تھا اس لیئے میں زمین کے اندر سے کچھ نہیں نکال سکا۔

جوابِ جاہلاں باشد خموشی

ایک بادشاہ نے کسی شخص کے رُقعہ یا درخواست کو تین مرتبہ پڑھا لیکن اس کا کوئی فیصلہ نہ کیا تو اُس نے بادشاہ سے شکایت کی کہ آپ نے آپ نے تین مرتبہ درخواست پڑھی ہے یا تو اس کو قبول فرمالیں، یا اس کو رد کردیں، بادشاہ نے اس رقعہ کی پشت پر لکھا "اما علمت ان ترک الجواب جواب" ــــ وجواب الاحمق السکوت۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ترکِ جواب بھی ایک جواب ہے اور احمق کا جواب سکوت سے دیا جاتا ہے اسی طرح درخت کا نہ اُگنا بھی ترکِ جواب

ہے لیکن اس ترک جواب کا ایک اور جواب ، یہ ہے کہ ہر عمل اور کام جو انسان کرتا ہے وہ سوال ہے اور اس کے ردّ عمل میں خوشی یا غم جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ جواب سوال ہے - اگر اچھی خبر سنے تو چاہیئے کہ شکر ادا کرے اور شکر کی تعریف یہ ہے کہ جس سوال کا جواب ایسا ملا جو اس کے مالہٗ اور ماعلیہٗ کو حاوی ہو ویسا ہی سوال کیا جائے لیکن اگر سوال کا جواب مرضی کے مطابق نہ ہو اور غم و اندوہ کا پہلو لئے ہوئے ہو تو استغفار کرے اور آئندہ ایسا دوسرا سوال نہ کرے -

" فلولا اذجاءہم باسنا تضرعوا ولکن قست قلوبھم" (انعام ع ۵) "جب ہمارا عذاب آپہونچا تو انہوں نے تضرع وزاری سے کیوں کام نہیں لیا۔ لیکن ان کے دل سخت ہو گئے تھے۔

یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی کہ جواب ان کے سوال کے مطابق ہے " وزیّن لھم الشیطٰن ما کانوا یعملون " (انعام ع ۵) شیطان نے اُن کے کرتوت ان کو اچھے کر کے دکھائے۔ یعنی وہ اپنے سوال کو اچھا سمجھتے رہے اور یہ خیال کرتے رہے کہ ہمارے (عمدہ) سوال کا ایسا خراب جواب نہ ہوگا۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ دھواں لکڑیوں کا تھا آگ کا نہیں تھا اور لکڑیاں جتنی خشک ہوں گی دھواں اتنا ہی کم ہوگا -

اگر تم نے باغ کو مالی کی سپردگی میں دیا ہے اب اگر وہاں سے ناگوار بو آئے تو الزام باغبان پر ہوگا۔ باغ موردِ الزام نہ ہوگا۔

مولاناؒ نے کسی شخص سے سوال کیا کہ تو نے اپنی ماں کو کیوں قتل کیا تو اس نے جواب دیا میں نے ناشائستہ بات دیکھی تھی - مولاناؒ نے کہا کہ مرد کو قتل کرنا چاہیئے تھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں کیا روزانہ ایک مرد کو قتل کرتا؟

اب جو کچھ تجھے پیش آئے تو اپنے نفس کی تادیب کر تا کہ روزانہ تجھے کسی سے جنگ نہ کرنی پڑے اور اگر کوئی تجھ سے یہ کہے کہ " کل من عنداللہ "

(نساء ع ۱۱) سب کچھ اللہ رب العٰلمین کی جانب سے ہے" تو اس کہنے والے کو ہم یہ جواب دیں گے کہ بیشک اپنے نفس کی تادیب کرنا اور دنیا کو اس سے نجات دلانا بھی اللہ رب العٰلمین کی جانب سے ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص زرد آلو کے درخت سے پھل گرا رہا تھا اور ان کو کھا رہا تھا۔ اس اثنا میں باغ کا مالک آگیا اور اس شخص سے مواخذہ کیا اور کہا کہ تیرے دل میں خدا کا خوف نہیں جو ایسی حرکت کر رہا ہے) تو وہ شخص جواب دیتا ہے۔ کیوں ڈروں درخت اللہ کا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں اس طرح میں خدا کا مال کھا رہا ہوں اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مالک نے اس کی یہ بات سن کر کہا ٹھیر جا میں اس بات کا ابھی جواب دیتا ہوں۔ اُس نے کسی کو کہا کہ رسی لاکر اس شخص کو درخت سے باندھو اور اس کو مار لگاؤ۔ چنانچہ مار کھاکر وہ شخص آہ وزاری کرنے لگا اور کہنے لگا کہ تجھے خدا کا خوف نہیں جو مجھے مارتا ہے۔ باغ کے مالک نے جواب دیا کہ میں خوف کیوں کھاؤں خدا کے بندے کو خدا کی بنائی ہوئی لکڑی سے پیٹا جا رہا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ یہ دنیا پہاڑ کی طرح ہے۔ اچھی یا بری جو بات بھی زبان سے نکالو گے پہاڑ سے ویسی صدا ئے بازگشت سنائی دے گی۔ اگر تم یہ خیال کرو کہ میں نے تو اچھی بات کہی تھی لیکن پہاڑ سے بُری بات سنائی دی تو یہ بات غلط ہے اور محال ہے کہ بلبل کی آواز پہاڑ میں گونجے اور پہاڑ سے کوّے کی بازگشت سنائی دے یا کبھی اور دھالو دکی آواز آئے۔ لہٰذا یہ یاد رکھو کہ پہاڑ میں جو بھی پکارو گے اسی کی بازگشت سنو گے۔

بانگ خوش دار چوں بکوہ آئی   کوہ را بانگ خرچہ فرمائی

جب تم پہاڑوں میں آؤ تو خوش آوازی کا مظاہرہ کرو۔ پہاڑوں میں گدھے کی طرح نہ رینکو۔ یہ نیلا آسمان تو تم کو خوش آوازی دیکھنا چاہتا ہے۔

فصل

خالقِ کائنات اور فعلِ تخلیق

مولاناؒ نے فرمایا ہماری حیثیت پانی پر پیالہ کی طرح ہے (کہ وہ اس پر تیر رہا ہے) پانی کا بہنا اور اس کا جاری رہنا پیالہ کے حکم میں نہیں ہے بلکہ پیالہ ہی پانی کے حکم میں ہے۔ ایک شخص نے کہا یہ تو حکم عام ہے لیکن بعض اس کو سمجھتے ہیں بعض نہیں مولاناؒ نے فرمایا کہ اگر یہ حکم عام ہوتا تو اس تخصیص "سا کہ "قلب المومن بین الاصبعین" (مومن کا قلب دو انگلیوں کے درمیان ہے) یہ حکم درست نہ ہوتا۔ مولاناؒ نے مزید فرمایا "الرحمٰن علّم القرآن (رحمٰن ع ۱) رحمٰن نے قرآن سکھایا؛ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عام حکم ہے۔ کیونکہ تمام علوم (بشمول قرآنِ مجید) اسی نے تعلیم فرمائے ہیں۔ اب قرآنِ مجید کی تخصیص کیوں ہے؟ اسی طرح "خلق السمٰوات والارض" (ہود ع ۱) جب فرمایا تو آسمان اور زمین کی تخلیق ہوئی۔ (یہاں آسمان اور زمین کی تخصیص کیونکر درست ہوگی) کیونکہ علی العموم تمام چیزوں کی تخلیق اسی خالقِ کائنات نے فرمائی ہے۔ اس طرح بلا شک و شبہ پانی پر تمام پیالے اسی کی قدرت اور مشیت سے ہیں۔ لیکن اگر برائیوں کی تخلیق کی نسبت خالقِ کائنات کی جانب کی جائے تو یہ بے ادبی اور گستاخی کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے۔ یا خالق السرقین والضراط والفساد (نعوذ باللہ) اے گوبر اور ریاح اور فساد کے پیدا کرنے والے (یہ تو گستاخی ہے) لیکن اگر یہ کہے کہ اے خالقِ سمٰوات اور اے خالقِ عقول تو اس طرح تخصیص فائدہ مند ہوگی باوجودیکہ عموم ہے مگر تخصیص سے اس چیز کو برتری بخشی۔ خلاصہ کلام یہ کہ پیالہ پانی پر تیر رہا ہے اور پانی اس کو جہاں چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے تاکہ تمام پیالے یہ نظارہ کریں کہ ایک پیالہ پانی پر تیر رہا ہے۔ یہاں ایک اور بات بھی ہے کہ دوسرے پیالے پانی سے بالطبع گریزاں ہوتے ہیں۔ اور پانی ہی انہیں گریز اور رفتار کی قوت عطا کرتا ہے۔ اور ان کے دل میں یہ بات

ڈالتا ہے کہ " اللھم زد نا منہا بعداً " خدا وندا اس سے ہماری دوری کو اور بڑھادے ، حالانکہ اس سے قبل تو کچھ اور ہی تمنا اور آرزو تھی یعنی اللھم زد نا منہ قربا : خدا وندا ، اس سے ہمارے قرب کو اور بڑھادے ۔

اب جو شخص کہ نظر عمومیت سے اس پیالہ کو دیکھ رہا ہے وہ یہی کہے گا کہ از روئے تسخیر دونوں قسم کے پیالے پانی سے مسخر ہیں اور اس اعتبار سے ایک ہیں لیکن ایک کا جواب یہ ہے کہ اگر تم اس کاسہ کے حسن و خوبی اور اس کو گردش دینے کا لطف دیکھتے اور حسن کے بارے میں دریافت کرتے (جو اس گردش کرنے والے کاسہ کو حاصل ہے) اور اس کی خوبی پر غور کرتے تو تم کو اس صفتِ عام کا خیال نہ آتا (کہ کاسہ ہونے میں تمام کاسے برابر ہیں) جس طرح معشوق ، فضلہ اور گندگی رکھنے کے اعتبار سے سب لوگوں میں مشترک ہے لیکن اپنی مخصوص ذات اور جسم کی خوبصورتی کے اعتبار سے کسی وقت بھی عاشق کے خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ میرا معشوق ان نجاستوں (بول و براز) کے لحاظ سے مشترک ہے کہ یہ ان دونوں کا (معشوق اور غیر معشوق کا) وصفِ عام ہے کہ دونوں جسم ہیں اور اجزاء رکھتے ہیں ــــ اور شش جہت کے ساتھ محدود ہیں ۔ دونوں حادث و فانی ہیں ۔ یہ اوصاف عامہ ان دونوں میں پائے جاتے ہیں ۔ پس وہ معشوق جو ایک گوہر کی طرح ہے ہرگز اس کے شایاں نہیں کہ تم اس کو اس صفتِ عام سے یاد کرو اور اسے اپنا دشمن سمجھنے لگو اپنا شیطان خیال کرنے لگو (جس سے بھاگنا پڑے) اب جب کہ تم نے اس محبوب کو نظریۂ عمومیت سے دیکھا تو پھر تمہاری نظر ہمارے حسنِ خاص کے نظارے پر نہیں ہوئی اور نہ تم اس کے اہل ہو ۔ اب تم سے اس سلسلے میں مناظرہ نہیں کیا جاسکتا ۔ کیونکہ اس بحث میں تو نظریۂ حسن شامل ہے اور حسن کا اظہار اس شخص پر کرنا جو اس کا اہل نہ ہو ظلم کے مترادف ہے ۔ قول ہے کہ

لا تعطوا الحکمۃ غیر اھلھا — حکمت کو نا اہل لوگوں کے سامنے پیش نہ کرو

فتظلموھا ولا تمنعوھا عن اھلھا — حکمت پر ظلم ہوگا ۔ اسی طرح اہل لوگوں سے

فتظلموھم ؛ اگر اس کو چھپاؤ گے تو اہل لوگوں پر ظلم ہو گا۔

اس کو ہم علمِ نظر کہتے ہیں۔ یہ علم مناظرہ نہیں۔ موسم خزاں میں پھول نہیں کھلتے اور نہ درختوں میں پھل آتے ہیں کیونکہ یہ مقابلہ اور مناظرہ ہوتا ہے۔ یہ موسم خزاں سے مقابلہ ہے موسم سے مقابلہ کرنا پھول کی فطرت نہیں۔ اگر آفتاب کی شعاعیں درخت پر پڑتی ہیں تو پھل بھی آتے ہیں ورنہ موسمی اثرات کے تحت وہ کلی سے باہر سر نہیں نکالتے۔ ایسے وقت میں موسم خزاں اُن سے کہتا ہے اگر تو خشک شاخ نہیں تو تیرے اندر ہمت ہو تو میرے سامنے آ لیکن وہ ایسے موقع پر کہتا ہے میں تیرے سامنے خشک شاخ ہی کی طرح ہوں اور تیری نظر میں بے حوصلہ سہی۔ تیرا جو جی چاہے کہہ لے (میں پھول بن کر سامنے نہیں آؤں گا)۔

اے بادشاہِ صادقاں چو من منافق دیدۂ بازندگانت زندہ ام بامردگانت مردہ ام

اے راست گویوں کے بادشاہ کیا تونے مجھ جیسا منافق بھی دیکھا ہے؟ میری حالت تو یہ ہے کہ تیرے زندہ لوگوں کے ساتھ زندہ اور تیرے مردوں کے ساتھ مردہ ہوں۔

ایک تمثیل

توجہ مولانا بہاؤ الدین کے نام سے موسوم ہے۔ اگر تیرے سامنے ایک بدصورت بڑھیا جس کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت جس کا چہرہ سوسمار کے پشت کی طرح سخت و کرخت اور بھیانک ہو، اگر ایسی خاتون آکر تجھ سے یہ کہے کہ اگر تو مرد ہے اور جوان ہے تو میں تیرے سامنے ہوں لے، تیرے سامنے بستر معشوق بھی ہے اور میدان جوانمردی بھی قدم بڑھا اور مردی کا اظہار کر۔ تو جواں مرد اس موقع پر یہی کہے گا کہ معاذ اللہ میں تو اپنی مردمی کی صلاحیتوں کے اظہار سے معذور ہوں اور میری مردمی کے بارے میں لوگ غلط کہتے ہیں۔ اگر تو میری جفت بننا چاہے تو مجھے نامردی قبول۔

انسان اور بچھو کا مکالمہ

ایک بچھو اگر ڈنک اٹھائے تمہارے عضو پر ڈنک مارنے آئے اور کہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بہت ہنس مکھ انسان ہو میں بھی تمہاری خوش طبعی کا مظاہرہ دیکھنا چاہتا ہوں اس موقع پر جو الفاظ تمہاری زبان سے ادا ہوں گے وہ یہی ہوں گے کہ میں نہ تو ہنس مکھ ہوں اور نہ خوش مزاج. میرے بارے میں غلط مشہور کیا گیا ہے. حقیقت یہ ہے کہ میں اس بات کا منتظر ہوں کہ تو کب یہاں سے جائے اور مجھ سے دور ہو تاکہ میری مسرتیں اور خوشیاں لوٹ کر آئیں ۔

اظہارِ حال کا موقع

مولاناؒ نے فرمایا ہر بات کا موقع اور محل ہے. آہ و فغاں کی تو ذوق رخصت ہو جائے گا. آہ و فغاں مت کرو تاکہ ذوق باقی رہے. لیکن بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں کہ آہ و فغاں کا اظہار ضروری ہوتا ہے اور بقائے ذوق آہ و فغاں پر منحصر ہوتا ہے ۔ اور یہ اختلاف حال کی وجہ سے ہے. اگر یہ امر حقیقی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا:

اِنَّ ابراھیم لاوّاہٌ حلیمٌ (توبہ ع ۱۴) بیشک ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے.

ہر وقت اپنی طاعت کا بھی اظہار نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی ذوق کے اظہار کے مترادف ہے۔ اور تم یہ جو کچھ بھی کہتے ہو وہ اس لئے ہوتا ہے کہ ذوق کا اظہار نہ ہو. لہٰذا اگر یہ طریقہ ذوق کو ختم کرتا ہے تو اس طرح تم ذوق کو ختم کرنیوالے امور سے موافقت و مرافقت کرتے ہو جو مناسب نہیں. اس کی مثال تو ایسی ہو گی کہ ایک سوتے ہوئے شخص کو جگا کر یہ کہیں کہ اٹھو دن نکل آیا اور قافلہ روانہ ہونیوالا ہے ۔ ایسے موقع پر اگر لوگ اس جگانے والے سے کہیں کہ چھوڑ دو یہ عالم ذوق میں ہے اگر جاگ گیا تو یہ کیفیت ختم ہو جائے گی. تو اس موقع پر یہی کہا جائے گا کہ یہ ذوق تو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے اور یہ دوسرا ذوق ہلاکت سے بچانے والا ہے۔ ایسے موقع پر یہ بھی کہتے ہیں کہ نیند سے جگانا تفکرات کو دور کرنے کا سبب ہو گا لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ آواز نہ دو سونے والا تفکرات کا شکار

ہو جائے گا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عالمِ خواب میں کیسی فکر ؟ تفکرات کا عالم تو اس پر خواب سے بیدار ہونے کے بعد طاری ہو گا۔

بیدار کرنے کا انداز بیدار کرنے اور جگانے کے انداز دو طرح کے ہیں۔ اگر جگانے والا اور متوجہ کرنے والا سونے والے اور خوابِ غفلت کے شکار سے مرتبۂ علم و فضل میں بلند ہے تو یہ جگانا اور توجہ دلانا اس کے (سونے والے کے) علم و فضل میں اضافہ کا سبب بنے گا۔ کیونکہ خبردار کرنے والا جب اس کو جگاتا ہے تو اس کی فکر بلند ہوتی ہے اور اپنی اسی بلندیٔ فکر کی وجہ سے وہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو آواز دیتا ہے لیکن جب معاملہ اس کے برعکس ہو یعنی جگانے والا سونے والے سے علم میں کم ہے اور کم عقل زیادہ عقل والے کو متنبہ اور خبردار کرے تو اس طرح جگانے والے کی نظر شرم سے جھکے گی یعنی جب جگانے والا مرتبہ میں اسفل ہو گا تو اس کی نظر بھی نیچی ہی رہے گی اور اس کی فکر بھی عالم سفلی کی راہ لے گی

فصل

تحصیلِ علم اور اندازِ تعلیم

یہ لوگ جنہوں نے علم حاصل کر لیا ہے یا علم حاصل کر رہے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب وہ یہاں آئیں گے تو اپنا پڑھا لکھا بھول جائیں گے۔ کیونکہ یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہاں آنے سے ان کے علم میں جان پیدا ہو گی ان کا علم نقش کی طرح سے ہے، جب اس نقش میں جان پیدا ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قالب مردہ میں جان پڑ گئی ہے۔ ان تمام علوم کی اصل کہیں اور ہے یہ سب عالم بے حرف و صوت سے نقل ہوئے ہیں۔

"وکلم اللہ موسیٰ تکلیما" (نساء ع ۲۲) ربّ کریم نے جناب موسیٰ سے کلام فرمایا۔ ذاتِ باری تعالیٰ کا یہ کلام حضرت موسیٰ سے حرف و صوت میں نہیں ہوا کیونکہ حروف و الفاظ

ادا کرنے کے لئے مُنہ اور لب چاہیئے اور ذاتِ باری جسم و جسمانیت سے منزہ اور پاک ہے۔ لہٰذا انبیاء علیہم السلام سے کلامِ الٰہی بغیر حروف و آواز کے ہوا اور اس انداز میں ہوتا ہے کہ انسانی فہم و خرد اس کے ادراک سے عاجز ہیں پھر انبیاء علیہم السلام عالمِ بے حرفی و صوتی سے حروف کی دنیا میں آجاتے ہیں اور ان طفلانِ مکتب کے لئے بچوں کے انداز میں تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں :کہ" بُعِثْتُ معلمًا" میں معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔ اب حرف و صوت کی دنیا میں رہنے والے اگرچہ ان کے احوال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن ان سے تقویت اور نشو و نما ضرور حاصل کرتے ہیں۔ اور ان سے ان کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ جس طرح شیر خوار بچہ اگرچہ اپنی ماں کو تحقیق کے ساتھ نہیں پہچانتا لیکن اس کی ذات سے آرام و سکون حاصل کرتا ہے جیسا کہ پھل اپنی شاخ پر سکون سے رہتا ہے۔ اس سے شیرینی حاصل کرتا ہے بڑھتا ہے اور پختگی حاصل کرتا ہے۔ حالانکہ اس کو درخت کی حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔

اسی طرح وہ لوگ اگرچہ حرف و آواز کو نہیں جانتے اور نہ متکلم کو پہچانتے ہیں اور نہ اس تک رسائی حاصل کرتے ہیں لیکن اس سے پرورش پاتے ہیں اور اس سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ان تمام نقوش میں یہ راز مضمر ہے کہ ورائے عقل و حرف و صوت کوئی اور چیز اور کوئی اور عالم عظیم ہے۔

دیوانوں سے رجوع

کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ لوگ دیوانوں سے رجوع کرتے ہیں۔ اور اُن کی زیارت کے لئے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ یہ وہی ہو! یہ بات درست ہے اور معاملہ یہی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس محل کو نہیں جانتے اور یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو کچھ عقل میں نہ آئے وہ وہی ہے۔

کُلُّ جَوْزٍ مُّدَوَّرٌ وَّ لَيْسَ كُلُّ مُدَوَّرٍ جَوْزٌ ہر اخروٹ گول ہوتا ہے لیکن ہر گول چیز اخروٹ نہیں ہوتی۔ اس کا نشان وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ اگرچہ (بظاہر) اس کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بایں ہمہ عقل و جان کو اس سے

قوت اور مدد ملتی ہے اور وہ ان کی پرورش کرتا ہے۔ لیکن یہ دیوانے (دنیا دار کو
سے مُراد ہے) جو اُس دیوانے (مجذوب) کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔ ان میں یہ بات نہیں
ہے۔ یہ دیوانے کے پیچھے پھرنے والے نہ تو اپنی خودی سے پلٹے ہیں اور نہ ان میں کوئی
انقلاب پیدا ہوا ہے اور نہ ان کو اس کی ذات سے آرام و سکون حاصل ہوتا ہے۔
اگرچہ بظاہر وہ یہی خیال کرتے ہیں کہ اُن کو سکون و آرام میسّر آگیا ہے لیکن ایسا نہیں کہ
ہم اس کو آرام نہیں کہیں گے۔ یہ تو اس بچہ کا آرام ہوا جو ذرا سی دیر کے لئے اپنی ماں
سے الگ ہو کر کسی دوسرے کے پاس آرام و سکون حاصل کر لیتا ہے مگر یہ آرام حقیقی نہیں
ہے (کہ یہ اس کی حقیقی ماں کی آغوش نہیں ہے) بلکہ اس سے بھول اور غلطی ہو گئی (وہ
اپنی ماں کو حقیقت میں نہ پہچان سکا ورنہ دوسرے کی گود میں سکون کیوں پاتا)۔

ہر پسند آنیوالی چیز مقوی نہیں ہوتی

اطبا کا کہنا یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی طرف طبیعت راغب
ہو اور مزاج کو پسند آئے وہ طاقت و قوت بخشتی ہے اور خون کو صاف
کرتی ہے لیکن یہ فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ جسم میں کوئی بیماری نہ ہو لیکن
کوئی مٹی کھانے والا آدمی مٹی کھائے تو ہم اس مٹی کو مصلح مزاج نہیں کہیں
گے حالانکہ کھانے والے کو مٹی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ اسی طرح صفراء کے مریض
کو ترشی اچھی اور مٹھاس بُری لگتی ہے لیکن اس پسند کا کوئی اعتبار نہیں
ہے کیونکہ یہ مرض کی وجہ سے ہے۔ اور اس کی بنیاد علالت ہے۔ خوش ذائقہ ہونے
کا معیار وہی ہے۔ جو مرض لاحق ہونے سے قبل خوشگوار اور خوش ذائقہ ہو۔
اِس کو اس طرح سمجھیں کہ ایک شخص کا ہاتھ کاٹ دیا گیا یا ٹوٹ گیا ہو اور
اس کا ہاتھ لٹک گیا ہو۔ اب جرّاح اس کا علاج کرتا ہے اور اس کو ٹھیک
جگہ پر بٹھا کر اس پر پٹی باندھ دیتا ہے لیکن مریض تکلیف کی شدت میں جرّاح کے

اس عمل کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اور سابقہ کیفیت میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔
لیکن جرّاح کہتا ہے جب تیرا ہاتھ درست اور ٹھیک تھا تو اس وقت آرام
سے تھا لیکن جب تیرا ہاتھ ٹوٹ گیا اور تو اس تکلیف سے دوچار ہوا اب
میرے علاج سے تیری تکلیف میں اضافہ ہوا اور تو یہ چاہتا ہے کہ اس تکلیف
پر جو تجھے میرے علاج سے پہلے تھی قناعت کرلے تو تیری یہ خواہش غلط ہے اور
ناقابل اعتبار ہے۔

ارواح کی عالم اجسام میں منتقلی

اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھیں کہ ارواح عالم
قدس میں ذکر حق اور عالم استغراق میں مگن اور خوش تھیں جس طرح ملائکہ
ہمہ وقت ذکر حق میں منہمک رہتے ہیں۔ لیکن جب ارواح کو اجسام میں منتقل
کیا گیا تو اس عمل انتقال سے وہ بیمار ہو گئیں۔ اور انہیں مٹی کھانا اچھا معلوم ہونے
لگا لیکن انبیاء اور اولیاء جن کی حیثیت طبیب کی سی ہے کہتے ہیں کہ ان کی مٹی
کھانے کی عادت اچھی نہیں ہے۔ تمہیں تو کوئی اور ہی چیز اچھی معلوم ہوتی ہے
مگر اس کو تم نے بھلا دیا ہے۔ تمہارے مزاج اصلی کے لئے وہی چیز حقیقتاً اچھی
چیز ہے جو سب سے پہلے اچھی لگی تھی۔ لیکن جو چیز اب اچھی معلوم ہو رہی ہے وہ
علالت کے سبب سے ہے لیکن تمہارا گمان یہ ہے کہ یہ چیزیں تمہیں اچھی معلوم
ہو رہی ہیں (جو حقیقت میں اچھی نہیں ہیں)۔

عارف اور نحوی کا مکالمہ

ایک عارف ایک نحوی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے
دوران گفتگو نحوی نے کہا "بات" ان تین
چیزوں سے خالی نہیں ہوتی۔ یا تو وہ اسم ہو گی یا فعل یا حرف۔ نحوی کی یہ بات سن کر عارف
نے فرط جذبات سے کپڑے پھاڑ ڈالے اور شور کرنے لگے کہ میری بیس سالہ جدوجہد
اور ریاضت بیکار ہو گئی۔ اور اس مدت میں جو سعی و طلب میں نے کی تھی وہ سب
ہوا میں اڑ گئی۔ میں تو اس امید پر مصروف گفتگو رہا کہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس سخن

کے علاوہ کوئی چیز اور بھی ہے۔ (اور تو کہتا ہے کہ ان تین باتوں سے باہر کوئی چیز نہیں ہوگی)
چونکہ عارف نے ان منازل سے گزر کر منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کر لی تھی،
لہذا اُس نے نحوی کو اس انداز سے نصیحت کی۔

حسنینؓ کریمینؓ کا اندازِ تبلیغ

حضرات حسنین کریمین کا لڑکپن تھا۔ ان حضرات نے دیکھا کہ ایک شخص غلط اور غیر شرعی طریقہ پر وضو کر رہا ہے۔ ان حضرات نے چاہا کہ اس شخص کو وضو کا صحیح اور شرعی طریقہ تعلیم فرمائیں۔ لہذا یہ دونوں بھائی اس شخص کے پاس پہونچے اور اس سے فرمایا کہ یہ میرا ساتھی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم غلط طریقہ پر وضو کرتے ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے سامنے ہم دونوں وضو کریں اور تم فیصلہ کرو کہ ہم میں سے کون درست طریقہ پر وضو کرتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے اس کے سامنے وضو کیا۔ وہ شخص کہنے لگا۔ صاحبزادگان والا قدر آپ نے بالکل درست طریقہ پر وضو کیا ہے۔ وہ حقیقت میں غلطی پر تھا اور میں ہی غلط اور غیر شرعی طریقہ پر وضو کیا کرتا تھا۔

مہمان خانہ کی وسعت

مہمان اگر بہت زیادہ تعداد میں آتے ہوں تو میزبان مکان یا مہمان خانہ اسی تعداد کے مطابق وسیع و عریض بناتا ہے۔ ان کے آرام و آسائش کے لئے مناسب انتظام کرتا ہے۔ ان کی تعداد کے مطابق خورد و نوش کا انتظام کرتا ہے۔

جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے تخیّلات (جو اس کے مہمان ہیں) کی پرواز بھی اُس کی عمر کے مطابق ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیں کہ خیال بمنزلہ مہمان کے ہے، اور جسم انسانی یا اس کا دل گویا گھر یا مہمان خانہ ہے۔ وہ اس عالم طفلی میں دودھ اور اپنی انا یا ماں کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ لیکن جب وہ بڑا ہونے لگتا ہے تو اس کے خیالات کے مہمان بھی زیادہ ہونے لگتے ہیں۔ عقل، تمیز، ادراک کی اس وسعت کے ساتھ قلب (یا گھر) میں وسعت ہونے لگتی ہے۔

عشق کے انداز | جب عشق کا مہمان کسی گھر میں قدم رنجہ فرماتا ہے تو اس گھر کو ویران کر دیتا ہے۔ اور از سرِ نو عمارت کی تعمیر کرتا ہے اس عمارت کے شاہانہ پردے، شاہی لشکر خدم و حشم جو اس کے ساتھ ہوتے ہیں وہ اس پرانے گھر میں نہیں سماتے، اور اس گھر کے دروازوں کے مطابق نہیں ہوتے۔ پس اس بے حد و شمار خدم و حشم اور شان و شوکت کے لئے ایک ایسے مقام کی ضرورت ہوتی ہے جو بے حد و بے پایاں ہو تعجب! جب یہ پردے آویزاں کیئے جاتے ہیں تو ان سے روشنی جھلملاتی ہے اور حجاب دور ہو جاتے ہیں اور پوشیدہ امور آشکار ہوتے ہیں لیکن اس عالم کے پردوں کے برعکس کہ ان سے تو حجاب میں اور اضافہ ہو جاتا ہے پس وہ پردے ان (دنیا دی) پردوں کے بالکل برعکس ہیں۔

اشعار :-

۱۔ میں بعض مصائب کا ذکر کرتا تو ہوں لیکن اس کا تعین نہیں کرتا کہ لوگ میری عذر خواہی اور مجھ پر ملامت سے بالکل بے خبر رہیں۔

۲۔ شمع کی طرح (جو شب بھر) روتی ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا یہ رونا کس سبب سے ہے کیا وہ آگ کی صحبت سے رو رہی ہے یا شہد کی جدائی کے باعث اس کا یہ رونا ہے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہ ابیات قاضی ابو منصور ہروی نے کہے ہیں مولاناؒ نے فرمایا کہ قاضی منصور نے یہ جو کچھ کہا ہے وہ رمز اور یقین بے یقینی کی کیفیت میں کہا ہے۔ اور اس سے ان کے تلوّن کا پتہ چلتا ہے لیکن منصور حلاج نے جو کچھ کہا تو اس میں کوئی بل نہیں دیا۔ برملا اور کھلم کھلا کہا۔ یہ تمام عالم گرفتارِ قضا ہے اور قضا اس شاہد حقیقی کی اسیر ہے۔ اور شاہد تو ہر بات کو نمایاں کرتا ہے وہ چھپاتا کب ہے (پس منصور نے ظاہر کر دیا۔ راز کو چھپایا نہیں)۔

تجسّس اور اس کا اظہار

مولاناؒ نے حاضرین میں کسی صاحب سے فرمایا۔ قاضی منصورؒ کے اشعار سناؤ۔ (
جب وہ صاحب شعر سنانے لگے تو آپ نے فرمایا دنیا میں اللہ رب العلمین کے کچھ ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ کسی خاتون کو چادر یا برقعہ میں ملبوس دیکھتے ہیں تو مطالبہ کرتے ہیں کہ نقاب تو اٹھاؤ کہ تمہارے رخِ زیبا کی زیارت کریں اور یہ دیکھیں کہ تم کون اور کیسی ہو ؟ کیونکہ جب تم نقاب ڈالے خود کو چھپائے گزرتی ہو تو ہمیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تم کون ہو اور کیسی ہو گی ؟! رہا ہمارا معاملہ تو ہم ان میں سے نہیں جو تمہارا چہرہ دیکھ کر فدا ہو جائیں اور تمہارے اسیر ہو جائیں۔ مدت ہو چکی ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہم کو اب اس اندازِ عشق سے بے نیاز کر دیا ہے اور ان علائق محبت سے پاک رکھا ہے۔ ہمیں یہ خوف نہیں ہے کہ کہ کوئی اچھی شکل ہمیں فتنہ میں ڈال دے گی۔ بخلاف ان لوگوں کے جو نفس کے بندے ہیں کہ اگر وہ ان حسینوں کے چہروں کو کھلا دیکھیں تو ان کے دلدار و شیدا بن جائیں اور عشق میں سرگرداں اور پریشان بھی ہوں پس ایسے لوگوں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ حسین ان کے سامنے بے نقاب نہ ہوں تاکہ فتنہ سر نہ اٹھا سکے یعنی صاحبانِ دل کے سامنے بے حجاب آئیں تاکہ فتنے سر نہ اٹھائیں۔

خطۂ خوارزم اور سودائے عشق

اس مجلس میں کسی صاحب نے کہا کہ خطۂ خوارزم میں کوئی اس مرض عشق میں مبتلا نہیں ہوتا کیونکہ وہاں حسینوں کی بہتات اور افراط ہے اگر ایک حسینہ پر نگاہ پڑتی ہے اور دل اس کی جانب مائل ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خوبصورت چہرہ نظر آجاتا ہے۔ اور سابقہ چہرے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ " اگر شاہدانِ خوارزم پر عاشق نہیں ہوا جاتا تو خطۂ خوارزم پر

عاشق ہونا چاہیئے کیونکہ وہاں حسینوں کے جھرمٹ لگے ہیں اور اس خوارزم کا دنیائے معرفت میں "فقر" نام ہے۔

اس خوارزم میں شاہدان معنوی بہت ہیں اور روحانی صورتیں بے حد و بے شمار ہیں کہ جس کو بھی دیکھ لوگے اور پسند کرنے لگوگے پھر دوسرا رُخِ زیبا ایسا نظر آئے گا کہ پہلے حسن کو بھول جاؤگے۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا۔ پس ہم کو تو نفسِ فقر پر عاشق ہونا چاہیئے کہ وہاں ایسے ایسے مرکز نگاہ اور اسقدر محبوب ہستیاں ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہر شخص دل دے بیٹھتا ہے اور عاشق ہو جاتا ہے۔ حالانکہ عاشق خوارزم کے حسن پر نہیں بلکہ خود فقر پر ہونا چاہیئے۔

فصل

رویت فی الوجود

سیف الدین بخاری ایک شہر میں پہنچے جہاں ہر شخص آئینے کا دیوانہ تھا۔ آئینے کا عاشق وہ اس لئے تھا کہ آئینہ اس کی صفائی ستھرائی اور دوسرے فوائد اس کے سامنے نمایاں کر دیتا تھا۔ مگر دیکھنے والے کو اپنے چہرے کی حقیقت معلوم نہیں تھی۔ وہ صرف پردے اور حجاب کو چہرہ سمجھتا تھا، اور پردے کے آئینے کو اپنے چہرے کا آئینہ تصور کرتا تھا۔

(ارے بھئی) میں کہتا ہوں تو اپنا چہرہ کھول تو مجھی تو مجھے اپنے چہرے کا آئینہ پائے گا اور یہ بات خود تیرے نزدیک بھی ثابت ہے کہ میں آئینہ ہوں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انبیاء و اولیاء گمانِ باطل پر ہیں، ان کے یہاں صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں، تو اُس سے پوچھنا چاہیئے کہ اگر اس قسم کی بات تو نے کہی تو یونہی اٹکل پچّو کہہ دی ہے یا کچھ دیکھا بھی ہے؟ اگر دیکھا ہے اور اس کے بعد یہ بات کہی ہے تو "رویت فی الوجود" تو ثابت ہوگئی۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہی رویت ہے جو ہستی کے اندر سب سے اہم، قابلِ اعزاز

اور اشرف ترین بات ہے بلکہ یہی بات اپنی جگہ خود انبیاء علیہم السلام کی تصدیق بھی ہے۔ کیونکہ انھوں نے رویت فی الوجود کے سوا اور کسی چیز کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور تم خود بھی اسی رویت کے اقراری ہو۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ رویت کا ظہور "دیکھی جانے والی چیز" کے بغیر نہیں ہوتا۔ کیونکہ رویت افعال متعدی میں سے ہے، اس کے لئے خود اس سے الگ کسی دیکھی جانے والی چیز کا موجود ہونا لازمی ہے۔ اب اس کی دو صورتیں ہیں یا تو یہ دیکھی جانے والی چیز مطلوب ہوگی اور دیکھنے والا طالب ہوگا۔ یا کبھی اس کے برعکس — تو خود تمہارے انکار سے طالب و مطلوب اور رویت فی الوجود کا اقرار ثابت ہو گیا۔ چنانچہ الوہیت اور عبودیت نے اس لحاظ سے ایک ایسے منطقی قضیئے کی صورت اختیار کرلی جس کی نفی کے اندر ہی اس کا اثبات موجود ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ واجب الثبوت ہیں۔[له] جب اوجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

مولانا کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کچھ لوگ ایک مغفل (احمق) کے ارادت مند ہیں اور اس کی بڑی تعظیم کرتے ہیں تو فرمایا وہ شخص پتھر کے بت سے کم نہیں، اس کے پجاریوں کے دلوں میں بھی تعظیم، تفخیم، رجا، شوق، سوال اور حاجات وابستگی وغیرہ کا عالم اسی طرح ہوتا ہے جس طرح پتھر کے سامنے ہوتا ہے اور ان پتھروں کو کسی بھی قسم کی خبر لوگوں کے اعمال کی نہیں ہوتی بلکہ کوئی احساس تک نہیں ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان لوگوں کی صداقت کے اظہار کا سبب بنا دیا جیسے جو ان کے اندر ہوتی ہے

له اللہ تعالیٰ نے اپنے بے شمار اسمائے حسنیٰ کے اعیان کو یا اپنے عین کو اپنی "جامع مخلوق" کے اندر مشاہدہ کرنا چاہا تو عالم انسانی کو پیدا فرمایا۔ کائنات آئینہ ہے اور "آدم" اس آئینے کی جلاء اس بات کو غالب نے ان دو شعروں میں دیکھئے:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے، آئینۂ باد بہاری کا
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

(نیز دیکھئے ص ۲۲۷ بر نمرہ رویت اسی کتاب میں)

ایک عمل کی توجیہہ

ایک فقیہہ ایک لڑکے کو مار رہا تھا۔ جب اس سے اس مار پیٹ کا سبب معلوم کیا گیا اور اس کی خطا دریافت کی گئی

تو فقیہہ کہنے لگا کہ تم نہیں جانتے یہ بڑا حرام زادہ اور بدمعاش ہے لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کیا بد معاشی کرتا ہے تو فقیہہ نے جواب میں کہا کہ یہ انزال کے وقت بھاگ لیتا ہے[1] یعنی عین انزال کے وقت اس کے خیالات میں تبدیلی آجاتی ہے اس لیئے انزال کی کیفیت بدل جاتی ہے اس سے طبیعت میں انتشار ہوتا ہے۔ لیکن اس بات میں شک نہیں کہ اس کا جذبۂ عشق اس کے خیالات کے تابع ہوتا ہے اور لڑکے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

اس کہانی کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ اسی طرح ان لوگوں کا عشق بھی ہے جو اس بطّال شیخ سے ہے۔ اور ان کے خیالات بھی اس شیخ کے ساتھ گندہ ہیں۔ اور وہ (شیخ) ان مریدوں کے ہجر و وصال اور اُن کے احوال سے غافل ہے۔ اگر یہ عشق غلط خیال کے ساتھ ہو تو وہ جب بھی وجد کا موجب ہے۔ لیکن وہ ایسے معانقہ کی طرح نہ ہوگا جو معشوقِ حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ معشوقِ اصلی عاشق کے حال سے خبردار ہے۔ دیکھو ایک شخص رات کی تاریکی میں کسی ستون کو اپنا معشوق سمجھ کر اس سے لپٹ کر روتا ہے

---

[1] مولانا نے اپنی مثنوی میں بھی بہت سی کہانیاں اچھی بری جو لوگوں کی زبان پر ہیں دہرائی ہیں اور انھیں کے ذریعے اپنا علمی نکتہ تمثیل یا تشبیہ کی صورت میں گوش گزار کیا ہے۔ یہ کہانی بھی "قیل" کہہ کر شروع کی ہے کہ کسی نے کہا ہے کہ ایک شیخ "مغفّل" لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ مولانا نے کسی کا نام نہیں لیا صرف یہ بات ذہنوں میں اتاری کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل، تم کو تو صرف حق اور حقیقت کی جانب مائل رہنا چاہیئے۔ جو لوگ غلط روش اختیار کرتے ہیں وہ اپنی دنیا و آخرت کو بھی برباد کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ تم اس سے بچو۔

اور گڑگڑاتا ہے، اس طرح اس کو وجد و لذت تو حاصل ہوتی ہے لیکن وہ حقیقی لذت حاصل نہیں ہوتی جو اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اصلی اور باخبر محبوب سے معانقہ کر کے حاصل کرتا ہے (دونوں لذتوں میں فرق ہے)۔

فصل

تدبیر کند بندہ ــــ تقدیر کند خندہ

جب کوئی انسان کسی جگہ جانے کا عزم کرنے کے بعد وہاں کا سفر کرتا ہے تو اس کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے کہ اگر میں وہاں پہونچ جاؤں گا تو بہت سی مصلحتیں سامنے آئیں گی اور بہت سے اچھے کام کرنے ہونگے اور میرے حالات سنبھل جائیں گے میری آمد سے دوست خوش ہونگے اور میں دشمنوں پر غالب آجاؤں گا۔ اس کا ذہن تو ان خیالات کی آماجگاہ بنا ہوتا ہے لیکن مقصود حق کچھ اور ہی ہوتا ہے اور وہ بہت سی امیدیں باندھ لیتا ہے اور خیالی پلاؤ پکاتا ہے لیکن ان میں سے اس کی کوئی بھی بات پوری نہیں ہوتی، اس کے باوجود وہ اپنی تدبیر اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرتا ہے۔

تدبیر کند بندہ و تقدیر نداند ــــ تدبیر بہ تقدیر خدا و ندچہ ماند

بندہ تدبیر کرتا ہے لیکن وہ تقدیر سے واقف نہیں ہوتا اور اس کی تدبیر مشیت ایزدی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اس کو اس طرح سمجھیں کہ ایک شخص خواب میں کسی اجنبی شہر میں جا پہونچا جہاں اس کا کوئی واقف نہیں نہ وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ وہاں کا رہنے والا اس سے واقف ہے۔ وہ حسرت و یاس کا شکار اور شرمندہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس شہر میں کیوں آگیا۔ اب سوائے کف افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ فرط حسرت و اندوہ میں ہونٹوں کو چباتا ہے لیکن جب وہ نیند سے جاگتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ شہر ہے اور نہ وہاں کی کیفیات ہیں جن سے وہ خواب میں دوچار تھا۔ اب اس کو احساس

ہوتا ہے کہ خواب کے عالم میں جس غصہ اور ندامت سے دوچار تھا وہ سب عبث اور بیکار تھے! اس کیفیت سے اس پر حقیقی ندامت طاری ہوجاتی ہے۔ لیکن جب وہ دوسری مرتبہ محوِ خواب ہوتا ہے تو خود کو پھر کسی ایسے ہی شہر میں پاتا ہے اور اس پر وہی ماسبق کی کیفیات طاری ہوتی ہیں لیکن اس کو یہ خیال نہیں آتا کہ پہلے بھی اس پر جب ایسی ہی کیفیات طاری ہوچکی ہیں۔ وہ بیدار ہونے پر ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرچکا ہے اور سابقہ کیفیات سے دوچار ہونے کے بعد ان کو بیکار اور عبث تصور کیا تھا۔ اور یہ سوچا تھا کہ وہ تو خواب کی حالت تھی۔ اور خواب بھی کیسا جو بیکار تھا۔ اب پھر اسی کیفیت کا اعادہ ہوا ہے۔

یہی کچھ حال مخلوق کا ہے۔

تدبیر و تقدیر تجربہ کی روشنی میں

مخلوق نے لاکھوں بار دیکھا ہے کہ اُن کی ساری تدبیریں باطل ہوگئی ہیں۔۔۔ ان سے اس کی مقصد برآری نہیں ہوسکی ہے۔ خالقِ کائنات ان پر نسیان کی کیفیت طاری کر دیتا ہے اور وہ ماضی کی ساری کیفیات کو فراموش کرکے خود کو اپنے خیالات اور اختیار کے تابع کر دیتے ہیں۔ اور ان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اُس کی علت یہ ہے کہ:۔ اَن اللّٰہ یحول بین المرء و قلبہ" اللہ رب العٰلمین انسان اور اُس کے قلب کے درمیان حائل ہوتا ہے۔

ابراہیم ادھمؒ کا ایک واقعہ

جناب ابراہیم ادھمؒ ایک مرتبہ شکار کے لئے نکلے اور گھوڑا ایک ہرن کے تعاقب میں چھوڑ دیا! اس طرح وہ لشکر سے جدا ہوگئے لیکن ہرن کا تعاقب جاری رہا یہاں تک کہ وہ ایک لق و دق میدان میں پہونچ گئے مگر اس تگ و دو میں وہ گھوڑے کو بھگاتے رہے۔ اور وہ پسینہ پسینہ ہوگیا! اس کے باوجود بھی تعاقب جاری رہا۔ جب معاملہ حد سے گزرا تو ہرن نے منہ پھیر کر ابراہیم ادھم سے کہا۔ ماخلقت

لٰھذا" تمہیں اس لئے تو پیدا نہیں کیا گیا تھا اور عدم سے وجود میں اس لیئے تو نہیں لایا گیا تھا کہ تم میرے پیچھے پڑ جاؤ۔ تم مجھے شکار کر بھی لو اور پکڑ بھی لو تو اس سے کیا ہوگا۔ ابراہیم ادھم نے جب ہرن کا یہ کلام سُنا تو ایک نعرہ مارا اور گھوڑے سے گر پڑے۔ اس وقت صحرا میں سوائے ایک گڈریہ کے اور کوئی نہ تھا آپ نے اس کی منت سماجت کر کے اپنا گھوڑا، شاہی لباس اس کو دیدیا اور اس کا بندہ کا لباس لے کر پہن لیا۔ اور اس گڈریہ سے کہا، خبردار میری حالت کی کسی کو خبر نہ کرنا اور نہ میری منزل کی جانب کسی کی رہبری کرنا۔ یہ کہکر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

اس واقعہ سے اندازہ کیجیئے کہ ابراہیم ادھم کی غرض کیا تھی۔ وہ تو ہرن کا شکار کرنے نکلے تھے لیکن خود اس کا شکار ہو گئے۔ قدرت نے یہ دکھایا کہ دنیا میں وہی کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے جو مشیت الٰہی کا تقاضہ ہوتا ہے۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل اپنی ہمشیرہ کے یہاں تشریف لائے جو باآوازِ بلند مصروفِ تلاوت تھیں اور اس وقت اُن کی زبان پر سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات تھیں۔ جب انہوں نے بھائی کو دیکھا تو خاموش ہو گئیں اور وہ کاغذ جس کو دیکھ کر پڑھ رہی تھیں چھپا دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حالات کا جائزہ لیا اور بہن سے کہا بتاؤ تم کیا پڑھ رہی تھیں اور اس کو کیوں چھپا دیا حقیقتِ حال سے مجھے فوراً باخبر کرو ورنہ تمہاری گردن مار دونگا۔ اور ذرا بھی رو رعایت سے کام نہ لونگا۔ بہن اپنے بھائی کے غصہ سے واقف تھیں اس وقت اُن کے غصہ کا جو عالم دیکھا تو وہ تھرّا گئیں اور کہنے لگیں کہ میں اللہ ربّ العٰلمین کے اُس کلام کی تلاوت کر رہی تھی جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر

نازل ہوا ہے۔

جناب عمر رضی اللہ عنہ نے بہن سے کہا کہ تم میرے سامنے پڑھو تاکہ میں بھی سنوں۔ اِدھر انہوں نے سورۂ طٰہٰ کی تلاوت شروع کی اُدھر حضرت عمرؓ کا غصہ بڑھتا رہا۔ جب غصہ انتہا کو پہونچا تو فرمانے لگے۔ اگر میں اس وقت تجھے قتل کر دوں تو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ (خاکم بدہن) پہلے جا کر میں انھیں (سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر کاٹ لاؤں! اس کے بعد تجھے ختم کر دونگا۔ یہ کہکر وہ برہنہ تلوار لے کر قیام گاہِ نبوی کی جانب روانہ ہوئے (اُس زمانے میں اسلام کا تبلیغی مرکز حضرت ارقمؓ کا مکان تھا) راستہ میں اکابر قریش سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ (حضرت) عمرؓ (حضرت) محمد (علیہ السلام) کے قتل کے ارادے سے جا رہے ہیں۔ اور یہ کام انہی سے ہو سکتا ہے۔ مکہ والوں میں جناب عمرؓ کی بہادری اور سطوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ عمرؓ جس لشکر کے ساتھ ہوتے دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے اور وہ لشکر فتح و ظفر سے ہمکنار ہوتا تھا۔ مکہ والے یہ بھی جانتے تھے کہ نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا! مکہ کے ان دو سربر آوردہ لوگوں یعنی عمر بن خطاب یا ابوجہل بن ہشام کے ذریعہ میرے دین کی تائید فرما۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات قابل توجہ ہے کہ آپ اکثر (زمانۂ اسلام میں) اس دعا کو یاد کرتے اور روتے تھے۔ اور کبھی کبھی بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کرتے یا رسول اللہ اگر آپ اپنی دعا میں ابوجہل بن ہشام کا نام پہلے لیتے اور وہ اسلام لے آتا تو میرا کیا حال ہوتا۔ میں گمراہیوں کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا۔

پس جب عمر رضی اللہ عنہ ننگی تلوار لیکر قیام گاہِ نبوی کی جانب رواں دواں تھے کہ اسی وقت جناب جبرائیل علیہ السلام وحی لیکر آئے اور رسول خدا صلی اللہ

علیہ وسلم سے عرض کیا رب کریم فرماتا ہے کہ عمرؓ اسلام لانے کے لئے آرہے ہیں آپ اُن سے بغلگیر ہوں!

فوراً ہی جناب عمر رضی اللہ عنہ قیام گاہ نبوی (حضرت ارقم کے گھر) تشریف لائے، جب چہرۂ تابانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر پڑی تو جناب عمرؓ نے یہ محسوس کیا کہ تیر کی طرح کی کوئی نورانی چیز سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آئی اور ان کے دل میں پیوست ہو گئی۔ اسی دم حضرت عمرؓ نے نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے۔ محبت اور عشق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوے قلب میں موجزن ہونے لگے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ ذات نبویؐ میں سما جائیں اور اس میں گم ہو جائیں۔ جب ہوش میں آئے تو بارگاہ نبویؐ میں عرض کیا۔ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اسلام کا کلمہ مجھے تعلیم دیکر مجھے مشرف بہ اسلام فرمائیں۔ اس کے بعد بارگاہِ رسالت پناہؐ میں عرض کیا۔ یارسول اللہ یہ شمشیر برہنہ (خاکم بدہن) میں آپ کے قتل کے لئے لیکر نکلا تھا۔ لیکن اب اس غلطی کا کفارہ اس طرح ادا ہو گا کہ آئندہ جس شخص کے بارے میں مجھے معلوم ہو گا کہ وہ آپ کے درپے آزار ہے میں اس کو نہیں بخشوں گا! اور اسی تلوار سے اس کا سر قلم کر دونگا۔ یہ کہکر آپ مجلس نبوی سے اٹھے اور باہر تشریف لائے۔ راستہ میں اپنے والد خطاب سے ملاقات ہوئی تو خطاب نے کہا، اے عمر! تم اپنے دین سے پھر گئے ہو۔ یہ سنتے ہی آپ نے ان کا سر تن سے جدا کر دیا اور خون آلود تلوار ہاتھ میں لئے آگے بڑھے۔ راستہ میں اکابر قریش سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے تلوار کو خون آلود دیکھا تو کہنے لگے:۔

اے عمر! تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ (خاکم بدہن) محمدؐ کا سر لاؤں گا وہ سر کہاں ہے؟ جناب عمرؓ نے فرمایا دیکھو یہ سر موجود ہے۔ کفار کہنے لگے۔ یہ سر وہ کہاں ہے؟ یہ تو ابھی ابھی کا کاٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جناب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تمہارا خیال درست ہے، یہ اُن کا سر نہیں ہے! اس واقعہ سے اندازہ کرو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کا مقصد کیا تھا اور مشیتِ ایزدی کیا تھی - یہ واقعہ اس لئے نقل کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کام تو وہی انجام پاتے ہیں جن کو اللہ پا سکے[1]

شمشیر بکف عمر در قصد رسول آید   در دام خدا افتد و ز بخت نظر یابد

رسول علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کر کے عمرؓ شمشیر بکف آتے ہیں لیکن مشیتِ ایزدی سے ان کو خوش نصیبی میسر آتی ہے (دولتِ اسلام ملتی ہے) -

سر نہیں سر چاہیئے

اب اگر تم سے بھی کہا جائے کہ تم کیا لائے ہو اور تم یہ کہو کہ ہم سر لائے ہیں۔ اور دیکھنے والے یہ کہیں کہ ہم نے تو اس سر کو دیکھا ہے تو تم کہو کہ یہ وہ سر نہیں ہے سر تو وہ ہوتا ہے جس میں سِر (بھید) ہوں ورنہ ہزار سر ایک پیسے میں بکتے ہیں۔

حقیقتِ کعبہ

اس واقعہ کو سنانے کے بعد آپ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی: "واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی" (بقرہ ع ۱۵) جب ہم نے خانۂ کعبہ کو مرجع خلائق اور امن کا گہوارہ بنایا اور حکم دیا کہ مقامِ ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بناؤ۔ اس بشارت کے بعد جناب ابراہیم خلیل علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا خداوندا! تو نے مجھے جب اپنی رضا کی خلعت (مرتبۂ خُلّت) سے سرفراز فرما دیا تو میری ذرّیت کو بھی ایسی ہی بزرگی عطا فرما۔ جناب ابراہیم علیہ السلام کی عرضداشت کے جواب میں رب کریم نے فرمایا: "لاینال عھدی الظّٰلمین" (بقرہ ع ۱۵) "میرا عہد (ذمہ) ظالموں کے لئے نہیں ہوگا"۔ یعنی ظالم اس قابل نہیں کہ وہ کرامت و خلّت کے حقدار ہوں۔

---

[1] یہ روایت آج تک نظر سے نہیں گزری کہ جناب عمرؓ نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ نمعلوم مرتب نے اس روایت کو کس طرح مولاناؒ کی جانب منسوب کیا ہے۔ (مترجم) شعر بھی درست نہیں ہے -

عنایت کا حقدار کون ہے؟

اس ارشادِ باری تعالیٰ سے جب ابراہیم علیہ السلام کو یہ معلوم ہوگیا کہ ظالم اور نافرمان انعام خداوندی سے سرفراز نہیں ہونگے تو آپنے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔ الٰہی جو مطیع و فرمانبردار ہیں اور ایمان لے آئے ہیں اور خوگرِ ظلم نہیں ہیں ان کے رزق میں فراخی عطا فرما اور انواع و اقسام کی نعمتوں سے ان کو مشرف اور سرفراز فرما۔ رب تعالیٰ نے فرمایا تقسیم رزق میں کوئی امتیاز نہیں۔ سب کو اس میں سے حصہ رسد ملتا ہے اور ہمارے اس مہمان خانہ سے ساری مخلوق فیضیاب ہوتی ہے لیکن رضا، قبولیت شرف و کرامت کی خلعت سے سرفرازی صرف برگزیدہ اور خاص لوگوں کے لیئے ہے۔

خدا کا گھر کہاں ہے؟

ظاہربین حضرات کہتے ہیں کہ بیت سے مراد کعبہ ہے اور جو کوئی اس میں آجاتا ہے وہ تمام آفتوں سے محفوظ و مامون ہو جاتا ہے۔ وہاں شکار اور کسی ذی رُوح کو تکلیف پہونچانا حرام ہے اور حق تبارک و تعالیٰ نے اس خطہ کو شرف و عزت سے ہمکنار کیا ہے اور یہ بات درست اور ظاہراً نص قرآنی کے مطابق ہے لیکن صاحبانِ تحقیق کا کہنا کچھ اور ہی ہے وہ کہتے ہیں کہ خانۂ خدا انسان کے اندر ہے کہ باطن کو وسواس اور مشاغل شیطانی سے خالی کرکے سود و زیاں کے اندیشوں کو دل سے نکال دے۔ یہاں تک کہ اس میں کسی قسم کا خوف باقی نہ رہے۔ اور امن ظاہر ہوجائے اور کلیتہً وہ تیرے لیئے محلِ وحی بن جائے کہ وسوسوں کے دیو (شیطان) کو اس میں راہ نہ مل سکے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان پر شہاب (ثاقب) مقرر فرما دیئے کہ وہ مردود شیطان کو راستہ نہ دیں اور ملائک کے اسرار اور ان کے احوال سے یہ شیاطین آگاہ نہ ہوسکیں اور وہ شیاطین کے خطرات سے محفوظ رہ سکیں۔ الٰہی اسی طرح تو اپنی عنایت کے پاسبان ہمارے دل پر مقرر فرمادے۔ تاکہ شیطان کے وسوسوں اور

نفس و ہوائے مکر و فریب کو ہم سے دُور رکھے۔ یہ قول اہلِ باطن اور ارباب تحقیق کا ہے اور ہر شخص اس کو اپنی اپنی جگہ بہتر سمجھتا ہے۔

قرآنِ کریم سے محبت اور اس کا انداز

معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآنِ کریم ایک ایسی پیاری کتاب ہے جس کے دُو رخ ہیں اور دونوں ہی رُخ حسین اور خوبصورت ہیں۔ بعض کسی ایک رُخ سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور بعض دُوسرے رُخ سے لیکن ان دونوں استعمال کرنے والوں میں کسی ایک کو بھی غلط استعمال کرنے والا نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ مشیت ایزدی یہ ہے کہ دونوں گروہ اس سے استفادہ کریں چنانچہ یہ ایسا ہوا کرتے ہیں۔ اس کو مثال سے اس طرح سمجھو کہ ایک شادی شدہ عورت کا شوہر اور ایک شیر خوار بچہ ہے اب یہ دونوں شوہر اور بچہ اس عورت سے لذت اور استفادہ کرتے ہیں۔ بچہ اس کی چھاتی سے اپنی غذا اور لذت حاصل کرتا ہے جب کہ شوہر اُس سے مباشرت کرکے لذت یاب ہوتا ہے

عوام کی حالت راہ چلتے بچوں کی سی ہے جو قرآنِ کریم سے ظاہری لذت حاصل کرتے ہیں مگر وہ لوگ جو صاحبانِ کمال ہیں انھیں معانی و مطالب قرآنی میں کچھ عجیب ہی لطف آتا ہے اور وہ اس سے کچھ اور ہی فہم حاصل کرتے ہیں۔

مُقامِ ابراہیمؑ کیا ہے؟

مقامِ ابراہیمؑ و مصلائے ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کے قریب ہی تھوڑے سے فاصلے پر ایک جگہ ہے جہاں علمائے ظواہر کے نزدیک دو رکعات نماز نفل ادا کرنا کثیر اجر و ثواب کا سبب ہے اور درست ہے مگر اہل بصیرت کے نزدیک مقام ابراہیمؑ وہ مقام ہے کہ جہاں حضرت ابراہیمؑ کی طرح تم بھی حق تعالیٰ کی خاطر اپنے آپ کو آتش نمرود میں ڈالو اور راہ حق میں اپنی جد و جہد سے اُس مقام بلند تک یا اس سے قریب تر پہنچنے کی کوشش کرو جہاں انھوں نے اپنے آپ کو فدا کیا

تھا۔ یعنی اس کے سامنے اپنی جان کا بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ نہ کانپے نہ تھرائے۔ مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کرنا بہت ہی بہتر ہے مگر ایسی نماز کہ قیام تو اس عالم میں ہو لیکن رکوع اُس عالم میں۔

مقصودِ کعبہ کعبۂ مقدسہ سے مراد انبیاء علیہم السّلام اور اولیائے عظام رحمہم اللہ کے مبارک اور پاک قلوب ہیں جو مہبط وحی و الہام ہیں۔ حقیقی کعبہ وہی ہے اور یہ معروف کعبہ اس کعبہ کی تو فرع اور ایک شاخ ہے۔

اگر دل نہ ہو تو کعبہ کس کام کا۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ انبیاء علیہ السلام اور اولیائے عظام رحمہم اللہ نے ذاتی مقاصد و خواہشات کو کلّی طور پر ترک کر دیا ہے اور وہ مکمل طور پر مرضیٔ الٰہی کے تابع ہیں۔ جو مشیتِ الٰہی ہوتی ہے وہ وہی کرتے ہیں اور جس پر اس (ذاتِ باری) کی عنایت نہ ہو اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں اور اس میں وہ اپنے اور غیر کا امتیاز نہیں کرتے بلکہ مشیت کے مطابق وہ اپنے ماں باپ سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں اور وہ ان کی نگاہوں میں دشمن دکھائی دیتے ہیں۔

دادیم بدست تو عنانِ دلِ خویش　　　تا ہر چہ تو گوئی پختت من گو کم سوخت

ہم نے تیرے ہاتھ میں دل کی باگ ڈور دیدی ہے تاکہ جیسا تیرا حکم ہو ویسا ہی عمل کریں تو کہے پک گیا میں کہوں جل گیا۔

مثال اور مثل کا فرق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ مثال ہے۔ مثل نہیں۔ اِن دونوں میں فرق ہے اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اللہ ربّ العٰلمین نے اپنے نور کو مصباح (چراغ) سے تشبیہ دی ہے۔ اور اولیاء کے وجود کی تشبیہ زجاجہ (شیشہ کی قندیل) سے دی ہے۔ یہ مثال کے لئے کیونکہ جب نورِ الٰہی کون و مکاں میں نہیں سما سکتا تو زجاجہ و مصباح اس کی سمائی کی تاب کہاں لا سکتے ہیں؟ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انوارِ الٰہی کی تجلیات قلب میں کس طرح سما سکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تو ان

تجلّیات کا طالب ہو تو ان کو اپنے قلب میں جلوہ گر پائے گا اور یہ دل میں پایا جانا از رُوئے ظرف نہیں ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے لازوال انوار کے لئے ظرف بن گیا ہے اور وہ نور وہاں موجود ہے بلکہ یہ نور تجھ کو اس طرح ملے گا جس طرح تجھ کو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے باوجودیکہ تیرا کوئی نقش ظرف آئینہ میں موجود نہیں ہے۔ بایںہمہ جب بھی تم آئینہ میں دیکھو گے تو اپنا عکس اس میں موجود پاؤ گے۔ وہ چیزیں جو عقل میں آنیوالی نہیں ہیں جب ان کو کسی مثال سے بیان کرتے ہیں تو وہ عقل اور سمجھ میں آجاتی ہیں اور جب وہ معقول بن جاتی ہیں تو پھر وہ محسوس بھی ہوتی ہیں۔

مثلاً یہ کہا جائے کہ جب ہم آنکھ بند کرتے ہیں تو عجیب عجیب محسوس صورتیں اور شکلیں نظر آتی ہیں لیکن جب آنکھ کھولتے ہیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن اس کا کوئی یقین نہیں کرتا اور اس بات کو معقول نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن جب مثال سے بتایا جائے تو سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس جزئیہ کو اس طرح سمجھا جائے کہ ایک شخص خواب میں لاکھ چیزوں کو دیکھتا ہے لیکن عالم بیداری میں اس کے لئے اُن میں سے ایک چیز کا بھی دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کو ایک اور مثال سے سمجھیں کہ ایک انجینئر اپنے ذہن میں ایک مکان کا خاکہ بناتا ہے لیکن اس کا طول و عرض کسی کی سمجھ میں نہیں آتا جب تک کہ وہ اپنے تصوّرات کو کاغذ پر منتقل نہیں کرتا۔ حیثیت متعین نہیں ہوتی لیکن جب وہ کاغذ پر نظری نقشہ مرتب کر دیتا ہے تو بات ظاہر ہو جاتی ہے لیکن جب وہ اس نقشہ میں رنگ بھر کر ان تمام تصورات کو واضح کر دیتا ہے اور اس تصوری نقشہ کے سارے نقوش واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں تو اس رنگین خاکہ پر مکان کی تعمیر کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب یہ بات متعیّن ہو جاتی ہے کہ عقل میں نہ آنے والی تمام باتیں مثال کے ذریعہ معقول و محسوس بن جاتی ہیں۔

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس عالم آخرت میں اعمال نامے اڑتے ہوئے بعض سیدھے ہاتھ کی اور بعض الٹے ہاتھ کی طرف پہونچیں گے۔ اسی طرح ملائکہ، حشر، جنت، دوزخ میزان اور حساب و کتاب کا معاملہ ہے کہ یہ سب کے سب عقل سے نہیں سمجھے جاتے جب تک کہ

ان کو مثال سے نہ سمجھایا جائے۔ اگرچہ ان سب کی اس دنیا میں کوئی مثل نہیں ہے لیکن مثال کے ذریعہ ان کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں اس بات کو ہم اس طرح سمجھیں کہ :۔ رات کو بادشاہ، فقیر، قاضی، درزی اور کفش دوز (جوتی مرمت کرنے والا) سب ہی سوتے ہیں اس وقت ان کے ذہن سے سارے خیالات و افکار محو ہو جاتے ہیں کسی کو اپنے منصب کا احساس نہیں رہتا۔ لیکن جب سفیدۂ سحر صورِ اسرافیل کی طرح نمودار ہوتا ہے تو ان کے جسم کے ذرات زندہ ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کے خیالات کاغذ کی طرح اڑتے ہوئے اُن کی طرف آتے ہیں۔ درزی کو کپڑے سینے کا احساس ہوتا ہے، کفش دوز کو جوتوں کی مرمت کا، بادشاہ کو امورِ مملکت کا اور قاضی کو مقدمہ کے فیصلوں کا۔ ظالم کو ظلم کا اور عادل کو انصاف کا خیال دامنگیر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ سویا تو درزی کی حیثیت سے لیکن صبح کو کفش گر (کفش ساز) کی حیثیت سے بیدار ہوا ہو۔ کیونکہ اس کا عمل اور مشغولیت اس کے اپنے پیشہ کے ساتھ تھی۔ پس اسی طرح اس عالم میں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص دریافت کرتا ہوا منزلِ مقصود کی راہ پر لگ جائے تو اس عالم کے تمام احوال کا وہ اس دنیا ہی میں مشاہدہ کر لیتا ہے اور وہ اسرار اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ جان لیتا ہے کہ سب کی سمائی اور گنجائش دست قدرت یعنی ربّ کائنات کے اختیار میں ہے۔

تم بہت سی ہڈیاں قبر میں دیکھتے ہو کہ وہ بوسیدہ ہیں مگر وہ راحت و آرام سے تعلق رکھتی ہیں۔ (آرام میں ہوتی ہیں اور سرمستی کے عالم میں خوابیدہ پڑی ہوتی ہیں) اور اس لذتِ مسرت سے باخبر بھی ہیں۔ یہ سب کچھ محض لاف و گزاف نہیں ہے یہ جو مقولہ ہے کہ "خاک برو خوش باد" یہ مٹی اس کے لئے خوشگوار ہو۔ پس اگر خاک کو خوشی کی خبر نہ ہوتی تو یہ بات کیوں کہتے ؟ .

صد سال بقائے آں بت مہوش باد   تیر غم او را دل من ترکش باد

وہ بت ماہ وش سو سال تک باقی رہے اور اس کے تیر غم کے لئے میرا دل ترکش بنا رہے۔

برخاک درش بمرد خوش خوش دل من　　　یارب کہ دعا کرد کہ خاکش خوش باد

اُس کے در کی خاک پر میرے دل نے بخوشی جان دیدی ۔ خداوندا یہ دُعا کس نے دی تھی کہ اس کی مٹی خوش رہے ۔

عَالم وَجاہل میں فرق

اور یہ مثال تو عالم محسوسات میں بھی ملتی ہے کہ دو شخص ایک بستر پر سو رہے ہیں اور دونوں خواب دیکھتے ہیں ۔ ان میں سے ایک خود کو حسین مرغزاروں اور باغ و بہشت میں دیکھتا ہے جب کہ دوسرا خود کو سانپوں بچھوؤں اور دوزخ کے دہکتے ہوئے شعلوں میں دیکھتا ہے، اگر تم حقیقت کا جائزہ لو تو ان دونوں کے خوابوں میں سے کچھ بھی نہ پاؤ گے ۔ لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض لوگوں کی ہڈیاں قبر میں عیش و آرام، فرح و مسرت کے عالم میں ہوتی ہیں اور بعض کی عذاب، تکلیف اور اذیت کے عالم میں ۔ لیکن کسی دیکھنے والے کو (ان ہڈیوں کو دیکھ کر) نہ تو ان کی مسرت کا احساس ہوتا ہے اور نہ ان کی رنج و تکلیف کا ۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ نہ سمجھنے والی چیز مثال سے سمجھ میں آجاتی ہے اور مثال مثل کی طرح نہیں ہے ۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ عارف فراخی، کشادگی اور فرح کو بہار سے تعبیر کرتا ہے جب کہ غم و حزن اور قبض کی کیفیات کو خزاں سے ۔ اس طرح عالم صوری میں بہار کو مسرت اور خزاں کو حزن و غم سے تعبیر کرتے ہیں ۔

یہ صرف ایک مثال ہے جس کے بغیر عقل ان معانی کا تصور و ادراک نہیں کر سکتی ۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے " لا یستوی الظلمات و لا النور ولا الظل ولا الحرور "[له] تاریکی اور روشنی، سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہو سکتے، (مولانا نے بات اپنی زبان میں ادا کی اور اپنی تقریر جاری رکھی اور فرمایا کہ ایمان کی نسبت نور سے ہے اور کفر کو تشبیہ ظلمت سے دی گئی ہے ۔ بالفاظ دیگر

[له] قرآن کریم کی آیت اس طرح ہے ما یستوی الاعمی والبصیر ۝ ولا الظلمات ولا النور ۝ ولا الظل ولا الحرور ۝ (فاطر ع ۳) بینا اور نابینا، ظلمت اور روشنی، سایہ اور دھوپ برابر نہیں ہو سکتے ۔

ایمان کی نسبت آرام دہ سایہ سے دی اور کفر کی نسبت دھوپ کی تمازت سے دی ہے۔ جس کی تپش سے دماغ پگھل جاتا ہے۔ جب کہ ایمان کی روشنی اور لطف کو اُس عالم کی روشنی سے اور کفر و ظلمت کو اس دنیا کی تاریکی سے کوئی نسبت اور تشبیہ نہیں یہ تو محض مثال کے ذریعہ غیر معقول کو محسوس سے معقول بنایا گیا ہے۔

گفتگو کے دوران توجہ اور عدم توجہی!

اگر کوئی شخص میری مجلس میں میری تقریر کے وقت سونے لگتا ہے تو اس کا یہ عمل خواب غفلت کے مترادف نہیں بلکہ اس کی یہ کیفیت سکون و اطمینان کی وجہ سے ہے کہ اس کو ذوق بیسر آگیا ہے اور اس کو مثال سے اس طرح سمجھیں کہ اندھیری رات میں کوئی قافلہ دشوار گزار و خطرناک راستہ سے گزرتا رہتا ہے تو اُس پر خوف و دہشت طاری رہتی ہے لیکن جب قافلہ والوں کے کانوں میں کتوں کے بھونکنے کی آواز یا مرغ کی بانگ سنائی دے جاتی ہے تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہم لق و دق صحرا سے نکل کر آبادی کے قریب آ گئے ہیں اور اس طرح وہ مطمئن ہو جاتے ہیں اور پیر پھیلا کر آرام کی نیند لینے کی فکر کرتے ہیں لیکن جب تک اُن کے ذہنوں پر لیٹروں کا خوف مسلط رہا اُن کے ذہنوں میں نیند کا تصور بھی نہ آیا۔ حالانکہ اس وقت راستہ میں کسی بھی قسم کا شور و ہنگامہ نہ تھا۔ صرف خوف کی وجہ سے نیند نہ آئی لیکن آبادی کے ہنگاموں اور کتوں کے شور اور پرندوں کے خروش کے باوجود وہ پرسکون نیند سو گئے۔

مولاناؒ فرماتے ہیں کہ ہماری گفتگو بھی اسی طرح امن و سکون کے مترادف ہے ہم انبیاء علیہم السلام اور اولیائے عظام کی باتیں کرتے ہیں اور روحیں جب اپنوں اور بیگانوں کی باتیں سنتی ہیں تو مطمئن ہو کر خوف سے محفوظ ہو جاتی ہیں کیونکہ ان باتوں سے ان کو امید اور دوست کی خوشبو آتی ہے جیسا کہ تاریک رات میں کوئی شخص قافلہ کے ہمراہ خوف کی وجہ سے ہر لحظہ یہ سوچتا ہے کہ ساتھیوں کی باتیں سن کر اس گفتگو سے ان کو پہچانے۔ جب وہ اُن کی باتیں سنتا ہے اور کوئی ایسی بات نہیں

پاتا تو مطمئن ہو جاتا ہے۔

دعویٰ اور اس کی دلیل

مذکورۂ بالا گفتگو کے سلسلہ میں یہ مثال برمحل ہے کہ ربِ کریم نے جناب جبریل کو حکم فرمایا۔

"قُلْ" یَا مُحَمَّدُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اقرأ میں پڑھتا ہوں کیونکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی مقدس ذات ایسی لطیف ہے جہاں نظروں کی رسائی نہیں۔ لیکن جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ارواح اس گفتگو کو سنکر پہچانتی ہیں کہ یہ آواز تو گوش آشنا ہے اور آپ کی آواز سے ان کو سکون و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

کفیٰ بجسمی نحولا اننی رجل۔ لولا مخاطبتی ایاك لم ترنی

اگر میرا تخاطب تجھ سے نہ ہوتا تو تو مجھے نہ دیکھ سکتا تیرے فراق میں میرے جسم کا گھل جانا میری پہچان ہے کشتِ زار یا باغ میں ایک ایسا جانور بھی ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا لیکن جب وہ بولتا ہے تو اپنی آواز کی وجہ سے پہچان لیا جاتا ہے یعنی اس دنیا کی مخلوق اس میں پوری طرح ڈوبی ہوئی ہے اسی طرح مخلوقِ کشت زار دنیا میں مستغرق ہے اور آپ کی ذات سراپا لطف اور انتہائی لطیف ہے جو لوگوں کو نظر نہیں آتی ۔ پس آپ کلام فرمایئے تاکہ یہ مخلوق آپکو پہچان لے۔

دِل تم سے پہلے عازم راہ ہوتا ہے

جب تم کہیں جانے کا ارادہ کرتے ہو تو پہلے تمہارا دل وہاں جاتا ہے، وہاں کے حالات کا جائزہ لیتا ہے۔ سب کچھ دیکھ بھال کر وہاں سے واپس آجاتا ہے اس کے بعد جسم کو اس طرف کھینچتا ہے۔ یہ تمام مخلوق انبیا علیہم السلام اور اولیائے عظام کے مقابلے میں اجسام ہیں اور یہ ان کے دل ہیں پہلے یہی دل اُس عالم کی سیر کرتے ہیں اور عالم بشریت سے باہر آتے ہیں۔ عالم کے تحت و فوق (اوپر نیچے) کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم کریں کہ کس راہ سے جاتا ہے اور راستہ کیسا (آسان یا مشکل) ہے۔ اس کے بعد اس عالم کی طرف متوجہ ہو کر مخلوق کو بتاتے

ہیں کہ آؤ اس عالم (آخرت) کی طرف توجہ کرو کیونکہ یہ عالم (دنیا) تو ایک ویرانہ ہے اور دارِ فانی ہے ہم نے بہت ہی خوشگوار جگہ تلاش کر لی ہے جس کی بابت ہم تم کو یہ خبر پہونچا رہے ہیں۔

دل اپنے دلدار سے وابستہ ہے

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ دل تمام حالات میں دلدار سے وابستہ ہے۔ اس کو قطع منازل اور راہزنی کا خوف نہیں ہے اس کے علاوہ اس کو پالان اور شتر کی بھی ضرورت نہیں لیکن جسم مکین ہے اس کے لیئے ان سب کی ضرورت ہے اور وہ ان کا محتاج ہے۔

بادل گفتم کہ اے دل از نادانی　　محروم از خدمت کئی می دانی؟
دل گفت مرا سخت غلط می خوانی　　من لازم خدمتم تو سر گردانی!

میں نے دل سے خطاب کیا کہ اے دل تو اپنی نادانی کی وجہ سے کس کی خدمت سے محروم ہوا ہے کیا تجھے معلوم ہے؟

دل نے جواب دیا کہ تو نے میرے بارے میں غلط خیال قائم کیا ہے۔ میں تو اپنے فرضِ منصبی میں مشغول ہوں البتہ تو سر گرداں ہے (مارا مارا پھر رہا ہے)۔

جدوجہد کرو تاکہ محب بنو

جہاں ہو اور جس حال میں ہو جدوجہد کرتے رہو تاکہ تمہارا شمار محبین و عشاق میں کیا جائے۔ اس طرح جب محبت تمہاری ملکیت ہوگئی۔ تو ہمیشہ کے لیئے تم محب بن گئے قبر میں۔ حشر میں۔ جنت میں۔ ہر جگہ اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے! اس کو یوں سمجھو جب تم گیہوں بوؤ گے تو گیہوں ہی اُگے گا۔ انبار اور کھلیان میں بھی گیہوں ہی ہوگا۔ اور تنور میں بھی گندم ہی ہوگا۔

مجنوں نے لیلیٰ کو جب خط لکھنا چاہا تو اس نے قلم ہاتھ میں لیا (اور ان تخیلات کا اظہار کیا)۔ یہ شعر اس کی زبان پر آگیا۔

خیالک فی عینی واسمک فی فمی　　وذکرک فی قلبی الیٰ این اکتب

"تیرا سراپا میری آنکھوں میں ہے اور تیرا نام میری زبان پر ہے۔ تیرا ذکر میرے دل میں ہے تو اب میں خط کس کو اور کہاں لکھوں"

دیر تک مجنوں اسی عالم میں گم رہا کہ — تیرا خیال میری آنکھوں میں تیرا نام میری زبان پر تیری یاد صمیم قلب میں جاگزیں ہے۔ جب تو ان تمام جگہوں میں مقیم ہے تو مجھے خط لکھنے کی کیا احتیاج؟ یہ کہکر اس نے کاغذ پھاڑا اور قلم توڑ دیا۔

اظہارِ مدعا کا انداز بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے دل ایسے جذبات سے پر ہیں لیکن اظہارِ مدعا کے لئے ان کو الفاظ نہیں ملتے۔ یعنی وہ ان کو ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتے باوجودیکہ ان میں عشق، نیاز مندی اور طلب کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے مگر ہم اس کو عشق کی حقیقت نہیں کہہ سکتے بلکہ اس کی اصل دل ہے جب کہ نیاز مندی اور عشق کی حیثیت ثانوی ہے۔

جس طرح بچہ دودھ کا متوالا ہوتا ہے اس سے غذا حاصل کرتا ہے تقویت پاتا ہے اس کے باوجود وہ دودھ کی خوبیاں اور اس کی تشریح کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس کی ساخت یا فوائد کو شرح و بیان میں نہیں لا سکتا کہ بتا سکے دودھ پی کر کیا فوائد حاصل کرتا ہوں اور اس کے نہ پینے سے مجھے کیا تکلیف و کمزوری ہوتی ہے وہ ان کیفیات کا اظہار کرنے سے قاصر رہتا ہے باوجودیکہ وہ دودھ کا دل و جان سے عاشق ہے لیکن بالغ فرد اگرچہ ہزار طریقہ سے دودھ کی تعریف و توصیف کر سکتا ہے لیکن نہ تو اس کو ایسی لذت حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ ایسا فیض حاصل کرتا ہے جس طرح ایک شیر خوار بچہ اس سے لطف اندوز اور منافع یاب ہوتا ہے۔

فصل

ابتداء اپنی ذات سے کرو ایک مجلس میں آپ نے دریافت کیا کہ اس جوان کا کیا نام ہے؟ حاضرین نے عرض

کیا کہ اس کا نام سیف الدین ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ سیف (تلوار) تو غلاف میں ہے جو نظر نہیں آتی۔ سیف تو وہ ہوتی ہے جو دین کے لیئے جہاد کرے۔ اس کی تمام جدوجہد اللہ کے لیئے ہو وہ خطا کے عوض صواب تلاش کرے۔ حق کو باطل سے پہچانے مگر اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی ذات سے جنگ کرے اور اپنے اخلاق کو سُدھارے" ابدا بنفسك" نصیحتوں کی ابتداء اپنے نفس سے کرو یعنی خود سے مخاطب ہو اور کہے کہ تو بھی تو انسان ہے۔ تیرے ہاتھ، پیر، سر، ہیں آنکھیں، منہ اور دُوسرے اعضاء کے ساتھ ہوش و حواس بھی ہیں۔

انبیاء علیہم السلام اور اولیائے عظام نے دارین کی دولتیں پائیں اور اپنے مقصود کو پہونچے۔ وہ بھی تو لباس بشریت میں تھے۔ ہماری طرح وہ بھی اعضائے انسانی رکھتے تھے۔ اب کیا بات ہے کہ انہیں راستہ ملا اور ان کے لئے فتح باب ہوا۔ (ہم کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا) اب میرے جیسا اپنے کان خود مروڑتا ہے اور شب و روز خود اپنی ذات سے جنگ کرتا ہے کہ تو نے کیا کیا اور تجھ سے کونسا ایسا عمل سرزد ہوا جو تیری مقبولیت کی راہ میں حائل ہوا۔ اور تو سیف الدین اور لسان الحق نہیں بن سکا۔ مثال سے یوں سمجھو کہ دس افراد کسی مکان میں داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن نو افراد کو اندر جانے کا موقع مل جاتا ہے اور دسواں شخص باہر رہ جاتا ہے۔ اور اس کو راستہ نہیں دیا جاتا۔ یہ شخص باہر رہ کر سوچتا ہے اور گریہ و زاری کرتا ہے، کہتا ہے کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہوئی جس کی پاداش میں مجھ کو یہ موقع نہ مل سکا کہ میں مکان میں داخل ہوتا۔ پھر وہ اپنی غلطی کو تسلیم کر کے خود کو بے ادب اور قصور وار ٹھہراتا ہے اور وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گناہ اور غلطی کا صدور مجھ سے ذاتی طور پر نہیں ہوا بلکہ اللہ نے کرایا ہے اگر اس کی مشیت ہوتی تو وہ مجھے ایسی توفیق دیتا جس کی وجہ سے صدور گناہ نہ ہوتا۔ ایسا خیال کرنا بالکل غلط ہے۔ ایسے تصورات سے بارگاہِ احدیت میں بے ادبی اور گناہ کا ارتکاب

ہوتا ہے اور کنا یتہً حق کے لیئے دشنام طرازی ہے اور خلاقِ حق تلوار چلانا ہے۔
اس صورت میں سیف علی الحق کہنا تو درست ہے۔ سیف اللہ کہنا درست نہیں ہے
اللہ تعالیٰ خویش اور اقرباء سے پاک ہے جیسا کہ ارشاد ہے :۔
"لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ" (نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے)۔

بندگی سبب حضوری ہے

بندگی کے اظہار کے بغیر کسی نے اس کے دربار تک رسائی حاصل نہیں کی ہے۔ اس کی شان اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتی ہے :۔ "وَاللّٰہُ الغنی وانتم الفقراء" (محمدؐ) اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے (جبکہ) تم محتاج ہو"

یہاں یہ بات سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں شخص کو جو قربِ الٰہی میسر ہوا اور اس کی جانب راہ پائی۔ وہ مجھ سے زیادہ اس سے قربت رکھتا تھا۔ اس کو مجھ سے زیادہ معرفت حاصل تھی۔ اس کی بارگاہ میں تقرب بندگی کے علاوہ اور کسی چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ معطی علی الاطلاق ہے جس نے دریا کے دامن کو موتیوں سے بھر دیا ہے کانٹوں کو پھولوں کی خلعت سے سرفراز فرمایا ہے۔ مٹھی بھر خاک کو حیات و روح بغیر غرض اور سابقہ تعلق کے عطا فرمائی ہے اور تمام اجزائے عالم اسی سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

کوئی شخص اگر یہ سنتا ہے کہ فلاں شہر میں ایک بزرگ اور سخی شخصیت ہے جو بہت زیادہ بخشش اور احسان کرتی ہے۔ تو اس کریم کے کرم کو حاصل کرنے کے لئے وہ وہاں جاتا ہے پس جب خداوند کریم کا انعام واکرام اتنا مشہور ہے اور سارا عالم اس کے لطف وکرم سے باخبر ہے تو پھر اس کے سامنے دستِ سوال کیوں نہ دراز کیا جائے۔ خلعت وصلہ کی امید کیوں نہ رکھی جائے۔ اور اگر تو کاہلوں کی طرح بیٹھ جائے اور خیال کرے کہ اگر وہ چاہے گا تو مجھے عطا کرے گا (یہ غلط ہے) تو اس سے عطا کا تقاضہ ہی نہیں کرتا۔ ذرا کتے کو دیکھ کہ اس کے پاس

عقل و ادراک نہیں مگر جب وہ بھوکا ہوتا ہے اور اُس کے پاس روٹی نہیں ہوتی تو وہ تیرے سامنے آتا ہے اور اپنی دُم ہلاتا ہے یعنی کہتا ہے کہ مجھے روٹی دو کہ میرے پاس روٹی نہیں ہے میں بھوکا ہوں اور تمہارے پاس روٹی موجود ہے۔ دیکھو کتا یہ تمیز رکھتا ہے۔ آخر تم کتے سے کم تو نہیں ہو کہ وہ اتنی پر راضی نہیں کہ زمین پر پڑا سوتا ہے؟ اور کہتا ہے کہ مالک جب چاہے گا روٹی دے دیگا بلکہ وہ کس کس طرح خوشامد کرتا ہے اور دُم ہلاتا ہے۔ پس تو بھی اسی طرح عاجزی کر اور خدا سے مانگ اور اُس کے حضور میں گدائی کر کہ ایسے معطی اور سخی کے سامنے گدائی کرنا اسے بہت پسندیدہ ہے۔ اگر تو بے نصیب ہے تو پھر دینے والے سے نصیبہ اور مقدر ہی مانگ لے کیونکہ وہ بخیل نہیں ہے بلکہ سخی ہے اور صاحب دولت ہے

حق تعالیٰ کی قربت

حق تعالیٰ تم سے بہت ہی زیادہ قریب ہے، ہر فکر اور ہر تصور جو تم کر سکتے ہو وہ اس کے ساتھ ہے کیونکہ وہ تصور اور وہ اندیشہ اسی "نزتو" ہستند" کیا ہے پھر وہ اس سے الگ کس طرح رہ سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کمال قرب کے باعث تم اُس کو دیکھ نہیں سکتے اور یہ کوئی محال نہیں ہے۔ دیکھو! کہ تم جو کوئی کام کرتے ہو اس کے ساتھ تمہاری عقل موجود ہے۔ اور اسی سے تم اس کام کو شروع کرتے ہو مگر عقل کو تم کسی طرح بھی نہیں دیکھ سکتے۔ حالانکہ اس کا اثر تم کو نظر آرہا ہے لیکن اس کی ذات کو تم دیکھ نہیں سکتے۔ یہی صورت حق کے ساتھ نزدیک تر ہونے کی ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص حمّام میں جاتا ہے تو وہ گرم ہو جاتا ہے۔ اب وہ جدھر بھی جاتا ہے آگ کی حدّت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن وہ آگ کو نہیں پاتا۔ اور جب وہ حمام سے باہر آتا ہے تو وہ حمام کو گرم کرنیوالی آگ کو دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ اندر حدّت و حرارت اسی آگ کی وجہ سے تھی۔ انسان کا وجود بھی حمّام کی طرح ہے جس کے اندر عقل روح اور نفس کی حرارتیں موجود ہیں لیکن

جب وہ وجود تنے تمام سے باہر آتا ہے اور اُس جہان میں جاتا ہے تو وہاں وہ عقل نفس اور رُوح کی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ عقلمندی ادراک وغیرہ سب کچھ اسی عقل کی تابشوں کا نتیجہ ہیں اور وہ تدبیریں اور حیلے یہ سب نفس کی کرشمہ سازیاں تھیں اور یہ زندگی کیا تھی رُوح کا اثر کارفرما تھا ان میں سے تم ہر ایک ذات کا مشاہدہ کر لو گے مگر جبتک تم اس دنیا کے حمام میں ہو صرف اثر ہی دیکھ سکتے ہو جیسے حرارت سے تم آگ کے وجود کو محسوس کرتے ہو اور اس بات کو دوسرے انداز میں اس طرح سمجھو کہ کسی ایسے شخص کو جس نے کبھی بہتا پانی نہ دیکھا ہو اس کی آنکھیں بند کر کے اگر اس کو پانی میں ڈال دیا جائے تو وہ پانی کو نہ دیکھ سکے گا لیکن اس کے جسم پر کوئی نرم نرم چیز محسوس ہو گی۔ اس کو یہ نہیں معلوم کہ یہ کیا چیز ہے لیکن جب اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو یقیناً اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ پانی تھا۔ پہلے تو اس کو پانی میں گرتے وقت پانی کے اثرات کا احساس ہوا تھا لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو خود پانی کی ذات کا علم ہوتا ہے کہ پہلے جب آنکھیں بند تھیں تو پانی کو محض محسوس کیا تھا لیکن اب احساس یقین میں بدل گیا اور خود اس کی ذات کو دیکھ لیا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تو حق کی گدائی کر اور اپنی حاجتیں اسی سے طلب کر کیونکہ اُس کے یہاں کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ خداوند قدوس فرماتا ہے:

"ادعونی استجب لکم" (مومن ع ۶) تم ہم سے مانگتے رہو ہم تمہاری دُعا قبول کرتے رہیں گے

اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ

مولانا فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں خوارزم شاہ نے سمرقند فتح کرنے کے لئے ایک لشکر کے ساتھ شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا میں سمرقند میں موجود تھا جس محلہ میں میرا قیام تھا اس محلہ میں ایک نہایت حسین و جمیل دوشیزہ بھی تھی جس کے حُسن کی اُس پورے محلہ میں مثال نہ تھی۔ مولانا فرماتے ہیں۔ لوگ اس کی آواز برابر سُن رہے تھے وہ اللہ کو یوں پکار رہی تھی خداوندا! تجھے یہ کس طرح گوارا ہو گا کہ مجھے ظالموں کے ہاتھوں میں دیدے اور میں

یہ بھی یقین رکھتی ہوں کہ تو اس کو روا نہ رکھے گا بس میں تیری ذات پر بھروسہ کرکے خود کو تیرے سپرد کر رہی ہوں۔"

خوارزم شاہ کے لشکریوں نے جب شہر کو تاراج کیا اور لوگوں کو قیدی بنایا ان میں اس حسینہ کے گھر کی کنیزوں کو بھی اسیر کیا لیکن اس حسینہ کو کوئی گزند نہ پہونچا۔ اس کے حسن و جمال کے باوجود کسی نے بھی اس کی طرف نظر تک نہ اٹھائی اور اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو کوئی خود کو اللہ تعالیٰ کے حفظ و امان میں دے دیتا ہے وہ تمام فتنوں اور آفتوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بارگاہ رب العزت میں کسی کی حاجت ضائع نہیں ہوتی۔

ذاتِ باری پر اعتماد

ایک درویش نے اپنے بیٹے کو سکھایا تھا کہ جس چیز کی طلب ہو وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔ جب بچہ کسی چیز کی طلب میں روتا اور خدا سے طلب کرتا تو باپ اس کی مطلوبہ چیز فوراً مہیا کر دیتا تھا۔ اسی روش پر کئی سال گزر گئے۔ ایک دن بچہ گھر میں اکیلا تھا۔ اس وقت اس کو ہریسہ کھانے کی خواہش ہوئی تو اس نے حسب معمول اللہ سے ہریسہ طلب کیا تو عالم غیب سے ہریسہ کا پیالہ اس کو عطا کیا گیا جس کو اس نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ جب اس کے ماں باپ گھر واپس آئے تو بچہ سے معلوم کیا کہ کسی چیز کی خواہش تو نہیں ہے؟ بچہ نے حسب عادت کہا کہ مجھے ہریسہ کی خواہش تھی میں نے اللہ سے طلب کیا وہ مجھے مل گیا۔ باپ نے بچہ کی بات سن کر اللہ رب العلمین کا شکر ادا کیا اور اس بچہ سے کہا کہ خدا کا شکر و احسان ہے کہ تو نے اس مقام تک رسائی حاصل کر لی۔ اور اللہ رب العلمین کی ذات پر تیرا بھروسہ اور اعتماد قوی ہو گیا۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ اس مرتبہ جو ولادت ہوگی اس مولودہ کو اللہ کی راہ میں دین کے کاموں کے لیے وقف کر دوں گی۔ اور اس کو

خانۂ خدا کے لئے چھوڑ دوں گی۔ چنانچہ منّت کی تکمیل کے لئے انہوں نے حضرت مریمؑ کو مسجد کے گوشہ میں چھوڑ دیا۔ جناب مریمؑ کی نگہداشت اور اُن کی کفالت حضرت زکریا علیہ السلام اور دُوسرے لوگ بھی کرنے کے خواہش مند تھے۔ لہذا اس سلسلہ میں بات بڑھی۔ اس وقت مروجہ رسم کے مطابق جب کسی معاملہ میں آپس میں تنازعہ ہوتا تو سب لوگ اپنے اپنے نام کی مخصوص لکڑیاں پانی میں ڈال دیتے تھے جس کی لکڑی پانی پر تیرتی رہتی وہ کامیاب قرار دیا جاتا۔ لہذا اس واقعہ پر جب سب نے لکڑیاں پانی میں ڈالیں تو حضرت زکریا علیہ السلام کی لکڑی پانی پر تیرتی رہی اس طرح کفالت حضرت ذکریا علیہ السلام کے حق میں نکلی لہذا جناب مریمؑ کی نگہداشت اور کفالت کی ذمہ داری حضرت زکریا علیہ السلام کے ذمہ قرار پائی۔ اب جناب زکریا علیہ السلام حضرت مریمؑ کے لئے جب کھانا اور دوسری اشیاء لاتے تو مسجد کے اس گوشہ میں جہاں حضرت مریمؑ مقیم تھیں ان چیزوں کو پہلے سے موجود پاتے۔ ایک دن آپؑ نے حضرت مریمؑ سے دریافت فرمایا تمہارا کفیل تو میں ہوں پھر یہ تمام چیزیں تمہارے پاس کہاں سے آتی ہیں؟ تو جناب مریمؑ نے فرمایا مجھے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ عطا فرما دیتا ہے۔ اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسہ کرتا ہے وہ اُس کے اعتماد کو ضائع نہیں فرماتا۔ جناب مریم علیہا السلام کی یہ بات سنکر حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ احدیت میں دعا فرمائی کہ خداوندا! تو سب کی حاجت روائی فرماتا ہے میری بھی ایک حاجت ہے اس کو پورا فرما دے۔ مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو میری تعلیم و ترغیب کے بغیر ہی تیری محبت میں سرشار اور تیری عبادت میں مشغول رہے۔ اُن کی دعا قبول ہوئی اور ربّ تبارک و تعالیٰ نے جناب یحییٰ علیہ السلام کو اس وقت اُن کے یہاں پیدا کیا جب کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے دوہری ہو گئی تھی۔ اور ان کی بیوی جوانی کی عمر سے ہی بانجھ تھیں۔ انہیں اس وقت بڑھاپے میں ماہواری شروع ہوئی اور حضرت زکریا علیہ السلام سے اُن کو حمل رہ گیا۔ قدرت کاملہ ایسے کرشمے یوں دکھاتی ہے تاکہ دنیا یہ جان لے کہ یہ ساری باتیں اس کے سامنے

بہانہ کی طرح ہیں ۔ ورنہ جو کچھ بھی ہے وہی ہے وہ حاکم مطلق ہے ۔

مومن کون ہے ؟

مومن وہ ہے جو یہ سمجھے کہ پسِ پردہ کوئی ہے جو ہمہ وقت ہمارے ہر حال سے واقف رہے اور ہمیں دیکھتا ہے اگرچہ ہم اس کو نہیں دیکھتے لیکن اُسے اس کا یقین ہوتا ہے ۔ بخلاف اُس شخص کے جو یہ کہتا ہے کہ یہ سب قصّے کہانیاں ہیں اور اس کی قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں رکھتا ۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب گوشمالی ہوتی ہے تو پشیمان ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے غلطی کی تھی اور غلط کہا تھا ۔ وہی سب کچھ ہے ۔ وہی کارفرما ہے ۔ لیکن میں اس کے ماننے سے انکار کرتا رہا ۔ تمثیل کے طور پر یوں سمجھ کہ تو رباب بجانے والا ہے تجھے معلوم ہے کہ دیوار کے پیچھے میں ہی ہوں تو رباب بجانے میں مشغول رہتا ہے پھر پوری توجہ میری طرف ہوتی ہے اسلئے رباب بجانا بند نہیں کرتا ۔

نماز کی حقیقت

نماز کا یہ مفہوم نہیں کہ تم تمام دن قیام ، رکوع اور سجود میں مشغول رہو ۔ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ جو کیفیت نماز میں طاری ہوتی ہے وہ ہر وقت تم پر طاری رہے خواہ وہ عالم خواب ہو یا عالم بیداری ۔ پڑھنے کی حالت ہو یا لکھنے کی کسی بھی حالت میں یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو ۔ یہی مفہوم ہے اس آیت قرآنی کا کہ :

" هم فی صلوتهم دائمون " (معارج ع ۱) وہ ہمیشہ نماز کی حالت میں رہتے ہیں ۔ تیرا بولنا یا خاموش رہنا ۔ کھانا ۔ سونا ۔ حالت سکون یا غیظ یا غضب یا عفو و درگزر یہ تمام احوال پن چکّی کے پاٹ کی گردش کی طرح ہیں جو گھومتے ہیں اور ان کو پانی گردش میں لاتا ہے ۔ اور یہ عمل پانی اور بغیر پانی کے تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ اس چکّی کے پاٹ میں گردش پانی کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اگر چکّی کو یہ گمان ہے کہ اس گردش میں اس کا ذاتی عمل کارفرما ہے تو یہ عین جہالت اور بے خبری ہے ۔ پس یہ گردش اور میدان تو بہت ہی محدود چیز ہے اس لئے کہ اس کا تعلق احوال عالم سے ہے ۔ حق تعالیٰ کے حضور میں تو گڑگڑا کر عرض کر کہ بارِ الٰہا ! مجھے اس سیر و

گردش کے علاوہ (جس کا تعلق اس عالم سے ہے) عالم روحانی کی گردش میسّر فرما.
چونکہ تمام حاجتیں انسان کی تیری ہی ذات سے بر آتی ہیں. تیرا کرم، تیری رحمت تمام
عالم موجودات کے شامل حال ہے (پس میری حاجت بھی پوری فرمادے) پس اپنی
تمام حاجتیں دم بہ دم، لحظہ بہ لحظہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر اور کسی وقت
بھی اس کے ذکر کے بغیر نہ رہ، کہ اس کی یاد مرغ رُوح کے بازؤں اور پَروں کی
قوت ہے (وہ انہیں سے محوِ پرواز ہوتا ہے)۔ پس اگر وہ مقصود بکلّی حاصل ہوگیا تو
سُبحان اللہ، نورٌ علیٰ نور ورنہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہنے سے باطن تھوڑا تھوڑا
منور اور روشن ہوتا ہے اور اسی انداز میں تیرا تعلق دنیا سے منقطع ہوتا جائیگا۔
اور اس کی مثال یہ ہے کہ ایک پرندہ اگر آسمان کی جانب اڑنا چاہتا ہے اگرچہ وہ
آسمان تک نہیں پہونچ پاتا لیکن جتنا بھی وہ پرواز کرتا ہے عالم دنیا یعنی زمین
سے دور ہوتا ہے اور دوسرے پرندوں سے زیادہ اونچا ہوجاتا ہے مثلاً
اگر کسی ایسی ڈبیا میں مُشک ہو جس کا منہ تنگ ہو اور اگر تو چاہے کہ اس میں
سے مُشک نکالے تو یہ ممکن نہیں ہوتا لیکن تیرا ہاتھ خوشبودار ہوجاتا ہے اور اس
کی خوشبو سے دماغ معطر ہوجاتا ہے۔ اسی طرح یادِ حق بھی ہے۔ اگرچہ اسکی
ذات تک رسائی حاصل نہیں ہوتی لیکن اس کی یاد تو تیرے اندر اثر انداز ہوتی ہے
اور اس سے عظیم فوائد حاصل ہوتے ہیں ۔

فصل

نبوت کسبی نہیں ہے

شیخ ابراہیمؒ بہت ہی معزز درویش ہیں اُن کو دیکھ کر مجھے عزیز دوست
یاد آجاتے ہیں، مولانا شمس الدینؒ (شمس تبریزی) اُن کے ساتھ بہت عنایت و
شفقت فرماتے تھے اور اُن کو اپنی ذات کے ساتھ نسبت دیا کرتے تھے۔ تو فرماتے تھے۔
"ہمارے شیخ ابراہیم"

سنو ! عنایت اور چیز ہے اور اجتہاد دُوسری چیز ہے ۔ انبیاء علیہم السلام مرتبۂ نبوّت پر اپنے اجتہاد کے ذریعہ نہیں پہونچے ۔ یہ دولت ان کو عنایت و کرم سے نصیب ہوئی ۔ مگر سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جس کو یہ منصب حاصل ہو اس کی زندگی اور اس کی سیرت سراسر جد و جہد اور صلاح سے آراستہ ہو اور یہ بھی عوام ہی کی اصلاح کے لیئے ہوتا ہے تاکہ لوگ اُن کی سیرت اور ان کے اقوال پر اعتماد کریں کیونکہ عوام کی نظر باطن پر نہیں بلکہ ظاہر پر ہوتی ہے اور اسی ظاہر کو دیکھ کر وُہ اتباع کرتے ہیں اور اسی اتباع کی برکت سے وہ باطن تک راہ پاتے ہیں ۔

دیکھو ! فرعون نے کس قدر جدّوجہد کی ، کتنے ہی رفاہی کام کئے ، شاہ خرچی سخاوت اور احسان میں وہ پیش پیش رہا لیکن اس پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت نہیں ہوئی تو اُس کے رفاہی کاموں نے اس کو کچھ فائدہ نہ پہونچایا ! اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی امیر یا قلعہ دار کسی قلعہ کے بسنے والوں پر احسان کرتا اور ان کے ساتھ نیکی سے پیش آتا ہے تو اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وُہ ان سب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے (اپنا گرویدہ بنا کر) بادشاہ سے باغی بنادے ایسی صورت میں اس کے احسانات کی کچھ قدر و منزلت نہیں ہوتی لیکن اس کے احسانات کی مکمل طور پر نفی بھی نہیں کی جاسکتی ، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایات دَرپردہ اس کے شاملِ حال ہوں اور بظاہر کسی مصلحت سے اُس پر عتاب ہو اور اس کو راندۂ درگاہ کر دیا جائے ۔ کیونکہ بادشاہ میں لُطف و رحمت کے ساتھ ساتھ قہر و غضب کی صفات بھی ہونی چاہئیں کہ اگر وہ خلعت و نعمت سے سرفراز کرے تو اسیرِ زنداں بھی کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبانِ بصیرت اس سلسلہ میں مکمل طور پر لطف و عنایت کی نفی نہیں کرتے لیکن ظاہر بین لوگ اس کو بالکل راندۂ درگاہ جانتے ہیں ۔ اور مصلحت اس کی قیامِ نظم ہے ۔ بادشاہ اگر کسی کو پھانسی دیتا ہے تو لوگوں کی عبرت کے لئے اس کی لاش شارعِ عام پر لٹکادی جاتی ہے ، بادشاہ چاہے تو خاموشی کے ساتھ کسی کو قتل کرادے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلے پس یہ عمل لوگوں میں عبرت پیدا کرنے کے لئے اور نفاذِ حکم اور امتثالِ امر کے لئے کیا جاتا ہے ۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ تمام سولیاں (دار یں) جن پر لٹکایا جاتا ہے لکڑی ہی کی نہیں ہوتیں۔ یہ دنیا کا اقتدار اور اختیار بھی ایک عظیم قسم کی سولی ہے۔

کثیر دولت ایک آزمائش

اللہ تعالیٰ جب کسی کو سزا دینا چاہتا ہے اور اس کو ابتلا اور آزمائش میں ڈالنا ہوتا ہے تو اس کو کثیر دولت عطا کر دیتا ہے یا مسندِ اقتدار و اختیار پر متمکن کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرعون (و قارون) اور نمرود جیسوں کو دیکھو ان کو بھی دولت و اقتدار کی سولیوں پر لٹکایا گیا تھا تاکہ دنیا ان کے احوال سے عبرت حاصل کرے۔

حدیث قدسی کی تشریح

اللہ تعالیٰ کا ارشاد (حدیث قدسی) ہے کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً فَاَحبَبتُ اَن اُعرَف

یعنی میں ایک مخفی خزانہ تھا جب میری مشیت یہ ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں (میری ذات کا تعارف لوگ حاصل کریں) تو میں نے کائنات کی تخلیق فرمائی۔ اس کی غرض اپنی ذات کو ظاہر کرنا تھا۔ کہیں لطف و کرم سے اس کا اظہار کیا اور کسی جگہ قہر و غضب سے وہ ایسا بادشاہ نہیں ہے جس کے ملک و اقتدار کا تعارف کراتے و الاصرف ایک ہی فرد ہو، اس کی ذات تو ایسی ہے کہ اگر سارا عالم اور اس کے ذرات مل کر اس کا تعارف کرانا چاہیں تو وہ بھی اس کا تعارف کرانے سے عاجز و قاصر رہیں۔

اس کی تمام مخلوق شب و روز اعلانِ حق اور اظہار حقیقت کرتی رہتی ہے مگر ان میں سے بعض تو اپنی اس عبدیت کو جانتے ہیں اور اظہار کے طریقہ سے واقف ہیں اور بعض غافل ہیں اور طریقۂ اظہار سے ناواقف ہیں، لیکن بہر دو صورت اظہارِ حق ہر طرح ثابت ہے اس بات کو اس طرح سمجھو کہ ایک امیر آدمی کسی شخص کو سزا کے طور پر زد و کوب کئے جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ فریاد و زاری کرتا ہے لیکن یہ دونوں ضرب لگانے والا اور ضربات سہنے والا امیر کے تابع فرمان ہیں۔ ان دونوں کی پذیرائی عمل سے امیر کے حکم کا اظہار ہوتا ہے، کیونکہ جب ایک شخص مارتا ہے تو دوسرا مار کی تکلیف سے چلاتا ہے دونوں جانتے ہیں کہ امیر کے زیر اقتدار ہیں اس لئے امیر کا حکم ان دونوں سے

نمایاں ہوتا ہے۔

پس جو شخص حق کا اظہار کرتا ہے اور جو شخص اثبات کے مخالف پہلو (نفی) کا خوگر ہے وہ بھی اسی حق کا اظہار کرتا ہے کیونکہ کسی چیز کا ثبوت بغیر اس کی نفی کے متصور نہیں ہوتا۔ جب کسی چیز کی نفی کی جاتی ہے تو اولاً اس کا اثبات ظاہر ہوتا ہے پھر دوسرے مرحلے میں اس کی نفی ہوتی ہے یعنی اثبات بغیر نفی کے نہیں ہوتا۔

نفی و اثبات کی مثال

اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی مناظر کسی مجلس میں کوئی مسئلہ بیان کرے اور وہاں کوئی معترض نہ ہو جو اس مناظر کے قول کی تردید کرے اور یہ کہے کہ "ہم تو تمہارے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کرتے"۔ اس صورت میں وہ اپنے مفہوم کے ثبوت میں کیا زور دکھائے گا۔ (اپنی خطابت سے کس طرح متاثر کرے گا) کیونکہ کسی چیز کے اثبات کے لئے اس کا دوسرا منفی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ مقابلۂ نفی کے بغیر اثبات بے مزا ہے اس نکتہ کو اس طرح کہنا چاہئے کہ دنیا اظہارِ حق کی محفل ہے۔ بغیر نفی و اثبات کے دعوؤں کے اس محفل میں رونق نہیں آتی

مسلمان آپس میں ایک جان کی طرح ہیں

کچھ لوگ اپنے والی و امیر کے پاس گئے تو وہ ان لوگوں پر ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ اتنی کثیر تعداد میں لوگ کیوں آئے ہیں، اتنے لوگوں کا یہاں کیا کام؟ اُن لوگوں نے کہا کہ ہم کسی پر ظلم و ستم کرنے کے لئے جمع نہیں ہوئے ہیں ہم اتنے لوگ اس لئے آئے ہیں کہ آپ کے سامنے صبر و تحمل کا مظاہرہ کریں اور باہم ایک دوسرے کے مدد و معاون ثابت ہوں جس طرح لوگ تعزیت کے لئے جب کسی کے یہاں پہونچتے ہیں اور جمع ہوتے ہیں تو یہ مقصد تو نہیں ہوتا کہ وہ موت کو دفع کر دیں گے بلکہ (اس اجتماع سے مقصود) مصیبت زدہ کو سہارا دینا ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے دل سے رنج و غم کے اثرات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

المؤمنون کنفسٍ واحدۃ

تمام مسلمان آپس میں یکجان نفس واحد کی طرح ہیں یعنی تمام درویش ایک جسم کی طرح

ہیں! اعضائے بدن میں سے اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو تمام اعضا کو تکلیف ہوتی ہے۔ آنکھ دیکھنا چھوڑ دیتی ہے۔ کان سننا اور زبان بولنا ختم کر دیتی ہے! اس طرح اس ترکِ عمل میں سب متحد ہو جاتے ہیں۔ دوستی کی شرط بھی یہی ہے کہ خود کو دوست پر فدا کر دے اور دوست کی خاطر خود کو آزمائش میں ڈال دے کہ سب کا مطمحِ نظر اور مطلوب ایک ہی ہے اور سب ایک ہی سمندر کے غریق ہیں! ایمان کا اثر اور اسلام کی شرط یہی تو ہے ایک یار تو وہ ہے جس کی طرف تن بدن سے کھچتے ہیں اور ایک یار وہ جس کی طرف اپنی روح اور جان سے لپکتے ہیں (کچھ مضائقہ نہیں) ہم تو اپنے پروردگار کی جانب پلٹ جانے والے ہیں۔ (لا ضیر) انا الی ربنا لمنقلبون۔

فدا ہونے کا انداز

مومن جب خود کو فدائے حق کرتا ہے تو وہ بلاؤں اور مصیبتوں سے ہاتھ پیر کیوں بچائے، اور ان کی حفاظت کی فکر کیوں کرے۔ کیونکہ جب دوست کی طرف رجوع ہے تو اس میں ہاتھ پیروں کی کیا ضرورت ہے۔ ہاتھ پیر تو اس لیئے دیئے گئے ہیں تاکہ تو ان سے کسی طرف کو چلے لیکن جب تو ہاتھ اور پیر بنانے والے کی طرف جا رہا ہے تو اب ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب نہ تو ہاتھ اٹھنے کی احتیاج اور نہ پیر سے چلنے کی ضرورت! یہاں تو طریقہ کار ہی بے دست و پا ہونا چاہیئے۔ فرعون کے درباری ساحروں کی طرح ہو جائے تو کیا پروا! (حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ پر ہار جانے اور مسلمان ہو جانے کی وجہ سے فرعون نے ان جادوگروں کے ہاتھ پیر کٹوا دیئے تھے)۔

زہر از کفِ یارِ سیمبر بتواں خورد تلخی سخنش ہمچو شکر بتواں خورد

سیم تن محبوب کے ہاتھوں زہر کھایا جا سکتا ہے اور اس کی باتوں کی تلخی کو شکر سمجھ کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بس با نمکست یار بس با نمکست جائے کہ نمک بود جگر بتواں خورد

ہمارا دوست تو بہت ملیح ہے، جس جگہ پر ایسا نمک موجود ہے وہاں تو اپنا کلیجہ بھی نکال کر کھایا جا سکتا ہے۔

فصل خیر و شر

اللہ رب العالمین خیر و شر دونوں کا ارادہ فرمانے والا ہے وہی دونوں کا خالق ہے۔ مگر خوش فقط خیر ہی سے ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ "میں چھپا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ امر و نہی کا خواہاں ہے لیکن کوئی امر (حکم) درست نہیں ہوتا جبتک کہ مامور یعنی جس کو حکم دیا گیا ہو اس چیز سے بدکتا نہ ہو جس کا اسے حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً کسی بھوکے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اے بھوکے حلوہ کھا اور مٹھائی کھا۔ اگر اس طرح کہا جائے گا تو اس قول کو امر و حکم شمار نہیں کیا جائے گا، بلکہ انعام و اکرام کا نام اس کو دیا جائے گا۔ اسی طرح نہی کسی ایسی چیز سے ممانعت کو نہیں کہا جائے گا جس سے انسان رغبت نہ رکھتا ہو، اگر کوئی کہے کہ پتھر نہ کھاؤ اور کانٹے نہ چباؤ تو اس کو نہی قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "امر بالخیر اور نہی عن الشر" کی درستی کے لئے ضروری ہے کہ نفس کے اندر شر کی رغبت موجود ہو اور اس قسم کی بات کا نفس کے اندر موجود ہونا ارادہ شر کا موجود ہونا ہے۔ حالانکہ وہ شر سے خوش نہیں ہے ورنہ خیر کا حکم نہ دیتا اور اس کا اظہار وہی کرتا ہے جو سبق دینا اور کچھ سکھانا چاہتا ہو اور متعلم کی جہالت و بے خبری کو دور کرنا چاہتا ہو، تدریس ہمیشہ متعلم کی جہالت و بے خبری پر ہوتی ہے۔ کسی بات کا ارادہ اس بات کے لوازم کا ارادہ ہوتا ہے کیونکہ معلّم متعلم کی جہالت و بے خبری کو پسند نہیں کرتا ورنہ وہ اسے تعلیم نہ دیتا۔ اسی طرح طبیب بیماریوں کو چاہتا ہے، جب وہ اپنی طبابت کا ظہور چاہتا ہے کیونکہ اس کی طبابت کا ظہور لوگوں کی بیماریوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ وہ لوگوں کی بیماریوں کو پسند نہیں کرتا ورنہ

وہ کبھی اس کا علاج اور دوا دارو نہ کرتا، یہی حال نانبائیوں کا ہے
وہ لوگوں کی بھوک کے طالب ہیں تاکہ ان کی کمائی ہو اور معاش حاصل
ہو، حالانکہ وہ بھوکوں کی بھوک سے خوش نہیں ہیں، ورنہ وہ روٹی ان
کے ہاتھوں فروخت نہ کرتے۔ یہی حال امیروں اور لشکریوں کا ہے کہ وہ
چاہتے ہیں کہ ان کے سلطان کا کوئی مخالف و حریف ہو ورنہ ان کی بہادری
شجاعت جوانمردی اور سلطان سے ان کی محبت کا اظہار نہ ہوگا خود سلطان
بھی ان کو جمع کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ ان کی حاجت اس کو نہیں ہے
بلکہ اس لئے کہ اس کے مخالفین سے وہ خوش نہیں ہوتے ورنہ وہ کبھی قتال نہ کرتے۔

یہی حال انسان کا ہے کہ وہ اپنے نفس کے اندر شر کے اسباب کو اس لئے
چاہتا ہے تاکہ وہ اللہ کا شکر گزار بندہ اور مطیع و متقی بن کر رہے اور یہ بات ممکن
نہیں ہوتی جبتک کہ ترک شکر، ترک طاعت اور ترک تقویٰ کے اسباب و دواعی
بھی اس کے نفس کے اندر موجود نہ ہوں ان تمام اشیاء کی طلب ان اشیاء
کے لوازم کی طلب ہوتی ہے حالانکہ وہ ان کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ مجاہد
ہے اور جد وجہد کرتا ہے کہ اس قسم کی باتوں کا اس کے نفس سے ازالہ
ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ایک پہلو سے وہ شر کا چاہنے والا ہے اور ایک
پہلو سے اس کا نہ چاہنے والا ہے۔

لیکن اس تصور کا مخالف یہ کہے گا کہ نہیں وہ شر کا چاہنے والا کسی پہلو سے
بھی نہیں ہے، مگر یہ بات محال ہے کہ آدمی کسی شے کا خواہاں تو ہو لیکن اس کے لوازم
کا خواہاں نہ ہو یعنے امر و نہی کے لوازم کو نہ چاہے، یہ نفس یعنی ایسا کرنے والا نفس
وہ ہے جو شر کی جانب طبعی طور پر رغبت رکھتا ہے اور خیر سے طبعی طور پر نفرت کرتا
ہے یہ نفس وہ ہے جس کے لوازم میں ان تمام اقسام کے شرور داخل ہیں جو دنیا میں پائے جاتے ہیں تو
اگر ان شرور کا ارادہ نہ کرتا تو نفس بھی اس کا ارادہ نہ کرتا اور جب نفس
ارادہ نہ کرتا تو، وہ امر و نہی کا بھی ارادہ نہ کرتا جو دونوں نفس کے ملزوم

ہیں، اور اگر وہ ان سب سے راضی ہوتا تو نہ ہمیں کوئی حکم ہی دیتا نہ ان کی نعمت ہی کرتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شر کا وجود (لذاتہٖ نہیں ہے بلکہ) "لغیرہٖ" ہے۔

پھر ہم یہ بھی کہیں گے کہ اگر وہ خیر ہی خیر کا ارادہ کرنے والا ہے تو شر کا دفع کرنا بھی تو خیرات اور بھلائیوں ہی میں داخل ہے لہٰذا وہ دفع شر کا خواہاں ہوا۔ اب دیکھو کہ ایمان کا وجود چونکہ کفر کے بعد ہی ممکن ہے اس لئے ایمان کے لوازم میں کفر داخل ہوگیا، حاصل کلام یہ ہے کہ شر کا ارادہ قبیح اس صورت میں ہوتا ہے جب مراد "لعینہٖ" ہو، لیکن اگر اس کا ارادہ "خیر" کیلئے ہو تو قبیح نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ولکم فی القصاص حیوۃ، (قصاص کے اندر تمہاری زندگی ہے) اور کوئی شبہ نہیں کہ قصاص ایک شر ہے اللہ تعالیٰ کی ایک بنیان و تعمیر کا ڈھانا ہے لیکن یہ "شر جزوی" ہے اور مخلوق کو قتل سے بچانا "خیر کلّی" ہے لہٰذا شر جزوی کا ارادہ یقیناً خیر کلّی کا ارادہ ہے اس لئے قبیح نہیں ہے ورنہ شر جزوی کے ارادے کا ترک کرنا شر کلّی سے راضی ہونا قرار پائے گا جو قبیح ہے۔

اس کی نظیر ایک یہ ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کی زجر و توبیخ نہیں چاہتی اس لئے کہ وہ صرف شرّ جزوی کو دیکھتی ہے اور باپ اس کی زجر و توبیخ چاہتا ہے اور "جزو آکلہ" کو ختم کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس کی نظر شر کلّی پر ہے، اللہ تعالیٰ بڑا عفو و درگزر کرنے والا، غفور بھی ہے اور شدید العقاب بھی ہے۔ تو کیا وہ اس کا خواہاں ہے کہ یہ تمام گناہ و آثام اس پر صادق آئیں؟

ضروری ٹھہرا کہ وہ عفو و درگزر کرنے اور بخشنے والا تو ہے مگر گناہوں کے وجود کے بعد۔ یاد رکھو کہ کسی شئے کا ارادہ اس کے لوازم کا ارادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمیں عفو و درگزر کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اس حکم کا کوئی فائدہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جبتک خصومت اور لڑائی جھگڑے کا وجود نہ ہو۔

اس کی نظیر وہی ہے جو صدر الاسلام نے کہا ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کسب کا اور حصول مال کا، اس لئے کہ اس کا ارشاد ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور خرچ اور انفاق مال ممکن ہی نہیں۔ جبتک مال موجود نہ ہو

اگر کوئی کہے کہ اٹھو نماز پڑھو تو گویا اس نے حکم دیا کہ وضو کرو اور یہ حکم بھی دیا کہ پانی حاصل کرو (تاکہ وضو کر سکو) ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں اس کے لوازم میں سے ہیں۔

فصل

شکر کیا ہے؟

شکر بجالانا نعمتوں کو گھیرنا اور اُن کو اپنا قیدی بنالینا ہے جب شکر کی صدا سنائی دیتی ہے تو مزید نعمت کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو محبوب بنانا چاہتا ہے تو اس کو ابتلاء میں ڈال دیتا ہے اور جب وہ اس مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اس کو برگزیدہ بنالیتا ہے اور اگر وہ اس ابتلاء و مصیبت پر شکرِ الٰہی بھی بجالاتا ہے تو اُس کو منتخب فرمالیتا ہے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر اس کے قہر و غضب کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اور بعض اس کے لطف و کرم کی وجہ سے اور یہ دونوں قسم کے لوگ قابلِ تعریف اور خوب ہیں۔ کیونکہ شکر وہ تریاق ہے جو قہر کو لطف میں تبدیل کر دیتا ہے اور زیادہ عقلمند وہی کہلاتا ہے جو ظاہر و باطن میں ابتلا پر شکر بجالائے اس طرح وہ برگزیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا ہے لیکن اگر اس کی مراد حصولِ نار ہو تو اس کے لئے سہل اور زود تر عمل شکر کی ضد شکوہ اور شکایت ہے۔ ایک بات اور یہ بھی ہے کہ ظاہری شکوہ و شکایت باطنی شکوہ و شکایت کی تنقیص ہوتی ہے۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "انا الضحوک القتول"۔ میں ضحوک و قتول ہوں یعنی کسی گناہگار کے سامنے میرا تبسم فرمانا اُس کے قتل کے مترادف ہے اور

ضحکؑ سے مراد شکایت کے بجائے شکر ہے۔ اس سلسلے میں ایک حکایت بیان کی جاتی ہے۔

ایک یہودی ایک صحابیؓ کا ہمسایہ تھا۔ صحابی مکان کے زیریں منزل میں قیام پذیر تھے۔ جب کہ یہودی مکان کے بالائی حصہ میں مقیم تھا۔ اس یہودی کا معمول یہ تھا کہ وہ صحابی کے مکان میں کوڑا، کرکٹ، گندگی بچوں کا پیشاب پاخانہ اور کپڑوں کا دھوون اوپر سے گراتا تھا۔ لیکن وہ صحابی شکوہ و شکایت کے بجائے خود بھی اس کا شکریہ ادا کرتے اور اپنے بچوں کو شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ان صحابی کا انتقال ہوا تو وہ یہودی تعزیت کے لئے ان کے یہاں آیا تو اُن کے گھر میں نجاست کے ڈھیر لگے دیکھے یعنی بالاخانہ کی نالی سے نکلنے والی ان نجاستوں کے ڈھیر کو دیکھا تو اُسے احساس ہوا کہ اس طویل مدت میں وہ کیا کرتا رہا ہے۔ اس کو بہت شرمندگی ہوئی اُس نے صحابی کے گھر والوں سے کہا ہائے ہائے تم اس بُرائی پر بھی ہمیشہ میرا شکریہ ادا کرتے رہے تو انہوں نے جواب دیا کہ "صحابی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہمیشہ اظہارِ تشکر کا حکم دیتے رہے اور تاکید کرتے رہے کہ اظہارِ تشکر ترک نہ کرنا یہ سُنکر وہ یہودی اسلام لے آیا۔

ذکرِ نیکاں محرّکِ نیکی است ہمچو مُطرب کہ باعثِ سِکی است

اچھوں کا تذکرہ نیکی کے جذبہ کو ابھارتا ہے جس طرح کہ مُطرب کا گانا شراب نوشی پر اکساتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے انبیاء و مرسلین کا اور اپنے صالح بندوں کا تذکرہ کیا ہے اور جو کچھ بھی انھوں نے کیا ہے

اس پر ان کی سعیٔ مشکور کو بیان کیا ہے اور ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کی اس نے عزت افزائی کی ہے اور اپنی بخشش و کرم سے ان کو نوازا ہے۔

شکر ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے جب دودھ چوستا ہے تو اس کو دودھ ملتا ہے۔ اسی طرح تم بھی نعمتوں کی چھاتی سے جبتک دودھ چوسو گے نہیں، تم کو دودھ نہیں ملے گا۔ شکرِ نعمت کی مثال تو ایسی ہی ہے۔

سبب ناشکری کیا ہے؟

دریافت کیا گیا کہ ناشکری کا سبب کیا ہے اور مانع شکر کیا چیزیں ہیں؟ حضرت شیخؒ نے فرمایا۔ مانع شکر خام طبعی ہے اور جو کچھ کہ اُسے مل گیا ہے اُس کی طمع تو اسے پہلے ہی سے تھی لہٰذا یہ نامکمل لالچ اور طمع خام پر قائم رہتا ہے اسی نے اُس کو ناشکرا بنا دیا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقدّر سے غافل تھا اور وہ نقد کہ جس کی اُس کو پیشکش ہوئی اور غیب سے اُس کو ملا وہ اس سے غافل تھا۔ لہٰذا طمع خام کچا پھل کھانے، ناپختہ روٹی کھانے اور کچّے گوشت کو کھانے کے مترادف ہے جو بیماری اور ناشکری پیدا ہونے کا سبب ہے۔ (کیونکہ اگر شاکر رہتا تو پکا پھل، پکا کھانا اور پکا ہوا گوشت کھاتا)۔ اور جب اُس نے یہ سمجھا کہ اُس نے خراب اور کچّی غذا کھائی ہے تو قئے کرنا اس کے لئے لازم ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کو ناشکری میں مبتلا فرما دیا کہ وہ قئے کرے اور غلط پندار اور خیال فاسد سے نجات حاصل کرے تاکہ وہ ایک بیماری بہت سی بیماریوں کا سبب نہ بنے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلّھم یرجعون (اعراف ع ۲۱) ہم نے اُن کی نعمتوں اور مصیبتوں سے آزمائش کی تاکہ وہ ہماری جانب رجوع ہوں یعنی ہم نے اُن

کو ایسے ذرائع سے رزق عطا کیا جہاں سے اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
اور وہ عالمِ غیب سے ہے لیکن اُن کی نظر ان اسباب و وجوہ کو دیکھنے میں
لگی رہتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات سے شرک کا شائبہ بھی ہوتا ہے جیسا
کہ ابویزید نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا۔ خداوندا! میں نے تیری ذات کے
ساتھ شرک کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابویزید! کیا
لیلۃ اللبن (دودھ والی رات) ایسا نہیں ہوا تھا یعنی اس رات جب تجھے
دُودھ سے تکلیف ہوئی تھی حالانکہ نفع اور ضرر دونوں میری ہی جانب سے
ہیں مگر تو نے دُودھ کو نفع و ضرر کا سبب سمجھا لہذا تیرا شمار مشرکین میں
ہوا کیونکہ دُودھ پینے سے پہلے اور بعد نفع و ضرر میرے اختیار میں ہیں
میں دُودھ کو ایسا (بظاہر) نقصان رساں بناتا ہوں جیسا کہ استاد کی تادیب
کسی اُستاد نے اگر شاگرد کو یہ نصیحت کی کہ میوہ نہ کھانا لیکن اس نے
میوہ کھایا اور استاد نے اُس کے تلوے پر ضرب لگا کر تادیب کی اب شاگرد
کا یہ کہنا دُرست نہ ہوگا کہ میرے میوہ کھانے کی وجہ سے میرے پیر کو تکلیف
ہوئی! اس مثال کے مصداق جس نے اپنی زبان کو شرک سے محفوظ کر لیا تو
اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذمہ لے لیا کہ اس کی رُوح کو بھی شرک کی آلودگیوں سے
پاک کر دے۔ اللہ کے نزدیک تو قلیل سے قلیل مدت بھی کثیر ہوتی ہے

حمد و شکر کا فرق

اللہ تعالیٰ کے یہاں حمد و شکر میں بھی فرق
ہے کیونکہ شکر حصولِ نعمت پر کیا جاتا ہے اور
اصطلاح کے مطابق یہ نہیں کہا جاتا کہ میں نے اس کے حُسن و جمال پر اس کا شکر ادا کیا۔
یا میں اس کی بہادری پر شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن حمد معنوی شکر سے زیادہ عام
اور وسیع ہے۔

فصل

ایک غلطی اور اس کا ازالہ

ایک امام نے نماز کی پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھی " الاعراب اشد کفرا و نفاقا (توبہ رکوع ۱۲) عرب کے دیہاتی کفر و نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں اتفاق سے ایک دیہاتی سردار بھی نماز میں موجود تھا۔ اس نے جب یہ آیت سنی تو حالت نماز میں ہی امام کے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ جب دوسری رکعت میں امام نے یہ آیت پڑھی " ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الآخر (توبہ رکوع ۱۲) ۔ اور ان دیہاتیوں میں ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں " اس دیہاتی نے جب یہ آیت سنی تو فرط جذبات میں پکار اٹھا امام صاحب ایک ہی تھپڑ نے آپ کو سیدھا کر دیا۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہر دم غیبی تھپیڑ کھاتے ہیں اور یہ غیبی تھپیڑ ان برائیوں کی اصلاح کر دیتے ہیں ۔ مگر ہم ہیں کہ پھر کسی چکر میں پھنس جاتے ہیں۔

قیل مالاطاقۃ لنا بہ الخسف	کہا گیا ہے کہ ہمیں خسف اور قذف کی طاقت
والقذف وقیل قطع الاوصال	نہیں ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ قطع اوصال یعنی
ایسر من قطع الوصال	جوڑوں کا کاٹ دینا قطع وصال سے زیادہ آسان ہے

خسف و قذف کی تعریف

خسف سے مراد دنیادار ہونا اور دنیا میں دھنس جانا ہے اور قذف سے مراد اولیاء اللہ کے دلوں سے اتر جانا یا نکل جانا ہے ۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے کھانا کھایا اور اس کھانے نے معدہ میں صفرا (ترشی) پیدا کر دیا اور اس نے قئے کر دی۔ اگر وہ کھانا صفرا نہ بنتا اور کھانے والا

نضم نہ کرتا تو یہی غذا (خون بن کر) جزو بدن بن جاتی۔ اسی طرح مرید اپنے شیخ کی خدمت کرتا ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ شیخ کے دل میں اس کے لئے جگہ ہو جائے لیکن خدانخواستہ اگر مرید سے ایسی کوئی حرکت سرزد ہو جائے جو شیخ کی مرضی کے خلاف ہو اور شیخ کے دل میں اس کی طرف سے گنجائش باقی نہ رہے تو اس کی مثال بھی اس کھانے کی سی ہے۔ جس کو کھانے کے بعد قئے کی ضرورت پیش آتی ہے حالانکہ مُروّرِ زمانہ کے ساتھ شیخ کی خوشنودی کا وہ شرف حاصل ہو جاتا۔ لیکن اس کی کوئی حرکت جو شیخ کی ناخوشی کا سبب ہوئی اور اس کی محبت شیخ کے دل سے نکل گئی اور وہ اس سعادت سے محروم رہ گیا۔

عشق تو منادی بعالم در داد تا دلہا را بدست شور و شر داد

تیرے عشق نے ساری دنیا میں منادی کر دی اور اسی عشق نے دلوں میں شور و شر پیدا کر دیا۔

وانگہ ہمہ را بسوخت خاکستر داد وآورد بباد بے نیازی بر داد

اس کے بعد اس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا اور اس کے بعد اس کو ہوا اٹے بے نیازی کے سپرد کر دیا کہ اس ہوائے بے نیازی میں دلوں کی خاک کے ذرّے رقص کناں اور نعرہ زناں ہیں۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ خبر کون دے اور اس اطلاع کو کون تازہ بیان کرے۔ اگر دل اپنی زندگی اس جلنے اور خاکستر ہونے میں نہ پاتے تو پھر اس سوختگی کی طرف کیوں اس قدر لپکتے لیکن ہائے وہ قلوب جو شہواتِ دنیا کی آگ میں جل کر بھسم ہو گئے۔ کیا تم نے کبھی ان کی رونق دیکھی اور کبھی ان کا شہرہ وآوازہ دیکھا سُنا۔

بے نیازی اور روزی کا تعلق

بہ ظاہر یہاں پر موضوع زیر بحث ختم ہو جاتا ہے اور اشعار ذیل سے ایک

نیا موضوع " روزی ہر حال میں پہونچتی ہے " شروع ہوتا ہے۔ مترجم)۔

لقد علمت وما الاسراف من خلقی ان الذی ھو رزقی سوف یاتینی

اسعی لہ یعنّینی.... تطلبہ ولو جلست اتانی.... لایعنینی

(حضرت مولاناؒ خود اس کی تشریح ذیل میں فرماتے ہیں)۔

حصہ کے مطابق رزق ضرور ملتا ہے

میں نے روزی حاصل کرنے کے طریقے کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور یہ میری عادت نہیں ہے کہ میں اس کے لیئے بیکا ننگ و دو کروں۔ اور نہ میں بلا ضرورت تکلیف برداشت کروں اور جو حصہ بھی رزاق نے کھانے پینے والی اشیاء، دولت و ثروت، لباس اور دنیاوی آسائش میں میرے لئے مقرر کیا ہے وہ مجھ کو ضرور بیٹھے بیٹھے مل جائے گا۔ لیکن میں اگر اس کے پیچھے بھاگوں گا تو مجھے ذلت و پریشانی کے علاوہ ان چیزوں کے حصول کے لئے ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر میں اپنی جگہ بیٹھا رہوں تو روزی خود مجھے اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اور اگر وہ اپنی طرف کھینچنے میں ناکام ہو جائے تو خود کھنچ کر میرے پاس آجائے گی کیونکہ روزی و رزق کو بھی میری طلب ہے۔ اسی لئے وہ مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے

امورِ دین میں مشغولی

حاصل کلام یہ ہے کہ دین کے کاموں میں مشغول ہو جاؤ۔ تاکہ دنیا تمہارے پیچھے بھاگے اور ابھی جو بیٹھ رہنے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ وہ بیٹھنا درحقیقت دین کے کام میں بیٹھنا ہے اگرچہ دین کے کام میں دوڑنا بھی ہو تو اس کو دوڑنا نہیں کہیں گے بلکہ اس کو بیٹھنے سے تعبیر کریں گے لیکن جو حصولِ دنیا کے لئے بیٹھا ہے اس کو ہم دوڑنا کہیں گے۔ معلمِ انسانیت ہادیٔ اعظم سرورِ دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من جعل الھموم ھمًّا واحدًا کفی اللہ سائر ھمومہ جس شخص نے اپنے تمام رنج و غم

کو چھوڑ کر صرف ایک ہی رنج و فکر کو اپنے ساتھ لگا لیا ہے تو اللہ رب العلمین اس کی
دوسری فکروں کو بھی دور فرما دے گا۔

ذکر کا سبب

جس شخص کو دنیا غم ہوں تو وہ دین کے ایک غم کو اختیار
کر لے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تو غموں کو بغیر کوشش کے
دور کر دے گا۔ اور اس کے معاملات درست ہو جائیں گے، جیسا کہ انبیاء علیہم السلام
نام و نمود اور دنیاوی بکھیڑوں میں نہیں پڑتے تھے وہ صرف حق تعالیٰ کی
رضامندی اور خوشنودی کے حصول میں مشغول رہتے تھے۔ ان کو اسی طرح
رزق بھی ملتا تھا! ورنا موری بھی حاصل ہوتی تھی اور جو شخص بھی رضائے
الٰہی کو طلب کرتا ہے وہ اس جہان میں بھی اور اُس جہان میں بھی پیغمبروں کے
ساتھ ہوگا۔ ارشادِ ربانی ہے: "اولٰئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین
والصدیقین والشہداء والصالحین"۔ یہ لوگ ان کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام
فرمایا ہے! انبیاء میں سے صدیقین میں سے شہداء میں سے اور صالحین میں سے۔

اور ان نفوس کی معیت تو قرآن سے ثابت ہے ہی۔ اس سے بڑھ کر ایک
بشارت حدیث قدسی سے بھی ملتی ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتا ہے:
"انا جلیس من ذکرنی۔" جو میرا ذکر کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہو جاتا ہوں
اور اس کا ثبوت اس طرح ملتا ہے کہ اگر ذاتِ حق اس کی ہم نشین نہ ہوتی
تو اس کے دل میں جذبۂ حق پیدا نہ ہوتا۔ کیونکہ مشک اور پھول کے بغیر نہ تو
مشک کی خوشبو ہی آسکتی ہے نہ پھول کی۔ اس بات کی کہاں تک
تشریح کی جائے۔ جیسے کہ دوسری باتوں کا اختتام ہوتا ہے اس سخن کی انتہا ہی نہیں ہے۔

شب رفت و حدیث ما بپایاں نرسید   شب راچہ گنہ حدیث ما بود دراز

رات گزر گئی لیکن ہماری باتیں ختم نہ ہوئیں! اس میں رات کا کیا قصور، ہماری

باتیں تھیں بہت طویل تھیں۔

دنیا میں رات اور اس کی تاریکی گزر جائے گی۔ لیکن ان باتوں کی نورانیت ہر دم تر و تازہ رہے گی۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ ظاہری کا دور گزر جاتا ہے لیکن اُن کی تعلیمات کی نورانیت باقی رہتی ہے نہ وہ ختم ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔

عشق کیا ہے؟

مجنوں سے کہا گیا کہ تم لیلیٰ کو چاہتے ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ تم دونوں مکتب میں ساتھ پڑھتے تھے۔ محبت ہوگئی؟ مجنوں نے جواب دیا یہ تمام لوگ بے ذوق ہیں۔ "ای ملیحۃ لا تشتھیٰ" وہ کونسی زن ملیحہ ہوسکتی ہے جس کی جانب میلانِ طبع نہ ہو! عشق تو وہ ہے جس سے غذا بھی ملے اور لذت بھی حاصل ہو جیسا کہ ماں باپ کے دیدار، اولاد کی خوشی اور انواع و اقسام کی مسرتوں اور خواہشات سے کیف اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ دیکھو! عشق کی دنیا میں مجنوں کی ذات ایک مثال بن گئی ہے۔ جیسے علمِ نحو میں زید و عمر کے نام مثال میں پیش کیے جاتے ہیں۔

گر نقل و کباب و گرمے ناب خوری   می داں کہ بخواب در ہمی آب خوری

اگر تو نقل و کباب کھائے یا شراب پیئے تو یہ سمجھ لے کہ تو خواب میں پانی پی رہا ہے۔
"الدنیا کحلم النائم"۔ دنیا تو سوتے انسان کے خواب کی طرح ہے۔
دنیا اور اس کی نعمتیں ایسی ہی ہیں جیسے کہ حالتِ خواب میں کوئی شخص کچھ کھائے۔ پس دنیا کی حاجتوں کی طلب کی مثال ایسی ہے جیسا کہ حالتِ خواب میں کوئی شخص کچھ طلب کرے۔ اور وہ اسے مل جائے۔ لیکن جب وہ نیند سے بیدار ہو تو کچھ

بھی نہ ہو بس دنیا کیا ہے ؟ خواب میں اس نے ایک چیز مانگی تھی جو اس کو دے دی گئی تھی لیکن یہ عطا بھی بقدر سوال ہوتی ہے " فکان النوال بقدر السوال "

فصل

انسان میں اصل چیز جوہر قابل ہے

امیر نے عرض کیا ہم انسانی کیفیات کو ایک نظر میں پہچان لیتے ہیں اور اس کے مزاج کی کیفیات، اس کی طبیعت کی حرارت و برودت سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں پھر بھی یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ کیا چیز ہے جو اس میں باقی رہے گی۔

مولانا نے فرمایا، ان کیفیات کا سمجھنا صرف بات پر منحصر ہوتا تو کسی کو بھی جدوجہد، مشقت اور ریاضت کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور کوئی شخص بھی خود کو رنج و محن میں مبتلا نہ کرتا۔ مثلاً کوئی نادان سمندر کے کنارے آئے تو سوائے پانی، مگرمچھ اور مچھلیوں کے کچھ نہ دیکھے گا۔ اب اگر وہ یہ کہے کہ موتی کہاں ہیں؟ یہاں تو موتی نظر نہیں آرہے ہیں تو غور کرو کہ صرف سمندر کو دیکھنے سے موتی کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ کوئی شخص ہزار بار سمندر کے پانی کو طشت سے چھانے تو اس کو موتی حاصل نہ ہوں گے۔ موتی حاصل کرنے کے لئے سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت ہے۔ اور وہ بھی ہر غوطہ خور کو سمندر سے موتی حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے مہارت اور خوش قسمتی دونوں ایک ساتھ درکار ہیں — ورنہ یہ دنیاوی ہنرمندی اور علم تو دریا کے پانی کو طشت سے اچھالنا ہے۔ رہی دریا سے موتی حاصل کرنے کی بات تو وہ معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ بہت سے انسان ایسے ہوتے ہیں جو تمام صفات سے متصف ہوتے ہیں مالکِ مال و زر اور صاحبِ حسن و جمال ہوتے ہیں لیکن ان میں وہ جوہر قابل نہیں ہوتا۔ اور بہت سے انسان

ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر حسنِ صورت سے آراستہ نہیں ہوتے لیکن ان میں وہ جوہر قابل ہوتا ہے اور اس جوہر قابل کی وجہ سے وہ عزت و شرف سے ہمکنار ہوتے ہیں اور تمام مخلوق پر ان کو برتری اور فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ شیر اور چیتے اور گھڑیال وغیرہ دوسری مخلوقات میں بہت سے ہنر اور خاصیتیں ہوتی ہیں لیکن وہ صفت جو باقی رہنے والی ہے یعنی جوہر قابل وہ ان میں نہیں ہوتا اگر انسان اس راہ پر گامزن ہو جائے تو وہ اپنا شرف آدمیت حاصل کر لیتا ہے۔ ورنہ وہ اس فضیلت سے بہرہ ور نہیں ہوتا۔ ان تمام صفات کی مثال ایسی ہے کہ کوئی آئینہ کی پشت پر موتی لگا دے۔ روئے آئینہ اس سے بے خبر ہے (اس موتی کا عکس روئے آئینہ پر منعکس نہیں ہو گا) اور نہ روئے آئینہ کو اس کی ضرورت ہے۔ روئے آئینہ تو صرف "صفا" کا خواہاں ہے بس جس کا چہرہ زشت ہے وہ ہی پشت آئینہ پر نظر کرتا ہے (روئے آئینہ سے گریز کرتا ہے) کیونکہ روئے آئینہ تو صورتوں کا غماز ہے (جیسی صورت ہو گی ویسی ہی اس میں نظر آئے گی)۔ اور جو خوب رو ہے وہ روئے آئینہ کا سو جان سے خریدار ہے کیونکہ روئے آئینہ اس کے حسن کا مظہر ہے:

صورت نہیں عمل کی ضرورت ہے

جناب یوسف مصری علیہ السلام کے پاس ایک دوست سفر سے واپس آیا۔ تو آپ نے دریافت فرمایا میرے لئے کیا تحفہ لائے۔ اس نے جواب دیا کونسی ایسی چیز ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے؟ حسن و جمال میں آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں اس لئے میں آپ کے لئے آئینہ لایا ہوں۔ تاکہ آپ آئینہ کو دیکھ کر اندازہ کریں کہ وہ کونسی چیز ہے جو رب العلمین کے پاس نہیں ہے۔ اور اس کو اس کی ضرورت و احتیاج ہے۔ (وہ جس نے آپ کو ایسا حسن و جمال دیا ہے خود کس چیز کا محتاج ہو گا؟)۔

اللہ تعالیٰ کے حضور میں قلبِ روشن لے جانا چاہیئے کہ اس میں اپنے جمال کا مشاہدہ کرے۔ " ان اللّٰہ تعالیٰ لا ینظر الی صورکم ولا الی اعمالکم بل ینظر الی قلوبکم" اللہ تعالیٰ نہ تو تمہاری صورتوں کی طرف نظر فرماتا ہے نہ تمہارے اعمال کی جانب وہ تو تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

بلاد ما اردت وجدت فیھا ولیس یفوتھا الا الکرام

یہ ایسے شہر ہیں کہ ان میں جو چاہو گے تم کو حاصل ہو گا یہاں سب کچھ ہے سوائے اس کے کہ کوئی دانشمند یہاں نہیں پاؤ گے۔

یعنی ایسا شہر کہ اس میں جو کچھ تم چاہو گے پاؤ گے۔ خوبصورت اور حسین لوگ، طبع کو ہیجان میں لانے والی چیزیں، اور طرح طرح کی آسائشیں لیکن اس میں کوئی دانشور تم کو نہیں ملے گا۔ کاش کہ اس کے برعکس ہوتا (دانشور اس میں ہوتا اور کچھ نہ ہوتا)۔

یہ شہر انسان کا وجود ہے کہ اگر اس میں ہزاروں ہنر موجود ہوں لیکن وہ معنی (حقیقت) سے خالی ہو تو ایسے شہر کا ویران ہو جانا ہی اچھا ہے۔ اور اگر اس میں معنی اور حقیقت موجود ہے اور ظاہری آرائش و آسائش موجود نہیں ہے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اس وجودِ انسانی میں رازِ حقیقت موجود ہونا چاہیئے کہ انسان جس حال میں بھی ہے وہ حق میں مشغول رہے اور اس کے یہ ظاہری اشغال اس کے باطن کے مشاغل میں مانع اور مزاحم نہیں ہو سکتے جیسے کہ ایک حاملہ عورت، خواہ حالتِ جنگ میں ہو یا حالتِ صلح میں، کھانا ہو یا پینا، جنین اس کے پیٹ میں پرورش پاتا رہتا ہے اور قوت و حواس اس میں تکمیل پاتے رہتے ہیں اور ماں کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ انسان بھی اسی بھید اور اسی سِرّ کا حامل ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:-

"وحملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولا" (احزاب ع ۹) انسان نے اس بوجھ کو اٹھانے کی ذمہ داری قبول کر لی حالانکہ اس عمل میں وہ اپنے حق میں ظالم اور بے علم تھا۔ لیکن حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انسان کو ظلم و جہل کی حالت میں نہیں

چھوڑتا۔ انسان نے جو بار امانت اٹھالیا ہے اور جیسا کہ ارشاد ربّانی ہے وہ مستقل اس بار کو اٹھائے ہوئے ہے اسی کی بدولت انسانی صورت میں باہمی موافقت ہم نشینی و رفاقت اور رشتۂ آشنائی کے ہزاروں آثار نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ انسان کے اندر جو "سِرّ" پوشیدہ ہے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر ہزار آشنائیوں کو جنم دے۔ یعنی اس سے دوستی اور آشنائی ظہور میں آئے۔ زندگی کی حالت کے مانند مرنے کے بعد بھی اس سے بہت کچھ ظاہر ہوتا ہے ضرورت صرف اس سِرّ یعنی اس رازِ محبت کی ہے کیونکہ یہ سِرّ درخت کی جڑ کی طرح ہے۔ اگرچہ جڑ پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اس کا اثر تنے اور شاخوں سے ظاہر ہوتا ہے اگر ایک دو شاخیں ٹوٹ بھی جائیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ اگر جڑ مضبوط ہے تو وہ دوبارہ نکل آتی ہیں۔ اگر جڑ ہی میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو نہ شاخیں رہیں گی نہ پتے نکلیں گے۔

سلامِ ربّانی

ربِ تعالیٰ نے سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ" اے نبیِ مکرّم آپ پر سلام ہو یعنی آپ کی ذاتِ مقدس اور جو آپ سے متعلق ہیں اُن پر سلامتی ہو۔ اگر حق تعالیٰ کا مقصد یہ نہ ہوتا تو سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم یوں نہ فرماتے "عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْن" یعنی ہم پر اور اللہ کے تمام نیکوکار بندوں پر (سلام ہو) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام اگر صرف آپ کے لئے مخصوص ہوتا تو سیدالمرسلین علیہ السلام نیکوکار بندوں کا اضافہ نہ فرماتے۔ یعنی الٰہی جو سلامتی تو نے میری ذات پر فرمائی ہے وہ مجھ پر تو ہے ہی لیکن اس میں تیرے وہ نیکوکار بندے بھی شامل ہیں جو میری جنس سے ہیں (یعنی میری اُمت

کے نیکو کار بندوں پر بھی سلام ہو)۔

سیّدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ وضو فرما رہے تھے، صحابہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا غیر اس (طرح) وضو کے نماز درست نہیں ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی تخصیص نہیں ہے ورنہ پھر کسی شخص کی بھی نماز درست نہ ہوتی اگر صحتِ نماز کی شرط رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو ہوتا بلکہ ارشاد سے مطلب یہ تھا کہ اس طرح کے وضو کے بغیر اگر کوئی نماز پڑھے گا تو اس کی نماز درست نہ ہوگی (یعنی جنس وضو مقصود تھا نہ کہ وضوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) جس طرح کہا جائے کہ یہ گلنار کا تھال ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس یہی تھال یا طبق گلنار کا ہے اور اس کے سوا گلنار نہیں ہیں بلکہ اس قول سے مراد یہ ہے کہ یہ طبق گلنار کے جنس سے بھرا ہے (دنیا میں ہزاروں جگہ گلنار ہیں)۔ ایک دیہاتی شہر میں کسی کا مہمان ہوا۔ شہری دوست نے اس کو حلوہ کھلایا۔ دیہاتی نے بڑی رغبت سے وہ حلوہ کھایا اور کہا اے شہری دوست میں رات دن گاجریں کھاتا رہا ہوں اب جو میں نے (گاجر کا) یہ حلوہ کھایا ہے تو گاجروں کی لذت میرے لئے ہیچ ہو گئی ہے۔ اب ہر بار تو یہ حلوہ مجھے نصیب نہ ہوگا۔ اور گاجروں کی وقعت میری نظر میں باقی نہیں رہی۔ بتاؤ اب کیا تدبیر کروں؟۔ دیہاتی نے چونکہ حلوہ کھایا تھا اور اس کو اس کی چاٹ پڑ گئی تھی لہذا وہ پھر شہر کی طرف لوٹ آیا (تاکہ حلوہ کھائے) کیونکہ شہری نے اس کا دل جیت لیا تھا۔ دل کی خواہش کو تو پورا کرنا ہی پڑتا ہے۔

بعض لوگ سلام کرتے ہیں تو ان کے سلام سے مشک کی خوشبو آتی ہے اور بعض ایسے ہیں کہ وہ جب سلام کرتے ہیں تو ان کے سلام سے دھوئیں کی بو آتی ہے خوش بو ہو یا دھوئیں کی بو ہو اس کا احساس ہوتا ہے لیکن اس بو کو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کے پاس ایسا (حساس) دماغ ہو پس دوست کا امتحان کر لو کہ اس کے

پاس دوستی کا ظرف یا دوستی کی خوشبو محسوس کرنے کے لئے مشام ہے یا نہیں تاکہ بعد میں پشیمانی نہ اٹھانی پڑے۔ اس سنت الٰہی کو اس طرح فرمایا ہے:

(ابدأ بنفسك (اپنے نفس اور اپنی ذات سے آغاز کرو) پس نفس اگر بزرگی کا دعویٰ کرے جب بھی اس کے اس دعویٰ کو بغیر امتحان کے قبول نہ کرو۔

غور کرو! وضو میں جب ناک میں پانی چڑھاتے ہیں تو پہلے (کلی کی صورت میں) اس کو چکھ لیتے ہیں کہ کہیں اس کے ذائقہ اور بو میں تغیر نہ آگیا ہو (اگر بو، ذائقہ اور رنگ میں تغیر آجائے تو اس پانی سے وضو جائز نہیں ہے) پس یہ امتحان ہوا اس پانی کے لئے! اس امتحان کے بعد اس کو مکمل طور پر کام میں لاتے ہیں (اس سے پورا وضو کرتے ہیں)۔

تمہارے دل میں نیک و بد سے جو کچھ پوشیدہ ہے حق تعالیٰ تمہارے ظاہر سے اس کو ہویدا اور نمایاں فرما دیتا ہے۔ درخت کی جڑ در پردہ جن چیزوں کو جذب کرتی ہے اور ان سے غذا حاصل کرتی ہے اس کا اثر اس کی شاخوں اور برگ و بار سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ (اس تمثیل کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر غور کرو) "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود"۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات نمایاں ہیں (ان کے باطن کی خوبیاں، سجدوں اور بندگی کے نشانات کی صورت میں ان کے چہروں میں ظاہر ہو گئی ہیں) اور یہ بھی ارشاد الٰہی ہے کہ "سنسمہ علی الخرطوم" (کہ ہم اس کی ناک پر داغ لگائیں گے) بد باطن کی باطنی برائیاں ناک پر داغ کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔

اگر ہر کسی کو تمہارے چہرہ سے اندرونی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا تو تمہارے چہرہ کے رنگ کا کیا فائدہ ہے؟ (چہرہ کے رنگ سے باطن کا اندازہ ہونا چاہیئے)۔

فصل

طلبؔ اور اس کا انداز

ہمہ چیز را تا بجوئی نیابی ــــــــ جز ایں دوست را تا نیابی بجوئی

تمام چیزوں کی جب تک تلاش نہ کروگے نہ پاؤ گے سوائے اس دوست کے کہ وہ جب تک نہیں ملتا تب تک اس کو تلاش نہیں کیا جاتا۔ انسان کی طلب یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز کا طالب ہو اس کی طلب میں شب و روز مصروف رہے لیکن تعجب اس وقت ہوتا ہے کہ کوئی چیز کسی کو حاصل ہو گئی ہو اس کے بعد بھی اسی کو طلب کرے ایسی بات کا تصور بھی انسان کے ذہن میں نہیں آتا خیال وگمان سے دور ہوتا ہے کیونکہ اس کی طلب تو ایسی چیز کیلئے ہوتی ہے جو اس کو اب تک نصیب نہیں ہوئی ہے لیکن یہ چیز جو اس کو مل چکی ہو وہ پھر اسی چیز کا خواہاں اور طالب ہے وہ طلب حق ہے کیونکہ تمام اشیاء اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور وہ سب پر قادر اور سب کا مختار ہے۔ اس قدرت کی مثال کن فیکون سے عیاں ہے۔

واجد کی تشریح

واجد وہ ہے کہ اس نے سب کچھ پالیا ہو۔ حق تعالے طالب ہے "ھوالطالبُ الغالبُ" اس کی ذات طالب بھی ہے اور غالب بھی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اے انسان جس قدر بھی تو اس کی طلب کرتا ہے وہ طلب حادث ہے اور یہی وصفِ انسانیت ہی تو مقصود سے دوری کے مماثل ہے۔ لیکن جب تیری طلب حق کی طلب میں فانی ہو جائے گی اور حق کے لئے جو طلب ہے وہ تیری طلب پر غالب آجائے گی! اس وقت تو طلب حق میں صادق ہو گا۔ اور اس کا طالب ہو جائے گا۔ بلکہ صاحبِ مجد و شرف ہوگا۔

واصل بحق کی شناخت کے لئے دلیل قطعی

حضرت مولاناؒ سے ایک شخص نے عرض کیا یہ جاننے کے لئے کہ "واصل بحق اور ولی اللہ" کون ہے کوئی دلیل قطعی موجود نہیں ہے! اس سلسلے میں

نہ قول دلیل قطعی بن سکتا ہے نہ فعل و کرامات ۔ اس لئے کہ قول کو اگر دلیل قطعی کہا جائے تو ممکن ہے وہ پہلے سے سکھا دیا گیا ہو ۔ رہا فعل اور کرامات تو یہ دونوں باتیں تو جوگیوں میں بھی پائی جاتی ہیں کہ وہ دل کی بات بتا دیتے ہیں اور بہت سے خوارق عادات جادو کے ذریعہ ان سے ظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اُن کو از جنس کرامات شمار کیا جاتا ہے ۔

مولانا قدس سرہٗ نے جواب میں فرمایا کہ تم کسی کے معتقد ہو یا نہیں ؟ سائل نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں معتقد ہوں ۔ صرف معتقد ہی نہیں بلکہ (آپ) کا عاشق ہوں حضرت مولانا نے فرمایا کہ تمہیں جو اعتقاد اس شخصیت سے ہے کسی دلیل یا علامت اور نشان پر مبنی ہے یا یوں ہی آنکھیں پھاڑ کر اس کے معتقد بن بیٹھے ہو ۔ سائل نے کہا ؛ جی ! ہر گز نہیں ! حاشا و کلا ، یہ اعتقاد بے دلیل اور نشان کے ممکن نہیں ۔

مولانا قدس سرہٗ نے فرمایا پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ اعتقاد پر کوئی دلیل نہیں ہے اپنے اعتقاد کے بے دلیل نہ ہونے کے سلسلہ میں تم صاف کہہ چکے ہو ۔ تم نے خود ہی اعتراف کر لیا ہے کہ میرا اعتقاد بے دلیل نہیں ہے) یہ تو متناقض بات ہوئی (اقرار بھی کرتے ہو اور انکار بھی) ۔

ایک اور شخص نے سوال کیا کہ ہر صاحب دل اور ہر بزرگ کو اس بات کا زعم اور دعویٰ ہوتا ہے کہ مجھے قرب الٰہی حاصل ہے اور رب کریم کی جو عنایات مجھ پر ہیں وہ کسی دوسر کو حاصل نہیں ہیں ۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ اس قول کا قائل ولی ہے یا غیر ولی ہے اگر یہ کسی ولی کا قول ہے تو اس نے اپنے علم کے مطابق یہ کہا ہے کیونکہ ہر ولی کا اپنے بارے میں یہی اعتقاد ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس عنایت و نوازش کے لئے مخصوص نہیں ہوتا اور اگر یہ کسی غیر ولی نے کہا ہے تو وہ درحقیقت اللہ کا خاص اور مقرب بندہ ہوگا ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اس راز کو تمام اولیاء سے پنہاں رکھا ۔ لیکن اس پر آشکار فرما دیا ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بادشاہ کی دس کنیزیں

تھیں۔ ان سب نے آپس میں طے کیا دیکھیں بادشاہ ہم سب میں کس کو عزیز رکھتا ہے۔
اور جب بادشاہ سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا کہ بتایئے ہم میں سے آپ کو سب سے زیادہ
کون محبوب ہے ؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ میری یہ انگوٹھی کل جس کے پاس ہوگی وہی مجھے
سب سے زیادہ عزیز ہوگی۔ اس کے بعد بادشاہ نے سنار کو بلا کر ویسی ہی دس
انگوٹھیاں بنانے کا حکم دیا۔ جب انگوٹھیاں آگئیں تو سب کنیزوں کو ایک ایک انگوٹھی
پوشیدہ طور پر پہنا دی۔

یہ واقعہ سنا کر آپ نے فرمایا سوال اپنی جگہ ابھی باقی ہے۔ اس تمثیل سے ابھی
جواب مکمل نہیں ہوا۔ اور اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی اطلاع (کہ
بادشاہ نے دس انگوٹھیاں ایک جیسی بنوائی ہیں) ان دس کے علاوہ کس نے دی ؟۔
اگر ان دس میں سے کسی کو یہ معلوم ہوا کہ یہ انگوٹھی اس کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں
ہے اور ہر ایک کے پاس ایسی ہی انگوٹھی موجود ہے تو اس کو کوئی خصوصیت اور
تفوق حاصل نہ ہوگا اور وہ بادشاہ کی محبوب باندی نہ ہوگی۔ لیکن اگر دس انگوٹھیاں
بنوانے کی اطلاع ان دس کے علاوہ کسی اور نے دی ہے تو وہی بادشاہ کی منظور
نظر قرار پائے گی۔ کیونکہ اس کو اس قابل سمجھا گیا کہ اس راز سے اس کو آگاہ کر دیا گیا۔

عاشق کا کام

کسی نے سوال کیا۔ کہتے ہیں کہ عاشق کے لئے ذلت،
خواری اور گمنامی ضروری ہے اور عاشق میں یہ صفات
ہونی چاہئیں۔ آپ نے فرمایا کہ عاشق کی صفت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ معشوق کے اشارہ
چشم و ابرو پر چلے۔ اگر عاشق کی یہ تذلیل مرادِ معشوق نہیں ہے تو پھر وہ عاشق
نہیں ہوا (اس کو عاشق نہیں کہا جائے گا)۔ وہ اپنی مراد و آرزو کا پیرو ہوگا۔ اور
اگر یہ تذلیل معشوق کی مراد ہے اور معشوق یہی چاہتا ہے کہ عاشق ذلیل و خوار ہو تو
پھر وہ ذلیل کس طرح ہوا ! اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہم کو یہ نہیں معلوم کہ معشوق، عاشق

کے کون سے احوال کو پسند کرتا ہے (اس لئے مرادِ مستغرق کا تعین کس طرح کیا جائے)۔

ایک نکتہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ مجھے اس بات سے تعجب ہوتا ہے کہ ایک حیوان دوسرے حیوان کو کس طرح کھا لیتا ہے" عجبت من الحیوان کیف یاکل الحیوان" اہلِ ظاہر اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان حیوان کا گوشت کھاتا ہے اور یہ دونوں حیوان ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہے اس لئے کہ آدمی تو گوشت کھاتا ہے اور گوشت حیوان نہیں ہے۔ بلکہ از قسم جماد ہے اس لئے کہ جب جانور ذبح ہو گیا تو پھر وہ حیوان نہیں رہا وہ تو جماد ہوا۔ اس توجیہہ و تاویل سے مراد یہ ہے کہ شیخ مرید کو بے چون و چگونہ کھا لیتا ہے (اپنے اندر جذب کر لیتا ہے بغیر کیف و کم کے) پس اس نادر عمل سے مجھے تعجب ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نمرود سے گفتگو

کسی شخص نے آپ سے سوال کیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ میرے رب میں یہ قدرت ہے کہ وہ زندہ کو مارتا ہے اور مردہ کو زندگی عطا فرماتا ہے تو نمرود نے اس کا جواب یہ دیا کہ یہ قدرت تو مجھ میں بھی ہے۔ میں بھی ایک شخص کو معزول کر دیتا ہوں۔ وہ بمنزلہ اس کی موت کے ہے اور ایک کو منصب پر فائز کر دیتا ہوں وہ بمنزلہ اس کی حیاتِ نو کے ہے۔ یہ سنکر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کا الزامی جواب نہیں دیا تھا اور بات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ میرے رب میں اتنی قدرت ہے کہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں چھپا دیتا ہے، تو اگر قدرت رکھتا ہے تو اس کے برخلاف کر کے دکھا۔ یہ بات بظاہر اس کے جواب سے مخالف ہے۔

تو آپ نے اس سوال کے جواب میں فرمایا، حاشا و کلا حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے جواب سے لاجواب نہیں ہوئے تھے اور یہ بات نہ تھی کہ نمرود کی اس بات کا ان کے پاس جواب نہیں تھا۔ بلکہ وہی بات فرماتی تھی دوسری مثال کی صورت میں

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مشرق سے مراد رحمِ مادر ہے اور مغرب سے مراد قبر ہے یعنی آپ نے کہا کہ تو اگر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے برخلاف کرکے دکھا یعنی قبر سے بچّہ کو پیدا کر اور رحمِ مادر میں دفن کردے۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل وہی بات ہے اور اسی دعوے کی دلیل ہے اور اس کی بات کا جواب الزامی بھی ہے۔ خداوند کریم ہر لحظہ انسان کو حیات نو عطا کرتا ہے اس کے باطن میں دوسری نئی نئی اور ایسی تازہ چیزیں پیدا کر دیتا ہے جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ انسان خود سے بے خبر ہے اور اپنی ذات کی معرفت نہیں رکھتا۔

معرفتِ خودی

سلطان محمود غزنوی کے پاس ایک دریائی گھوڑا لایا گیا جو نہایت خوبصورت تھا۔ سلطان عید کے دن اس پر سوار ہوا تو لوگ اپنی چھتوں سے اس منظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ایک مست و مدہوش شخص اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ احباب نے اس سے کہا چلو تم بھی اوپر چل کر اس گھوڑے کو دیکھو۔ وہ کہنے لگا میں تو اپنی ذات میں مشغول ہوں مجھے اس گھوڑے سے کیا سروکار۔ لیکن لوگ زبردستی اس کو اوپر لے گئے۔ جب اس مست نے سلطان کو گھوڑے پر دیکھا تو کہنے لگا۔ میرے لئے اس گھوڑے کی کیا حقیقت ہے۔ اگر کوئی اس وقت مجھے رباب پر اچھا سا نغمہ سنائے اور ایسا گھوڑا میرے پاس ہو تو میں اس مطرب خوشنوا کو بخش دوں۔"

بادشاہ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ بہت برہم ہوا اور حکم دیا کہ ایسے گستاخ کو جیل میں ڈال دو۔ ایک ہفتہ جب اس کو جیل میں گزر گیا تو اس نے کسی کی معرفت بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے میری غلطی سے آگاہ کیا جائے کہ مجھ سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں مجھے پابندِ سلاسل کیا گیا ہے؟

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس قیدی کو دربار میں پیش کیا جائے۔

جب اس بدمست قیدی کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اس سے دریافت کیا۔ "اے گستاخ! تجھے یہ جرأت کیسے ہوئی اور تیری زبان سے یہ بات کیوں نکلی"؟ اس قیدی نے جواب دیا۔ "بادشاہ سلامت یہ بات میں نے نہیں کہی۔ اس وقت چھت پر ایک مرد مست کھڑا تھا اس نے یہ بات کہی تھی اور اس کے بعد وہ چلا گیا تھا۔ اب میں وہ مست نہیں ہوں بلکہ میں تو ایک عقلمند اور ہوشیار انسان ہوں"۔ بادشاہ کو اس کا جواب پسند آیا اس کو قید سے آزاد کر دیا اور خلعت بھی عطا کی۔

تعلق خاطر

اسی طرح جس شخص نے ہماری صحبت اختیار کی اور وہ اس شراب سے مست ہو گیا ہے اب وہ جہاں کہیں بھی جائے جس کے ساتھ بھی بیٹھے اور جن لوگوں سے تعلق رکھے وہ درحقیقت ہمارا ہی ہم نشین ہو گا۔ اور ہماری جنس سے ہی اس کو تعلق رہے گا۔ کیونکہ غیروں کی مصاحبت دوست کی مصاحبت کے لطف کی آئینہ دار ہوتی ہے کیونکہ غیر جنس سے بھی ملنا جلنا اپنی جنس سے الفت و محبت کا سبب بنتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اشیاء کی حقیقت ان کی ضد (مخالفت) سے ہی معلوم ہوتی ہے۔

جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شکر کا نام "امّی" رکھا تھا۔ یعنی مادر زاد شیرینی۔ اب دوسرے پھل شکر پر نخوت و حسد کرتے ہیں کہ ہم تو تلخی اور کسیلے پن کی منزلوں سے گزر کر شیرینی کی اس منزل تک اب پہونچے ہیں۔ پس جس کسی نے تلخی کی محنت اور مشقت نہیں اٹھائی ہے وہ شیرینی کی لذت کو کیا جانے

فصل

ایک شعر

دیکن بوی چوں بغایت رسید   شود دوستی سر بسر دشمنی

جب تمنا اور خواہش اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے تو دوستی سراسر دشمنی میں بدل جاتی ہے ۔

اس شعر کی تشریح آپ سے دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ دشمنی کی دنیا دوستی کی دنیا کے مقابلے میں کم اور تنگ ہے. کیونکہ دشمنی کی دنیا سے بھاگنے والے دوستی کے عالم میں آتے ہیں ۔ اسی طرح دوستی کی دنیا بھی اُس عالم کے مقابلے میں تنگ ہے جس عالم سے یہ دونوں دوستی اور دشمنی وجود میں آتے ہیں ۔ دوستی دشمنی کفر و ایمان یہ سب کے سب دوئی کا سبب بنتے ہیں. کیونکہ کفر انکار کا نام ہے اور منکر کے لئے کسی ایسی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جس کا انکار کیا جائے اور اقرار و ایمان کے لئے بھی ایسی شخصیت اور ذات درکار ہے جس کا اقرار کیا جائے. اس سے معلوم ہوا کہ یگانگی اور بیگانگی دوئی کا سبب ہیں لیکن وہ عالم کفر و ایمان، دوستی و دشمنی سے بہت وراء ہے. عالم کفر و ایمان دوستی و دشمنی سے بالکل الگ تھلگ ہے ۔

دوستی موجب دوئی کیونکر ہوسکتی ہے وہ تو ایک ایسا عالم ہے جہاں دوئی نہیں ہے خالص اتحاد و یگانگت ہے. جب وہاں تک رسائی ہوئی تو دوئی کا تعلق ختم ہوگیا اس طرح وہ پہلا عالم جو دوئی کا تھا اس کو اب عشق سے تعبیر کر دیا اس کو دوستی کہو وہ اُس عالم کی نسبت سے جہاں سے وہ اس وقت منتقل ہوا ہے بہت پست اور فروتر ہے جس کو وہ گوارا نہیں کرتا (تو یہ دوستی سراسر دشمنی ٹھہری) ۔

منصور اور انا الحق

چنانچہ اس سلسلہ میں منصور کی مثال ہمارے سامنے رہے ۔ جب ذاتِ باری کے ساتھ اس کی محبت انتہا کو پہونچ گئی تو اس نے خود کو اپنی ذات کا دشمن سمجھ کر اس کو مٹا ڈالا اور اَنا الحق کا نعرہ لگا کر یہ ثابت کر دیا کہ میں نے خود کو فنا کر دیا ہے اب میں باقی نہیں ہوں بلکہ حق باقی ہے. یہی غایت تواضع اور انتہائے بندگی و عبودیت ہے

یعنی بس وہی وہ ہے اور کچھ نہیں۔ دعویٰ اور تکبر تو یہ ہے کہ کہنے والا یہ کہے کہ تو خالق ہے میں بندہ ہوں۔ اس طرح وہ ذاتِ خالق کے ساتھ اپنے وجود کو بھی ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اس میں دوئی پائی جاتی ہے۔ "اور جب تم ھو الحق کہتے ہو تو اس سے بھی دوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک "انا یعنی" میں "نہ ہو" "ھو" کس طرح ہو سکتا ہے بس انا الحق حق تعالےٰ ہی نے فرمایا کیونکہ اس کی ذات کے سوا غیر کا وجود نہیں تھا چونکہ منصور (حلاج) فنا ہو چکا تھا پس انا الحق، حق نے ہی فرمایا۔

عالمِ خیال اور اس کی وسعت

خیال کی دنیا عالم مصوّرات (اشکال) و محسوسات کے مقابلہ میں وسیع ہے کیونکہ تمام اشکال خیال کی پیداوار ہیں اور اس عالم کے مقابلہ میں جس سے خیالات جنم لیتے ہیں عالم اشکال تنگدست ہے اور افہام و تفہیم سے اتنا ہی سمجھ میں آتا ہے ورنہ الفاظ و عبارت سے حقیقت معنوی کی بات کا سمجھ میں آنا محال ہے۔

الفاظ و عبارت کا فائدہ

اس گفتگو کو سننے کے بعد سائل نے ایک سوال کیا کہ اگر یہ بات ہے جو آپنے بیان فرمائی ہے تو پھر الفاظ و عبارت کا کیا فائدہ ہے (الفاظ و عبارت کس کام کے ہیں)۔ آپ نے فرمایا کہ سخن کا فائدہ یہ ہے کہ وہ تیرے اندر طلب و ہیجان پیدا کرتے ہیں اس سے یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ الفاظ و عبارت سے مطلوب حاصل ہو جاتا ہے اگر ایسی بات ہوتی جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو نہ مجاہدہ کی ضرورت ہوتی اور نہ اپنی ذات کو فنا کرنے کی۔ سخن کی حیثیت بس ایسی سمجھیئے دور سے ایک چیز کو ملتا ہوا دیکھ کر اسے دیکھنے کے لئے قریب جاتے ہو۔ تمہارا ایسا جانا اس کے دیکھنے کے لیئے ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی جنبش سے تم اس کو دیکھ لوگے۔ انسان کے

نطق کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ باطن میں متحرک رہتاہے اور تم کو اس حقیقت کی طرف کھینچتاہے اگرچہ تم اس حقیقت کی طرف دیکھ نہیں رہے ہو۔

ایک شخص کہا کرتا تھا کہ میں نے اتنا علم حاصل کیا اور اس قدر معانی و مطالب کی تحصیل کی (ان کو اپنے حافظہ میں محفوظ کیا) لیکن آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انسان کی وہ حالت (معنوی کیفیت) کونسی ہے جو باقی رہنے والی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا اگر یہ کیفیت اور بات صرف کلام سے ظاہر ہو جاتی تو انسان کو اپنا وجود مٹانے اور اس سلسلہ میں اس قدر رنج و محن برداشت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اس سلسلہ میں تجھے اتنی کوشش کرنی چاہیئے کہ تو باقی نہ رہے تب تجھے معلوم ہوگا کہ وہ چیز کیا ہے جو باقی رہنے والی ہے۔

ایک شخص نے عرض کیا میں نے سنا ہے کہ کعبہ ہے لیکن میں نے اس کو دیکھنے کی جتنی بھی کوشش کی وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ تو کیا اب میں چھت پر جاکر اسے دیکھوں؟ اس خیال کے تحت میں چھت پر چڑھ جاتا ہوں لیکن جب بھی کچھ نظر نہیں آتا، حالانکہ گردن خوب لمبی کر کے دیکھتا ہوں پھر بھی کعبہ نظر نہیں آتا تو کیا ایسا شخص کعبہ کے وجود سے منکر ہو جائے گا کہ کعبہ تو موجود ہی نہیں رہے (توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ) صرف اپنی جگہ کھڑے ہو کر دیکھنے سے کعبہ نظر نہیں آتا۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ سردی کے موسم میں پوستین کی شدید ضرورت ہوتی ہے لیکن گرمی کے موسم میں اس کی احتیاج نہیں رہتی ہے اور اس کی احتیاج نہ ہونے کی وجہ سے اب وہ اس کی طرف نظر نہیں کرتا۔ یوں سمجھیں کہ سردی میں پوستین کی ضرورت ٹھنڈک سے محفوظ رہنے کی غرض سے تھی، اس لیئے سردی سے بچنے اور گرمی کو حاصل کرنے کے لئے پوستین کی مدد درکار ہوئی لیکن سردی ختم ہو گئی پس اس کو روکنے والی چیز کی احتیاج نہ رہی تو پوستین کو اتار پھینکا، لیکن پوستین کی افادیت اپنی جگہ برقرار ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس کعبہ کی اہمیت اور ضرورت کا بھی یہی حال ہے کسی کو نظر آئے یا نہ آئے۔

آیاتِ کریمہ کی تشریح

" اذا السّماء انشقت (انشقاق.ع ۱) جب آسمان پھٹ جائے گا اور اذا زلزلت الارض زلزالھا (زلزال ع ۱) جب زمین زلزلہ کی وجہ سے کپکپانے لگے گی یہ اشارہ ہے کہ تیرا وجود ظاہری اربعہ عناصر کا مجموعہ ہے! اس کی لذت سے تو بہرہ یاب ہو چکا. اب اُن کے افتراق کی کیفیت کا بھی مطالعہ کرنا تو اس تنگنائے عالم (فانی) سے رہائی پا کر اور اس عالم کی فراخی سے لذت اندوز ہوگا. مثلاً ایک شخص کو چاروں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیا جائے تو وہ اسی حال میں خوش ہوگا کیونکہ وہ آزادی کی لذت کو بھول چکا ہے لیکن جب وہ اس قید سے آزاد ہوگا تو اس وقت اس کو معلوم ہوگا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا تھا اسی طرح قید عناصر سے رہائی کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ قید عناصر اس کے لئے کتنا بڑا عذاب تھا).

شیر خوار بچوں کی پرورش گہوارہ میں کی جاتی ہے اور ان کو اس میں آسائش ملتی ہے. اگر کسی بالغ کو اسی طرح باندھ کر ڈال دیا جائے تو وہ اس کیلئے اذیت کا سبب ہوگا

اندازِ فہم

بعض لوگوں کی خواہش یہ ہوتی ہے اور انہیں اسی میں لطف آتا ہے کہ پھول کھلیں اور کلیاں اپنے سر باہر نکالیں. بعض کی خواہش ہوتی ہے کہ پھول کے تمام اجزا متفرق ہو کر اپنی اصل کے ساتھ مل جائیں، اسی طرح بعض لوگوں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوستی، عشق، کفر و ایمان کے امتیازات باقی نہ رہیں اور وہ اپنی اصل کے ساتھ مل جائیں کیونکہ یہ سب رکاوٹیں دوئی اور تنگی کا سبب ہیں لیکن وہ عالم (باقی) فراخی کا موجب ہے اور وحدت مطلق کا یہی حال سخن کا ہے کہ بذات خود وہ عظیم نہیں ہے اور نہ بذات خود صاحب قوت ہے. سخن عظیم ہو بھی کس طرح ؟ کہ سخن ہی جو ٹھہرا کہ یہ ضعف کا بھی سبب ہے. اور موثر حق بھی ہے (حق کی تاثیر بھی رکھتا ہے. اور

حق کو سچائی میں بھی لاتا ہے۔ گویا حق اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ سخن کی ہیئت ظاہری دیکھو تو بس دو تین حروف کا مجموعہ ہے بھلا یہ کیا زندگی اور سچائی کا موجب ہو سکتا ہے۔ دیکھو ایک شخص تمہارے پاس آیا۔ تم نے اہلاً و سہلاً (خوش آمدید) کہہ کر اس کا خیر مقدم کیا وہ تمہارے اس سخن سے خوش ہو گیا اور یہ سخن موجب محبت بن گیا۔ ایک دوسرا شخص تمہارے پاس آیا۔ تم نے اس کو (خوش آمدید کہنے کے بجائے) دو تین گالیاں دیدیں۔ وہی تین حروف اس کے غضب کا باعث بن گئے۔ اور ان سے وہ رنجیدہ خاطر ہوا۔ اب غور کرو کہ یہ دو تین الفاظ کا مرکب (جملہ) محبت کے فزوں کرنے یا غیظ و غضب پیدا کرنے سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے ان کو اسباب پایۂ وہ بنا دیا ہے تاکہ ہر ایک کی نظر اس کے جمال و کمال پر نہ پڑے۔ کمزور نظروں کو ان کی نظروں کی مناسبت سے کمزور پردے دیتے ہیں۔ وہ انھیں پردوں کے پیچھے سے حکم کرتا ہے اور اسباب مہیا فرماتا ہے۔ دیکھو روٹی بذاتِ خود یعنی حقیقت میں زندگی کا سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زندگی اور قوت کا سبب اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ روٹی کا شمار جمادات میں ہے وہ قوت تو مہیا کرتی ہے لیکن انسان جیسی زندگی اس میں نہیں ہے کیونکہ اگر اس میں زندگی ہوتی وہ خود کو زندہ رکھتی۔

فصل

اندیشہ سے کیا مراد ہے؟

دریافت کیا گیا کہ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟

ای برادر تو ہماں اندیشہ ای   ما بقی تو استخوان و ریشہ ای

اس شعر کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ تو اس طرف توجہ کر کہ یہ لفظ اندیشہ اس مخصوص فکر خیال کی جانب اشارہ ہے تو سع کے نقطہ نظر سے ہم نے اسکو اندیشہ کا نام دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ اندیشہ نہیں ہے اور اگر اس کا نام اندیشہ ہی رکھا جائے تو وہ اندیشہ نہیں جس کو لوگوں نے سمجھا ہے۔ یہاں ہمیں لفظی بحث سے سروکار نہیں ہمکو تو اس کے معنی سے مطلب ہے لیکن اگر کوئی عوام کو سمجھانے کے لیئے کوئی لطیف تاویل کرنا ہی چاہے تو یوں کہہ سکتا ہے؛ کہ الانسان حیوان ناطق، انسان حیوان ناطق ہے (اور اسی نطق کا نام اندیشہ (فکر) ہے خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ دونوں حالتوں میں وہ اس حیوان (ناطق) سے ایک الگ چیز ہے۔ لہذا اب یہ بات درست اور صحیح ثابت ہوئی کہ انسان نام ہے اندیشہ کا۔ ورنہ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کو ہم ہڈیوں اور پٹھوں سے تعبیر کر سکتے ہیں (یہی اس شعر کا مطلب ہے)۔

لیکن کلام آفتاب کی طرح سے ہے اور حرارت اسی آفتاب کی رہین منت ہے۔ تمام انسان اس سے حرارت حاصل کر سکتے ھیں۔ اور اسی سے ثمرات زندگی حاصل کرتے ہیں۔ آفتاب کی ایک ہستی ہے اور وہ موجود ہے اور اس سے سب ہی حرارت حاصل کرتے ہیں لیکن آفتاب نظر نہیں آتا اور لوگ نہیں جانتے کہ اسی سے ان کی زندگی اور حرارت ہے۔

لیکن اگر الفاظ بلا کر ان سے عبارت ترتیب دی جائے خواہ شکریہ کے کلمات ادا کیئے جائیں یا شکایت کی جائے۔ خیر طلب کریں یا شر کی بات کریں۔ تو اس وقت آفتاب اسیطرح نظر آجاتا ہے جس طرح آفتاب فلکی موجود ہے کہ ہمیشہ نظر نہیں آتا جب تک کہ اس کی شعاعیں دیوار پر منعکس نہ ہوں اسی طرح جبتک کہ الفاظ و آواز کا سہارا نہ لیا جائے۔ آفتاب سخن کی شعاع پیدا نہیں ہوتی۔

اگرچہ باطن میں وہ برابر ہی موجود ہے کیونکہ آفتاب بھی لطیف ہے وھو اللطیف
ارشاد ربانی ہے تو ان لطیف چیزوں کو دیکھنے کے لیئے کثافت کی ضرورت ہے۔
جس کی وجہ سے وہ ظاہر ہوں اور دکھائی دیں۔
"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا"
بقول ایک شخص کے کہ اس نے کہا کہ میں مایوس اور افسردہ ہوں کہ مجھ پر
خداوند تعالیٰ نے کبھی حقیقت کو منکشف نہیں فرمایا۔ تو دیکھو جب وہ آفتاب
کی گرمی سے گرم ہوا تو اس نے اس کو دیکھ لیا (جان لیا کہ یہ گرمی اس کو آفتاب سے
پہونچی ہے) پس لطافت حق اگرچہ موجود تھی اور اپنا جلوہ بھی دکھا رہی تھی۔
لیکن اس پر اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ جب تک امر و نہی۔ خلق و قدرت کی
شرح اس کے سامنے نہیں کی جائے گی وہ اس لطافت حق کو نہیں دیکھ سکے گا۔
دیکھو! دنیا میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ کمزوری صحت کے سبب سے خالص شہد کو ہضم
کرنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔ تو وہ اس کو کسی غذا میں آمیختہ ہی استعمال
کر سکتے ہیں۔ جیسے زردہ، چاول، حلوہ وغیرہ ان واسطوں سے استعمال کرنے
کے بعد پھر ان میں اتنی قوت آجاتی ہے کہ وہ بغیر کسی واسطہ کے شہد کو استعمال کرنے
لگتے ہیں۔
پس اس طرح معلوم ہوا کہ نطق بھی آفتاب ہے جو لطیف بھی ہے اور روشن و
تاباں بھی۔ جس کی تابانی کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ لیکن تم تو کثافت کے محتاج
ہو تا کہ تم آفتاب (سخن) کی شعاعوں کو دیکھو اور اس سے استفادہ کرو۔
لیکن جب تم ایسی منزل پر پہنچ جاؤ گے کہ اس کی شعاعوں کو بغیر کثافت کے دیکھ
سکو اور اس کی لطافتوں سے براہِ راست استفادہ کر سکو اور اس کے عادی ہو جاؤ
اور اس کو دیکھنے کی بھرپور قوت حاصل ہو جائے اس وقت تم اس دریائے لطافت

میں عجیب رنگارنگی اور عجیب عجیب تماشے دیکھو گے اور سمجھ جاؤ گے کہ وہ آفتاب نطق ہمیشہ تمہارے اندر موجود رہا ہے چاہے تم گفتگو کرو یا نہ کرو۔ خواہ تمہارے اندر نطق کا خیال بھی نہ ہو جب بھی ہم یہی کہیں گے کہ نطق دائمی طور پر موجود ہے۔ جیسی طرح کہتے ہیں کہ الانسانُ حیوانِ ناطق"۔ انسان حیوانِ ناطق ہے۔

پس جب تک تم میں حیات باقی ہے حیوانیت بھی باقی رہے (الانسان حیوان ناطق) کا اطلاق تم پر ہوتا رہے گا! اسی طرح یہ لازم آیا کہ نطق بھی بطور دوام تمہارے باطن میں موجود رہے گا جب تک حیوان ناطق کا اطلاق تم پر ہوتا رہے گا چاہے تم گفتگو کرو یا نہ کرو نطق کا تا زندگی تمہاری ذات سے تعلق رہے گا۔

جس طرح سونا (نیند) حیوانیت کے ظہور کا سبب ہے (اس کی ذات میں داخل ہے)۔ اس کی حیوانیت کے لئے شرط نہیں ہے (کہ اگر حیوان نہ سوئے تو ہم کہیں کہ یہ حیوان نہیں ہے بلکہ وہ اس کی حیوانیت کی ایک صفت ہے۔ سوئے یا نہ سوئے) اسی طرح نطق کے لئے بولنا اور بلند آواز میں گفتگو کرنا بھی اس کے حیوان ناطق ہونے کا ایک سبب ہے۔ اس کے لیے شرط نہیں ہے (بعض نسخوں میں خوابیدن کے بجائے۔ خائیدن یعنی چبانا یا جگالی کرنا ہے)۔

انسان کی تین حالتیں

انسان کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی اور ابتدائی حالت یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف رجوع نہیں کرتا (خدا پرست نہیں ہوتا) ۔ گو کہ وہ تمام مخلوق کی عبادت اور خدمت کرتا ہے۔ پتھروں اور مٹی کو پوجتا ہے۔ زن و فرزند اور دوسرے لوگوں کی مدارات کرتا ہے لیکن خدا کی عبادت نہیں کرتا۔ پھر جب اس کو معرفت و آگہی حاصل ہو جاتی ہے تو وہ غیر خدا سے ترکِ تعلق کر لیتا ہے (ان کی پرستش نہیں کرتا) جب اسی کیفیت

ہیں ترقی کے مدارج طے کرتا ہے تو پھر خاموشی اختیار کر لیتا ہے! اس وقت نہ وہ یہ کہتا ہے کہ "میں خدمتِ خلق کرتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہے کہ میں خدمتِ الٰہی میں مشغول ہوں۔ وہ ان دونوں حدوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں دنیا میں کوئی شہرہ اور آوازہ نہیں پایا جاتا۔ (لوگ ان کو جانتے ہی نہیں)۔

اللہ تعالیٰ غیبت و حضور کا خالق ہے

اللہ تعالیٰ نہ حاضر ہے نہ غائب بلکہ وہ ان دونوں یعنی غیبت و حضور کا خالق ہے۔ اس طرح وہ ان دونوں کا غیر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر وہ حاضر ہے (اس کو حاضر تسلیم کیا جائے) تو غیبت کا وجود نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی طرح وہ حاضر بھی نہیں ہے اس لئے کہ جب حاضر ہے تو غیبت کہاں ہے اور ہم نے غیبت کو تسلیم کیا ہے، پس اس طرح وہ غیبت و حضور سے موصوف نہیں ہو سکتا۔ ورنہ لازم آئے گا کہ حضوری کو غیبت نے پیدا کیا ہو اور حضوری غیبت کی ضد ہے۔ یہی صورت غیبت کے ساتھ ہے کہ ضد سے ضد پیدا نہیں ہو سکتی ہے اور یہ بھی شایانِ شان نہیں کہ حق تعالیٰ اپنا مثل پیدا کرے۔ جب کہ وہ فرماتا ہے کہ "لا ندّ لہٗ" اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے"۔ اگر مثل کا مثل پیدا کرنا ممکن ہوگا تو ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی! اور ایجاد الشئ بنفسہٖ (اپنے نفس و ذات سے شئ کا ایجاد کرنا) اور یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ جب تم اس مقام پر پہونچ گئے تو یہاں ٹھہر جاؤ اور زیادہ تصرف مت کرو کہ عقل کو یہاں دخل و تصرف کی گنجائش نہیں ہے۔ جب تم دریا کے کنارہ پہونچ گئے تو ٹھہر جاؤ جبتک تک کہ تم میں مزید ٹھہرنے کی طاقت نہ رہے۔ تمام علوم، جمیع ہنر اور صنائع و حرفت اسی حقیقت سے لذت حاصل کرتے ہیں اگر یہ حقیقت نہ ہو تو کسی کام اور کسی حرفت میں دلچسپی اور کشش باقی نہ رہے۔

لیکن لوگ اس کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف نہیں ہیں اور اس کا جاننا بھی شرط نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہے جس کے پاس بکریوں کے ریوڑ اور گھوڑوں کی بہتات ہو اور یہ شخص بکریوں اور گھوڑوں کی نگہداشت کرتا ہو۔ اس عورت کے باغ میں درختوں کو پانی دیتا ہو تو ان تمام خدمات کو وہ اس عورت کی خواستگاری کی وجہ سے انجام دیتا ہے۔ اگر اس عورت کی خواستگاری کا معاملہ درمیان میں نہ رہے تو اس کو ان تمام کاموں سے کوئی رغبت باقی نہ رہے اور اس کی خدمات سرد اور بے جان ہو جائیں۔ اسی طرح دنیا کے تمام علوم اور صنائع میں جو زندگی جو خوشی اور گرم بازاری ہے وہ اس ذوقِ عرفان کا پرتو ہے۔ اگر اس میں اس کا ذوق اور اس کا وجود نہ ہو تو ان تمام کاموں میں ذوق ولذت باقی نہ رہے اور یہ سب بے جان رہ جائیں۔

فصل

اثر وقت کا رہینِ منت ہے

حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ پہلے ہم شعر کہتے تھے! اس وقت شعر کا ذوق شوق اپنے کمال پر تھا اسی ذوق وشوق کے عالم میں اثرانگیز شعر مرتب ہو کر زبان پر آتے تھے اس میں بڑا اثر تھا۔ اب ذوق بکھر جاتا رہا اب رو بہ زوال ہے مگر حق تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ آغازِ کار میں تربیت فرماتا ہے جس کے باعث عظیم تاثیر و حکمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگرچہ حالت زوال یا غروب کی ہے پھر بھی تربیت وہی قائم ہے جو پہلے (ابتدا) میں تھی۔ اللہ تعالیٰ رب المشرق والمغرب ہے طلوع وغروب کے محرکات اسی کے عمل سے ہیں اور وہی اصل کارفرما ہے۔

افعالِ انسانی کا خالق کون ہے؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے اور جو فعل بھی اس سے سرزد ہوتا ہے وہ اس کے عمل کا نتیجہ ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ جو فعل بندہ سے صادر ہوا ہے یا تو وہ اُن آلات کے سبب ہے جو اس کو عطا ہوئے ہیں۔ یعنی عقل، رُوح، قوت و جسم یا اُن اسباب کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن کسی بھی حال میں یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ بندہ افعال کا خالق ان اسباب و عمل سے ہو کیونکہ وہ ان کے جمع کرنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ یہ اسباب اس کے محکوم نہیں ہیں۔ تو یہ ممکن نہیں کہ وہ ان اسباب کے ذریعہ کسی فعل کا خالق ہو سکے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ ان اسباب کی مدد کے بغیر وہ کسی فعل کا خالق ہو سکتا ہو بدیہی طور پر یہی سمجھا جائیگا کہ افعال کا خالق ذاتِ باری تعالیٰ ہے بندہ نہیں ہے۔

غور کرو کہ ہر فعل خواہ اس کا تعلق خیر سے ہو یا شر سے، اس کا کرنے والا کسی ارادہ یا غرض و غایت کے تحت اس کو کرتا ہے لیکن اس کام میں وہ حکمت نہیں ہوتی جو اس کے تصوّر میں آسکے اور کام میں اتنی ہی حکمت اور فائدہ ہوتا ہے جو عامل کو نظر آتا ہے اور وہ یہ کام کر لیتا ہے۔ اس کام سے، جو کلّی فوائد ممکن ہو سکتے تھے ان کو اللہ ربّ العٰلمین ہی خوب جانتا ہے اور اس سے جو فوائد مرتب ہو سکتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ مثلاً تم نماز کو اس لئے ادا کرتے ہو کہ اس سے ثواب حاصل ہو آخرت میں نیکنامی اور دنیا میں امن و سکون لیکن نماز سے صرف یہی فوائد تو نہیں ہوتے! اس کے لاکھوں دوسرے فوائد بھی ہیں جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے! ان کا علم صرف ربّ العٰلمین ہی کو ہے جو بندہ کو اس کام کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انسان اس کے قبضۂ قدرت میں اس طرح ہے جس طرح انسان کے ہاتھ میں کمان ہو جس کو حق تعالیٰ استعمال کرتا ہے پس حقیقت میں فاعل اللہ تعالیٰ ہوا نہ کہ کمان۔ کمان تو ایک آلہ اور واسطہ ہے (بندہ) جو بے خبر اور حق سے غافل ہے اور اسی

غفلت سے دنیا کا قوام ونظام قائم ہے ۔ ہاں اس عظیم کمان کے کیا کہنے جو اس بات سے آگاہ ہو جائے کہ میں کس کے ہاتھ میں ہوں

دنیا کا قوام غفلت ہے

میں اس دنیا کے بارے میں کیا بتاؤں کہ اس کی بنیاد اور اس کا ستون ہی غفلت ہے ۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کسی کو نیند سے جگاتے ہیں تو وہ دنیا سے بیزار معلوم ہوتا ہے اور مبہوت سا ہوتا ہے ۔ یہ کیفیت تھوڑی دیر برقرار رہتی ہے ۔ انسان بچپن سے جو نشو ونما حاصل کرتا رہا ہے اس میں غفلت کا عمل کارفرما رہا ہے اگر غفلت کا عالم نہ ہوتا تو وہ نشو ونما اور بالیدگی حاصل نہ کرتا ۔ بچہ ہی رہتا بڑا نہ ہوتا ۔ اس طرح چونکہ اس کی نشو ونما اور اس کا کہن سال ہونا ہی غفلت کے واسطہ سے ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں نہ بالیدگی آتی اور نہ وہ نشو ونما حاصل کرتا ۔ لہذا حق تعالیٰ نے اس کے لیئے رنج ومحن ، مجاہدے اور تکلیفیں جبری اور اختیاری طور پر مقرر فرما دی ہیں تاکہ ماضی کی غفلت کی کیفیات اس سے دور ہو جائیں اور وہ اس سے دھل کر پاک وصاف ہو جائے اس کے بعد ممکن ہے کہ وہ اس عالم سے آشنا ہو جائے ۔

وجودِ انسانی کی مثال

انسان کا وجود ایک کوڑا گھرا اور گوبر کا ایک ڈھیر ہے لیکن اس کو یہ ڈھیر اس لیئے عزیز ہے کہ اس پر شاہی مہر لگی ہوئی ہے (معرفت حق) یا یوں سمجھ لو کہ وجود انسانی گیہوں کی ایک بوری کی طرح ہے بادشاہ کی طرف سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ اے شخص گیہوں کی اس بوری کو کہاں لیئے جا رہا ہے کہ اس میں میرا پیمانہ (صاع) ہے (اور معرفت حق) لیکن (حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح) وہ اس صاع سے غافل ہے

علاوہ ازیں انہیں کام میں ذاتی اختیار نہیں ہے ان کے فعل کی مثال بس ایسی ہے کہ جب خواب میں تم کوئی کام کرتے ہو تو وہ تمہارا کوئی ذاتی فعل نہیں ہوتا اس سبب سے اس سلسلہ میں کوئی جوابدہی نہیں ہوگی۔ خواہ ارتکاب کفر ہو یا زنا۔ یا اقرار توحید۔ فرشتے عالم بیداری میں بالکل اسی طرح ہیں کہ ان کا فعل اختیاری نہیں ہے۔ انسان کے افعال کی کیفیت اس کے برعکس ہے۔ انسان کو اختیار حاصل ہے وہ ہر چیز کی ہوس رکھتا ہے اور سب کچھ اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں خونریزی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور یہ صفت حیوانی ہے۔ اس طرح ملائکہ کے احوال انسانی احوال کی ضد ہیں۔ نظر نہ کرو اور عالم سفلی ہی کی طرف توجہ رکھو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ صانع اور اس کا عکس پردہ ہی میں پنہاں رہ گیا۔

فصل

مدح و تعریف کسی شخص نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ قاضی عزالدین آپ کی ہمیشہ تعریف کرتے ہیں اور انھوں نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے تو آپ نے فرمایا:۔

ہر کہ از ما کند بہ نیکی یاد یادش اندر جہاں بہ نیکی باد

جو شخص ہمیں اچھے الفاظ سے یاد کرتا ہے دنیا میں اس کی یاد بھلائی کے ساتھ باقی رہے۔

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے حق میں بھلائی اور خیر کے کلمات کہتا ہے تو یہ کلمات درحقیقت خود اسی کے واسطے ہوتے ہیں اور اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان کے اطراف میں سبزہ لگائے اور پھول کھلائے تو جب بھی ان کی طرف دیکھے گا اس کو گلشن نظر آئے گا۔ اور اس کو اپنا گھر بہشت معلوم ہوگا

اور جب کوئی شخص کلمات خیر کہنے کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ کسی کی تعریف و توصیف کرتا ہے تو وہ اس کا محبوب ہو جاتا ہے اور جب اس کی یاد آتی ہے تو وہ محبوب کی یاد ہوتی ہے۔ محبوب کی یاد گلِ گلستاں ہے اور خوشبو اور راحت ہے۔

اسی طرح تعریف کے برخلاف کوئی شخص اگر کسی کے بارے میں برے کلمات کہتا ہے تو اس کی نظر میں مبغوض (ناپسندیدہ) ہو جاتا ہے اور جب اس کا خیال آتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سانپ بچھو یا کوڑا کرکٹ اس کے سامنے ڈال دیا گیا ہے۔ اب جب کہ تمہاری خواہش یہ ہے کہ بہار کا سماں اور سرسبز و شاداب مناظر تمہاری نظروں کے سامنے رہیں تو کیڑے مکوڑے اور کوڑا کرکٹ کو درمیان میں کیوں لاتے ہو (کسی کو برا مت کہو) سب کو دوست رکھو تاکہ تم ہمیشہ گل و گلستان میں رہو۔ اگر تم دوسروں کو دشمن رکھوگے اور دشمن کا تصور کروگے تو معلوم ہوگا کہ تم خارستان اور مارستان میں سرگرداں ہو۔ سب کو دوست رکھو تاکہ ہمیشہ سرسبزی و شادابی میں رہو اور اگر سب کو دشمن رکھوگے تو دشمنوں کا خیال گھیرے رہے گا اور تم خارستان اور مارستان میں سرگرداں رہوگے۔

اولیا اور مدح

اولیائے کرام جو سب کو دوست رکھتے ہیں اور سب کو اچھی نظروں سے دیکھتے ہیں یہ سب کچھ وہ اپنے ہی لئے کرتے ہیں۔ غیر کے لئے نہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی برا خیال ان کی نظروں کے سامنے یا ان کے واہمہ میں آجائے اور یہ بات عین فطرت کے مطابق ہے کہ انسانوں کا خیال ذہن و تصورات میں آتا رہتا ہے اس لئے وہ حضرات کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کا ذکر ہمیشہ محبوب و مطلوب رہے تاکہ نفرت اور تشویش سے ان کی راہ کھوٹی نہ ہو اور خیالات فاسد کو ذہن میں راہ نہ ملے۔ اس لئے تم مخلوق کے ساتھ جو بھی عمل خیر یا برائی کرتے ہو وہ تم پر ہی لوٹ آتی ہے۔

قرآنِ کریم میں اِرشاد ہے : " من عمل صالحًا فلنفسہٖ ومن اساء فعلیھا " (جاثیہ رکوع ۲) جس نے نیک عمل کیا اس نے اپنے لیئے کیا اور جس نے بُرائی کی وُہ بھی اس نے اپنے ہی حق میں کی ہے ۔ " فمن یّعمل مثقال ذرّۃٍ خیرًا یّرہٗ و من یّعمل مثقال ذرّۃٍ شرًا یّرہٗ " (زلزال) جس نے رائی کے دانہ برابر بھی نیکی کی وہ اسے دیکھے گا اور جس نے رائی کے دانہ کے برابر بھی برائی کی وہ اس کو دیکھے گا خیر و شر اگر ذرہ برابر بھی ہو تو اس کا بدلہ ملے گا ۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ (از راہِ نوازش) رب کریم کے اس ارشاد کی تشریح فرمائیں " ۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ (بقرہ ع ۳) میں خطۂ زمین پر اپنا نائب بھیجنا چاہتا ہوں ۔ فرشتوں نے اس کے جواب میں عرض کیا تھا ۔ " اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدك و نقدس لك " (بقرہ ع ۳)

(اے رب) تو اس زمین میں اپنا نائب اسے بنانا چاہتا ہے جو وہاں فتنہ و فساد برپا کرے گا اور خونریزی کرے گا ، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں ۔ " ابھی تو خلقت آدم (علیہ السلام) ہوئی بھی نہ تھی ۔ پھر فرشتوں نے پہلے ہی سے فتنہ و فساد اور خونریزی کے بارے میں کیوں کہا ؟ ۔

فتنہ و فساد کی وجوہ

سائل کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ اس کی دُو وجوہ بتائی گئی ہیں ۔ ایک منقول اور دُوسری معقول (عقلی) ۔ پہلی منقول وجہ تو یہ ہے کہ فرشتوں نے لوحِ محفوظ میں دیکھا تھا کہ دنیا میں ایک ایسی مخلوق ہوگی جس کی صفات ایسی اور ایسی ہوں گی اسی لیئے انہوں نے اس کو نقل کر دیا ۔

دوسری وجہ عقلی ہے کہ ملائکہ نے عقل سے یہ استدلال کیا چونکہ وہ قوم زمین سے متعلق ہوگی ۔ اس لیئے حیوان ہوگی ۔ چونکہ فتنہ و فساد لازمۂ حیوانیت ہیں باوجودیکہ معنویتِ حق بھی ان کے اندر ہوگی اور وہ ناطق ہونگے لیکن اِن میں نطق

کے ساتھ ہی چونکہ حیوانیت بھی ہوگی اس لئے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہوں گے اور خونریزی بھی کریں گے جو لازمۂ آدمیت ہے۔

کچھ حضرات نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ملائکہ عقل محض اور خالصتاً خیر ہیں۔ علاوہ ازیں انھیں کام میں ذاتی اختیار نہیں ہے ان کے فعل کی مثال بس ایسی ہے کہ جب خواب میں تم کوئی کام کرتے ہو تو وہ تمہارا کوئی ذاتی فعل نہیں ہوتا اس لئے تمہاری اس سلسلے میں کوئی جواب دہی نہیں ہوگی۔ خواہ ارتکاب کفر ہو یا زنّار یا اقرارِ توحید۔ فرشتے عالمِ بیداری میں بالکل اسی طرح ہیں کہ ان کا فعل اختیاری نہیں ہے انسان کے افعال کی کیفیت اس کے برعکس ہے۔ انسان کو اختیار حاصل ہے وہ ہر چیز کی ہوس رکھتا ہے اور سب کچھ اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے اس مقصد کے حصول میں خونریزی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور یہ وصف حیوانی ہے۔ اس طرح ملائکہ کے احوال انسانی احوال کی ضد ہیں ممکن ہے کہ اس طریقہ پر ان کے بارے میں خبر دی گئی ہو کہ انہوں نے (فرشتوں نے) اس طرح کہا ہے۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ وہاں اس وقت نہ تو کوئی گفتگو تھی اور نہ ذریعۂ گفتگو، یعنی کوئی زبان۔

اس کو ہم اس تقدیر پر محمول کر سکتے ہیں کہ یہ دو متضاد احوال معرضِ بیان میں آئیں اور اپنے حال کی خبر دیں تو اس کی نوعیت وہی ہوگی جس کو شاعر نے اپنے اندازِ بیان میں بیان کیا ہے کہ حوض نے کہا کہ وہ پُر آب ہو گیا، دیکھو حوض بات نہیں کرتا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر حوض کی زبان ہوتی تو اس حالت میں وہ یہی کہتا۔

فرشتوں کو مستقبل کے حالات کا علم ہو جاتا ہے ـــ!

ہر فرشتے کے باطن میں ایک لوح ہے اس لوح پر وہ اپنی قوت کے مطابق مندرج احوالِ عالم کا جو مستقبل میں پیش آنے والے ہیں علم حاصل کر لیتا ہے اور جب وہ وقت آتا ہے اس لوح سے جو کچھ علم اس سے حاصل کیا ہے وقوع پذیر ہوتا ہے تو اس کا اعتقاد ذات

یادی سے اور مضبوط ہوتا ہے بلکہ اس سے عشق و مستی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہوتے اور اُس کی عظمت پر محوحیرت ہوتا ہے اُن فرشتوں) کے عشق و محبت میں یہ زیادتی، اعتقاد میں فراوانی اور تعجب و حیرانی بغیر الفاظ و عبارت کی برنگ تسبیح ظاہر ہوتے ہیں (وہ زیادہ سے زیادہ تسبیح کرتے ہیں)۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی مکان کی تعمیر سے قبل ایک انجنیئر اپنے ماتحتوں اور زیر دست کاریگروں کو اس کی تعمیر کا تخمینہ اور سامان کی بابت بتا دیتا ہے کہ اس میں اتنی لکڑی، لوہا، اینٹ اور دوسرا سامان درکار ہوگا جب مکان مکمل ہوا اور تعمیر میں اسی قدر سامان صرف ہوا تو اس کے شاگرد اور اس کے تحت کام کرنے والے انجنیئر کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس مثال سے اس کیفیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

فراق و وصل کی کیفیت

ایک شخص نے حضرت مولاناؒ سے دریافت کیا جب کہ خالق کائنات کے حبیب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اظہار ان الفاظ میں ہے کہ "لولاک لما خلقت الافلاک" اے حبیب اگر آپ کی ذات مقصود نہ ہوتی تو میں زمین و آسمان کو پیدا نہ کرتا۔ ان عظمت والے کلمات کے باوجود سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا:۔ "یالیت رب محمد لم یخلق محمدا" کاش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا نہ فرماتا" ایسا کیونکر؟ مولانا نے فرمایا اس کو مثال سے اس طرح سمجھو۔

ایک گاؤں میں ایک شخص ایک عورت پر فریفتہ ہوگیا۔ دونوں کے خیمے برابر برابر تھے۔ دونوں قربت کے خوب مزے لوٹتے رہے اور داد عیش دیتے رہے، دونوں ایک دوسرے کے دم سے زندہ تھے (اس مچھلی کی طرح جو پانی میں رہ کر زندگی کا لطف اٹھاتی ہے)۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے اور یہ ساتھ بسر کرتے رہے یکایک اللہ تعالیٰ نے ان کو غنی کر دیا۔ گائیں، بھیڑیں، گھوڑے، مال و زر، نوکر

جاگر سب کچھ اُن کے پاس ہوگیا۔ جب دولت مندی کا یہ عالم ہوگیا تو ان کو شہر
میں رہنے کی سوجھی۔ ہر ایک نے عالیشان محل بنوالیئے اور وہاں رہنے لگے لیکن
یہ شہر میں ایک طرف اور وہ شہر میں دوسری طرف۔ جب یہ الگ الگ رہنے لگے
تو وہ قربت کا عالم اور وصال کے روز و شب ختم ہو گئے۔ اور وہ کیفِ
وصال اور عیشِ قربت میسر آنا مشکل ہوگیا۔ دونوں کی حالت دگرگوں
ہوگئی۔ جگر (آتشِ جدائی سے) سوزاں تھا اور ہر وقت آہ و نالہ میں مصروف،
گفتگو کرنے کا موقع بھی میسر نہ آتا تھا جب یہ سوختگی اور بیکلی اپنی
انتہا کو پہونچ گئی اور یہ دونوں آتشِ فراق میں بھسم ہو گئے تو ان کی
فریاد بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگئی۔ وہ سامانِ عیش و عشرت اور جانوروں
کے ریوڑ گم ہونا شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہونچی کہ پھر
اپنی پہلی حالت پے مانگی پر آگئے اور قرب و وصال حاصل ہو گئے جب کے بعد
یہ دونوں جدائی کو یاد کرتے تو ان کو گویا یہ آواز سنائی دیتی۔ یالیت ما اب
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لم یخلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (یعنی اُن کی پچھلی جدائی
اس قول کے مصداق تھی)۔ جب سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس
عالمِ قدس میں تھی (یعنی لباس وجودِ دنیاوی سے آراستہ نہیں ہوئی تھی)
تو وصالِ الٰہی سے ہر لمحہ شاداں و فرحاں اور مسرور تھی۔ اور دریائے رحمت
میں مچھلی کی طرح جو ہر وقت پانی میں غوطہ زن رہتی تھی کامیاب و کامگار
تھی۔ جب آپ کی ذاتِ اقدس نے اس خاکدانِ عالم کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے
مشرف فرمایا۔ شرفِ نبوت، خلقت کی رہنمائی، اختیار و اقتدار کامل حاصل
ہوا، شہرت و عظمت نے قدم چومے، جاں نثار صحابہؓ ملے۔ بایں ہمہ جب سابقہ
قربت یاد آتی تو بیساختہ زبانِ مبارک پر یہ کلمات آتے، کاش میں نبی نہ ہوتا

اور اس دنیا میں نہ آتا۔ کیونکہ اس وصالِ مطلق کے مقابلہ میں یہ ساری باتیں شاق گزر رہی ہیں اور ان سے ایذا پہونچ رہی ہے

خدمت و عظمت کی مثال

پس یہ تمام عبدیت علوم اور مجاہدات عظمتِ باری تعالیٰ کے استحقاق کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے کہ ایک شخص نے تمہاری اطاعت و خدمت کی اس کے بعد وہ چلا گیا۔ اگر تم خدمتِ حق میں ساری زمین اپنے سر پر اٹھا لو تو یہ عمل ایسا ہی ہوگا جیسا کہ تم نے ایک مرتبہ اپنی جبینِ نیاز کو جھکا یا۔ کیونکہ اللہ کا لطف و کرم، اس کی رافت و رحمت تمہاری خدمت پر سبقت رکھتی ہے اور اسے یہ استحقاق ہے کہ اس نے تم کو کہاں سے پیدا فرمایا اور عالمِ وجود میں لایا اور تم کو خدمت و عبدیت کے لئے مستعد کر دیا۔ لیکن جب تم اس کی عبادت اور بندگی کا دعویٰ کرتے ہو تو کیا وہ عبدیت و بندگی ایسی ہی ہوتی ہے جیسی ہونا چاہیئے؟ تم نے تو لکڑی اور پھندے سے کچھ صورتیں گڑھی ہیں اس کے بعد اس کی بارگاہ میں یہ کہکر پیش کر دی ہیں کہ یہ مجھے بہت پسند آئی ہیں۔ اب ان میں جان ڈالنا میرا کام نہیں یہ تیری ہی قدرت ہے۔ اگر تو ان کے جسمِ بے جان میں جان ڈال دے تو یہ میرے علم میں اضافہ اور زیادتی کا سبب ہوگا۔ اور اگر حیات عطا نہ فرمائے تو یہ بھی تیرا ہی فرمان ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ رب تو وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور موت سے ہمکنار کرتا ہے "یحیی و یمیت" یہ سنکر نمرود نے کہا تھا کہ " انا احیی و امیت " میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک عطا فرمایا اور اس نے خود کو صاحبِ اختیار و اقتدار پایا تو اس نے یہ حق زندگی و موت اللہ کے حوالہ نہ کیا بلکہ کہنے لگا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ میری مراد اس ملک سے ملک دانش ہے جب اللہ تعالیٰ نے

انسان کو علم و فراست اور حذاقت عطا فرمائی تو اب وہ تمام کاموں کو اپنی جانب منسوب کرنے لگا۔ اب وہ کہتا ہے کہ میں اپنے علم و عمل سے بہت سے کام پیدا کرتا ہوں اور ذوق و شوق حاصل کرتا ہوں۔ نادان نے یہ نہ کہا کہ "ھو یحیی و یمیت"۔ وہی خالق برتر زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود

ایک شخص نے حضرت مولانا قدس سرہٗ سے دریافت کیا کہ جناب ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ارشاد کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ جب کہ انہوں نے نمرود سے فرمایا تھا کہ میرا رب تو ایسا ہے جو مارتا بھی ہے جلاتا بھی ہے تو نمرود نے کہا کہ یہ تو میں بھی کرتا ہوں! اس کی یہ بات سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسری دلیل پیش فرمادی اور فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا "ان اللہ یاتی بالشمس من المشرق" (بقرہ آیت ۲۵۸) اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے"۔ اگر تو خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کے برعکس کر کے دکھا یعنی سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں غروب کر، اس دلیل کو لانے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ (نعوذ باللہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے پہلے جواب سے زچ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے پہلی دلیل چھوڑ کر دوسری دلیل پیش کر دی۔

مذکورۂ بالا اعتراض کا جواب

اس کے جواب میں حضرت مولاناؒ نے فرمایا، اس سلسلہ میں دوسروں نے تو بکواس کی ہے اور تم بھی ان کی طرح لغو اور بیکار بات کر رہے ہو۔ غور کرو یہ دونوں دلیلیں ایک ہی ہیں لیکن مثالیں دو ہیں۔ اس کے سمجھنے میں تم نے

اور دوسروں نے غلطی کی ہے اس سے تو بہت سے مفاہیم ہیں ۔ ان میں سے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے عدم سے رحم مادر میں صورت ہستی عطا کی اس طرح تیرا مشرق شکم مادر تھا وہاں سے تو نے طلوع کیا اور قبر کے مغرب میں تجھے غروب کیا جائے گا ۔ یہ وہی پہلی بات ہی ہے لیکن باندازِ دگر کہ "ھو یحی و یمیت"۔ وہی مارتا اور جلاتا ہے ۔ اگر اب تو مارنے اور جلانے پر قادر ہے تو مغرب کی قبر سے زندہ کر کے باہر لا اور مشرق یعنی رحم مادر میں دفن کر کے دکھا اسی بات کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ عارف کو طاعت و مجاہدہ ہی کے ذریعہ اور عمل ہائے متفرق کے باعث باطن کی روشنی اور راحت میسر آتی ہے لیکن اس طاعت و مجاہدہ کے ترک کرنے کی صورت میں وہ خوشی غروب میں چلی جاتی ہے اس طرح یہ دونوں حالتیں، طاعت، وعبادت اور ترکِ عبادت اور ترکِ طاعت وعبادت اس کے مشرق و مغرب ہوئے پس اے نمرود اب اگر تو مردہ کو زندہ کرنے پر اس حالت غروب میں جس کو فتنہ و فساد اور معصیت سے تعبیر کرتے ہیں قادر ہے تو وہ روشنی اور ذوق جو طاعت سے طلوع ہوتی ہے اس حالت میں پیدا کر ۔ اب یہ جان لے اور سمجھ لے کہ یہ بندہ کا کام نہیں، بندہ اس کام کو کر ہی نہیں سکتا ۔ یہ تو خالق کا کام ہے کہ اگر وہ چاہے تو آفتاب کو مغرب سے طلوع کرے اور چاہے تو مشرق سے "ھوالذی یحی و یمیت"۔ وہی ایسی ذات ہے جو زندگی عطا کرتی ہے اور موت سے ہمکنار کرتی ہے ۔

کافر و مومن تسبیح کرتے ہیں

کافر و مومن دونوں ہی تسبیح و تہلیل کرتے ہیں ۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو سیدھا راستہ چلتا ہے شریعت کی متابعت اور انبیاء و اولیاء کے طریقہ پر عمل کرتا ہے تو اس کے لئے خوشیاں، روشنیاں اور زندگیاں ظاہر

ہوتی ہیں، لیکن اس کے برخلاف عمل کیا جاتا ہے تو تاریکیاں خوف اور بلائیں ظاہر ہوتی ہیں۔ دونوں گروہ جب ایسے عمل کرتے ہیں تو حق تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ "لا یزیدُ ولا ینقص"۔ وہ نہ زیادہ کرتا ہے نہ کم۔ سچ ثابت ہوتا اور ظاہر ہوتا ہے اور اس کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ یہ بھی اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں، (لیکن دونوں میں فرق ہے)۔ مثال سے اس کو اس طرح سمجھیں کہ ایک مجرم چور کو کسی جرم میں سولی پر چڑھا دیا گیا اس کی سزا یابی بھی وعظ و نصیحت اس کی ہے کہ جو جرم کریگا اس کا حال بھی ایسا ہی ہوگا۔ جو میرا ہوا۔

ایک شخص کو بادشاہ نے اس کی دیانت و امانت کی وجہ سے خلعت سے سرفراز فرمایا۔ یہ بھی مسلمانوں کو نصیحت کرنے والا ہے۔ لیکن یہ دونوں چور اور امین ایک ہی زبان سے وعظ نہیں کہتے۔ یہ اور زبان سے کہتا ہے اور وہ دوسری زبان سے۔ چور نے سولی پر چڑھ کر اپنی حالت زبوں کو پیش کرکے وعظ و نصیحت کی اور ایک نے امانت و دیانت کے صلہ میں خلعت پائی۔ یہ بھی امانت و دیانت کی نصیحت کرنے والا ہے کہ دیکھو امانت و دیانت کا یہ صلہ ہے لیکن دونوں کی زبانِ حال میں فرق ہے۔

فصل

خاطرِ عزیز اور شادمانی

حضرت شیخ نے ایک صاحب سے خیریت معلوم کرکے فرمایا، یہ خاطر بھی ایک بہت ہی عزیز چیز ہے اگر مزاج اور طبیعت درست نہیں ہے تو سمجھ لو سنگساری کا جال پھٹا ہوا ہے اب وہ کسی کام کا نہیں ہے پس دوستی اور دشمنی کو ہمیشہ اعتدال پر رہنا چاہیئے۔ ان دونوں میں افراط مناسب نہیں ہے کہ افراط و تفریط دونوں ہی حالتوں میں "جال" پھٹ جاتا ہے۔ دوستی بھی اعتدال

پر ہونا چاہیئے ، یہ جو میں نے کہا کہ دوستی بھی اعتدال پر ہونا چاہیئے یہ دوستی عام دوستی ہے جس کا خدا کی دوستی سے تعلق نہیں ہے اس لیئے کہ حق تعالیٰ کی دوستی میں افراط کا وجود ہی نہیں ہے، حق کی محبت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی بہتر ہے، غیر حق کی محبت کی طرح وہ مفرط نہیں ہو سکتی۔ مخلوق کا حال تو یہ ہے کہ وہ گردش فلکی کی تسخیر میں ہیں اور فلک ہمیشہ گردش کرتا رہتا ہے یعنی وہ ہمیشہ دائرہ رہتا ہے اور احوال خلق بھی مصروف دوران پس دوستی جب کسی کے حق میں حد افراط کو پہنچ گئی تو اس کی بزرگی ہمیشہ ترقی چاہے گی اور یہ ممکن نہیں ہے (دائرہ فلکی سے باہر نہیں نکل سکے گی)۔ پس طبیعت پریشان ہوگی۔ اسی طرح جب دشمنی حالت افراط میں ہوگی وہ ہمیشہ اس کے لیئے بدبختی اور نحوست کا باعث بنی رہے گی۔ فلک تو گردش اور دورہ کرتا آیا ہے کسی وقت اس کی گردش سعد ہو جاتی ہے اور کسی وقت نحس۔ ایسا نہیں کہ ہمیشہ نحوست کا دور رہی رہے۔ لہذا ان کیفیت میں بھی قلب تشویش و اضطراب میں مبتلا رہے گا۔

اس کے برعکس حق تعالیٰ کی دوستی اور محبت تمام عالم و مخلوقات میں پوشیدہ ہے خواہ وہ بندے میں گبر ہو یا یہودی یا آتش پرست۔ اس لئے کہ وہ کون شخص (نادان) ہے جو اپنے خالق اور موجد کو دوست نہ رکھے گا اگر بظاہر دوست نہیں رکھتا ہے تو یہ دوستی اس کے باطن میں پوشیدہ ہے۔ صرف بعض موانع اس کو ظاہر نہیں ہونے دیتے، جب وہ موانع دور ہو جاتے ہیں تو وہ محبت ظاہر ہو جاتی ہے! اس لیے کہ وہ موجودات جو عدم میں ہیں اپنے ظہور کے لئے بے چین ہیں کہ کب ان کا ظہور ہو کہ عدم سے وجود میں آئیں جس طرح چار شخص بادشاہ کے سامنے ایک منصب کے لئے ایک صف میں کھڑے ہیں اور ان میں

سے ہر ایک منتظر ہے کہ بادشاہ اس منصب کو اس کے سپرد کریگا (اس کا انتخاب کریگا) اور ان میں سے ہر ایک ایک دوسرے سے شرمندہ ہے (اسی حالت کی بدولت) اس لئے کہ ہر ایک کی توقع (کامیابی) دوسرے کے منافی ہے۔ (ہر ایک کامیابی کی امید رکھتا ہے تو دوسروں کو اپنے سامنے اپنی کامیابی سے شرمندہ پاتا ہے)۔ اسی طرح معدومات حق تعالیٰ سے ایجاد کے متوقع ہیں اور صف بستہ ہیں اور ہر ایک متوقع ہے کہ عالم ہست میں لایا جائے گا۔ اور ان میں ہر ایک باری تعالیٰ سے اپنے موجود ہونے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کا خواستگار ہے پس آپس میں یہ ایک دوسرے سے شرمسار ہیں جب معدومات کا یہ حال ہے تو "موجودات" کی کیا حالت ہوگی پس ہر شئی کا "مسبح" ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے (وان من شیئ الا یسبح بحمدہ) بلکہ تعجب کی بات تو یہ ہے سہ

کفر و دیں ہر دو در رہت پویاں "وحدہ لا شریک لہ" گویاں

کفر اور دین، دونوں ہی تیرے راستہ میں دوڑتے ہوئے۔ کہتے جاتے ہیں کہ "اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔"

غفلت کی کارروائیاں

اس گھر کی بنیاد غفلت پر رکھی گئی ہے اجسام اور دنیا کا قوام غفلت پر ہے۔ اور جسم جو پھولا پھلا ہے یہ بھی غفلت ہی کا ثمرہ ہے اور غفلت کفر ہے اور کفر کے بغیر دین کا وجود ممکن نہیں کیونکہ ترک دین ہی کا نام کفر ہے۔

کفر کی موجودگی ضروری ہے

لہذا ایسے میں کفر کا ہونا ضروری ہے کہ اس کو ترک کیا جا سکے۔ لہذا دونوں ایک ہی چیز ہوئے کہ نہ وہ اس کے بغیر ممکن اور نہ یہ اس کے بغیر۔ لہذا دونوں ایک دوسرے

کے لئے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح یہ بھی لازم آئے گا کہ ان کا ایک ہی خالق ہو۔ اگر خالق ایک نہ ہوتا تو ان میں سے ہر ایک (کفر اور ایمان) جدا جدا اجزا ہوتے! اس لئے کہ جب ان میں سے ہر ایک کسی چیز کو پیدا کرتا تو یہ پیدا ہونے والی چیزیں متجزی ہوتیں (اور ایسا نہیں ہے) پس جب خالق ایک ہی ہے۔ تو یقیناً وحدہ لاشریک ہوگا۔

کچھ حضرات نے حضرت مولاناؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ سید برہان الدین تقریر تو بہت اچھی کرتے ہیں لیکن اثنائے کلام میں حکیم سنائی کے اشعار بہت پیش کرتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے جواب میں فرمایا کہ یہ تعریف تو ایسی ہوئی کہ کوئی کہے کہ آفتاب تو اچھا ہے لیکن روشن رہتا ہے پس یہی آفتاب کا عیب ہے۔ حالانکہ سنائی کے اشعار پیش کرنا کلام کی تفسیر و تشریح کے لئے ہے۔ آفتاب چیزوں کو نمایاں کرتا ہے یعنی آفتاب کی روشنی میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آفتاب کے وجود کا مقصود ہی یہ ہے کہ وہ چیزوں کو دکھائے اور آفتاب اُن چیزوں کو بھی دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے جو کسی کام نہیں آتیں؟
حقیقت میں آفتاب تو وہی ہے جو اِن چیزوں کو دکھائے جو کام آئیں پس یہ آفتاب فلکی تو اُس آفتاب حقیقی کی ایک فرع اور مجاز ہے۔

آخر تم بھی تو اپنی عقل جزوی کے بقدر اس آفتاب سے رغبت رکھتے ہو اور نورِ علم طلب کرتے ہو تاکہ اس کے ذریعہ سے غیر محسوسات کا ادراک کر سکو اور تمہاری عقل و دانش میں اضافہ ہو۔ اسی طرح ہر استاد اور سبق سے بھی تم یہی توقع رکھتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس آفتاب صوری کے علاوہ ایک آفتاب اور بھی ہے جس کے ذریعہ کشف معانی و حقائق ہوتا ہے اور یہ علمِ جزوی جس کی جانب تو شوق سے بڑھ رہا ہے اور اس کے حصول

سے فرحت حاصل کرتا ہے وہ علم بزرگ کی ایک فرع ہے اور اس کا ایک پرتو ہے اور یہی پرتو اور عکس تجھے اس اصل اور مرکز کی جانب یعنی آفتاب اصلی کی طرف لاتا ہے بمصداق اس آیت کے :- "اولئك ينادون من مكان بعيد" (حم سجدہ ع ۴) (یہ لوگ ایسی حالت میں ہیں جیسے کہ انہیں بہت دور سے پکارا جا رہا ہے)۔

محال کا پیدا ہونا محال ہے تم اس علم کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہو اور وہ علم کہتا ہے کہ میں اس تنگ جگہ سما نہیں سکتا۔ تم اس حقیقت کو آسانی سے نہ سمجھو گے۔ میرا یہاں سمانا محال ہے اور تمہارا وہاں پہونچنا مشکل ہے۔

یہ بات اپنی جگہ متحقق ہے کہ محال کا پیدا ہونا محال ہے۔ البتہ دشوار کا پیدا ہونا محال نہیں ہے۔ تم جد و جہد کرو اغنیا، حق تعالیٰ کی صفت غنا کے فیض سے ذرہ ذرہ کر کے جمع کرتے ہیں اور ایک ایک حبہ اکٹھا کرتے ہیں تاکہ ان کو بھی صفت غنا حاصل ہو جائے لیکن اس غنا (الٰہی) کا پرتو اس غنا سے کہتا ہے کہ تم مجھے اس غنائے عظیم سے اس غنائے حقیر کی طرف کیوں کھینچ رہے ہو۔ میں تم کو بتائے دیتا ہوں کہ میں یہاں نہیں سما سکتا۔ تم خود اس غنائے عظیم کی طرف آجاؤ۔ بہرحال اصل تو عاقبت ہی ہے اللہ تعالیٰ عاقبت محمود فرمائے (آمین) (حسن عاقبت مرحمت فرمائے) سمجھ لو کہ عاقبت محمود یہ ہے کہ ایک درخت ہے جس کی جڑیں اس باغ روحانی میں پیوست ہیں لیکن اس کی شاخیں دوسری جگہ لٹکا دی گئی ہیں اور ان کے پھل یہاں گر رہے ہیں۔ پھر ان پھلوں کو اس باغ میں لے جاتے ہیں کیونکہ جڑ اسی باغ کے اندر ہے اور اگر برعکس ہو، تو کتنی ہی

تسبیح تہلیل کر و اس کی جڑ ہمارے اسی عالم میں ہے لہذا اس کے تمام میووں اور پھلوں کو اسی عالم میں کھینچ لاتے ہیں۔ لیکن اگر جڑ اور پھل دونوں اسی باغ روحانی میں ہوں تو کیا کہنا۔ نقشہ نور علیٰ نور کا ہوگا۔

فصل

شیخ سے دوستی اور اس کا انداز

اکمل الدین نے کہا کہ میں مولاناؒ کا عاشق اور ان کے دیدار کا آرزومند ہوں اور اس منزل پر ہوں کہ اپنی آخرت سے بھی بے خبر ہوں۔ میں مولاناؒ کے نقش کو تصور میں بغیر کسی اندیشے اور مقصد کے مشاہدہ کرتا رہتا ہوں۔ اور اس سے مجھے سکون حاصل ہوتا ہے اور میں ان کے جمال سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ ان کی عین صورت میرے سامنے ہوتی ہے یا ان کا خیال پیش نظر رہتا ہے۔ یہ سنکر مولاناؒ نے فرمایا اگر ان کو آخرت کا خیال بھی نہیں آتا تو کیا ہوا کہ آخرت اور حق دونوں ان کے قلب و تصور میں اسی دوستی کے باعث مضمر و پوشیدہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک رقاصہ نے خلیفہ کے سامنے چہارتارہ بجایا خلیفہ نے اس سے کہا کہ واہ واہ تیرے ہاتھوں میں کیا ہی خوب فن ہے۔ رقاصہ نے جواب میں کہا ہاتھوں میں نہیں میرے پاؤں میں یہ فن ہے، میرے ہاتھوں میں جو کیفیت نظر آتی ہیں وہ اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے جو میرے پیروں میں پوشیدہ ہے۔ رقاصہ کی بات سن کر مولانا نے فرمایا اگر مرید کو آخرت کی تفصیلات یاد نہیں آتیں مگر ان کی لذتیں شیخ کے دیدار میں اور فراق شیخ کے خوف میں سب موجود ہیں، جیسے کوئی شخص

اپنے بیٹے یا بھائی کو نوازتا ہے اور محبوب رکھتا ہے اگرچہ یہ بُنُوَّت (بیٹا ہونے) اور اُخوّت (بھائی ہونے) کی وجہ سے ہے مگر امید وفا اس کا مہر و کرم اور عاقبت کار اور باقی منفعتیں جو اپنوں سے اپنوں کو متوقع ہوتی ہیں کچھ بھی دل میں نہیں آتیں لیکن یہ تمام تفصیلات اس کی مہربانی میں مضمر ہوتی ہیں اسی طرح جیسے ہوا لکڑی میں پنہاں اور مضمر ہوتی ہے خواہ یہ لکڑی خاک میں پڑی ہو یا پانی میں۔ اگر اس میں یہ ہوا پنہاں نہ ہوتی تو آگ کا اس سے کچھ رابطہ اور تعلق نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ہوا ہی آگ کا کھاجا اور چارہ ہے اور اسی سے آگ کی زندگی ہے (جہاں ہوا نہ ہوگی وہاں آگ نہ ہوگی) اور یہ ہوا اس میں مضمر و پنہاں ہے۔ دیکھ لو کہ آگ پھونک مارنے سے دہک اُٹھتی ہے! اسی طرح لکڑی خواہ پانی میں ہو یا خاک اور مٹی میں ہو ہوا اس میں پنہاں اور پوشیدہ ہے اگر یہ ہوا اس میں پوشیدہ نہ ہوتی تو وہ سطح آب پر ابھر کر کس طرح آتی۔

یہی کچھ صورت حال گفتگو کی ہے۔ گفتگو اور کلام کے لوازم بہت ہیں جیسے عقل و دماغ۔ لب و دہن، کام و زبان غرض تمام اعضائے بدن اور ارکان یعنی عناصر اربعہ (آب و باد، آتش و خاک) طبائع، افلاک اور لاکھوں اسباب ہیں جن سے یہ عالم قائم ہے۔ پھر عالم صفات ہے اس کے بعد عالم ذات ہے۔ یہ لاکھوں اسباب اور یہ تمام معانی اس گفتگو میں پنہاں ہیں مگر ظاہر نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے۔

انسان دن میں پانچ چھ مرتبہ (کم از کم) نامرادی کا منہ دیکھتا ہے۔ جو قطعی اس کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق "کسی" اور "سے ہے اور

وہ اسی اونٹ کے قبضہ میں ہے اور وہ "اونٹ" اس کا نگہبان ہے۔ پس وہی یہ نامرادی اور نادروا افعال اس سے صادر کراتا ہے اگر وہ نگراں نہ ہوتا تو یہ افعال ظہور میں کس طرح آتے (وہی جو انسان پر نگراں اور مراقب ہے اس سے ان ناپسندیدہ افعال کا صدور کراتا ہے) اب انسان کو دیکھو اس بے مرادی ونامرادی کے باوصف اس کی طبیعت اس کا اقرار نہیں کرتی۔ اور وہ اس بات پر مطمئن نہیں ہوتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں (کسی کے حکم کے تحت ہوں)۔

"خلق اللّٰہ آدم علےٰ صورتہٖ" اس پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کے اندر صفت الوہیت بھی جو صفت عبودیت کی ضد ہے عاریتاً رکھی گئی ہے۔ جو ہر وقت اس کی (نافرمانی) پر اس کی سرکوبی کرتی رہتی ہے لیکن انسان (اس پر بھی) سرکشی کو ترک نہیں کرتا۔ اور بہت جلد اپنی ان ناکامیوں کو بھول جاتا ہے اور اس کو اس سرزنش سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا اس وقت تک جبکہ اس وصف مستعار کو اس کی ملکیت نہ بنادیا جائے وہ اس سرکوبی سے نجات نہیں پاتا۔

قصہ ل

عقدہ کشائی

ایک عارف نے کہا کہ میں ایک گلخن (تنور) کی طرف گیا تاکہ اپنے قلب کی خلش کو دور کروں اور یہ جگہ بعض اولیاء کا مرجع رہا ہے (انقباض کے عالم میں اولیاء کی پسندیدہ جگہ جاکر کشود کار اور بسط و انبساط ہوتا تھا) میں نے دیکھا کہ گلخن کے مالک کا ایک ملازم ہے جو بڑی مستعدی پھرتی کے ساتھ کام میں مشغول ہے۔ ہر کام کو جلدی جلدی نمٹا رہا تھا

ادھر مالک بھی اس کی حوصلہ افزائی کرکے اس سے کام لے رہا تھا۔ اس نے ملازم کے احساس ادائے خدمت کو دیکھ کر کہا کہ اگر تم اسی طرح چستی چالاکی اور ادب کا مظاہرہ کرتے رہے اور تم نے خود کو بڑی جگہ کا اہل ثابت کر دیا تو اپنی یہ جگہ تم کو دیدوں گا! اس کی یہ بات سن کر مجھے ہنسی آگئی اور میرے قلب کا وہ عقدہ کھل گیا (حالت بسط پیدا ہوگئی) اور یہ بات صاف ہوگئی کہ اس دنیا کے امراء و روٴسا کا طریق کار یہی رہا ہے کہ وہ اپنے ملازموں کی اسی طرح حوصلہ افزائی کرکے ان سے کام لیتے ہیں۔ (بس مجھے بھی اطاعتِ الٰہی میں اسی طرح مستعدی اور چستی کا اظہار کرنا چاہیئے (اور یہی وہ راز تھا جس نے مجھ پر انقباض طاری کر دیا تھا۔)۔

فصل

لاتدرکہ الابصار

کسی شخص نے عرض کیا کہ فلاں منجم یہ کہہ رہا تھا کہ یہ آسمان اور یہ کرۂ خاکی جو ہمیں نظر آرہے ہیں ان کے آگے کچھ (نزد ما) تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے وراء بھی کچھ موجود ہے لیکن میرے مشاہدہ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ اگر کچھ ہے تو دکھاؤ کہاں ہے؟

آپ نے فرمایا کہ سوال تو شروع ہی سے غلط ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ تم یہ کہتے ہو کہ (جو وراء آسمان ہے اس کو) دکھلاؤ کہاں ہے۔ حالانکہ اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب تم خود ذرا یہ بتاؤ کہ تمہارا اعتراض کہاں سے ہے اور کس جگہ ہے؟ ؟ زبان میں ہے ؟ منہ میں ہے ؟ سینہ میں ہے ؟ ان تمام کو ذرّہ ذرّہ اور ریت ریت کر ڈالو لیکن اس اعتراض اور اندیشہ کو کہیں نہ پاؤ گے۔ لہٰذا ہم نے جان لیا کہ تمہارے اندیشہ کا کوئی مقام اور جگہ نہیں ہے۔ جب تمہیں اپنے اندیشہ کی بابت ہی کچھ نہیں معلوم تو خالق اندیشہ

کو کس طرح جان سکتے ہو۔ یہ جو ہزاروں خیالات و احوال تم پر وارد ہوتے ہیں تمہارے قابو اور اختیار میں نہیں ہیں اور نہ وہ تمہارے محکوم ہیں اور نہ ان پر تم کو قدرت حاصل ہے۔ اگر تم ان کے مطالع اور منابع سے آگاہ ہو جاتے اور جان لیتے کہ یہ کہاں سے آتے ہیں تو تم ان میں اضافہ کر سکتے تھے (وہاں تک پہونچ جاتے)۔ حالانکہ یہ تمام افکار و احوال تم پر چھائے ہوئے ہیں۔ لیکن تم کو یہ خبر نہیں ہے کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور یہ کیا کریں گے۔ پس جب تم اپنے احوال کے جاننے ہی سے عاجز ہو تو پھر تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ تم اپنے خالق سے مطلع ہو سکو (کہ وہ کہاں ہے؟) بد کردار عورتوں کے دلال! تو مجھ سے کہتا ہے کہ وہ آسمان میں نہیں ہے۔ اے سگ دنیا تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ آسمان میں نہیں ارے کیا تو نے آسمان کا چپہ چپہ چھان ڈالا ہے اور اب وہاں سے (سیر افلاک سے) واپس آکر کہتا ہے کہ خدا وہاں موجود نہیں ہے: اے نادان تیرے گھر میں جو کچھ ــــــ موجود ہے تجھے تو اس کی بھی خبر نہیں ہے تو پھر تو اس کو آسمان میں کیسے جان سکتا ہے؟۔ بس تو نے تو آسمان کا نام سن لیا ہے ستاروں اور افلاک کے بارے میں سنا ہے اور ان ہی کے بارے میں کچھ کہہ دیتا ہے اگر تو آسمان سے آگاہ ہوتا اور آسمان کی طرف گیا ہوتا یا اس سے اوپر گزرا ہوتا تو تو اس طرح کی ہرزہ سرائی نہ کرتا۔ جو کہا جاتا ہے کہ خدا آسمان پر نہیں ہے اس سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ آسمان پر نہیں ہے بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ آسمان اس پر محیط نہیں ہے بلکہ وہ آسمان کو محیط ہے اس کا تعلق آسمان سے بیچون و چگونہ کے ہے اور یہ بالکل ایسی ہے جس طرح تجھ سے اس کا تعلق، اس کا رشتہ، اس کا ربط

"بیچون وچگونہ" کے ہے۔ یہ سب کچھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہ تمام اسی کے مظاہر ہیں اور اسی کے زیر تصرّف بھی ہیں پس وہ آسمان اور اکوان سے باہر نہیں ہے لیکن کلیتہً ان آسمان و اکوان کے اندر بھی نہیں ہے یہ اکوان و آسمان اس کو محیط نہیں ہیں بلکہ وہ ان تمام پر محیط ہے (ان اکوان و آسمان کو احاطہ کئے ہوئے ہے)۔

اس تشریح و توضیح کے اثنا میں ایک شخص نے سوال کیا کہ جب آسمان و زمین اور عرش و کرسی نہیں تھے تو بہت تعجب کی بات ہے کہ خدا کہاں تھا؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ یہ سوال تو ابتداء ہی سے فاسد ہے خدا اس کو نہیں کہتے کہ جس کی کوئی جگہ یا مقام ہو اور تم یہ جو دریافت کرتے ہو کہ ان تمام مکونات (عرش و کرسی وغیرہ) سے پہلے وہ کہاں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری تمام چیزیں (احوال و کوائف) بھی مقام نہیں رکھتیں۔ یہ چیزیں یعنی روح جو تمہارے اندر ہے اس کے مقام کا بھی تم کو علم نہیں ہے کہ وہ کس جگہ ہے پھر تم اس خالق کا مقام کیوں پوچھتے ہو کہ وہ تو مطلق "[illegible]" ہے (اس کی کوئی مخصوص جگہ نہیں ہے)۔ غور کرو کہ تمہارے اندیشوں اور خیالات کی جگہ کا بھی تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مقام اور جگہ کہاں ہے کیا تم خالقِ اندیشہ کو اندیشہ سے زیادہ لطیف خیال نہیں کرتے؟۔ سامنے کی مثال لے لو کہ معمار جس نے گھر بنایا ہے وہ گھر سے زیادہ لطیف ہوگا اس لیئے کہ گھر کی تعمیر میں اس نے سیکڑوں تدبیریں اور کام یکے بعد دیگرے انجام دیئے تب یہ گھر بن سکا۔ پس وہ اس مکان سے زیادہ لطیف ہوا لیکن وہ "لطافت" نظر میں نہیں آتی (امّا آں لطف در نظر نمی آید) وہ صرف اسی عملی گھر کے واسطہ سے نظر آسکتا ہے جو عالم محسوسات میں موجود ہے

(کہ اس گھر کے معمار نے حسن تدابیر سے اس کی تعمیر کی ہے) اسی سے اس معمار کا لطف صنعت اپنا جمال دکھا رہا ہے۔ دیکھو یہ سانس جو موسم سرما میں نظر آتی ہے (بھاپ بن کر منہ سے نکلتی ہے) موسم گرما میں نظر نہیں آتی۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موسم گرما میں نفس منقطع ہو گیا (سانس کا وجود ہی نہیں رہا) بلکہ بات یہ ہے کہ زمستان کے مقابلہ میں تابستان زیادہ لطیف ہے۔ اس لئے اس میں نفس لطیف ظاہر نہیں ہوتا۔ برخلاف زمستان کے (کہ وہ کثیف ہے اس میں نفس لطیف نظر آجاتا ہے)۔ اسی طرح تمہارے اوصاف (باطنی (اوصاف معانی) چونکہ لطیف ہیں اس لئے وہ نظر نہیں آتے صرف کسی فعل کے واسطہ ہی سے ان کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً حلم تمہارے اندر موجود ہے لیکن وہ نظر نہیں آتا۔ لیکن جب تم کسی خطا کار کو معاف کر دیتے ہو تو اس وقت تمہارا حلم محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح اور دوسری صفات کا حال ہے۔ حق تعالیٰ تو ان تمام لطیف معانی و صفات سے زیادہ لطیف ہے پس وہ اسی انتہائی لطافت کے باعث نظر نہیں آتا۔ مگر اس نے زمین و آسمان کو پیدا فرما دیا تاکہ اس کی قدرت و صفت تم کو نظر آجائے جیسا کہ ارشاد فرمایا" افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینٰھا (ق) کیا دیکھا نہیں آسمان کی طرف اپنے اوپر کہ ہم نے اسے کیسا بنایا ہے"

میری گفتگو اختیاری نہیں ہے

مولانا فرماتے ہیں کہ میری گفتگو اختیاری نہیں ہے اس لئے مجھے افسوس ہے اور میں تو چاہتا ہوں کہ دوستوں کو نصیحت کر دوں مگر میری گفتگو میری مطیع نہیں جس کا مجھے افسوس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میرے لئے ایک پہلو مسرت کا بھی ہے کہ میری گفتگو کو مجھ پر تفوق حاصل ہے اس کو مجھ پر

بالادستی حاصل ہے اور میں اس کا زیر دست اور محکوم ہوں اور یہی میرے لئے مسرت کا موجب ہے! اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جو بات حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے وہ بات جہاں بھی جاتی ہے زندگی بخش اور اثر آفریں ہوتی ہے۔ " وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ"۔ (انفال ع۲) (اور جب آپ نے تیر چلایا تو وہ عمل آپ کا نہ تھا وہ عمل تو اللہ تعالیٰ کا تھا) جو تیر خالق کائنات کی کمان سے نکلتا ہے اس کو نہ تو سپر روک سکتی ہے اور نہ جوشن (جنگی بازو بند)۔ پس میں اسی وجہ سے مسرور و شاداں ہوں کہ میرا کلام مجھ پر قادر ہے اور میں اس کا محکوم ہوں۔

انسان میں اگر صرف علم ہی علم ہوتا اور جہالت نہ ہوتی تو انسان جل بھن کر خاک ہو جاتا اور اس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔ لہٰذا جہل بھی علم کے ساتھ مطلوب ہے کیونکہ انسانی بقا کا انحصار اسی پر ہے اور علم کی طلب کی وجہ یہ ہے کہ وہ معرفت باری کا ایک وسیلہ ہے اس طرح دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں۔ اور ان کی کیفیت کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ رات اگرچہ دن کی ضد ہے لیکن اس کی معاون بھی ہے اور یہ دونوں ایک ہی عمل کرتے ہیں۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی تو کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ہمیشہ دن رہتا تو آنکھیں دماغ اعضائے جسمانی خیرہ اور بے چین ہو جاتے۔ اس لئے رات میں آرام کرتے ہیں تاکہ تمام اعضاء دماغ، فکر، سماعت و بصارت قوت حاصل کریں اور دن میں اس قوت کو صرف کریں۔

ہماری اور فلسفی کی سوچ کا انداز

تمام اضداد ہمیں ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں لیکن حکمت والے کی نسبت

سے دیکھو سب ایک ہی کام میں مشغول ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔
اس کو اس طرح سمجھو کہ دنیا میں ہمیں وہ برائی دکھاؤ جس کی تہہ میں کوئی نیکی نہ
ہو۔ اور وہ کونسی نیکی ہے جس کے ساتھ بدی نہیں ہے۔ اس کی مثال یہ ہے
کہ ایک شخص کسی کو قتل کرنے کے ارادہ سے چلا، راستہ میں ایک عورت
مل گئی جس کے ساتھ وہ زنا کے ارتکاب میں مشغول ہو گیا۔ اور اس مشغولیت
کی وجہ سے وہ ارتکاب قتل سے باز رہا۔ اس طرح زنا اگرچہ قبیح فعل ہے لیکن اس
کی وجہ سے وہ شخص اس سے زیادہ ایک بڑے عمل سے بچ گیا۔ اس لئے یہ زنا اس
کے حق میں بہتر ثابت ہوا کہ اس فعل نے اس شخص کو ارتکاب قتل سے روک دیا۔

اسی طرح بدی اور نیکی ایک ہی چیز ہیں جن کو جدا نہیں کیا جا سکتا! اسی
لئے ہم مجوسیوں سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ خدا
ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ایک خالق خیر (یزدان) اور دوسرا خالق شر (اہرمن)
اب مجوسیوں سے سوال یہ ہے کہ ہم کو کوئی چیز دکھاؤ جس میں شر نہ ہو یعنی خیر محض
تاکہ ہم اس بات پر یقین کر لیں کہ خالق خیر اور ہے اور خالق شر اور۔ مگر یہ محال و
ناممکن ہے کیونکہ خیر، شر سے جدا نہیں ہے۔ جب یہ دونوں ایک دوسرے سے
جدا نہیں ہیں تو (پھر ان کے عقیدہ کے مطابق) دو خالق کس طرح ہوئے۔
ہم اصرار نہیں کرتے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں، اسی پر یقین کر لو لیکن
کم سے کم اتنا گمان تو تمہارے دل میں ضرور پیدا ہوگا کہ ہو سکتا ہے۔ ایسا
ہی ہو جیسا کہ یہ کہتے ہیں۔ مان لیا کہ یقین تم کو نہیں ہوا کہ ایسا ہی ہے
لیکن یہی بتاؤ کہ اس کا یقین تمہیں کس طرح ہو گیا کہ ایسا نہیں ہے؟
(جیسا ہم کہہ رہے ہیں)
اللہ تعالیٰ تو یوں فرماتا ہے کہ ارے کافرو ، الا یظن اولٓئک انہم مبعوثون

لیوم عظیم (کیا یہ خیال بھی ان لوگوں کو نہیں آتا کہ قیامت کے بڑے سخت دن یہ لوگ پھر اٹھائے جائیں گے) یعنی یہ گمان بھی ان کے اندر نہ ابھرا کہ ہم نے جو یہ تمام وعدے کئے ہیں، ممکن ہے یہ سب ہو کر رہیں تو انکار کرنے والوں کا مواخذہ اسی بات پر ہوگا کہ آخر احتیاط نہیں کی اور ہمارے طالب کیوں نہ ہوئے۔
یہاں ظنیت کا اظہار نہیں ہو رہا ہے بلکہ یہ وعدہ ہے جو ہم نے کیا ہے. کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر اس کا اطلاق درست ہو اور بس اور کافروں سے مواخذہ اس بات پر ہوگا کہ تمہارے گمان میں بھی یہ نہ آیا اور تم نے احتیاط نہ کی اور ہماری طلب میں سرگرداں نہ ہوئے (قیامت کے مواخذہ کا خیال کر کے ہماری طلب میں سرگرداں نہ ہوئے)۔

فصل

حضرت صدّیق اکبرؓ کی فضیلت کا باعث

"مَافضل ابی بکر بکثرۃ صلوٰۃ وصوم وصدقۃ بل وُقِرَ بمافی قلبہ" حضرت ابوبکر صدّیق کو فضیلت ان کی کثرت عبادت، نماز، روزہ، صدقات کی وجہ سے حاصل نہیں تھی بلکہ ان کے قلب میں جو محبت کا جذبہ موجزن تھا یہ اس کی وجہ سے ہے۔

حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کو دوسرے اصحاب کرام پر فضیلت نماز، روزہ کی کثرت (وفور عبادات) کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ سرورِ کونین صلّی اللہ علیہ وسلم کی اس عنایت اور نوازش کے باعث تھی جو ان کے شاملِ حال تھی قیامت کے دن جب نماز، روزے اور صدقات کو میزان میں رکھا جائیگا (تو یہ سب میزانِ عمل کے پلڑے میں سما جائیں گے)۔ لیکن جب ان کی محبّت کو وزن کے لئے لایا جایا جائیگا تو محبت میزانِ عمل کے پلّے میں

نہیں سما سکے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل عمل محبت ہے۔ تم اپنے اندر اگر اس جذبۂ محبت کو پاؤ تو اس کو بڑھانے کی کوشش کرو تاکہ اس میں اضافہ ہو۔ اسی طرح تم اپنے پاس کے سرمایہ کو دیکھو (جس سے مراد طلب ہے) تو اس سرمایۂ طلب کو بڑھاؤ کہ حرکت میں برکت ہے۔ اگر تم اس کو بڑھانے کی کوشش نہیں کروگے تو اس سرمایہ کو ضائع کر دو گے (یہ تمہارے پاس سے چلا جائیگا)۔ غور کرو! کیا تم زمین سے بھی گئے گذرے ہو؟ زمین پر ہل چلانے سے اس کی حیثیت اور ہو جاتی ہے اور اس سے نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر اس کو بغیر گوڑے چھوڑ دیا جاتا ہے تو پھر وہ سخت ہو جاتی ہے (اس کی صلاحیت روئیدگی ختم ہو جاتی ہے)
جب تم اپنی ذات میں طلب کا جذبہ دیکھتے ہو تو آمد و رفت جاری رکھو اور یہ نہ کہو کہ اس آنے جانے سے کیا فائدہ؟ تم اپنا کام جاری رکھو۔ یہ فائدہ خود بخود ظاہر ہو کر رہے گا۔ غور کرو کسی شخص کا کسی دوکان کی طرف جانا بغیر غرض کے نہیں ہوتا۔ اور اس میں کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ روزی عطا فرماتا ہے لیکن اگر کوئی شخص گھر میں بیٹھ رہے تو درحقیقت وہ استغنا کا دعویٰ کرتا ہے۔ روزی اتر کر نہیں آئے گی۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ ناداں بچہ روتا ہے تب ماں اس کو دودھ دیتی ہے۔ اگر اس کو یہ خیال ہو جائے کہ میرے اس رونے سے کیا فائدہ حالانکہ یہی اس کو دودھ ملنے کا باعث ہے تو پھر اس بچے کو دودھ نہیں ملے گا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اس رونے کے باعث دودھ ملتا

رکوع و سجود

اگر کوئی یہ سوچے کہ اس رکوع و سجود میں کیا فائدہ ہے کیوں کیا جائے؟ (تو اس کا جواب یہ ہے کہ)۔

جب تم کسی امیر و رئیس کی خدمت کرتے ہو اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر کے جھک جاتے ہو یا اس کے سامنے مؤدب ہو کر دوزانو بیٹھتے ہو تو تمہارے اس ادب

سے مُتاثر ہوکر وہ تم پر مہربانی کرتا ہے۔ نان و نعمت عطا فرماتا ہے۔ وہ چیز جو امیر کو مُتاثر کرتی ہے۔ اور اس کا جذبۂ رحم اُبھرتا ہے وہ امیر کا گوشت پوست تو نہیں ہے۔ مرنے کے بعد یا عالمِ خواب ہے ہوشی میں یہ گوشت پوست اپنی جگہ رہے گا لیکن تمہارے لئے اس گوشت پوست کی موجودگی بے فائدہ ہے کہ حالت خواب میں یا بعد مرگ وہ امیر اس طرح تم پر مہربانی نہیں کریگا! اس سے معلوم ہوا کہ امیر میں رحم کا جو جذبہ موجود ہے وہ نظر نہیں آتا۔ پس یہ ممکن ہے کہ گوشت و پوست کے پردے میں ہم اُس چیز کی خدمت کرتے ہیں۔ جو ہم کو نظر نہیں آتی تو گوشت و پوست

سے ہٹ کر بھی وہ چیز ممکن ہوسکتی ہے (جس کی خدمت کی جاسکتی ہے) یہی چیز جو گوشت و پوست میں ہے اگر یہ پنہاں نہ ہوتی تو محض گوشت و پوست کے اعتبار سے ابوجہل اور حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم برابر اور یکساں ہوتے اور ان دونوں کے درمیان کچھ فرق نہ ہوتا۔ یہ گوشت و پوست از روئے ظاہری، بہرے، اور سننے والے میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ (بہرا بھی گوشت و پوست رکھتا ہے اور شنوا بھی) لیکن جو شخص بہرا ہے اس کے اندر یہ شنوائی چھپی ہوئی ہے اور پنہاں ہے وہ ظہور میں نہیں آتی۔

پس اصل چیز وہ عنایت ہے جس کا ظہور ہوتا ہے۔ تیرے پاس دو غلام ہیں۔ ایک بہت خدمتگزار ہے۔ اس نے بہت خدمت کی ہے۔ جبکہ دوسرا کاہل اور کام چور ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ تیری توجہ خدمت گزار کے بجائے کام چور اور کاہل کی طرف زیادہ ہے۔ اگرچہ تو اس خدمت گزار کو ضائع کرنا نہیں چاہتا لیکن ایسا ہوجاتا ہے۔ پس عنایت پر حکم نہیں لگایا جاتا۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ داہنی اور بائیں

آنکھیں بظاہر تو آنکھیں ہیں اور یکساں ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ داہنی آنکھ نے کونسی ایسی خدمت کی ہے جو بائیں آنکھ نے نہیں کی ہے (داہنی آنکھ کو زیادہ شرف حاصل ہے بمقابلہ بائیں آنکھ کے)۔ اور ایسی ہی مثال روزِ جمعہ کی ہے جس کو ہفتہ کے دوسرے دنوں پر فضیلت حاصل ہے۔

ان للّٰہ ارزاقاً غیر ارزاق ، کتبت فی اللوح المحفوظ فیطلبھا فی یوم الجمعۃ - اللہ کے یہاں مقررہ رزق ہیں لیکن اس مقررہ رزق کے علاوہ اور بھی رزق ہیں جو لوحِ محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں انہیں جمعہ کے دن طلب کیا جاتا ہے۔

اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ جمعہ کے دن نے ایسا کونسا کارنامہ انجام دیا ہے جو دوسرے دن انجام نہ دے سکے۔ لیکن اس دن کے اوپر عنایت خاص ہے اور اُسے عزّ و شرف سے ہمکنار کیا گیا ہے۔

اگر نابینا یہ کہے کہ مجھے نابینا پیدا کیا گیا ہے اور میں معذور ہوں تو اس کے یہ کہنے سے کہ میں معذور ہوں اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اس کی نابینائی اس سے دور نہ ہوگی۔ وہ خوبصورتوں کی خوبصورتی اور دنیا کی رعنائی کو دیکھنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح نابینا اور لنگڑے کا کا یہ کہنا کہ ہم معذور ہیں اُن کے لئے فائدہ مند نہ ہوگا اور اس قولِ محض سے ان کی تکالیف دور نہ ہونگی۔

یادِ خدا یہ کافر جو کفر کی حالت میں ہیں جب ہم اُن کا جائزہ لیتے ہیں تو جس رنج و محن کی حالت میں نہیں پاتے ہیں۔ اس کو بھی ان کے حق میں عین عنایت سمجھتے ہیں کیونکہ وہ راحت و آرام میں خداوند کریم کو بھول گئے ہیں اور بعد میں یاد کریں گے۔ اسی طرح دوزخ کافروں کا معبد بن جائیگا۔ کیونکہ کافر اللہ تعالیٰ کو وہیں یاد کرینگے

یعنی جب تکلیف ہوتی ہے تو خدا یاد آ جاتا ہے اور غفلت کے پردے نظروں سے ہٹ جاتے ہیں اس وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے التجائیں کی جاتی ہیں نالے اور فریادیں ہوتی ہیں۔ اللہ کی وحدانیت کے اقرار ہوتے ہیں توبہ واستغفار کر کے اپنی عبدیت کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن جب یہ کیفیت اور مصیبت دور ہو جاتی ہے۔ دانت کا درد یا کوئی اور لائق مرض دور ہو جاتا ہے تو پھر نظروں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت یہ کہنے لگتا ہے کہ میں خدا کو نہیں پاتا وہ نظر نہیں آتا۔ کہاں دیکھوں اور کیا دیکھوں۔ آخر یہ کیسی بات ہے کہ مصیبت کے وقت تو اس کی ذات اس کو نظر آ گئی لیکن اب نظر نہیں آتی۔ جب تو رنج و محن کے عالم میں اسے دیکھتا ہے تو وہ رنج و محن کو تجھ پر مسلط کر دیتا ہے تاکہ تو ذکر الٰہی میں مشغول رہے! اس طرح تو دوزخی ہوا کیونکہ تو آرام و آسائش میں خدا سے غافل تھا اور یادِ الٰہی نہ کرتا تھا لیکن دوزخ میں ہمہ وقت مشغول بہ ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ساری کائنات میں اچھوں اور بُروں کو صرف اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ اس کو یاد کریں اس کی بندگی و عبادت کریں، اس کی تسبیح و تقدیس کرنے والے بن جائیں اگر کافر عیش و آرام میں ذکرِ الٰہی نہیں کرتے حالانکہ پیدائش کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے۔ تو اس کا مداوا یہی ہے کہ انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے تاکہ وہاں تو ذکر کرتے رہیں۔ اور ذاکر بن جائیں۔ لیکن مومنوں کو اس تکلیف کے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے! اس لیئے کہ وہ اس آرام میں بھی اس تکلیف سے غافل نہیں ہیں اور اس تکلیف کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں جس طرح ایک عقلمند لڑکے کا پیر اگر گڑھے میں پڑ جائے تو آئندہ وہ احتیاط کے ساتھ چلتا ہے لیکن احمق وکو دن کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس کو ہر لحظہ تکلیف واذیت درکار

ہے ۔ اسی طرح چالاک گھوڑا ایک ہی بار ایڑ کی اور چابک کی ضرورت محسوس کرتا ہے اس کو دوسری مرتبہ چابک مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن نالائق گھوڑے کو ہر وقت چابک کی ضرورت ہوتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا گھوڑا انسانی سواری کے لائق ہوتا ہی نہیں اس پر تو گو بر ہی لادا جاتا ہے

فصل

سماعت و مشاہدہ

مسلسل کسی بات کا سننا بھی بمنزلہ مشاہدہ کے ہوتا ہے اور اس پر مشاہدہ کا حکم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ بات کہ تم فلاں شخص کی اولاد ہو اور تمہارے ماں باپ فلاں ہیں حالانکہ تم نے اس حقیقت کو بچشم خود نہیں دیکھا ہے لیکن سب سے سنتے رہنے کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم فلاں کی اولاد نہیں ہو تو تم اس کو تسلیم نہیں کرو گے۔ اسی طرح بغداد اور مکہ کے بارے میں دنیا سے بہت کچھ سن رکھا ہے حالانکہ ان شہروں کو دیکھا نہیں ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے اور قسمیں بھی کھائے کہ مکہ و بغداد کا کوئی وجود نہیں ہے تو تم یقین نہیں کرو گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بات کا مسلسل سنتے رہنا بھی اس کو دیکھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جیسا کہ ظاہری طور پر مسلسل اور علی التواتر سننے والی کسی بات کو مشاہدہ کی طرح مان لیتے ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ ایک شخص کی ایک ہی بات تواتر کا حکم رکھتی ہو۔ اب یہ بات اس کی تنہا نہ ہو گی بلکہ ایک لاکھ لوگوں کی بات کے برابر ہو گی۔ اس طرح اس کی ایک بات سو ہزار یا ایک لاکھ کی باتیں ہونگی۔ کیا یہ بات تمہیں تعجب خیز معلوم ہوتی ہے۔ دیکھ لو دنیاوی بادشاہ اگرچہ انفرادی حیثیت میں ایک ہی ہوتا ہے لیکن اس کا حکم ایک لاکھ کی برابری کرتا ہے کیونکہ اس

کے مقابلہ پر اگر ایک لاکھ بھی کچھ کہیں تو وہ قولی اور وہ حیثیت نہ رکھے گا جو اس یکہ و تنہا کے کہنے میں ہے۔ جب عالم ظاہر میں یہ کیفیت ہے تو عالم ارواح میں ایسا بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اس کو یوں سمجھو کہ تم نے ساری دنیا کی سیر کر ڈالی لیکن اس میں تمہاری غرض خدا کیلئے نہ تھی، نہ یہ سیر اس تعمیلِ ارشاد میں تھی کہ " قل سیروا فی الارض " (انعام ع ۲) اے نبی آپ ان سے فرما دیں کہ زمین کی (عبرت کے لئے) سیر کرو"۔ پس اب تم کو اس قرآنی حکم کی تعمیل میں دوبارہ سیر کرنا ہوگی۔ اللہ پاک فرماتا ہے کہ ماضی میں تمہاری سیر میرے لئے نہ تھی بلکہ لہسن اور پیاز (یعنی دنیاوی منفعت) کے لئے تھی۔ ان اشیاء کی طلب تمہارے لئے حجاب بنی ہوئی تھی۔ اس نے تمہیں مجھے دیکھنے کے لئے چھوڑا ہی نہیں۔ اور یہ بات یوں سمجھو کہ تم بازار میں کسی شخص کو تلاش کر رہے ہو تو پھر تم کسی اور کو نہیں دیکھتے اور اگر لوگوں کو دیکھتے بھی ہو تو ایسے جیسے خیالات سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تم کتاب میں کوئی مسئلہ دیکھنا چاہتے ہو تو تمہاری نظر میں وہ مسئلہ پھر رہا ہے اور کان بھی اس مسئلہ سے بھرے ہوئے ہیں تمہاری توجہ کتاب میں اس مسئلہ کی جانب مرکوز ہے۔ اس کتاب میں صرف اسی مسئلہ کی تلاش کروگے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب کسی کا مقصد متعین ہو تو طبیعت اسی جانب مرکوز ہوتی ہے۔ دوسری طرف منتقل نہیں ہوتی۔ اسی طرح ماضی میں جو تم نے سیر کی وہ کسی اور مقصد کے لئے تھی اس لئے ذات باری (کی رضامندی کے حصول) کی جانب تمہاری توجہ منعطف نہیں ہوئی ہوگی۔ (یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ میں سیر فی الارض کی تعمیل کر رہا ہوں)۔

پرورش اولاد میں ایک نکتہ

امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص عمر کی اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ خود کھا پی بھی نہیں سکتا تھا۔ نقاہت وکمزوری کا یہ عالم تھا کہ اس ضعیف العمر کی بیٹی اس کی پرورش بمنزلہ ماں کے کرتی تھی۔ امیر المومنین نے اس سعادت مند خاتون سے ارشاد فرمایا اس وقت جو حق باپ کا تم ادا کرتی ہو وہ کوئی بیٹا بھی ادا نہیں کر سکتا۔ خلیفۃ المسلمین کی بات سن کر اس خاتون نے جواب دیا، یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن میری اس نگہداشت میں اور میرے والد کی نگہداشت میں جو انہوں نے بچپن کے دوران میری کی تھی ایک واضح فرق ہے اور وہ یہ کہ میری پرورش کے دوران باپ لرزاں ترساں رہتا تھا کہ مبادا مجھے کوئی تکلیف نہ پہونچ جائے اس کے برخلاف میں اپنے باپ کی خدمت تو کرتی ہوں لیکن اللہ تعالیٰ سے ان کی موت کی دعا بھی کرتی ہوں تاکہ ان کو اس اذیت سے نجات حاصل ہو جائے۔ میں اگرچہ اپنے والد کی خدمت گزاری کرتی ہوں لیکن وہ تڑپ اور گداز کہاں سے لاؤں جو وہ میری پرورش کے وقت رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ھذہ افقہ من عمرؓ" - یہ عورت تو عمرؓ سے بھی زیادہ صاحب فہم ہے۔ نقیہہ ہے۔

فقیہ کی تعریف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا۔ میں نے تو ظاہری حالات کے تحت تبصرہ کیا تھا لیکن تو نے بات کی تہ تک جاکر اس حقیقت کو واضح کر دیا۔ اور فقیہ وہی ہوتا ہے جو کسی بات کی تہ تک سے واقف ہو اور اس کی حقیقت سے

آگاہ ہو ۔ مگر یہاں مفہوم یہ نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ معاملات کی تہہ اور سر واسرار کی حقیقتوں سے آگاہ نہ تھے ۔

ہمارے شیخ نے فرمایا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حالت یہی تھی کہ اپنی نفس کشی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی حوصلہ افزائی اور تعریف و توصیف اکثر کیا کرتے تھے ۔

بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ مشاہدۂ حضوری کو برداشت کرنے کی ان میں قوت نہیں ہوتی۔ اسی بنا پر وہ مشاہدہ اور ہمہ دم کی حضوری سے دور رہ کر زیادہ مسرور اور خوش ہوتے ہیں جس طرح دن کی یہ تمام روشنی آفتاب ہی سے ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص تمام دن آفتاب ہی پر نظر رکھے تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتا ہے ۔ اور علاوہ ازیں اس کی نظریں بھی (ہر وقت آفتاب کو دیکھنے سے) خیرہ ہو جائیں گی پس اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ آفتاب کو دیکھنے کے بجائے کسی اور کام میں مشغول رہے ۔ اسی کا نام غیبت ہے کہ اس کی نظر آفتاب کے مشاہدہ میں مصروف نہیں رہی ۔ اسی طرح بیمار کے سامنے لذیذ کھانوں کا ذکر اس لئے بہتر ہوتا ہے کہ اس میں اشتہا پیدا ہو اور وہ کھا پی سکے (کھانے پینے کی قوت اس میں عود کر آئے) جبکہ اس کے سامنے یہ کھانے رکھ دینا نقصان کا موجب ہو گا ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ "طلب حق" میں لرزش اور عشق کی ضرورت ہے (خشوع اور طلب صادق) جس میں یہ لرزش موجود نہیں اس پر خدا ترسوں کی خدمت لازم ہے یہ شخص درخت کے تنے کی طرح ہے اور ظاہر ہے کہ تنہ پر کبھی میوہ اور پھل نہیں آتا ۔ پھل تو ان شاخوں پر لٹکتا ہے جو ہمیشہ لرزاں رہتی ہیں لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ تنا بیکار ہے ۔ وہ تنا ہی ہے جو شاخوں کو تقویت

دیتا ہے۔ اور خود ڈھلوں کی وجہ سے وہ (تنا) کلہاڑی کی ضربوں سے بھی محفوظ رہتا ہے لیکن جب تنہ میں کلہاڑی کی ضرب سے لرزش پیدا ہو تو اس کا سیدھا کھڑا رہنا مناسب اور اس کا نہ لرزنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ وہ لرزنے اور ہلنے والی شاخوں کی خدمت میں لگا ہوا ہے، یہ خدمت بھی تو ضروری ہے۔ پس ایسے لوگ ان حوادث سے محفوظ ہیں جن کا سامنا ارباب حال کو کرنا پڑتا ہے

اسی مجلس میں مولانائے روم کے مرید خاص معین الدین پروانہ کا ذکر آ گیا تو اس نام سے بھی مولانا نے ایک نکتہ پیدا فرمایا۔ فرمانے لگے: کہ اس معین الدین کو دیکھو کہ وہ عین الدین نہیں ہے بلکہ معین الدین یعنی دین کا مددگار ہے! اس میں عین پر جو "میم" کا اضافہ ہے وہی اس کے لئے نقصان کا باعث بن گیا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے "کمال پر اضافہ نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ جس طرح پانچ انگلیوں سے پنجہ پورا ہوتا ہے اگر کسی کے اس پنجہ میں ایک انگلی کا بھی اضافہ ہو گیا تو وہ اس کے لئے موجب نقصان ہے اس کا پنجہ بدنما معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو! "احد" میں کمال ہے اور "احمد" میں چونکہ میم کا اضافہ ہے اس لئے وہ اس کمال احد تک نہیں پہونچا ہے۔ جب یہ میم درمیان سے نکل جائے گا تو وہ بھی "کمال احد" بن جائے گا۔ حق کی ذات تمام عالم کو محیط ہے اب اگر اس میں کچھ اضافہ ہو گا تو وہ موجب نقصان ہو گا۔ جس طرح ایک (۱) کا عدد تمام اعداد کے ساتھ ہے! اسی طرح ذات حق بھی ہر ایک کے ساتھ ہے۔ اگر ان میں سے ایک (۱) کے عدد کو نکال لیا جائے تو پھر کسی "عدد" کا وجود باقی اور ممکن نہیں رہے گا۔

مثال اور بے مثال کی حقیقت

ایک مرتبہ سید برہان الدین مصروفِ گفتگو تھے کہ اثنائے گفتگو کسی بیوقوف نے بات کاٹ کر کہا کہ ہمیں تو آپ بے مثال باتیں بتائیں۔ سیّد صاحب نے جواب دیا کہ پہلے تم بے مثال بن کر آؤ تاکہ بے مثال باتیں سنو تم خود بھی تو اپنی مثال ہو۔ تم خود اصل نہیں ہو، یہ تمہارا وجود تو تمہارا سایہ ہے۔ جب کوئی مرتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص گزر گیا! اگر وہ اصل تھا تو کہاں گیا؟ اس سے معلوم ہوا کہ تمہارا ظاہر تمہارے باطن کی ایک مثال ہے۔ لیکن تمہارے اس ظاہر سے تمہارے باطن پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ جو چیز بھی نظر آتی ہے وہ غلیظ و کثیف ہے لطیف نہیں ہے۔ جیساکہ موسم سرما میں ظاہر ہوتا ہے کہ سانس موسم سرما کی غلاظت اور کثافت کی وجہ سے نظر آتی ہے مگر یہی سانس موسم گرما میں اس طرح نہیں ہوتی (سرما کی کثافت ختم ہو جاتی ہے)۔

نبی کی ذمہ داری

نبی پر یہ واجب ہے کہ وہ قوتِ حق کا اظہار کریں اور دعوت وارشاد سے عوام کو متنبہ اور متوجہ کریں۔ لیکن ان پر یہ واجب نہیں کہ وہ کسی شخص کو اس کے قبولِ حق کی استعداد تک پہونچائیں۔ کیونکہ وہ ان کا نہیں بلکہ ذاتِ باری کا کام ہے اور ذاتِ باری کی صفات میں قہر اور لطف دونوں شامل ہیں انبیاء ان دونوں صفات ربانی کے مظہر ہیں۔ مومن لطفِ حق کے اور کافر و منکر قہرِ حق کے

جو لوگ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر لیتے ہیں وہ خود کو انبیاء کی ذات میں مشاہدہ کرتے ہیں انہیں سے اپنی آواز سنتے ہیں اور ان کی ذات میں اپنی خوشبو پاتے ہیں۔ اور کوئی شخص اپنی ذات کا منکر نہیں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء اپنے امتیوں سے فرمایا کرتے تھے "تم ہم ہو اور ہم تم ہیں" ہمارے درمیان بیگانگی نہیں ہے یہی وجہ

ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہے تو اس سے کوئی دلیل طلب نہیں کرتا کیونکہ ہاتھ اس کے جسم سے پیوستہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اس سے دلیل طلب کی جاتی ہے کیونکہ بیٹا اس کے جسم کے ساتھ متصل نہیں ہے بلکہ اس کا جزو منفصل ہے یعنی علیحدہ اور جدا حیثیت کا حامل ہے

فصل

محبّت و خدمت میں فرق

بعض حضرات کا خیال ہے کہ محبت خدمت کا سبب ہے حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ محبوب کا اپنا میلان و رجحان مقتضیٔ خدمت ہوتا ہے۔ اگر محبوب یہ چاہتا ہے کہ محِب اس کی خدمت میں مشغول رہے تو محب اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا۔ لیکن اگر محبوب خدمت کا طالب نہ ہو تو ترکِ خدمت، محبّت کے منافی نہ ہو گی۔ اگر محب خدمت نہیں کرتا تب بھی محبت اس کے اندر خدمت گزار رہتی ہے۔ کیونکہ محبت اصل اور خدمت اس کی فرع ہے۔ اس کی مثال اس طرح سمجھیں کہ آستین میں جنبش اس کی اصلی نہیں ہوتی بلکہ آستین کی جنبش ہاتھ کے تابع ہے۔ لیکن یہ بات لازم اور ضروری نہیں کہ ہاتھ ہلے تو آستین بھی ہلے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص ڈھیلا ڈھالا جُبّہ پہن لیتا ہے اور اس میں ہاتھ ہلاتا ہے لیکن جبّہ کی آستین جنبش نہیں کرتی۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ جبّہ بغیر ہلائے ہل جائے۔ بعض لوگوں نے جُبّہ کو انسان سمجھ لیا ہے۔ یہاں یہ ہاتھ، پیر، آستین و موزہ دوسری ہی چیزیں ہیں دیکھو۔ بعض مواقع پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا زبردست

ہے۔ یا فلاں شخص کے ہاتھ وہاں تک پہونچ جاتے ہیں یا فلاں شخص کی بات موثر ہے۔ یہ بات قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہاں ان ہاتھ پیروں سے مراد یہ دست و پا نہیں ہیں (بلکہ قوت و قدرت ہے)۔

ذریعہ، واسطہ یا وسیلہ

فلاں امیر فلاں موقعہ پر آیا اور اس نے ہم سب کو جمع کیا اور خود چلا گیا جس طرح شہد کی مکھی موم اور شہد کو جمع کر کے خود چلی گئی۔ کیونکہ مکھی کا وجود تو شہد و موم کے اجتماع کے لئے شرط تھا اور اس کی بقا اس اجتماع کے لئے شرط نہیں ۔ اسی طرح ماں اور باپ بھی انہی شہد کی مکھیوں کی طرح ہیں جو طالب کو مطلوب کے ساتھ جمع کر دیتے ہیں اور پھر شہد کی یہ مکھیاں بھی شہد و موم کو جمع کر کے یکایک اڑ جاتی ہیں کیونکہ اللہ رب العلمین نے شہد و موم جمع کرنے کے لئے انہیں واسطہ اور ذریعہ بنایا ہے چنانچہ یہ مکھیاں اڑ جاتی ہیں لیکن باغ میں موم و شہد باقی رہ جاتے ہیں۔ موم اور شہد باغ سے خود باہر نہیں جاتے اور (کائنات) یہ ایسا باغ نہیں ہے جس سے باہر جانا ممکن ہو سکے۔ البتہ ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں منتقل ہونا ممکن ہو سکتا ہے

ہمارا جسم شہد کے چھتے کی طرح ہے جس میں عشق حق کا موم اور شہد جمع ہے اور شہد کی مکھیاں ہمارے ماں اور باپ ہیں۔ اگرچہ واسطہ ہیں مگر باغبان ہی ہماری تربیت کرتا ہے۔ چھتہ کے لئے جگہ باغبان ہی بناتا ہے۔ ان شہد کی مکھیوں کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور ہی صورت عطا کی ہے۔ جس وقت یہ مصروف کار ہوتی ہیں ان کا لباس کام کے مطابق اور ہی ہوتا ہے لیکن جب اس عالم میں جاتی ہیں تو لباس تبدیل کرتی ہیں کیونکہ وہاں ان کو کوئی اور ہی کام کرنا ہوتا ہے لیکن شخصیت وہی رہتی ہے جو پہلے تھی (یعنی تبدیلیٔ لباس

سے شخصیت تبدیل نہیں ہوتی)۔

رزم و بزم کا لباس

ایک شخص جب رزم گاہ میں جاتا ہے تو جسم کو اسلحہ سے سجاتا ہے۔ سر پر خود رکھتا ہے۔ اور جنگ کے لئے پوری تیاری کرتا ہے۔ لیکن جب وہ کسی بزم میں جاتا ہے تو اس کے جسم پر دوسرا ہی لباس ہوتا ہے! اسی طرح وہ دوسرے مواقع پر بھی وہ موقع کی مناسبت سے لباس زیب تن کرتا ہے۔ کیونکہ ہر موقع پر اس کو مناسب موقع کام انجام دینا پڑتا ہے۔ ان حالات میں شخصیت ایک ہی رہتی ہے جس کو تم پہلے کسی اور لباس میں دیکھ چکے ہو مگر اس کے نقوش ذہن میں اس طرح مرتسم ہوتے ہیں کہ جب تم اس کو یاد کرو گے تو وہ اسی شکل میں تمہارے فہم میں موجود ہو گا۔ خواہ اس نے سو لباس بدلے ہوں۔

ایک شخص کی ایک جگہ اگر انگوٹھی گم ہو جاتی ہے اور اس کو کوئی وہاں سے اٹھا کر بھی لے گیا ہو لیکن وہ شخص اس کو وہیں تلاش کرتا ہے جہاں انگوٹھی کھوئی تھی۔ اور کہتا ہے کہ انگوٹھی میں نے اسی جگہ کھوئی تھی۔ جس طرح تعزیت کرنے والا مردہ کی قبر کے گرد گھومتا ہے! اسی طرح انگوٹھی کھونے والا بھی اسی جگہ گھومتا رہتا ہے اور تلاش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری انگوٹھی یہیں کھوئی تھی۔ لیکن اس کو خبر نہیں کہ وہاں انگوٹھی کو کب رہنے دیا گیا اور کوئی اٹھا کر اسے لے بھی گیا۔

مظاہرۂ قدرتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ بڑا ہی صنّاع ہے۔ اس نے اپنی صنعتوں سے اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے۔ کہ دو دن کے لئے روح کو جسم کے ساتھ مربوط کر کے اپنی حکمت کا اظہار فرمایا اگر انسان زندہ حالت میں تھوڑی دیر کے

لئے بھی قبر میں بیٹھے تو ڈر یہ ہے کہ وہ دیوانہ ہو جائے حقا
سوچنے کی بات یہ ہے کہ زندگی کی حالت میں کوشش کے باوجود وہ
کب تک قبر میں رہ سکے گا۔؟ اللہ تعالیٰ نے دلوں میں خشیت
پیدا کرنے اور ہول اور خوف کو تازہ رکھنے کے لئے ایک نشان
بنا دیا ہے (یہ نشان قبر ہے) تاکہ لوگ اس قبر کی وحشت اور خاک
تیرہ کو دیکھ کر ڈریں۔ جس طرح منزل کی جانب رواں دواں کارواں کو
راستہ میں اگر کہیں لوٹ لیا جاتا ہے تو اُس مقام پر نشان کے طور پر دو
بڑے بڑے پتھر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ ظاہر ہو جائے کہ یہ مقام بہت
پُرخطر ہے۔ بس اسی طرح یہ قبریں بھی نشان ہیں تاکہ محل خطر کو محسوس کر لیا
جائے (ان نشانات سے مقام پُرخطر کا اندازہ ہو جائے)۔ دیکھنے والوں
میں یہ خوف جس طرح اثر کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ظاہر بھی ہو اور عمل
میں بھی آئے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تم سے کہے کہ فلاں شخص تم سے بہت ڈرتا ہے
تو بغیر اس بات کے کہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہو جس سے یہ بات ثابت
ہو، تم اس شخص سے مہربانی اور لطف و مدارات کا اظہار کرنے لگتے ہو اور اگر اس کے
برعکس یہ بات کہی جائے کہ فلاں شخص کی نظر میں تو تمہارا وقار اور اہمیت
کچھ بھی نہیں ہے تو یہ بات سنتے ہی تمہارے دل میں اس کی طرف سے غیظ و غضب
پیدا ہو جاتا ہے

تبدّل احوال

ایک حال سے دوسرے حال تک پہونچنا۔ (یعنی تغیر حال جس کو دو پاؤں کہا گیا ہے) خوف
ہی کا نتیجہ ہے۔ تمام عالم بھاگ دوڑ اور انقلاب حال کا شکار ہے لیکن یہ
انقلاب حال ہر ایک کے مناسب حال ہوتا ہے! انسان میں اس کی نوعیت

دوسری ہے نباتات میں اس کی صورت کچھ اور ہی ہے۔ اور رُوح کے اندر کچھ اور ہی رنگ ہے۔ یہاں نہ نشان ہے نہ قدم ہے نہ رفتار ہے) انگور خام (نا پختہ انگور) کو دیکھو کہ کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد پختگی کے حال تک پہونچتا ہے۔ بس جونہی میٹھا ہوا اس مرتبہ پر پہونچ گیا لیکن اس کا یہ تغیر حال نظر نہیں آتا۔ یہ کیفیت حسی نہیں ہے البتہ جب وہ اس مقام پختگی تک پہونچ جاتا ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے بہت سی منازل طے کی ہیں۔ جس طرح کوئی شخص پانی (دریا) کے اندر ہی اندر دور تک چلا جائے تو کوئی بھی شخص اس کی رفتار و روانی کو نہیں دیکھ سکے گا لیکن جیسے ہی وہ پانی سے اپنے سر کو باہر نکالتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہونچا ہے۔ (یہی صورت حال اس کے تغیر احوال کی ہے)۔

فصل

دوست کا دیدار

دوستوں کے دلوں کیلئے بہت سے درد موجب اذیت بنتے ہیں جو ہر پرہیز و علاج سے بھی دور نہیں ہو سکتے۔ اس درد کو نہ سونے سے آرام ملتا ہے نہ چلنے پھرنے اور کھانے پینے سے۔ اس کا علاج صرف دوست کا دیدار ہے۔ جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے۔ لِقاءُ الخلیل شفاءُ العلیل دوست کا دیدار بیمار کی شفا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ اگر کوئی منافق مسلمانوں میں بیٹھتا ہے تو وہ ان کی صحبت کے اثر سے اس وقت اسلام کا اظہار کرتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا (بقرہ ع ۲)۔ جب وہ (منافق) مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لے آئے ہیں"

اِس منظر کا تصور کیجئے ۔ جب ایک مومن دوسرے مومن کے ساتھ بیٹھا ہو۔ غور کی بات یہ ہے کہ جب مومن کی صحبت کا اثر منافق پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرنے لگتا ہے اور فائدہ کا متلاشی ہوتا ہے لہذا جب مسلمان مسلمان کے ساتھ بیٹھے گا تو اس کو کتنا فائدہ ہوگا۔ پشم (اون) ایسی حقیر چیز پر غور کرو کہ ایک ہنرمند کی صحبت سے وہ منقش بساط اور قالین بن جاتی ہے! اسی طرح یہ مٹی بھی ہنرمند معمار کی صحبت سے عالیشان مکان میں تبدیل ہوگئی۔ پس جب جمادات کا یہ عالم ہے کہ عاقل اور ہنرمند کی صحبت کا ان پر اتنا اثر ہوتا ہے تو پھر مومن کی صحبت مومن پر کیا کچھ اثر نہ کرتی ہوگی۔

ایک نفس جزوی (ہنرمند و عاقل و صناع) اور عقل مختصر کی صحبت نے جمادات کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا۔ یہ تمام اثرات ایک عقل و نفس جزوی کے ہیں یہ سب کچھ عقل جزوی کا سایہ ہے، تو سایہ سے اصل عقل کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اور اب تم اسی سے قیاس کر سکتے ہو کہ آسمان زمین چاند سورج طبقات زمین کی تخلیق کے لئے کس عقل و فرزانگی کی ضرورت ہوگی۔

یہ تمام موجودات عقل کلی کا سایہ ہیں۔ عقل جزوی کا سایہ اس کے شخصی جسم کے مطابق ہے۔ اور یہ موجودات جو عقل کلی کا سایہ ہیں وہ اس کے شخصی وجود سے مناسبت و مطابقت رکھتے ہیں۔ اولیائے حق نے ان آسمانوں کے علاوہ دوسرے آسمانوں کا بھی معائنہ کیا ہے کیونکہ یہ آسمان ان کی نظروں میں جچتے نہیں اور ان کو حقیر نظر آتے ہیں اور یہ اولیاء ان آسمانوں کو پامال کرتے گزر جاتے ہیں۔ چنانچہ مولانا کے ایک مصرع کا ترجمہ یہ ہے۔

روحانی دنیا میں بے شمار آسمان ہیں۔

تعجب کی بات کیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسانوں کے درمیان ہوتے ہوئے یہ منزل حاصل کر لیتا ہے کہ اس کے قدم فلک ہشتم تک پہنچ جاتے ہیں۔

ہیں تو ہم بھی جنسِ خاک ہی سے لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے اندر ایسی قوت رکھدی ہے کہ اس کی بدولت ہم اپنی جنس سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ کہ ہم اس قوت پر متصرف ہو گئے اور وہ قوت ہمارے زیر تصرف ہو گئی جس کی بدولت ہم جس طرح چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں۔ کبھی ہم اس جنس خاک کو بلندیوں سے ہمکنار کرتے ہیں اور کبھی پستیوں میں دھکیل دیتے ہیں اور کبھی اس سے محل بناتے ہیں کبھی جھونپڑا بنا لیتے ہیں۔ کبھی اس کو کاسہ و کوزہ میں استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس کو دراز کرتے ہیں اور کبھی کوتاہ، مگر ہم پہلے بھی اسی جنسِ خاک سے تھے اور اب بھی اسی جنس سے ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ نے ہم کو اس جنس (خاکی) سے ممتاز کر دیا ہے۔ اگر اسی طرح اللہ تعالےٰ ہماری ہی جنس سے کسی ہستی کو ممتاز کر دے کہ ہم اس کے سامنے جماد کی طرح (حقیر و ناچیز) ہوں تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے! اور وہ ہستی ممتاز ہمارے اندر اس طرح متصرف ہو (جس طرح ہم متصرف تھے) ہم اس سے بے خبر ہوں لیکن وہ ہم سے بے خبر نہیں۔ باخبر ہے۔

بے خبری کے معنی

ہم اس لفظ بے خبری سے محض بے خبری مراد نہیں لیتے، بلکہ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں بے خبری ہیں بھی ایک خبر ہے۔

غور کرو کہ خاک بھی اس جمادی کیفیت کے باوجود اس صلاحیت کی بنا پر جو اس کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے باخبر ہے۔ اگر وہ اپنی صلاحیت سے بے خبر ہوتی تو پانی کو کس طرح قبول کرتی اور دانوں کی پرورش ان کی

صلاحیت کے مطابق کس طرح کرتی۔

جب کوئی شخص کسی کام میں منہمک ہوتا ہے اور اس میں اپنی پوری عملی صلاحیتیں صرف کرتا ہے تو اس کام میں اس کی بیداری دوسری چیزوں سے بے خبری کا سبب بنتی ہے۔ پس ہم اس غفلت سے غفلت کلّی مراد نہیں لیتے۔ مثلاً لوگ چاہتے تھے کہ بلی کو پکڑیں لیکن اس کو پکڑنا ناممکن نہ ہو سکا۔ ایک دن وہ کسی پرندے کے شکار میں مشغول تھی اور اس شکار میں خود کو منہمک کر لیا تھا کہ باقی ماحول سے وہ غافل ہو گئی تو اس حالت سے فائدہ اٹھا کر اس کو پکڑ لیا گیا۔

اس مثال سے یہ سبق لینا چاہیئے کہ خود کو کلیتاً دُنیا کے کاموں میں ہرگز ہرگز منہمک نہیں کر لینا چاہیئے بلکہ ان کو آسان انداز میں اختیار کرنا چاہیئے اور اس کو خود پر مسلط نہ ہونے دیں اور نہ۔ اس بات کا اندیشہ کریں کہ کامل استغراق اور کامل مشغولیت نہ ہونے کی وجہ سے دنیا کے کام ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ (ان کو ہماری عدم توجہی سے گزند پہونچے گا)۔ کرنا یہ چاہیئے کہ اصل خزانہ ہاتھ سے نہ جائے۔ اگر یہ کارہائے دنیا ہاتھ سے نکل بھی گئے تو یہ پھر بھی میسّر ہو سکتے ہیں اور ہمارے پاس واپس آ سکتے ہیں لیکن اگر وہ اصل (خالق کارہائے دنیا و مافیہا) ناراض ہو گیا تو اس کو کون راضی کر سکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اس بات پر غور کرو کہ اگر تمہارے پاس قیمتی ساز و سامان ہے اور دریا میں ڈوبنے کی نوبت آ گئی ہے تو تم کس سامان کو بچانے کے لئے ہاتھ پیر مارو گے۔ (جبکہ اس میں سے ہر ایک چیز پیاری ہے) لیکن یہ یقین ہے کہ نفیس ترین چیز کو بچانے کی کوشش کرو گے یعنی گوہر کو بچاؤ گے یا ایک قیمتی لعل کو کہ اس کو بچا کر شان و شوکت کے ہزاروں سامان فراہم کر سکتے ہو جس طرح ایک درخت سے میٹھے پھل حاصل

ہوتے ہیں اگرچہ وہ پھل اس درخت کا ایک جزو ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس جزو کو کل پر ممتاز کر دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پھل میں شیرینی پیدا کر دی جو اس کل یعنی درخت کو نصیب نہیں ہوئی اور اسی حلاوت کے سبب سے اس جزو نے کل (درخت) پر فوقیت حاصل کرلی وہ پھل اس درخت کا مقصود قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بل عجبوا ان جاءھم منذر منھم (ق ۲) (اور ان منکروں کو اس بات پر حیرانی ہوئی کہ ان کے پاس انھیں میں سے ایک ڈرانے والا آیا۔

جاہل داعی

ایک نادان شخص نے ایک شیخ طریقت سے کہا۔ مجھے ایسا حال میسر ہے کہ اس حال میں نہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ کسی ملک مقرب کی گنجائش ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بندے کو یہ خیال کیوں ہوا کہ نبی علیہ السلام کے لئے اس کے احوال میں تصرف کی گنجائش نہیں۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں ہر گندہ بغل کے لئے رسائی کی گنجائش ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھو کہ ایک مسخرہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح بادشاہ کو خوش کر کے اس سے بھی انعام حاصل کرے جیسا کہ درباریوں نے بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے تحفے دیئے تھے۔ لیکن بادشاہ اس وقت بہت ملول و رنجیدہ تھا۔ غصہ اور رنج کی حالت میں گرفتار خاموش دریا کے کنارے بیٹھا ہوا غم غلط کر رہا تھا۔ مسخرہ بادشاہ کے کبھی دائیں جانب آتا اور کبھی بائیں جانب، لیکن بادشاہ نے اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور پانی کو ہی دیکھتا رہا۔ جب مسخرہ عاجز آگیا تو اس نے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ پانی میں کس کو دیکھ رہے ہیں۔ بادشاہ نے غصہ میں جواب دیا کہ میں پانی میں ایک دیوث کو دیکھ رہا ہوں۔ مسخرہ نے بادشاہ کا جواب سنکر کہا بادشاہ سلامت میں بھی اندھا نہیں ہوں ــــــ یہ مثال دے کر حضرت

نے فرمایا کہ مجھے ایسا حال میسّر آیا ہے کہ سیّدِ عالم کی ذاتِ اقدس مجھ میں نہیں سما سکتی، تو تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں کبھی نہیں ہوتے کہ مجھ جیسا گندہ بغل بھی اُن کی بارگاہ میں جگہ پاسکے۔
غور کرکہ یہ حال جو مجھ کو میسّر ہوا ہے یہ اُن کی ہی برکت و تابتر ہے۔ اس لئے کہ اوّلاً تمام عطایا ان ہی کو دیئے جاتے ہیں پھر ان سے دوسروں کے حصے میں آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہی ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا " اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهٗ" یعنی تمام رحمتیں اے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم نے آپ پر بھیجدی ہیں تو حضورؐ نے فرمایا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰالِحِیْنَ (اور اللہ کے نیک بندوں پر بھی) اس سے ظاہر ہوا کہ تمام رحمتیں اصولاً آپ کے لئے مخصوص کی گئیں اور پھر ان سے نیک بندوں کو حصہ دیا گیا۔

رَاہِ حق کی کیفیت

راہِ حق سخت خوفناک اور برف کے تودوں سے بند تھی۔ اس پُرخطر وادی میں سیدِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گھوڑے کو ڈال دیا اور سبقت کرکے راستہ کو کھول دیا۔ اب اس راہ (مجاہدہ) کو جو بھی اختیار کرتا ہے وہ انھیں کی رہنمائی اور انھیں کی بخشی ہوئی ہدایت کی بنا پر ہوتا ہے۔
سید المرسلین صلے اللہ علیہ وسلم نے جب راستہ بنا دیا جگہ جگہ نشان قائم کئے اور لکڑیاں کھڑی کیں اور بتایا کہ اس راستہ پر چلتے رہو اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اختیار نہ کرو۔ اگر تم نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تو بھٹک کر اسی طرح ہلاک ہوجاؤ گے جس طرح قوم عاد و ثمود ہلاک ہوئی تھیں اور اگر میرے متعین کردہ راستہ کو اختیار کروگے تو مومنوں کی طرح (برائیوں سے) پرہیز کرتے ہوئے نجات حاصل کروگے۔

قرآنِ کریم میں روشن نشانیاں ہیں

قرآن کریم میں جابجا یہ بتایا گیا ہے۔ فیہ آیات بیّنات۔ (آل عمران ع ۱۰) اس (قرآن) میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ یعنی ہم نے راستہ کا تعین کرکے اس پر نشان لگا دیئے ہیں اب کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ اس راستہ کو خراب کرے اور ان لکڑیوں میں سے کسی لکڑی کو توڑ دے تو سب کا فرض یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کا مؤاخذہ کریں کہ لکڑی کو توڑ کر ہمارے راستہ کو کیوں خراب کرتا ہے یقیناً تو راہی نہیں ہے رہزن ہے۔ جو ہم لوگوں کی ہلاکت کا خواہاں ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اوّلیت سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ جب تک سید عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری نہ دو گے تمہاری رسائی ہم تک ممکن نہیں ہے۔

اس کو اس طرح سمجھو کہ تم کہیں جانا چاہو تو اس کام میں پہلے عقل رہبری کرتی ہے کہ مصلحت یہی ہے کہ فلاں جگہ جانا چاہیئے۔ اس کے بعد بصارت رہنمائی کرتی ہے اس کے بعد دوسرے اعضاء حرکت میں آتے ہیں اگرچہ دوسرے اعضاء کو آنکھ کے عمل کی خبر نہیں۔ اسی طرح آنکھ کو عقل کے عمل سے آگاہی نہیں۔ انسان اگرچہ خود غافل ہے لیکن اس کی رہنمائی کرنے والے اس سے غافل نہیں ہیں۔

بہرحال دنیا کے کاموں میں ضرورت سے زیادہ غرق نہ ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کے کاموں میں حد سے آگے بڑھ کر اور منہمک ہو کر حقیقت کار سے غافل ہو جاؤ تمہیں رضائے خلق کے مقابلہ میں رضائے حق طلب کرنی چاہیئے۔ کیونکہ مخلوق کی رضا، محبت و شفقت تو عارضی ہیں۔ حق تعالےٰ چاہے تو تم کو سکون و ذوق کی دولت سے مالا مال نہ فرمائے۔ عیش و آرام اور نعمتیں جو حاصل ہیں وہ سب رنج و محن میں تبدیل ہو جائیں پس یہ تمام اسباب و علل دست قدرت میں قلم کی

طرح سے ہیں اور لکھنے والا حق تعالیٰ ہے۔ چاہے تو قلم میں جنبش ہی نہ ہو۔ تم قلم کو دیکھتے ہو اور یہ کہتے ہو کہ قلم کے لئے ہاتھ بھی چاہیئے اسی طرح قلم کو دیکھ کر ہاتھ کو یاد کرتے ہو لیکن اصحاب عرفان ہمیشہ ہاتھ کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے لئے قلم بھی ہونا چاہیئے۔ مگر وہ ہاتھ کے مطالعہ میں اس قدر مستغرق ہوتے ہیں کہ قلم کے بارے میں کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا ہاتھ تو بغیر قلم کے ہو نہیں سکتا وہ ہاتھ سے قلم کے وجود پر دلیل لاتے ہیں۔ لیکن تمہاری حالت یہ ہے کہ تم قلم کے مطالعہ میں اس قدر محو ہو اور اس کی لذت اور مٹھاس میں اس طرح کھو گئے ہو کہ تم کو اس ہاتھ کی پرواہ ہی نہیں رہی (جیسے قلم ہے)۔

اور ارباب حال و اصحاب مشاہدہ کی حالت یہ ہے کہ وہ ہاتھ کے مشاہدہ کی لذت میں محو ہیں تو پھر ان کو قلم کے مطالعہ کی کیا پرواہ ہوگی جس طرح تم کو جو کی روٹی میں بھرپور لذت مل رہی ہے تو تم گیہوں کی روٹی کو کب یاد کروگے (اس کا خیال تم کو کب آئے گا)۔ تو اسی طرح وہ لوگ ہیں جن کو گیہوں کی روٹی میسر ہے تو وہ جو کی روٹی کو کیوں یاد کریں۔ جب تم کو زمین ہی پر رونق و لذت مل گئی ہے تو تم آسمان کی آرزو کیا کروگے جو ذوق و لذت کا اصل محل و مقام ہے۔ اور زمین کی زندگی اسی آسمان سے قائم ہو۔ یہی باعث ہے کہ اہل آسمان، زمین والوں کو یاد نہیں کرتے (ان کو زمین کے ذوق سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔

پس تو مسرتوں اور خوشیوں کو اسباب کا رہین منت نہ سمجھ اور اس بات کا یقین کرلے کہ یہ اسباب اور ذرائع سب کے سب مستعار اور عارضی ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ضرر اور نفع پہونچانے والا ہے۔ پس جب تمام ضرر اور منافع اسی کی ذات سے ہیں تو پھر تو اسباب سے چپک کر کیوں رہ گیا ہے۔

کلام کی خوبی

"خیر الکلام ما قلّ و دلّ"۔ بہترین کلام وہ ہے جو کم اور مدلل ہو کلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ مفید ہو نہ کہ طویل۔ اب سورۂ اخلاص (قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) کو دیکھو جو اگرچہ ایک چھوٹی سی سورت ہے لیکن فضیلت میں قرآن کریم کی طویل ترین سورۂ بقرہ پر فوقیت اور افادیت رکھتی ہے اگر طول زمانی کو مد نظر رکھا جائے تو جناب نوح علیہ السلام نے ہزار سال تبلیغ فرمائی لیکن چالیس افراد ان کے متبع ہو سکے اور ان پر ایمان لائے۔ لیکن سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغی زمانہ دیکھو کتنا مختصر ہے اس عرصہ میں کتنے ممالک مشرف بالاسلام ہوئے اور آپ کی امت میں کتنے اولیاء اور نادر نیک نہاد پیدا ہوئے۔ لہٰذا طول وعدم طوالت زمانی معیار نہیں بلکہ افادیت معیار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بعض افراد کی مختصر بات طویل باتوں سے زیادہ مفید ہوتی ہے مثال سے اس طرح سمجھیں کہ ایک تنور کی حرارت جب بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ منفعت بخش نہیں ہوتی کیونکہ گرمی کی زیادتی کی وجہ سے اس کے قریب جانا ممکن نہیں ہوتا اس کے برخلاف مدھم روشنی کے چراغ سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ ہمارا مقصود تو فائدہ حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ بعض کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ کسی بات کو نہ سنیں صرف دیکھنا ہی ان کے لئے منفعت بخش اور کافی ہے اور اگر وہ باتیں سن لیں تو یہ ان کے لئے موجب نقصان و مضرت ہوگا۔

اللہ والوں کے لئے حجابات کی کوئی حیثیت نہیں

ہندوستان کے ایک بزرگ کسی شیخ کی خدمت میں حاضری کے ارادے سے گھر سے نکلے قطع مسافت کے بعد جب وہ تبریز میں ان شیخ کے آستانہ پر پہونچے تو اندر سے آواز آئی کہ یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ تمہارے حق میں اتنا ہی بہتر ہے کہ تم اس دروازہ تک آگئے لیکن اگر تم نے شیخ کو دیکھ لیا تو نقصان اٹھاؤ گے۔

تھوڑی سی فائدہ مند بات بہت سی غیر مفید باتوں سے بہتر ہے جیسے بجھے ہوئے چراغ کو کسی جلتے ہوئے چراغ کی لو سے ہلا دیا جائے تو اس بجھے ہوئے چراغ کے حق میں صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اس طرح وہ اپنے مقصود کو پہونچ جاتا ہے (روشن ہو جاتا ہے)۔

نبی کسی شکل وصورت کا نام نہیں ہے بلکہ نبوت عشق و محبت کا جذبہ ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ جس طرح کہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی بظاہر ناقہ کی شکل میں تھی۔ الغرض نبوت وہ عشق و محبت ہے جو زندہ جاوید ہے۔

اللہ کے ساتھ ذکر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم

ایک شخص نے سوال کیا کہ منارہ پر صرف خدا کی ثناء کیوں نہیں کی جاتی ہے؟ اللہ کے ذکر کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کس لئے کرتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف دراصل اللہ رب العلمین کی تعریف و توصیف ہے اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ خداوندا بادشاہ کو اور اس شخص کو جس کے ذریعہ سے میری بادشاہ تک رسائی ہوئی ہے عمر طویل عطا فرما تو اس شخص کو جس کے ذریعہ سے بادشاہ کی مجھ تک تعریف و توصیف پہنچی اور جس نے بادشاہ سے مجھے روشناس کرایا یاد کرنا۔ اس کی درازی عمر کی دعا مانگنا اور اس کی تعریف کرنا درحقیقت بادشاہ ہی کی تعریف ہوگی۔

نبی تو یہ نہیں فرماتے ہیں کہ مجھے کچھ دو۔ مجھے ضرورت ہے یا میں ضرورت مند ہوں مجھے کچھ مال دیدو یا اپنا جبہ ہی دیدو۔ نبی کو جبّہ و مال کی ضرورت نہیں۔ نبی کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ وہ تمہارے لباس کو اتنا ہلکا اور سبک کردے کہ آفتاب کی حرارت سے تم استفادہ کرسکو۔ اللہ رب العلمین فرماتا ہے:۔

"واقرضوا اللہ قرضاً حسناً (حدید) اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دو۔ اللہ تعالیٰ قرض میں مال و جنس نہیں چاہتا۔ ان کے علاوہ اس نے تمہیں بہت سی چیزیں دی ہیں مثلاً علم، فکر، عقل و نظر وغیرہ پس تھوڑی دیر کے لئے نظر و فکر و عقل و خرد کو اس کی رضامندی اور خوشنودی کے حصول کے لئے خرچ کرو کیونکہ تم نے منال و مال انہیں کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔ وہ (ذاتِ باری) پرندوں اور جال سے بھی صدقہ طلب فرماتا ہے۔ اگر تو آفتاب کے سامنے برہنہ ہو سکتا ہے تو ایسا ہی کر کیونکہ آفتاب تجھے سیاہ نہیں بلکہ سفید کر دے گا۔ اگر نہیں کر سکتا تو اپنے لباس ہی کو ہلکا کر لے تاکہ تو آفتاب (دھوپ) کا مزا بھی چکھ سکے تو نے اب تک ترشی کا مزہ چکھا ہے اب تو شیرینی کو بھی آزمالے۔ (شیرینی کو بھی چکھ لے)

فصل

متابعت کیا چیز ہے؟

حضرت مولانا ایک مرتبہ امیر پروانہ کے یہاں مجلس میں گفتگو فرما رہے تھے دورانِ تقریر امیر پروانہ نے عرض کی کہ حضرت! اصل چیز تو متابعت ہے! مولانا نے فرمایا، تم ٹھیک کہتے ہو لیکن وہ متابعت نہیں جو عوام نے سمجھ رکھی ہے۔ متابعت کے معنی یہ ہیں کہ ایک بادشاہ دادو دہش، عدل، حکمت کرم اور دوسری خوبیوں کے ساتھ خزانے، لشکر اور دوسری بہت سی آسائشوں سے حکومت کو معمور کر دے۔ اس کا جو وارث و جانشین تختِ سلطنت پر متمکن ہو وہ العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں) کے مصداق اس سیرت داد و دہش (جیسی اس کے پیشرو نے ملک میں کی تھی) اخلاق و عادات کا مظاہرہ کرے اس کو متابعت سے تعبیر

کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک فقیر اٹھے اور متابعت کا دعویٰ کرنے لگے۔ متابعت اور چیز ہے اور مبایعت (بیعت) اور چیز ہے۔

فصل

تواضع کیا ہے؟

یہ کہنا کہ میں بالکل عدم محض ہوں اور ہیچ ہوں۔ اس قول میں تواضع تو بہت زیادہ ہے مگر لوگ اس نکتہ کو سمجھتے نہیں ہیں۔ جو کوئی محض اللہ کے لئے بندگی کرتا ہے اس میں بھی تو بندگی کا واسطہ درمیان میں موجود ہے۔ اگرچہ یہ بندگی خدا کے لئے ہے لیکن وہ خود کو بھی دیکھتا ہے (کہ بندگی کر رہا ہے) اور خدا کو بھی (جس کی وہ بندگی کر رہا ہے) ایسا شخص غرق آب نہیں ہے (اس کو غرقاب نہیں کہہ سکتے)۔ غرقاب تو وہ شخص ہے جس میں کوئی جنبش اور کوئی فعل اپنا نہ ہو (جب ہی اس کو مستغرق حق کہا جائیگا) اس کی جنبش صرف پانی کی جنبش ہو۔ سنو! ایک شیر نے ایک ہرن کا پیچھا کیا۔ ہرن جہاں تک ہو سکا (اس کے حملے سے بچنے کے لئے) بھاگا۔ یہاں دو ہستیاں اور دو وجود موجود تھے۔ ایک شیر کی ہستی اور دوسری ہرن کی! لیکن جب شیر نے ہرن کو دبوچ لیا اور ہرن اس سے مغلوب ہو گیا اور اس کے نیچے بے حس و حرکت ہو گیا تو اس وقت صرف ایک ہستی رہ گئی یعنی شیر کا وجود!۔ ہرن محو و نابود ہو گیا! اس کا نام استغراق ہے۔ یعنی اولیاء اللہ کو حق تعالیٰ اس خوف سے نجات دیدیتا ہے جس سے لوگ ڈرتے ہیں۔ جیسے شیر اور چیتے کا خوف یا کسی ظالم شخص کا خوف، حق تعالیٰ ان خوفوں سے ان کو نجات دیکر صرف اپنے خوف سے ڈرنے والا بنا دیتا ہے اور ان پر اس امر کا کشف فرما دیتا

ہے کہ خوف صرف حق کا ہے (حق سے ڈرنا چاہیئے)۔ امن بھی حق کی طرف سے ہے اور یہ تمام عیش و طرب بھی حق کی طرف سے ہے۔ (اسی حال کا نام استغراق ہے)۔

فصل

وجدان کیا ہے؟

سراج الدین نے عرض کیا۔ میں نے ایک مسئلہ بیان کیا تو میرے اندر انقباض پیدا ہو گیا۔ ان کی اس بات کو سن کر آپ نے فرمایا وہ ایک مؤکل کا اثر ہے جو یہ گوارا نہیں کرتا کہ تم اس مسئلہ کو بیان کرو۔ اگرچہ وہ مؤکل نظر نہیں آتا۔ لیکن جب شوق، حظ یا الم کی کیفیت تمہارے اندر پیدا ہو تو وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ کوئی مؤکل ہے جو اپنی موجودگی کا یا ندا دگر اظہار کر رہا ہے۔ فرض کرو تم کسی آبجو سے گزر رہے ہو۔ ایک طرف سے پھولوں کی نرمی کا سا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ کر ادھر جائیں تو کلنے ٹے ہونگے جس سے معلوم ہوگا کہ ادھر جھاڑیاں ہیں اور خارستان۔ تکلیف دہ اور اذیت ناک، اور اس طرف باغ ہے گلزار ہے اور ریگستان، سامان راحت سے معمور۔ حالانکہ تم ان میں سے کسی طرف بھی دیکھ نہیں رہے ہو۔ تو اسی کو وجدان کہتے ہیں۔ یہ محسوسات سے زیادہ نمایاں ہے۔ مثال میں دیکھو۔ بھوک، پیاس، غصہ خوشی یہ سب محسوسات میں نہیں ہیں کہ کسی "حس" کے ذریعے معلوم کر لو مگر یہ سب محسوسات سے زیادہ ظاہر ہیں۔ آنکھ سے کتنا ہی دیکھو نہ دیکھ سکو گے اور بھوک کا ازالہ بھی نہ کر سکو گے اسی طرح وہ گرمی جو گرم غذاؤں میں ہوتی ہے یا سردی یا مٹھاس یا تلخی جو کھانوں میں ہوتی ہے، یہ سب محسوسات میں نہیں کہ حواس کے وسیلے سے ان کو

جان لو۔ لیکن یہ سب محسوسات سے زیادہ نمایاں ہیں، تو پھر تم اس تن بدن پر کیا بھروسہ کرتے ہو اس سے تمہیں کیا ملتا ہے اور کیا تعلق ہے تمہارا؟ تم تو اس تن بدن کے بغیر بھی قائم ہو اور موجود ہو۔ رات ہو یا دن تم کو تن بدن کی پرواہ نہیں ہوتی اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہو۔ تو اب اس تصور سے کیوں کانپتے ہو کہ تمہارا تن بدن نہیں رہے گا یا دوسری جگہ یہ تن بدن تمہارے ساتھ نہ ہوگا؟ کہاں تم اور کہاں یہ تن بدن، اسی کو کہتے ہیں۔ (انا فی واد وانت فی واد) (میں کسی اور وادی میں ہوں اور تم کسی اور وادی میں)

سنو یہ جسم اور تن عظیم مغالطہ اور دھوکا ہے، دیکھو آنکھیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ جسم مُردہ ہوگیا (جسم مرگیا) تو وہ بھی مرجاتی ہیں بتاؤ کہ تمہارا اس تن سے کیا تعلق! یہ تو ایک عظیم نظر بندی ہے!

ساحرانِ فرعون کو اس رمز سے ذرا سی آگاہی ہوگئی۔ تو انہوں نے اپنے تن فدا کردیئے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ بغیر اس تن کے موجود ہیں اور اس تن کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے!۔

اسی طرح حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام اور دوسرے انبیاء اور اولیائے عظام جب اس کُنہہ سے آگاہ ہوگئے تو پھر وہ اس تن کے ہونے یا نہ ہونے سے بالکل فارغ و بے تعلق ہوگئے۔

حجّاج بن یوسف نے ایک مرتبہ بھنگ پی تھی، اس کے نشہ میں دروازہ پر سر رکھے چلّا رہا تھا کہ اے لوگو! دروازہ کو نہ ہلانا کہیں میرا سر نہ گر پڑے۔

بھنگ کے نشہ میں وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اُس کا سر اس کے تن سے جُدا ہے اور وہ دروازہ کے واسطہ سے قائم ہے (اگر دروازہ ہلائیں گے تو سر گر پڑیگا) ہمارا اور تمام مخلوق کا حال بھی یہی ہے ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بدن سے تعلق رکھتے ہیں یا بدن کے واسطہ سے قائم ہیں۔

فصل

آدم کی تخلیق احکام الٰہی کی صورت پر ہوئی ہے

خلق اللہ آدم علےٰ صورتہٖ ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ انسان ہمیشہ مظاہر کی طلب میں رہتا ہے۔ بہت سی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو سارا جسم تو پوشیدہ رکھتی ہیں لیکن چہرہ دکھا کر اپنے مطلوب و محب کو آزماتی ہیں جیسا کہ تم اُسترے کی صرف دھار دیکھتے ہو۔ عاشق اپنے معشوق سے اور محب اپنے محبوب سے کہا کرتا ہے کہ میں نے تیری وجہ سے نہ تو کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے نہ سویا ہوں میں تیرے بغیر تیرے ایسا اور ویسا ہوگیا ہوں اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ تم مظہر طلب کرتا ہے کہ دیکھ تیرا مظہر خود میں ہوں تاکہ معشوق سے معشوقی کرے اور معشوق کو اپنے حسن و عشق کا مظہر بنالے اسی طرح علماء اور ہنر مند کو بھی مظہر کی طلب ہوتی ہے (جس سے ان کا علم و ہنر ظاہر ہو)۔

حدیث قدسی ہے: "کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعرف" میں کنز مخفی تھا میں نے مناسب سمجھا کہ میں اپنی ذات کا تعارف کراؤں۔

پس اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت کے ...سر پیدا

فرمایا۔ یہاں صورت سے مراد احکام ہیں یعنی تخلیق آدم علیہ السلام احکامِ الٰہی کے مطابق ہوئی تاکہ احکامِ الٰہی مخلوق میں جلوہ فگن ہو جائیں۔ کیونکہ یہ تمام ذاتِ باری کا پَرتو ہیں اور سایہ شخص کے ساتھ ہی باقی رہتا ہے۔ اگر پانچوں انگلیاں کھول دی جائیں تو ان کا سایہ بھی اسی طرح کھل جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان رکوع میں جائے تو سایہ بھی رکوع میں جاتا ہے اور اگر وہ لیٹ جائے تو سایہ بھی اسی طرح دراز ہو جاتا ہے۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ تمام مخلوق ایک محبوب و مطلوب کی طالب ہے۔ اور اس مخلوق کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ سب اس کے محب و مطیع بن جائیں۔ ان کے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہو جائیں اور یہ تمام احکام اور صفاتِ حق ہیں جو اس کے ظل اور پَرتو میں نمایاں ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ہمارا سایہ ہم سے تو بے خبر ہے لیکن ہم اس سے بے خبر نہیں بلکہ باخبر ہیں لیکن جب اس علم کی نسبت جو مخلوق کو حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے علم (علمِ الٰہی) سے کی جاتی ہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ علمِ الٰہی کے مقابلہ میں ہماری یہ آگہی تمام تر عدم واقفیت ہے اور دلیل یہ ہے کہ انسانی سایہ انسانی علم اور اس کی شخصی خصوصیات کا کامل پَرتو نہیں ہوتا۔ سائے میں شخصی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں بس جملہ صفاتِ حق ان ظلال میں نمایاں نہیں ہیں اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ تم کو علم سے بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے۔ اگر معرفت کی نسبت علمِ باری کے ساتھ تلاش کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تو بے خبری اور کمال لاعلمی ہے اور ہر وہ چیز جو شخصیت میں ہوتی ہے وہ سب پَرتو میں ظاہر نہیں ہوتی صرف چند چیزیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ذاتِ باری کی تمام صفات ہمارے ظل اور سائے میں نمایاں نہیں ہوتیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً (بنی اسرائیل ع۱۰) اور نہیں دیئے گئے

تم علم میں سے مگر تھوڑا۔

فصل

تحصیلِ علم

ہر وہ علم جو تحصیل وکسب سے دنیا میں حاصل ہوتا ہے اس کا تعلق علم الابدان سے ہے اور جو علم مرنے کے بعد حاصل ہو اس کو علم الادیان کہا جاتا ہے۔ (انا الحق کے بارے میں علم حاصل ہوجانا علم الابدان ہے اور انا الحق ہوجانا علم الادیان ہے چراغ کے نور کو اور آگ کو دیکھنا علم الابدان ہے اور آگ میں پڑ کر آگ ہوجانا علم الادیان ہے یعنی جو کچھ کسی نے دیکھا ہے علم الابدان ہے اور دیکھنے والا خود وہ چیز بن گیا جو اس نے دیکھی ہے تو یہ علم الادیان ہے۔ پس یہی دیدار و دید محقق ہے اسی کو ہم حقیقت کہتے ہیں باقی علوم، علوم خیالی ہیں مثلاً ایک انجینئر نے غور وخوض کیا کہ وہ ایک مدرسہ تعمیر کرے۔ ہر چند کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے اور خیال کیا ہے وہ صحیح اور درست ہے لیکن با اینہمہ وہ ایک خیال سے زیادہ نہیں ہے اور یہ خیال حقیقت اس وقت بن سکتا ہے کہ مدرسہ (کی عمارت) مکمل ہوجائے۔ اب غور کرو کہ ایک خیال سے دوسرے خیال تک کس قدر فرق ہے اور دیکھو حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا خیال دوسرے صحابۂ کرام کے خیال سے اسی طرح بالاتر ہے۔ جس طرح ایک دانا مہندس کا خیال جس کو بنیاد خانہ کی فکر ہو اور غیر مہندس کا خیال ان دونوں میں فرق عظیم ہے اس لئے کہ مہندس کا خیال حقیقت سے قریب تر ہوتا ہے۔

اسی طرح اس جانب دیکھو یعنی عالم حقائق و دیدار کو تو ایک دید سے دوسری دید تک فرق ہی فرق ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، پس یہ جو کچھ کہا جاتا ہے کہ سات سو پردے ظلمات کے ہیں اور سات سو پردے نور کے ہیں۔ (تو یہ درست ہے) کہ جو کچھ عالم خیال میں ہے وہ ظلمت ہے اور جو کچھ حقائق ہیں وہ نور کے پردے ہیں لیکن ظلمتوں کے پردوں کے درمیان جس کو ہم نے خیال کہا ہے کسی طرح بھی فرق نہیں کیا جا سکتا اور نہ انتہائے لطافتِ خیال کے باعث ان کو دیکھا جا سکتا ہے اس عجیب فرق کے باوجود حقائق

کے مابین بھی جو فرق ہے اس کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔

فصل

اہل دوزخ، منافق اور کافر

اہل دوزخ دنیا کے مقابلے میں دوزخ کے اندر زیادہ اچھے رہیں گے کیونکہ وہ دوزخ میں حق سے باخبر ہوں گے۔ مگر دنیا میں ہیں تو حق سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ کوئی چیز بھی حق سے اور حق کے علم و خبر سے زیادہ خوشگوار اور شیریں نہیں ہو سکتی۔ پس جو لوگ دنیا کی آرزو کریں گے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں رہ کر وہ کچھ عمل کرتے اور مظہر لطف خداوندی سے باخبر ہوتے، اس کا سبب یہ نہیں کہ دنیا کچھ دوزخ سے زیادہ اچھی جگہ ہے۔

منافق کو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں اس لئے رکھا جائے گا کہ ایمان اس نے قبول کیا لیکن چونکہ اس کا کفر قوی تھا اس نے ایمان پر عمل نہیں کیا، پس اس کا عذاب زیادہ سخت ہوگا تاکہ اس کو حق کی خبر مل جائے۔ لیکن کافر نے ایمان قبول ہی نہیں کیا اور اس کا کفر کمزور تھا اس لئے وہ تھوڑے عذاب ہی سے حق سے باخبر ہو جائے گا۔ جس طرح چادر جس پر گرد پڑی ہو اور ایک کمبل جو گرد آلود ہو تو چادر یا کمبل کو تو ایک شخص ہی جھاڑ سکتا ہے لیکن گرد آلود قالین کو جھاڑنے کے لئے چار افراد کی ضرورت ہوگی۔ تب ہی اس سے گرد صاف کی جا سکتی ہے اس کو پوری شدت سے جھاڑیں اور وہ جو دوزخ میں ہونگے اہل جنّت سے کہیں گے کہ افیضوا علینا مِمّا رزقکم اللّٰہ (جو کچھ اللہ نے تم کو روزی عطا کی ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی عطا کر دو) وہ کھانے کی چیزیں طلب نہیں کرینگے بلکہ اس چیز کے طالب ہونگے جو تم نے پائی ہوگی اور جو تم پر چمک دمک رہی ہوگی۔

قرآن حکیم کے مطالب سے آگہی

قرآن کریم ایک دلہن کی طرح ہے جب تک تم اس کا نقاب نہیں الٹو گے اس کی شکل نہ دیکھ سکو گے اور تم جو اس کے ساتھ بحث کر رہے ہو اور تمہارے اندر ذوق و شوق

اور کیف پیدا نہیں ہو رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تم نے اس کے چہرے سے نقاب الٹنا چاہا تو اس نے منع کر دیا (ہاتھ جھٹک دیا) اور تمہارے ساتھ چال چلی اور اگر تم کو اپنا چہرہ دکھایا بھی تو بُرا کر کے دکھایا۔ یہ بتانا چاہا کہ میں وہ شاہد نہیں ہوں جو تمہارے خیال میں ہے اور جس کے دیدار کے تم مشتاق ہو۔ یہ عروسِ خوش جمال اس بات پر قادر ہے کہ وہ جس صورت میں چاہے خود کو دکھائے اگر تم اس کی چادر کھینچنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کی رضا کے طالب رہو اور دور رہ کے اس کی کھیتی کو سیراب کرتے رہو اور بار بار اور بہت اس کے کام انجام دیتے رہو۔ (اسی کی جانب مائل اور مصروف رہو۔) اور جس امر میں اس کی رضا ہو وہی کام تم کرو تو اس کے بغیر ہی کہ تم اس کی چادر کھینچو وہ تم کو اپنا جمال دلنواز ضرور دکھائے گی۔

اسی طرح تم اہل حق کی طلب کرو کہ اس کا اعلان ہے فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی "میرے بندوں میں داخل ہو پھر میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

حق تعالیٰ ہر شخص سے معروفِ کلام نہیں ہوتا۔ دنیا کے بادشاہوں کو ہی دیکھ لو کہ وہ ہر کس و ناکس سے کلام نہیں کرتے بلکہ انھوں نے وزیر اور نائب السلطنت مقرر کر دیئے ہیں تاکہ ان کے توسط سے بادشاہ تک رسائی حاصل کریں! اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اپنے کسی نہ کسی بندے کو انتخاب فرما لیا ہے کہ جو کوئی طالبِ حق ہو وہ اس کی طرف رجوع کرے۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام اسی مقصد کے لئے تشریف لائے ہیں کہ ان کے سوا مخلوق کا اور کوئی رہبر و رہنما نہیں ہے

فصل

اللہ کا غضب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ اے روح اللہ دنیا اور آخرت میں سب سے عظیم اور سب سے زیادہ صعب و دشوار کیا چیز ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔ اللہ کا غضب! سوال کرنے والوں نے پوچھا کہ اس سے نجات دینے والی کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے غصّہ کو مار دو اور اس غصّہ کو پی جانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو۔ جب وہ شکایت کی طرف تم کو متوجہ کرے تو تم شکایت کے بجائے شکر ادا کرو اور اس عمل میں خوب کوشش کرو

تاکہ تمہارے اندر اس کی محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے کیونکہ مبالغہ کے ساتھ شکر ادا کرنا بھی اللہ کی محبت تلاش کرنے کے مترادف ہے۔ عظیم المرتبت مولانا نے فرمایا الشکایۃ عن الخلق شکایۃ عن الخالق مخلوق کی شکایت کرنا بھی خالق کی شکایت کی طرح ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا دشمنی اور غصہ تیری فطرت میں تہہ بہ تہہ پوشیدہ ہیں بالکل آگ کی طرح کہ جب تو دیکھے کہ اس میں سے کوئی چنگاری اٹھی ہے تو اس کو فوراً ختم کر کے عدم میں پہنچا دے۔ جہاں سے وہ آئی ہے۔ لیکن اگر تو اس کو ختم نہ کرے گا تو یہ اس کی مدد ہو گی اور وہ کبریت جوابی اور نفت مجازی کی طرف راستہ پا لے گی۔ دنیاوی کبریت (گندھک) اور آتش گیر مادہ بن جائے گی اور عدم سے دوسری چنگاریاں اور زیادہ رواں دواں ہو جائیں گی۔ پھر ان کو عدم میں بھیجنا ناممکن ہو جائے گا۔ ادفع بالتی ھی احسن۔ (حم سجدہ ع ۵) اس کو بہتر طریقہ سے دفع کرو۔ اس طرح تم دشمن کو دو طرح سے مغلوب کر سکو گے۔ کیونکہ تمہارا دشمن اس کا گوشت پوست نہیں ہے بلکہ اس کے خیالات ہیں اور جب یہ خیالات دفع ہو جائیں گے اور کثرت سے تمہاری شکر گزاری کی وجہ سے یہ "دشمن" خود اس سے دور رہ جائیں گے پہلی وجہ طبعی ہے کیونکہ الانسان عبید الاحسان۔ انسان اچھائی کا بندہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اس عمل میں کوئی فائدہ نہیں پائے گا۔ دیکھا ہو گا کہ لڑکے جب کسی سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں تو وہ انھیں گالیاں دیتا ہے تو ان لڑکوں میں مزید جوش و خروش پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ہماری طرف توجہ کی ہے۔ لیکن اگر کوئی ان کی چھیڑ چھاڑ کی طرف توجہ نہیں کرتا ہے تو وہ مایوس ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

پھر دوسرے یہ کہ جب عفو کی یہ صفت تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی تو اس وقت معلوم ہو گا کہ تمہاری جو مذمت دشمن نے کی تھی۔ وہ بالکل غلط تھی۔ یہ دیکھنے والے کی کج بینی تھی اس نے تم کو حقیقت میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس وقت یہ بات بالکل کھل کر سامنے آ جائے گی کہ مذموم وہ خود ہے تمہاری ذات نہیں ہے اور دشمن کو کوئی حجت اور دلیل اس سے یاد شرمندہ نہیں کر سکتی جب اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا جھوٹ سب پر کھل گیا ہے اس طرح تم دراصل ستائش کر کے شکر میں لپیٹ کر اپنے دشمن کو زہر دے رہے ہو۔ اس لئے کہ وہ تمہارے نقص اور کمزوری کا اظہار کر رہا تھا اور تم نے اپنے کمال کا اظہار کیا کہ تم محبوب حق ہو اور حق تم کو

پسند کرتا ہے) چنانچہ فرمایا گیا ہے ۔ وَالعافین عن الناس واللّٰہ یحب المحسنین
اور یہ لوگ دوسرے لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست
رکھتا ہے۔ پس محبوبِ حق ناقص نہیں ہوتا کامل ہوتا ہے) پس تم اس کی اس قدر ستائش کرو کہ
تمہارے دشمن کے دوستوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ جب اس کا اس سے اس قدر اتفاق اور دوستی
ہے اور ہمارے ساتھ اس کی دشمنی ہے تو وہ ضرور ہم سے منافقت برت رہا ہے ؎

برکن برفق سبلتِ شاں گرچہ سبلتند　　　　بشکن بحکم گردنِ شاں گرچہ گردنند

"ان کی مونچھیں نرمی کے ساتھ اکھاڑ دے اگرچہ وہ مونچھوں والے ہوں اور حلم و بردباری سے
ان کی گردنیں توڑ ڈال اگرچہ وہ طاقتور انسان ہوں"۔ اللہ تعالیٰ اس عمل کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

فصل

ذات باری اور بندہ کے درمیان حجابات

بندہ اور خالق کے درمیان صرف یہی دو حجابات ہیں اور باقی حجابات انہی دو حجابات
سے ظہور میں آتے ہیں اور یہ دونوں حجابات صحت اور مال ہیں
جو شخص صحت مند تندرست اور توانا ہوتا ہے وہ کہتا ہے، خدا کون ہے مجھے نہیں
معلوم اور وہ مجھے دکھائی بھی نہیں دیتا۔ لیکن جب تکلیف پہنچتی ہے اور مبتلائے آلام ہوتا
ہے تو وہ اللہ اللہ پکارتا ہے ایسے وقت وہ اللہ تعالیٰ کا ہمراز وہم سخن بن جاتا ہے پس تم نے
دیکھا کہ صحت کس طرح حجاب کی حیثیت رکھتی تھی کہ ذات حق اسی درد والم کے پیچھے موجود تھی
اسی طرح جب تک انسان کے پاس مال و منال ہوتا ہے تو وہ اس شخص کے لئے حصول مراد
میں ممد و معاون بنتا رہتا ہے اور وہ شخص شب و روز اسی مال میں مست رہتا ہے لیکن
غربت آجاتی ہے اور مال کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو نفس کمزور ہو کر　ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب رجوع کرتا ہے

مستی و تہی دستیت آورد بمن　　　　من بندۂ مستی و تہی دستیٔ تو

اے تو کیسا مال ہیں مست رہا آخر تیری تہی دستی تجھے کھینچ کر مجھ تک لے ہی آئی، میں تو ایسی مستی اور تہی دستی پر قربان ہوں
فرعون کو حق تعالیٰ نے چار سو سال کی عمر عطا فرمائی ۔ ملک، اقتدار، اختیار کار فرمائی عطا کی لیکن

یہ تمام کے تمام حجابات تھے جو اس کو ذاتِ باری سے دور رکھتے تھے۔ ایک دن بھی ایسا نہ ہوا کہ اس کو در دِ سر ہوتا یا اس کو کسی مرحلہ پر مایوسی ہوتی اور نامرادی سے ہمکنار ہونا پڑتا۔ یہ اس لئے تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان حالات میں اس کو ہماری (اللہ تعالیٰ) یاد آجائے مشیت نے کہا کہ اچھا یہی سہی تو اپنے حال میں مگن رہ اور ہمیں یاد نہ کر۔ ؎

از ملکت سیر شد سلیمان   وایوب نہ گشت از بلا سیر

حضرت سلیمان علیہ السلام تیری عطا کردہ حکومت سے سیر ہو گئے لیکن حضرت ایوب علیہ السلام بلاؤں سے سیر نہ ہوئے۔ وہ بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا رہے اور اللہ کو یاد کرتے رہے ؎

بہت خوش ہوں خدا یاد آرہا ہے اس مصیبت میں   مری کشتی کو اے طوفاں یوں ہی زیر و زبر رکھنا

فصل

اخلاق ذمیمہ انسان کے لئے حجابات ہیں

آپ نے فرمایا یہ جو کہتے ہیں کہ نفس انسانی میں ایسا شر موجود ہے جو حیوانوں اور درندوں میں بھی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انسان ان سب سے بدتر ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بری خصلتیں شرِ نفسانی اور وہ نحوستیں جو انسان میں ہیں وہ اس گوہر مخفی کے مطابق ہیں جو اس کے اندر رہے اور یہ ساری برائیاں اس گوہر مخفی کے لئے حجاب بن گئی ہیں۔ یہ گوہر جس قدر نفیس تر، عظیم تر اور شریف تر ہے۔ اتنا ہی حجاب وسیع و عظیم ہے۔ اسی طرح یہ تمام نحوستیں اور بداخلاقیاں اس گوہر کے لئے حجاب بنی رہتی ہیں۔ اور ان حجابات کا اٹھنا سوائے کثرتِ مجاہدات کے ممکن نہیں اور یہ مجاہدے بھی نوع بہ نوع ہیں۔ ان مجاہدوں میں عظیم ترین مجاہدہ ایسے لوگوں سے تعلقات کی استواری اور ان کی صحبت اختیار کرنا ہے جو دنیا سے منہ موڑ کر اللہ ربّ العالمین سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ پس اس سے سخت اور کوئی مجاہدہ نہیں ہے کہ نیک لوگوں کی خدمت میں حاضر رہے جن کو دیکھنے سے قلب

ہیں گداز پیدا ہوتا ہے اور نفس مائل بہ فنا ہوتا ہے۔
اسی لئے کہتے ہیں کہ سانپ اگر چالیس سال تک آدمی کو نہ دیکھے تو اژدھا بن جاتا ہے بالفاظ دگر یوں کہیں کہ اُس نے کسی ایسے کو نہیں دیکھا جو اس کے شر اور نحوست کے ازالہ کا سبب بنتا۔ دیکھو جہاں بڑا تالا ڈالتے ہیں وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کوئی خاص اور قیمتی چیز رکھی گئی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جہاں حجاب عظیم ہے وہاں گوہر بھی عظیم ہے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ خزانہ کے منہ پر سانپ ہوتا ہے لہٰذا تو سانپ کی شکل و برائی کو نہ دیکھ بلکہ خزانہ کو دیکھ کیونکہ سانپ تو خزانہ کا ایک حجاب ہے۔
کمال کا اقتضا یہی ہے کہ اس کی جانب اُس کے غیر کا یعنی ناقص کا میلان ہو۔ ناقص ہمیشہ کمال تک پہنچنے کا خواہاں رہتا ہے، نقصان اور کمی کا خواہاں نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ہر اعتبار سے کامل اور جامع کمالات ہونا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کی پیدا کردہ جتنی بھی موجوداتِ ہستی ہیں ان کے اندر کمال اور جامع کمالات کی جانب میلان موجود ہے، اب اگر کوئی شخص ذات خداوندی میں نقص ظاہر کرنے کی بات کرتا ہے تو وہ اصل میں اس کے کمال ہی کا منکر نہیں ہے خود کائنات اور اس کے مصالح و مفادات کا بھی انکار کر رہا ہے اور دوسرے لفظوں میں یہ کہہ رہا ہے کہ کائنات خود زبردست ہے اور معدوم ہونے والی نہیں ہے (گویا ازلی اور قدیم ہے)۔
دیکھو تمہارا کیا حال ہے، تم مزے کا تصوّر تو کرتے ہو مگر اس کی کیفیت وحدود کے چکر میں پڑ جاتے ہو اور مزا غائب ہو جاتا ہے اسی طرح تصوّر تو تم اللہ کے فعل کا کرتے ہو مگر سمجھتے یہ ہو کہ اللہ کا تصور کر رہے ہو، اس کی خبر ہی تم کو نہیں کہ اس طرح مزا تم کو نہیں مل سکتا یعنی وہ صورت اور وہ

خیال جو تم نے اپنے ذہن میں قائم کرلیا ہے، وہ اللہ ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے
تو یہ فرمایا ہے کہ میرے طالب اور میرے عاشق بنو اور ہر قسم کے تصور و تخیل
اور حدود و کیفیت اور تمام اغراض کو ترک کرو۔ تب تمہیں کمال نقیب ہوگا۔
تمہارے سروپا میں، جو درد، تڑپ اور بیقراری ہے اس کو ایک قسم کا کف اور
ابال سمجھو جو دیگ سے باہر جوشش عشق کی بنا پر نکل رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جبتک
تم اپنے آپ سے بے خبر نہ ہوگے مجھ سے باخبر نہ ہوسکو گے۔

اللہ کی تمام صفات میں سے اس کی ذات تک ہر ایک کے اندر ڈبو اس
طرح جس طرح تم فقہ، نحو، تشریح یا جدل، خلاف اور عربی الفاظ کی تحقیق میں
ڈوبتے ہو۔ جبتک یہ نہ کروگے تم اس ترتیب عالم کو نہیں پاسکتے تمہاری
اس کوشش اور تجسس کی خوشبو مشک کی طرح ہوگی کہ وہ تمام جہان میں
پھیل جائے گی۔ اور ہر شخص تمہاری علمی جد و جہد کے باعث تمہاری قدر کریگا
اور تم کو باشرف سمجھے گا۔ اسی طرح تم لا إله الا الله کے کلمہ کے اندر اللہ کی تلاش
میں لگ جاؤ اور تم کو ذوق تمام حاصل ہوجائے اور تم اسی آن و احار میں تمام
علوم مذکورہ کے غور و فکر میں اللہ کے ساتھ رہو تو ان تمام علوم کو بھی اسی ایک
لمحہ اور لحظہ میں یاد کرلوگے کہ تمام مسائل کا مدار کیا ہے اور اس کا غیر کیا ہے
بے ذوقی میں تمام علوم ہی بے ذوق ہوجائیں گے۔ ذوق اور غلبہ اور اکرام اصل
میں یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس مشقت تک پہنچاؤ اور تم ایسی صفت اور حالت
کے حامل ہوجاؤ کہ دوسری روحوں کو بھی الجھنوں سے نکالو، اور ان کی پریشانیوں
پراگندگیوں کی طوفانی ہوائیں فراموش ہوجائیں بلکہ تمہارے "حال" کی
روشنی میں اسی طرح ناپید ہوجائیں جیسے ستاروں کی چمک آفتاب کی روشنی
میں گم ہوجاتی ہے، یقیناً تمہاری یہ روشنی ان سب کو نظر آئے گی اور وہ کہہ

اٹھیں گے کہ سبحان اللہ کیا ہی دانا اور زیرک شخص ہے یہ۔ مگر جلدی نہ کرو اگرچہ آدمی کی عمر بہت کوتاہ ہوتی ہے تم اس عمر کو چند کلمات میں ڈوب کر اختتام تک پہنچا دو تو تمہاری تمام تر مشقتیں اور علوم و فنون کی کتابیں، تمہاری ہو جائیں گی۔

اگر تم ادھر میری جانب نہیں آتے تو کیا تمہارے اختیار میں ہے کہ اپنے نہ آنے پر تم حق کی تہدید کرو؟ اگر آؤ گے تو خود اپنی خاطر آؤ گے (خود فائدہ اٹھاؤ گے)

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا کی تفسیر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔ نعمتوں کا شمار کرو اور جو وعدہ حضرت مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

اوّل یہ کہ تم جس دروازے پر دستک دے رہے تھے اس کو میں نے کھول دیا ہے کہ تمہاری دعائیں ہمارے حضور میں متجاب و مقبول ہوں، دوم یہ کہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ یعنی مغفرت اور آمرزش تاکہ تم جس کو دوست رکھتے ہو اس کا گناہ اور لغزش، تم کو گناہ نظر نہ آئے اور اس کا عیب تم کو عیب نہ معلوم ہو (بس ان سب کے گناہوں کو بخش دیا گیا یہی اس مغفرت کا راز ہے۔

سوم یہ کہ يُتِمَّ نِعْمَتَهٗ کہا گیا، نعمت کا یہ اتمام اور تکملہ ہی آپ کی خصوصیّت کی دلیل ہے۔ اس لئے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نعمتوں کا اتمام اور تکملہ نہیں ہوا تھا بس اس وصف کے باعث ان سے خاص تر ہوا کہ آپ سے زیادہ راہ یافتہ سب سے زیادہ حقیقت رسیدہ اور سب سے زیادہ حق پر قائم ہیں۔

چہارم:- يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا، فرمایا گیا یہ ارشاد آپ کی سلطنت اور ولایتِ (کاملہ) کی دلیل ہے، تم جانتے ہو وہ کون سی ولایت ہے، جس کے بارے میں ارشاد ہے یہ ولایت قوت نظر ہے جس سے ہر چیز کو وہ حق کی نگاہ سے دیکھیں جس طرح حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں قدم رکھ دیا (انھوں نے اس آگ کو حق کی طرف سے جانا) یا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بہ اطمینان خاطر دریا میں اتر گئے بلکہ اور دیکھو جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے آفتاب پر حکم چلایا حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کو (ابلنے کا) حکم دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے لوہے کو اس قدر نرم کیا۔ جس قدر آٹے کا خمیر نرم ہوتا ہے اور پہاڑوں سے گانے کی آواز ان کے حکم سے آئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارواح حیوانی پر حکم کیا اور جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شب آسمانوں کے طبقات سے اس طرح گزر گئے جس طرح معراج میں آپ گزرے تھے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا شمار نہیں ہے۔

چونکہ ان صاحبانِ نظر نے تمام چیزوں کو مامور من اللہ اور بندۂ حق جان لیا اور حق تعالیٰ کے امر کلّی کو دیکھ لیا، تو کائنات کی تمام اشیاء ان کی مسخر ہو گئیں اور یہ خود حق تعالیٰ کے مسخر ہیے اور حق تعالیٰ نے فرمایا، لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ شیخ ابن عطاؒ اس خطاب باری تعالیٰ کی تفسیر میں کہتے ہیں۔

"جب حضرت محمد مصطفےٰ علیہ السلام معراج میں درخت سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقام اور ٹھکانا ہے اور اس کے اوپر عرش ہے اور حضور علیہ السلام وہاں سے آگے بڑھے تو جبرئیل علیہ السلام جو یہاں تک آپ کے ساتھ تھے ٹھہر گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے برادر جبرئیل تم نے مجھے ہیبت جلال کے اس مقام پر تنہا چھوڑ دیا تو حق تعالیٰ نے عتاب فرمایا اور ندا آئی کہ صرف دو تین قدم کی ہمراہی نے تم کو جبرئیل (علیہ السلام) کا اس قدر گرویدہ بنا دیا۔ وہ گناہ جس کو "لیغفر لک اللہ" میں ذکر کیا گیا ہے یہی اس سے مراد ہے یعنی میں نے تمھارے دل کو (جبرئیل) کی محبت سے پاک صاف کر دیا اور تم کو غیر حق سے مستغنی کر دیا۔"

اسی سلسلہ میں شیخ ابن عطاؒ مزید فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) اور اولیاء کو مبتلائے گناہ کیا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آہ و زاری کی کہ ان کو بخش دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مصطفےٰ

علیہ السلام پر اپنی عنایت کی اور اپنی عطائے خاص سے اس حالت کو پوشیدہ رکھا تاکہ وہ بارگاہ ایزدی میں لا بہ و نزاری نہ کریں۔ فرمایا اگلے پچھلے تمام گناہ بخش دیئے اور لطف یہ کہ کسی گناہ کا نام نہیں لیا۔ اس رتبہ کے اظہار سے غرض آپ کی وہ محبت تھی جو تمام انبیاء سے زیادہ حق تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا۔ ابن عطاؒ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ "میں نے تمہاری وجہ سے گناہ پیشیں یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کو اور "ما تأخر" گناہ پسیں کو یعنی آپ کی امت کے گناہوں کو لطف سے بخش دیا چونکہ آپ ان کے رہبر و رہنما ہیں اس لئے وہ آپ سے اپنے گناہوں کے بخشوانے کی امید رکھتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ اوّل زمانے والے ہوں یا آخری زمانے والے بغیر آپ کے حق تک انکی رسائی نہیں ہے (آپ کے توسط ہی سے حق تعالیٰ تک پہنچ سکتے ہیں ۔)

کہا جاتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی یہ طلب آمرزش جذب وحق کی سے نکل کر دنیائے ہوشیاری میں آنے پر تھی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کے برعکس تھا، یعنی آپ کی استغفار حالت بیخودی میں حالت ہوشیاری سے تھی، (یعنی آپ نے حالت ہوشیاری میں، عالم بیخودی سے نکل آنے پر استغفار کی تھی) بعض کہتے ہیں کہ آپ نے ان دونوں حالتوں میں طلب مغفرت فرمائی (عالم بیخودی اور عالم باخودی) دونوں حالتوں میں آپ استغفار فرماتے تھے) مولاناؒ نے اس سلسلہ میں تین قول نقل کئے ہیں، قول اوّل یہ کہ آپکے استغفار کا تعلق حالت بیخودی سے تھا جس میں آپ اپنے عالم ہوشیاری سے استغفار فرماتے تھے، دوسرا قول یہ ہے کہ آپ اپنے اس حال ہوشیاری میں، حال بیخودی سے استغفار فرماتے تھے، تیسرا قول یہ ہے کہ آپ کی استغفار ان دونوں حالتوں سے تھی، (دیکھئے فیہ مافیہ صہ ۲۳۸ معارف پریس ایڈیشن) اس لئے کہ آپ کی نظر صرف حق پر تھی آپ کی ذات گرامی سے، سُکر کا تعلق تھا نہ صحو کا (مستی اور ہوشیاری آپ کی ذات سے متعلق نہ تھی) کہ اس سُکر و صحو کا تعلق تو ان لوگوں سے ہے جو صاحبانِ تلوین ہیں یعنی جن کے اندر تلوّن اور تغیّر پایا جاتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نہ سُکر سے متصف کیا جا سکتا ہے اور نہ صحو سے۔

چونکہ آپ ناظرِ حق تھے اس لئے آپ دونوں حالتوں سے استغفار فرماتے تھے یہ دونوں حالتیں آپ کے قبضے اور اختیار میں تھیں، ان احوال کی شرح تو یہ لوح و قلم بھی نہیں کر سکتے۔ ہاں اس لوح سے ممکن ہے جو خدا کی صفت ہے اور اس کا نام ہی 'لوح' ہے حقیقت میں وہ ایک ایسی صفت ہے جس کی نہایت نہیں ہے۔

خلق را زیرِ گنبدِ دوّار　　چشمہا درد، و دیدنی بسیار

(اور مخلوق کا عالم تو یہ ہے) کہ اس گنبد دوّار کے نیچے آنکھیں تو ہیں لیکن درد میں مبتلا ہیں اور یہاں دیکھنے کے لائق بے شمار چیزیں ہیں، شاید کرم الٰہی دستگیری کرے (تو دیدہ ممکن ہے) کُلٌّ عُسْرٍ عِنْدَ اللّٰہِ یُسْرٌ ۔ تمام مشکلیں اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہیں۔

یہ تمام توضیحات اور تمام مشاہدات جن پر ہماری اس وقت دسترس ہے اور یہ تمام اختیار اگر بچپن میں ہم کو سمجھائے جاتے تو اس وقت اُن کے سمجھنے کا امکان نہیں تھا۔

رضیت بما قسم اللہ لی	وفوّضت أمری الی خالقی
جو کچھ میری قسمت میں ہے میں اس پر راضی ہوں	اور میں نے اپنے تمام امور اللہ کے سپرد کر دیئے ہیں
لقد احسن اللہ فیما مضیٰ	کذلک یحسن فیما بقی
ماضی میں بھی اللہ نے اس کو بہتر ہی کیا	اور جو کچھ باقی ہے اس کو بھی اللہ بہتر ہی کریگا

پاک لوگوں کی نشانیوں سے یہ جو ہزاروں چیزیں ہم کو دکھائی ہیں ان کا ہم شکر ادا کرتے ہیں کہ شکر مزید نعمت کا سبب ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ تم پر اپنی نعمت تمام کر دے گا۔ نعمت تو محبت کی مِلک ہے، اوّل طلب محبت کی توفیق ہے تم محبّ تھے، محبوب بن گئے۔ تم نے پیغمبروں کی اتباع کی جسکے نتیجے میں تم متبوع بن گئے۔ تم محتاج تھے تم کو معراج (بلندی غِنا) عطا فرمائی جس کے نتیجے میں سیاہ و سفید (مال ومنال) سے تم کو رہائی مل گئی بلکہ تم کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تم ذاکر تھے (اس کا ذکر کرتے تھے) تم کو مذکور بنا دیا (اب ہر جگہ تمہارا ذکر ہے) مناروں پر، محرابوں میں اور سکّوں پر (اس میں لطیف کنایہ ہے ذات سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ وہ محبّ تھے اللہ کے محبوب بن گئے۔ تابع تھے متبوع ہو گئے، کم مایہ تھے معراج کی عظیم دولت نصیب

ہوئی اور وہ ہر سیاہ و سفید کے مالک بنا دیئے گئے، ذاکر تھے اس طرح مذکور ہوئے کہ اذان میں، خطبہ میں اور سکّوں پر نام نامی دوڑنے لگا)

اللہ تعالیٰ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب ہے، وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ٥ اور آپ کو اس راستہ پر لگا دیا جو حق تک پہنچانے والا ہے، وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا ٥ اور آپ کو شیاطین جن و وسواس پر منصور کر دیا اور اسی طرح شیاطین الانس پر جو کافر ہیں نصرت عزیز عطا فرما دی ایسا منصور نہیں بنایا جس میں کسی خوف کا عنصر شامل ہو یا زوال دولت کا اندیشہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، وَأَنزَلَ السَّكِينَةَ (اور ہم نے سکینہ وطمانیت نازل فرمادی) سکینہ ایسی نعمت ہے جس سے بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ سکینہ نام ہے اس کا کہ اسباب عالم سے جو کچھ پاس موجود نہ ہو اس سکینہ کے باعث یہ محسوس ہو کہ وہ موجود ہے یعنی اعتماد کلّی کا یہ عالم ہو (کہ اسباب ناموجود کو بھی موجود سمجھے) بعض حضرات کہتے ہیں کہ سکینہ یہ ہے کہ صاحب سکینہ جس طرح ظاہری چیزوں میں فرق کرتا ہے اسی طرح باطنی چیزوں میں بھی فرق کرتا ہو (صاحب تمیز ظاہر و باطن ہوتا ہے) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا ٥ (ان کے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے ان کا ایمان بڑھتا ہے)، مُراد یہ ہے کہ درویشوں میں ایمان روز بروز زیادہ اور افزوں ہوتا ہے جس طرح ماہ (روز بروز بڑھ کر بدر بن جاتا ہے)

اور یہ جو ارشاد فرمایا گیا، لِلَّهِ جُنُودُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے سب ہیں) تو جُنُودُ السَّمَاوَاتِ ملائیکہ ہیں اور زمین کے لشکر نفس سے مجاہدہ کرنے والے اور نفس سے لڑنے والے (درویش) ہیں بعض حضرات کہتے ہیں کہ آسمانی لشکر یہ دل ہیں اور زمین کے لشکر ان کے قالب ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ شیاطین اس کے لشکر ہیں وہ چاہے تو جنود شیاطین کو غالب کر لے اور چاہے تو ان قالبوں کے لشکروں کو غلبہ عطا فرما دے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے، إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا، ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا یعنی آپ کی ذات قول و فعل اور حال سے شاہد اور گواہ ہے۔ (آپ اپنے قول سے شاہد

ہیں، اپنے فعل سے شاہد ہیں اور اپنے حال سے شاہد ہیں) وَ مُبَشِّرًا ۔ آپ آمرزش کی بشارت
دینے والے ہیں۔ وَنَذِیْرًا اور آپ بدعت وضلالت سے ڈرانے والے ہیں آپ حق تعالیٰ
کی اجازت سے بشیر و نذیر ہیں۔ اپنی خواہش سے نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ (تاکہ تم سب اللہ پر
ایمان لاؤ) تاکہ راست گو کو اس ایمان لانے کی بدولت) راست گو جانو ۔ وَتُعَزِّرُوْہُ (یعنی اس محبوب
کو میں گرامی اور عزیز رکھتا ہوں۔ پس تم بھی اس کی عزت کرو اور گرامی جانو! زبان سے بھی اور خدمت
سے بھی یہی خلق عظیم سے ان کو موصوف کرنا، ان کی خدمت اور بندگی کرنا ہے،

اور اللہ تعالیٰ نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ ۔ یعنی وہ لوگ جو آپ کے ہاتھ
پر عہد و پیمان کر رہے ہیں، یہ خدا کے ساتھ عہد و پیمان کر رہے ہیں کیونکہ بشریت تو آپ میں بطور عاریت
ہے، اس عاریت کے واسطے کو بے واسطہ دیکھنا چاہیئے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ
بیعت کرنے والوں پر احسان ہے اللہ کا ان بیعت کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ پر کچھ احسان نہیں ہے،
بعض اصحاب کہتے ہیں کہ ان کی بیعت اور ان کی قوت حق تعالیٰ کی قوت کے نیچے ہے (حق تعالیٰ کی قوت
کے زیردست ہے۔) اگر وہ ان کی اس قوت کو یہاں کام میں نہ لاتا تو وہ کچھ بھی کام نہیں کر سکتے
تھے یہی مفہوم ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کا (کوئی خوف اور کوئی قوت، سوائے حق کی قوت کے نہیں ہے
اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ الاٰخرہ۔ تا آخر آیت اور اگر مکہ میں مومن
مرد نہ ہوتے (ترجمہ ناتمام)، شیخ سہل بن عبداللہ تستری رضی اللہ عنہ، (المعروف بہ سہل تستری رح
مومن کی تشریح و تصریح میں) فرماتے ہیں "مومن حقیقت میں وہ ہے جو اپنے نفس اور اپنے دل سے
غافل نہیں ہے اور اپنے احوال کی جستجو میں لگا رہتا ہے کہ میں نے فلاں وقت کیا کام کیا اور فلاں
وقت (مجھ پر کیا احوال طاری ہوئے) جب وہ اپنے حال میں کوئی تغیر پاتا ہے تو گریہ و زاری کرتا ہے
بالکل اسی طرح کہ جب زمین پر کوئی بلا نازل ہوتی ہے، جیسے چاند گرہن، سورج گرہن، زلزلہ،
زبردست بارش، ٹڈی دل کا شور، اور وبا وغیرہ، کہ جب اس قسم کی کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے
تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے تو وہ گریہ و زاری کرنے لگتے ہیں۔ (اس

طرح مومن اپنے حال کے تغیر سے آہ وزاری کرتا ہے، پس جب مومن اپنے اندر یقین کی کیفیت کو کم پاتا ہے، اپنے آنسوؤں کو خشک پاتا ہے یا احوال قلب کی طرف نظر کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کے اوقات بیکار گزر گئے ہیں آہ وزاری کرتا ہے، غور کرو تو دنیا کی بلائیں حق سے فرار کا نشان نہیں ہیں بلکہ دل پر جب یہ تغیرات اور بلائیں نزول کرتی ہیں تو یہ فراق حق کا نشان ہوتی ہیں۔ پس اس کے نقصان میں زیادتی ہوتی ہے، جس طرح دوسرے لوگ دنیا کے نقصان سے ترساں اور لرزاں ہوتے ہیں، بندۂ مومن دنیا کی زیادتی سے اس طرح ترساں اور لرزاں ہوتا ہے (کہ دنیا کی زیادتی دل کے نقصان کا باعث ہے) یہ لوگ حالِ دل کے ادنیٰ تغیر اور طاعت الٰہی سے دل کے گریز اور طاعت بے فایدہ سمجھنے اور رجا نہ سے ڈرتے رہتے ہیں (کہ کہیں ان کے دل میں یہ خطرات پیدا نہ ہوں)، اس لئے کہ یہ تھوڑا نقصان ایسا ہے جو بہت سے فائدے کو ختم کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ الآیۃ (سورۃ الفتح) یعنی جبکہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں عار کو جگہ دی اور عار بھی جاہلیت کی یعنی مومنوں کو آزار پہنچانے میں نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ مومنوں کے ایمان سے حسد کرتے ہیں (حسد ایمان غلط طبع ہوا ہے، از حسدِ ایمانِ ایشاں" صحیح ہے) اور اپنے عیش اور نفس کی خواہش کو یاد دلاتے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح وہ مومن کے عیش کو منغص نہ کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں اور مومن تو یہ چاہتے ہیں کہ اس عیش فانی میں عیش باقی کی قلم کاری کر کے ایک دوسرے سے ملا دیں۔ ان کا یہ عمل ایسا ہی ہے کہ کوئی ناواقف شخص سے زبردستی کر کے گیہوں چھین لیتا ہے لیکن اسی کے لئے گندم کو بو دیتا ہے تاکہ اس نادان شخص کی روزی اور قوت (خوراک) کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ لیکن وہ نادان (جو اس رمز سے آگاہ نہیں) فریاد کر رہا ہے کہ دیکھو مجھ پر کیسا ظلم کیا ہے۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ لوہے کی ایک انگشتری نے جس پر بادشاہ کا نام کندہ تھا، سونے کی ایک غیر منقش انگوٹھی سے کہا کہ ذرا بتانا کہ تجھ پر ایسا نقش موجود ہے (شاہ کا نام کندہ ہے) سونے کی انگوٹھی نے کہا نہیں۔ لوہے کی انگوٹھی نے کہا بس میں تجھ سے بہتر اور برتر ہوں۔ سونے کی انگوٹھی

کہاکہ ذرا اپنا نام تو بتا تو اس نے کہا لوہے کی انگوٹھی، سونے کی انگوٹھی نے کہا کہ نقش کے کندہ ہونے نے کیا تجھے "لوہا" ہونے سے بچا لیا۔ اس نے کہا نہیں تو سونے کی انگوٹھی نے کہا مجھے بے نقشی نے کیا سونا ہونے سے معزول کر دیا (کیا میں سونے کی انگوٹھی نہیں رہی) لوہے کی انگوٹھی نے کہا کہ نہیں ایسا تو نہیں ہے تب سونے کی انگوٹھی نے کہا غور کر نقد (دولت) کس کو حاصل ہے اور نقصان سے کون محفوظ ہے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَاِلَیْہِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآب

حضرت مولانا کی وصیت و نصیحت

مولف ملفوظات فیہ مافیہ کہتے ہیں کہ یہ وصایا حضرت مولاناؒ کے کلام سے ہیں۔

میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرو پوشیدہ ہو یا ظاہری ہو۔ کم کھانے کی عادت ڈالو، کم سونا اختیار کرو، اور کلام کم کرو، معاصی سے گریز کرو اور گناہوں سے بچو، خواہشات کو ترک کر دو ہمیشہ کے لئے، مخلوق کی زیادتی اور جفا کو برداشت کرو، روزوں پر مواظبت کرو (ہمیشہ نفلی روزے رکھتے رہو) قیام (نماز) کو دوامی بنا لو، کم عقلوں کی مجالست اختیار مت کرو، بلکہ اصحاب فضل اور صالحین کی صحبت اختیار کرو، اے میرے عزیز! اے میرے بھائی میری یہ نصائح یاد رکھو، دولت اور فضیلت کی قید میں مت رہو بلکہ اس فکر میں رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو کھول دے۔

تمت بالخیر